بطفیل اعلیٰحضرت سلطان العالم الحاج صوفی میاں محمد حسن شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کلید اعجاز

شرح اردو

مثنوی گنج راز

مصنفہ حضرت صوفی عبدالرحمٰن فتح آبادی نوراللہ مرقدہٗ

تقدیم

حضرت الحاج صوفی میاں احمد حسن شاہ صاحب قبلہ زید مجدہم

تالیف:- مولانا صوفی ظہیر احمد قریشی

ناشر

مکتبہ الفاروق وزیر بلڈنگ بھنڈی بازار، بمبئی-۳

سرپرستِ اعلیٰ :- بحضرت الحاج صوفی احمد حسن شاہ صاحب قبلہ زید مجدہم

نگراں :- مولانا صوفی قمر شاہ صاحب سیوہاروی

تالیف :- مولانا صوفی ظہیر احمد شاہ صاحب قریشی

نظرِ ثانی :- مولانا صوفی عتیق الرحمٰن شاہ صاحب

ناشر :- مکتبۃ الفاروق، وزیر بلڈنگ، بھنڈی بازار، بمبئی ۳-

ہدیہ :- ساٹھ روپئے /60

آمدنی :- وقف برائے درگاہ الحاج صوفی میاں محمد حسن شاہ صاحب و صوفی میاں عنایت حسن شاہ صاحب بھینسوڑی شریف تحصیل ملک ضلع رامپور-

معاونین خصوصی :- حضرت صوفی مُتّن شاہ صاحب (خلیفہ حضرت الحاج صوفی احمد حسن شاہ صاحب) بڑودہ

حضرت صوفی محمد اسماعیل شاہ صاحب " " " "	اجمیر شریف
حضرت صوفی صابر میاں شاہ صاحب " " " "	خلد آباد
حضرت صوفی مولانا قمر شاہ صاحب " " " "	بمبئی
حضرت صوفی محمد اسماعیل شاہ صاحب گیرج والے	بمبئی
حضرت صوفی نثار احمد شاہ صاحب	بمبئی
حضرت صوفی عبد المطلب شاہ صاحب	بمبئی

اشاعت اوّل : دو ہزار ایک سو ۲۱۰۰ - تاریخ اشاعت : جنوری ۱۹۸۳ء - شیروانی آفسٹ پریس مٹیا محل - دہلی ۶-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایجابِ کرم

بی زوانی کوردی اثبات مر احسن قبول

ای کہ دُرساختہ ای قطرہ باران را

بحضور سلطان الاولیاء آقای و مرشدی تاجدار زهنی

الحاج صوفی محمد حسن شاہ صاحب

قدس اللہ سرہ العزیز

صوفی احمد حسن شاہ نجفی

نظرِ کرم

از مقرب بارگاہ اولیا جناب صوفی لیاقت حسین شاہ صاحب عرف منے میاں زید مجدہم
سجادہ نشین درگاہ حسنی عزیزی بھینسوڑی شریف تحصیل ملک ضلع رام پور، (یو۔پی)

حامداً و مصلیاً! حضرت الحاج صوفی احمد حسن شاہ صاحب کی حیات فنا فی الشیخ کا جیتا جاگتا نمونہ ہے، اطاعتِ شیخ انکی زندگی کا اولین نصب العین ہے، یہی نصب العین سلطان العالم حضرت صوفی محمد حسن شاہ صاحبؒ کے دستِ مبارک سے عطا کردہ مثنوی گنج راز کی تشریح منظرِ عام پر لانے کا باعث ہے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کا نسخہ حضرت حاجی صاحب کو خصوصی طور پر یہ کہتے ہوئے مرحمت فرمایا تھا کہ ہمارے اوپر والے جو کچھ ہم سے کہنا چاہتے تھے وہ اس کتاب میں ہے، اس کا ترجمہ اردو میں شائع کر دینا۔ حضرت حاجی صاحب نے صمیمِ قلب سے اس سعادت کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھا اور فرمانِ شیخ کے مطابق اس اہم کام کو انجام دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کام بہت مشکل تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان اور بزرگوں کی نظرِ کرم کے طفیل بڑے سلیقہ کے ساتھ ظاہری اور باطنی خوبیوں کو اپنے جلو میں لئے یہ عروسِ تصوف اردو کے لباس میں جلوہ گر ہے، اہلِ تصوف اور اربابِ قلب و نظر کیلئے حقیقۃً یہ کتاب رہنمائے منزل ہے، اس میں جسقدر اشغال بیان کئے گئے ہیں ان کی افادیت بزرگانِ دین کے تجربات سے مسلّم ہے، ان اشغال میں سے کوئی بھی شغل ایسا نہیں جس کا لازمی نتیجہ ذاتِ وحدہٗ لاشریک کی معیت و قربت کے حصول سے خالی ہو، ہر ایک شغل خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو، سالک کو اس راستہ پر لگا دیتا ہے جو صرف ذاتِ وحدہٗ لاشریک کی معرفتِ صفات کے ذریعہ ذات کا تعارف کرا دیتا ہے، اس سے بڑھ کر اس فانی انسان کے لئے اور کیا نعمت ہو سکتی ہے کہ وہ معرفتِ صفات حاصل کر کے مقصدِ تخلیق کی تکمیل کرے۔

تقریباً ساڑھے چار سو برس قبل کی یہ کتاب اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس وقت تصوف کی کیا شان تھی، اہلِ قلم، اہلِ علم، اہلِ عمل اور اہلِ دل حضرات کی جانفشانی نے کہاں کہاں سے ان موتیوں کو جمع کر کے ایک لڑی میں پرو دیا اور شریعت کے دوش بدوش چلتے ہوئے طریقت میں کچھ ایسے مفید

امور کو معمول بنایا جن کے ذریعہ توحیدِ خالص کا بے بہا خزانہ ہاتھ آگیا۔

اشغال کے سلسلے میں معترضین حضرات کا یہ کہنا کہ ان کا کتاب وسنّت سے ثبوت نہیں ملتا یہ بعد کی پیداوار ہیں جن میں یونانی اور عجمی فلسفہ اور طریق کار کو دخل ہے اور یہ تمام بدعت کے ضمن میں آتا ہے، تو اس سلسلے میں اس ناچیز کی گذارش یہ ہے کہ اس قسم کا اعتراض کرنے سے پہلے تھوڑی دیر کیلئے دل ودماغ کو ٹھنڈا کر کے اتنا ضرور سوچ لینا چاہیئے کہ تمام اشغال اس اعتراض کے ضمن میں آتے ہی نہیں، کیونکہ یہ سب احداث للدین ہیں، احداث فی الدین نہیں یعنی ان تمام کا اضافہ تقویتِ دین کے لئے شریعت سے تعارض کے بغیر کیا گیا ہے، شریعت کے اندر کتربیونت کر کے نہیں کیا گیا، جیسا کہ مؤلف نے لکھا ہے کہ اختلاف رائے کوئی بری بات نہیں لیکن اس اختلاف کو مخالفت کا رنگ دینا کسی طرح بھی کسی سنجیدہ آدمی کے لئے مناسب نہیں۔

کتاب کی افادیت میں تو شک نہیں لیکن بعض مقامات کی تشریح میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے اگر وہاں تھوڑی تفصیل سے کام لیا جاتا تو بہت مناسب تھا نیز بعض جگہ عبارت اسقدر مشکل نظر آتی ہے کہ اصطلاحات کے جانے بغیر مفہوم کا اخذ کرنا مشکل ہے، اگرچہ اس مجبوری سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ عبارت کتنی بھی آسان کی جائے مگر پھر بھی بعض جگہ اصطلاحات کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ صوفیاء محققین نے اکثر اصطلاحات اس قدر جامع اور مختصر مقرر فرمائی ہیں کہ ان کی تشریح کیجئے تو پھر کتاب کی ضخامت قیاس سے بالاتر ہو جائے گی۔

بہرحال میں اس کارِ خیر کی تکمیل اور انجام دہی پر حضرت الحاج صوفی احمد حسن شاہ صاحب کو اپنی طرف سے اور اپنے متعلقین کی طرف سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور ہم سب کو اس کتاب سے فائدہ اٹھا کر اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، اور راہ معرفت ہم سب کے لئے آسان فرمائے۔

والسلام

طالب دعا و دعا گو ——— صوفی لیاقت حسین

فیضِ نظر

حضرت صوفی فصاحت میاں شاہ صاحب قبلہ، سجادہ نشین درگاہ
حضرت صوفی راحت میاں شاہ صاحب و درگاہ حضرت صوفی عنایت حسن شاہ صاحب
بھینسوڑی شریف و درگاہ اسد جہانگیر سیدنا و مولانا حضرت صوفی میاں
محمد نبی رضا خاں صاحب نور اللہ مرقدہ، لکھنؤ

الحمدُ للہِ وَکفیٰ وَسَلامٌ علیٰ عِبادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفیٰ۔ امابعد! حضرت الحاج محترم صوفی احمد حسن شاہ صاحب کے پیر و مرشد حضرت الحاج صوفی محمد حسن شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے شیخ سے جو والہانہ عقیدت تھی، اور شیخ کو اپنے اس مرید سے جو قربت تھی مثنوی گنج راز درحقیقت اسی رابطہ کا ظہور ہے۔ ہمارے جدِ امجد نے حاجی احمد حسن صاحب کے شیخ کو یہ کتاب مرحمت فرمائی تھی۔ انھوں نے اپنے اس چہیتے کو یہ کہتے ہوئے مثنوی گنج راز سپرد کی تھی کہ ہمارے اوپر والے جو کہنا چاہتے تھے وہ سب اِس میں ہے، اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ اشغال کے سلسلے میں یہ مختصر مگر جامع کتاب ہے۔ تمام سلاسل کے اشغال اس میں نہایت مستند طریقہ پر ایک نرالی شان کے ساتھ نظم کردیے گئے ہیں۔

بظاہر تو یہ کام بہت مشکل نظر آتا تھا کیونکہ اس دور میں چاروں طرف مادیت کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں اور عوام ہی نہیں بلکہ خواص کی نظریں بھی ظاہر پر ٹکی ہوئی ہیں، ان حالات میں اس کتاب کی اشاعت اللہ تعالیٰ کا کرم اور بزرگانِ دین کا فیضان معلوم ہوتا ہے۔

جو حضرات تصوف اور اشغال و اوراد سے کچھ علاقہ رکھتے ہیں اور طلب حق کا چراغ بھی ان کے دلوں میں روشن ہے، وہ ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور اس کتاب سے روحانی فیض حاصل کرینگے کیونکہ بعض اشغال نہایت مختصر ہونے کے باوجود بیحد مفید ہیں۔ مرشد کی نگرانی میں ان میں سے کسی بھی شغل کو معمول بنانے سے جن کیفیات کا حصول ہوگا وہ قوتِ ایمانی میں اضافہ کا باعث ہوگا اور اس کے ذریعہ قربِ ذات کی منزلیں بہت جلد طے ہوجائیں گی۔

ان اشغال کے سلسلے میں یہ بحث کرنا کہ قرآن و سنت سے ان کا ثبوت نہیں، دراصل بحث برائے بحث کی غمازی کرتا ہے، ورنہ اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اذکار کی طرح اشغال کا تعلق بھی قرآن و سنت سے ہے اور یہ تعلق کہیں یقینی ہے، کہیں جلی ہے، کہیں خفی ہے۔ ان مراتب میں امتیاز نہ کرنے کی وجہ سے شبہ پیدا ہوجاتا ہے، اور یہ بات بھی ہے کہ صوفیاء حضرات الفاظ کی تکرار میں زیادہ حصہ بھی نہیں لیتے تھے، اس لئے انھوں نے نتائج کو بیان کرکے راہِ عمل متعین کردی، لیکن جب قلب و نظر کی سلامتی کے ساتھ ان اشغال کے ماخذ پر غور کیا گیا تو قرآن و سنت سے ان کے راستے مل گئے، میرا تو نظریہ آج بھی یہی ہے کہ ان مباحث میں پڑکر الفاظ کی کش مکش سے دامن بچانا نہایت ضروری ہے۔ صمیم قلب کے ساتھ مرشدِ کامل کی نگرانی میں جہاں تک ہوسکے ان اشغال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

میں بارگاہِ خداوندی میں دست بدعا ہوں کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اس کتاب کو تمام سلاسل کے لئے ہر طرح فیض بخش بنائے۔ آمین

والسلام

صوفی فصاحت بیاں شاہ

حرفِ نظر!

از حضرت الحاج صوفی میاں نقیب اللہ شاہ صاحب قبلہ دامت برکاتہم
آستانہ عالیہ نقیب آباد، تحصیل قصور، لاہور (پاکستان)

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ واہل بیتہ اجمعین، اما بعد! زیرِ نظر کتاب "مثنوی گلشن راز" کے اردو ترجمہ وتشریح پر محترم بھائی صوفی احمد حسن شاہ صاحب کی طرف سے تبصرہ کی ذمہ داری ایک اہم کام تھا۔ یوں تو بذاتِ خود تصوف کے سلسلے میں لوگوں کی رائے افراط وتفریط سے دامن نہ بچا سکی، خصوصاً اشغال کا معاملہ تو ایسا پیچیدہ ہے جس پر قلم اٹھاتے ہوئے بڑے محتاط انداز سے سوچنا اور لکھنا پڑتا ہے اور آج کے مادی دور میں روحانیت کا تصور ایک ایسا خواب بن گیا ہے جس کی تعبیر بہت مشکل ہے۔

حالانکہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا اسلام ایک ایسا متحرک، فعال اور کشادہ نظر مذہب ہے جس کی بنیاد ارکان خمسہ پر قائم ہے اور اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ (اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم یہ تو ضرور سمجھو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے) یہ حدیثِ پاک ان ارکان میں روحانیت کا تصور پیدا کر کے مومن کو مرکزِ نظر کی وحدت سے روشناس کراتی ہے۔ بزرگانِ دین نے اس تصور کی تحصیل کے لیے مختلف قسم کے اشغال متعین فرما کر اس راہ کو بہت آسان کر دیا ہے۔ جو تجربہ

کی کسوٹی پر بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ کتاب مثنوی گنج راز میں کوئی شغل ایسا نہیں ہے جس سے یہ مقصدیت حاصل نہ ہوتی ہو۔

سیدی و مرشدی ولی الاکمل حضرت الحاج صوفی میاں محمد حسن شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے دستِ خاص سے عطا کی ہوئی کتاب مثنوی گنج راز کی تشریح و ترجمہ کی اشاعت ہم سب حلقہ بگوشانِ حسنؒ کے لیے بڑی مسرت کا باعث ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ اہم کام محترم بھائی الحاج صوفی احمد حسن شاہ صاحب کی زیر نگرانی مکمل کرا دیا اور دوسرے متعدد کاموں کی طرح یہ سعادت بھی انھیں کے حصہ میں آئی۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ صمد میں دعا گو ہوں کہ وہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ نفع بخش بنائے، اور ہم سب کو زیادہ سے زیادہ علم و عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

والسلام

صوفی نقیب اللہ شاہ

اعجازِ منظر

از: حضرت صوفی شمشاد علی صاحب حسنی قادری ابوالعلائی جہانگیری

لیاقت آباد، نزد جامع مسجد۔ بی ایریا، ۱۷/۲، کراچی نمبر ۱۹

سیدی و مرشدی ولی اکمل حضرت الحاج صوفی میاں محمد حسن شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک سے عطا کی ہوئی کتاب "مثنوی گنج راز" کے سلسلہ میں محترم بھائی احمد حسن شاہ صاحب سے ذاتی طور پر بھی ملاقات ہوئی، دورانِ تالیف متعدد مقامات کے پڑھنے کا اتفاق ہوا، بعض عنوان پر تبادلۂ خیال کرنے کے بعد مفید اصلاحات بھی کی گئیں۔

حاجی صاحب موصوف کے ذریعہ حضرت پیر و مرشد کے فرمان کی تکمیل یقیناً ہم سب کے لئے باعثِ سعادت ہے۔ کتاب کو ترتیب و اشاعت کے مراحل سے گزار کر منظرِ عام پر لانا بڑا مشکل کام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم اور پیرانِ عظام کی توجہات سے آسان بنا دیا۔

میری تمنا ہے کہ تمام سلاسل سے متعلق حضرات، جن کے دل میں طلبِ حق کی تڑپ ہے اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں اور خلوصِ قلب کے ساتھ عمل کر کے دارین کی سعادت سے بہرہ ور ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں تمام کوشش کرنے والوں کی جد و جہد کو شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین بجاہِ سید المرسلین علیہ التحیۃ والسلام الیٰ یوم الدین۔

صوفی شمشاد علی حسنی قادری ابوالعلائی جہانگیری۔

مشاہدۂ نظر

از: جناب صوفی منصور الحسن شاہ صاحب دامت برکاتہم محفل خانۂ حسنی کھنڈی باڑہ ہلٹ کالونی بمبئی ۔ ۸۲
ای ۔ ۱۹۷ ۔ سیٹ لائٹ ٹاؤن ، بیک سائڈ ہولی فیملی ہاسپٹل ، راولپنڈی ، پاکستان

کتاب "مثنوی گنج راز" کے دوبارہ دستیاب کرنے کے سلسلے میں جناب بھائی صوفی الحاج احمد حسن شاہ صاحب کو جس قدر پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے میں اس کا عینی اور عملی شاہد ہوں، بھائی صاحب مسلسل جدّوجہد اور انتھک طبیعت کے مالک ہیں فی الواقع یہ انہیں کے عزم محکم اور جذبِ خالص کا نتیجہ ہے کہ سیّدنا و مرشدنا الحاج صوفی میاں محمد حسن شاہ صاحب کے حکم کی تعمیل بحسن و خوبی انجام پذیر ہوئی۔ حضرت قبلہ کی دعاؤں کے طفیل اس کتاب کا ترجمہ اور تشریح جس انداز میں ہوئی ہے اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہے۔ اس مادّی دور میں جبکہ چاروں طرف بے سکونی اور اضطراب کی لہر چل رہی ہے یہ کتاب دردِ لادوا کے لئے بہترین معالج ثابت ہوگی۔ ہمارے اسلاف کی دُوربیں نگاہیں زندگی کے تمام شعبوں پر کس قدر نتیجہ خیز انداز سے پڑتی تھیں، اُس کا ایک نمونہ اس کتاب کی بامقصد اشاعت ہے۔

میری دُعا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر مثنوی گنج راز کو طالبانِ راہ معرفت و حقیقت کے لئے مفید سے مفید تر بنائے، اور میرا یقین کامل بھی یہی ہے کہ یہ کتاب وابستگانِ دامانِ اولیاء کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

والسلام
صوفی منصور الحسن شاہ۔

باسمہٖ وحمدہٖ

آگاہی حقیقت

فیض العارفین حضرت مولانا صوفی غلام آسی پیا حسنی شاہ صاحب قبلہ دامت برکاتہم

بہار حسن و بہار چمن سلام علیک — نسیم گلشن خواجہ حسن سلام علیک (آسی)

محترم مقرب بارگاہ برادر طریقت الحاج صوفی احمد حسن شاہ صاحب زید مجدہم نے جس خلوص کے ساتھ مثنوی گنج راز کی تشریح کا فریضہ انجام دیا ہے اس کیلئے موصوف کی جدوجہد اور لگن کو داد دیتا ہوں مثنوی گنج راز صرف پیری مریدی ہی سے متعلق نہیں بلکہ اس کتاب میں مرید و مرشد کا مقصد، ذمہ داریاں اعمال و اشغال، اور کیفیت عبادات کا جس انداز میں ذکر کیا گیا ہے، اس مسئلہ میں اسقدر اختصار اور جامعیت کے ساتھ آجتک کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گذری۔ شاید "دیوان تراب" اور "دیوان نیاز" کا ماخذ یہی کتاب ہے۔ اس کتاب کا صرف ترجمہ مطالب کی وضاحت کیلئے ناکافی تھا، اسلئے اسکی تشریح بھی حتی الامکان نہایت ذمہ داری کے ساتھ کی گئی۔ اگرچہ اس اہم بالشان کام کیلئے کافی طویل عرصہ اور تجربہ درکار ہے مگر سرکار کے نوازنے کے انداز نرالے ہیں۔ ذرّے کو آفتاب کردیں اور قطرے کو سمندر کی وسعت بخش دیں۔ اس دور میں جبکہ چاروں طرف مادیت کا سیلاب امڈ رہا ہے اس کتاب کی اشاعت اندھیرے میں چراغ روشن کرنے کے مترادف ہے۔

ترجمہ میں کہیں کہیں بخل سے کام لیا گیا ہے اور بعض جگہ تشریحات میں اختصار ہے جس کی وجہ سے یک نظر دیکھنے سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے، غالباً کتاب کی ضخامت زیادہ ہونیکے پیش نظر اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

صمیم قلب سے دعا گو ہوں کہ اس کتاب سے وابستگان سلاسل اربعہ کو فیض پہنچے اور دنیا و آخرت میں رفعت درجات کی نعمت بے بہا میسر ہو۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

مشعلِ عرفان و آگہی

از: حضرت الحاج محمد یٰسین شاہ صاحب صادق دہلوی مدظلہ العالی۔

"مثنوی گنجِ راز" تصوف کے اشغال و دیگر بنیادی اُمور کے سلسلہ میں وہ عدیم المثال خزانہ ہے جو ہمارے پیر و مرشد سلطان الاولیا شمس العارفین حضرت الحاج صوفی میاں محمد حسن شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک سے برادرِ معظم حضرت حاجی صوفی احمد حسن شاہ صاحب کو عطا ہوا کہ وہ اس مشعلِ عرفان و آگہی کے نور کو طالبانِ حق و راہروانِ طریقت تک پہونچا سکیں۔

بفضلہٖ تعالیٰ حاجی صاحب موصوف نے مسلسل جدّ و جہد اور لگن کے ساتھ فرمانِ مرشد کی احسن طریقہ پر تکمیل کی، بلاشبہ اس اہم نصب العین کی کامیابی پر موصوف ہم تمام وابستگان سلسلہ کی جانب سے مبارک باد کے لائق ہیں۔ تاریخ اپنے آپ کو ہمیشہ دُہراتی رہتی ہے اسی لئے میرا نظریہ یہ ہے کہ پندرھویں صدی جہاں اپنے جلو میں اسلام کے لئے مسائل کا انبار لیکر آئی ہے وہاں منجانب اللہ ایسے اسباب بھی ظہور پذیر ہوں گے جو آج کے دورِ ظلمت و الحاد میں مشعلِ معرفت روشن کر کے بھٹکی ہوئی انسانیت کی روحانی تشنگی کو دُور کر سکیں گے۔ زیرِ نظر کتاب کے اشغال کے ذریعہ وحدہٗ لاشریک کی وحدانیت، قدرت، لامحدودیت اور ربوبیت پر یقینِ کامل کا حصول ہو سکتا ہے جو اسلام کا بنیادی مقصد ہے اور یہی مقصد حدیث پاک کے اس مفہوم کی کہ رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّ بِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دست بہ دُعا ہوں کہ ہم کو اپنی رحمت، اور اپنے حبیب پاک کے صدقے اور اولیاء کرام کے طفیل اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے اور دوسروں تک پہونچانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وابستۂ دامنِ حسن :- صادق دہلوی

چشمِ التفات

از: حضرت مولانا صوفی محمد خوشحال میاں صاحب، چلّہ گاہ بہار گڑھ، مظفر نگر، یوپی۔

زیر نظر کتاب "مثنوی گنج راز" تصوف کا بیش بہا خزانہ ہے۔ جس میں اشغالِ تصوف کو اِس جامعیت اور اختصار کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے جو لائق صد تحسین ہے، فارسی زبان میں ہونے کی وجہ سے اس کی افادیت محدود تھی۔ آقائی و مرشدی حضرت الحاج صوفی میاں محمد حسن شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اس مقصدِ اعلیٰ کی توسیع کے پیش نظر اُردو میں اس کتاب کے ترجمہ و تشریح کا کام الحاج صوفی احمد حسن صاحب کے سپرد کیا، جس کو موصوف نے اپنی نگرانی میں مولانا صوفی ظہیر احمد صاحب کے ذریعہ بحُسن و خوبی اختتام تک پہونچا دیا۔ مضامین کی تشریح بھی خوب ہے اور ترجمہ میں ترجمانی بھی عمدہ ہے۔ دو تین شغل بہت مختصر، اہم اور مفید ہیں، باجازت ان میں مشغول ہونے پر طالب حق کو ان شاء اللہ تعالیٰ بہت فائدہ پہونچے گا۔

خداوند دو عالم حاجی صاحب اور مولانا صاحب کی اس سعیٔ جمیل کو قبول فرما کر ثوابِ دارین عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

محمد خوشحال

چلّہ گاہ بہار گڑھ، مظفر نگر، یوپی۔

انکشافِ راز

از: محترم جناب صوفی سیّد نواب علی شاہ صاحب اِسلامیہ بیکری آگرہ روڈ کُرلا بمبئی

منزلِ معرفت کے راہرو "مثنوی گنج راز" کے نام ہی سے تڑپ اٹھیں گے، یہ کتاب عشاق کے لئے مشعلِ راہ ہے، عشاق کے مراتب عقل سے باہر ہیں، سرکار غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

حسابِ عمر صد عاقل بمحشر بگذرد یک دم
حسابِ یک دم عاشق بصد محشر نمی گنجد

مثنوی گنج راز کی شرح میں قبلہ حاجی احمد صاحب مدظلہ العالی کی سعیٔ بلیغ صوفیائے کرام اہلِ محبت پر بہت بڑا احسان ہے، اس تشریح کے ذریعہ گویا سترِ نہاں کو منکشف کر دیا۔ اس دور میں اس قسم کی کتابیں شاذ و نادر ہی طبع ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی بارگاہ میں اس کو قبول فرما کر طالبانِ حق کو فیضیابی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

صوفی سیّد نواب علی، اسلامیہ بیکری، آگرہ روڈ، کُرلا۔ بمبئی نمبر

خانقاہ نوابیہ، بالا کمپاؤنڈ، بھیونڈی، ضلع تھانہ۔

خانقاہ نوابیہ، نمبر ۱۵۱، بجاری کی چال، گومتی روڈ، احمد آباد، نمبر ۲۱

خانقاہ نوابیہ، نواب منزل، پنجاروا ڑہ، دوحد، ضلع پنج محل، گجرات۔

خلوصِ بیکراں

از: جناب صوفی عبداللہ مجید شاہ صاحب محفل جہانگیریہ بیٹھک مہری درگاہ

وڈالا۔ بمبئی ۳۷۔

رازہائے معرفت کا گنجینہ بے مثال "مثنوی گنج راز" فارسی زبان میں وہ منظوم تحفہ ہے جو اکثر سلاسل طبقات کے اشغال پر مشتمل ہے۔ اردو زبان میں اس کا ترجمہ اور تشریح وقت کی اہم ضرورت تھی، حضرت الحاج صوفی احمد حسن شاہ صاحب نے ولی اکمل حضرت قبلہ میاں محمد حسن شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ کے فرمانِ عالی کی تعمیل میں جس خلوصِ بیکراں کا ثبوت پیش کیا ہے وہ ذاتِ مرشد سے انتہائی عقیدت کا مظہر ہے۔

پیش نظر کتاب یقیناً ہر مکتبہ فکر کے لئے رہنما ہے، خصوصیت کے ساتھ طالبانِ حق اور وابستگانِ سلسلہ اس سے عظیم فائدہ اٹھائیں گے۔

میری دعا ہے کہ بھائی الحاج صوفی احمد حسن شاہ صاحب کو اللہ تعالیٰ دونوں جہان میں شاد و آباد رکھے۔ آمین۔

صوفی عبدالمجید شاہ۔

رموزِ معرفت

از : حضرت صوفی محمد زکریا شاہ صاحب زید مجدہم ۔ بمبئی

اشغالِ تصوف سے اولیاء کرام کی تصنیفات و ملفوظات مزین ہیں ۔ اور تقریباً تمام سلاسل میں محققین صوفیائے عظام نے اذکار و اشغال پر یکسوئی اور مستقل مزاجی کے عمل کرنے کی تلقین کی ہے ۔ اور ان کو مقصودِ اصلی کی معرفت حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے ۔

" مثنوی گنجِ راز " کے مصنف علیہ الرحمۃ نے ان تمام اشغال کو نظم کی صورت میں جمع کر کے سمندر کو کوزے میں سمو دیا ہے ۔ سیدنا و مرشدنا الحاج صوفی میاں محمد حسن شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی اہمیت کے پیش نظر اس تحفۂ بے مثال کو اردو میں اشاعت کے لئے محترم بھائی حاجی احمد حسن شاہ صاحب زید مجدہم کا انتخاب کیا ۔ موصوف نے انتھک اور مسلسل جدّ و جہد کر کے بڑے سلیقے اور عمدگی کے ساتھ فرمانِ شیخ کی تعمیل کی ۔

بلاشبہ حاجی صاحب اس عظیم کارنامے پر ہم سب کی طرف سے لائقِ مبارکباد ہیں ۔ بارگاہ ذوالجلال میں دست بہ دعا ہوں کہ حاجی صاحب قبلہ کی اس کوشش کو قبول فرما کر رموزِ معرفت کے متلاشی حضرات کے لئے مشعلِ راہ بنا دے ۔ آمین

والسلام

صوفی محمد زکریا شاہ ۔

تقدیمِ خیر

از :۔ محترم جناب صوفی علی حسین شاہ صاحب مدّظلہٗ العالی، بمبئی

"مثنوی گنج راز" اشغالِ تصوف کے سلسلہ میں ایک جامع اور مختصر منظوم صحیفہ کی صورت بے مثال قلمی کاوش تھی جو تقریباً ساڑھے چار سو برس قبل مرشد سالکان حضرت صوفی عبدالرحمن فتح آبادی (چاٹگام) کے قلم گہربار سے صفحۂ قرطاس پر شہود پذیر ہوا حضرت شاہ عبدالحئی صاحب قبلہ چاٹگامی نور اللہ مرقدہٗ نے متعدد قلمی نسخوں کے ذریعہ اس مثنوی کی نشاۃ ثانیہ فرمائی، اسقدر طویل سفر طے کرتا ہوا سیّدی و مرشدی حضرت الحاج صوفی میاں محمد حسن شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک سے یہ قیمتی تحفہ محترم بھائی حاجی احمد حسن صاحب تک پہونچا، تاکہ اس کو اردو میں ترجمہ کراکے سالکانِ راہِ طریقت کی رہنمائی کے لئے زیورِ طبع سے آراستہ کیا جائے۔

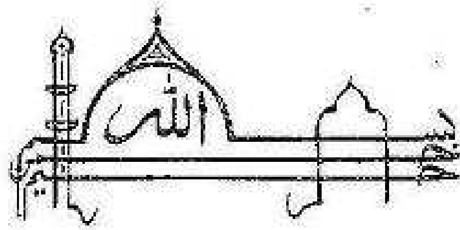
خدا کے فضل و کرم اور پیران عظام کی دعاؤں کے طفیل ترجمہ و تشریح کا کام لفظی اور معنوی خوبیوں کے امتزاج کے ساتھ منزل تکمیل تک پہونچ گیا۔ حاجی صاحب موصوف کی طرف سے یہ کوشش "تقدیمِ خیر" کے مترادف ہے۔ تمام سلاسل طیبّہ سے منسلک حضرات کے لئے یہ کتاب بہت ہی مفید ہوگی۔ اللہ تعالیٰ شرف قبولیت عطا فرماکر اس سلسلہ میں جدّ و جہد کرنے والے تمام حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

والسّلام

احقر سگ درِ حسنی علی حسین

فہرست مضامین

کلیدِ اعجاز شرح اردو مثنوی گنجِ راز



وجہِ تالیف

از:- سیدی و مرشدی الحاج صوفی میاں احمد حسن شاہ صاحب قبلہ دامت برکاتہم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد وآلہ وصحبہٖ و اولیائہ اجمعین، اما بعد! ۱۹۵۷ء میں خادم بہ سلسلہ شرکتِ عرس داداحضور قبلہ ہادی الاکمل الحاج صوفی میاں محمد عنایت شاہ صاحب بھینسوڑی شریف پہنچا۔ پیرومرشد ولی الاکمل حضرت الحاج صوفی محمد حسن شاہ صاحب قبلہ کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا، اُن دنوں حضرت پیرومرشد پر عجیب انداز کی کیفیات طاری تھیں حاضرین کی تمام تر توجہات حضرت قبلہ کی طرف مرکوز تھیں، ایک آنکھ بھی ایسی نہ تھی جو آپکی طرف سے ہٹی ہوئی ہو، حضرت کی ذاتِ گرامی کی طرف دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آپکی ذات گرامی اسرارِ خداوندی کی کھلی کتاب ہے۔

ہمیں بھی اپنی کچھ سُدھ بُدھ نہ رہی۔ اسی اثناء میں ایک روز حضرت شہزادہ محبوب میاں شاہ صاحب سے فرمایا کہ اندرونِ خانہ سے ہمارا بکس لاؤ، بکس سے ایک کتاب بنام مثنوی گنجِ راز نکال کر ہمیں دیتے ہوئے فرمایا "اس کتاب کو اردو کروالینا، ہم جو کچھ تمہیں سمجھانا چاہتے ہیں ہمارے اوپر والے اس میں سب کچھ لکھ گئے ہیں" کتاب ہمارے ہاتھ میں آئی کھول کر ایک نظر دیکھا، اُدبا بند کرلیا، پہلی فرصت میں مثنوی شریف کو باغور دیکھا، کبھی خود کو، کبھی مثنوی شریف کو دیکھتے اور غور کرتے کہ اس دقیق کتاب کو ہم اُردو کیونکر کرا سکیں گے۔

بمبئی میں اکثر پڑھے لکھے لوگوں میں جاتے اور یہ کتاب دکھلاتے، جیسے جیسے لوگوں کو کتاب

دکھلائی جاتی رہی ویسے ویسے کتاب کا دقیق ہونا معلوم ہوتا گیا لیکن ہمیں ایسے شخص کی تلاش رہی جو عربی اور فارسی پر دسترس رکھتا ہو اور صوفی مسلک بھی ہو۔ اسی جستجو میں تقریباً چھ مہینے گذر گئے، اتفاق سے ڈکن روڈ پر ہمارا گذر ہوا، ہماری ملاقات حضرت صوفی الطاف حسین شاہ صاحب عرشی نصیر آبادی خلیفہ حضرت مولانا عبدالشکور شاہ صاحب سے ہوئی، ہم نے ان بزرگ کی دست بوسی کی، آپ ہمارا ہاتھ پکڑ کر اس کارخانے میں لے گئے جس کے دروازے پر آپ کھڑے تھے اور جس میں آپ منیجر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اس کارخانے میں تانبے کے اُن رولز پر ڈیزائن کی کھدائی کا کام ہوتا تھا جو کپڑے کی ملوں میں ڈیزائن کی چھپائی کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، آپ نے ہمیں پورے کارخانے کی سیر کرائی، اسی دوران ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں رولوں کی گھسائی ہو رہی تھی، ہم نے معلوم کیا، حضور! یہ کیا ہو رہا ہے، فرمایا پرانے نقش و نگار مٹائے جا رہے ہیں، پھر ان پر جدید طرز کے نقوش کھودے جائیں گے۔

اِن بزرگ کی اس بات پر ہماری نگاہِ تصور کے سامنے "سیرت فخر العارفین" کا صفحہ دو سو ننانوے پر عنوان "نئی شان کا ظہور" آ گیا، دست بستہ ہم نے کہا کہ حضور! ہمارے بھی پرانے نقش و نگار مٹوا دیجئے اور جدید طرز کے اپنے والے کھدوا دیجئے، یہ جملہ پورا بھی نہ ہو پایا تھا کہ آپ کی ایک ایسی چیخ نکلی کہ سارا کارخانہ گونج گیا، آپ کا چیخ مارنا ساری رات ہمیں یاد آتا رہا۔ رات ہی کو ہم نے طے کر لیا کہ "مثنوی گنجِ راز" عرشی صاحب ہی کو کیوں نہ دی جائے، لہٰذا صبح ہی کو لے کر پہونچ گئے، عرشی صاحب کو کتاب پیش کر دی گئی اور عرض کیا کہ حضرت پیر و مرشد نے اُردو کرنے کو فرمایا ہے۔ آپ نے کتاب کو اردو میں منتقل کر دینا قبول کر لیا، کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ آپ اسی کارخانے سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن چلے گئے ہیں، چنانچہ نصیر آباد پہنچ کر ملاقات کر لینا طے کر لیا گیا، پھر بہ سلسلہ عرس غریب نواز اجمیر شریف جانا ہوا، وہاں عرشی صاحب سے ملاقات ہو گئی، کتاب کے بارے میں ذکر ہوا تو فرمایا میری ڈیوٹی غریب نواز کے گنبد شریف کی مرمت اور کلس پر سونا چڑھانے پر لگی ہے، لہٰذا اس کام سے فراغت کے بعد مثنوی شریف کا کام ہاتھ میں لے لوں گا

دوسرے سال بہ موقع عرس شریف عرشی صاحب سے ملاقات کی گئی، کچھ کاروباری دشواریاں اور پریس کا بند ہوجانا کتاب نہ لکھنے کی وجہ بیان کی، تیسرے سال پھر ملاقات ہوئی، کتاب نہ لکھنے کی وجہ اپنی بیماری اور کمزوری فرمائی بہر دفعہ ہم خاموش ہوجایا کرتے، کچھ عرصے بعد جناب محترم صوفی منصور الحسن شاہ صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت صوفی عرشی شاہ صاحب وصال فرماگئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ یہ خبر ہمارے لئے انتہائی دردناک ثابت ہوئی کہ ہم پیرو مرشد کا دیا ہوا کام پورا نہ ہوسکا۔ پھر ہمیں معلوم ہوا کہ حضرت منصور شاہ صاحب اجمیر شریف جارہے ہیں منصور شاہ صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ عرشی صاحب کے مکان نصیر آباد جائیں اور کسی بھی طرح کوشش کرکے عرشی صاحب کے صاحبزادگان سے "مثنوی گنج راز" کا نسخہ لے آئیں تاکہ مثنوی شریف کا کام کسی اور عالم کے ذریعہ مکمل کرایا جائے، منصور الحسن صاحب نے اجمیر شریف کی واپسی پر بتلایا کہ انتہائی کوشش کے باوجود "مثنوی گنج راز" عرشی صاحب کے مکان سے دستیاب نہ ہوسکی۔ "مثنوی گنج راز" کھوجانے کا صدمہ اور قلق ہمارے دل پر ہمہ وقت طاری رہنے لگا، کبھی کبھی یہ بات آنسوؤں کی شکل اختیار کرلیتی۔ "مثنوی گنج راز" کا دوسرا نسخہ دستیاب ہونا ہمارے لئے ایک بہت بڑا مشکل مسئلہ بنا رہا۔ ۱۹۷۵ء میں خانقاہ حسنی جھنجوری شریف کی توسیع کے موقع پر کچھ پرانے کمرے بھی توڑے جارہے تھے کہ ایک عدد بنڈل جو پارسل کی شکل میں تھا ایک مچان سے برآمد ہوا، خاک آلودہ اور بوسیدہ ہونے کے سبب ہم نہیں جان سکے کہ اس میں کیا ہے البتہ جلی حرفوں میں اس کے اوپر پنڈت برج لال شرما لکھا ہوا تھا جو سمجھ میں آگیا تھا، پنڈت جی کے سپرد یہ بنڈل کردیا گیا، کہ لیجئے صاحب یہ آپ کی امانت۔ شاید کسی نے کہیں سے پارسل بھیجا ہوگا، پنڈت جی نے یہ کہتے ہوئے پارسل لے لیا کہ آج سے دس بارہ سال پہلے ہماری معرفت کسی صاحب نے پاکستان سے یہ کتابیں منگوائی تھیں وہ صاحب خود پاکستان چلے گئے۔ پنڈت جی نے وہ پارسل کھولنے کے لئے ہم سے کہا، پارسل کا بوسیدہ کپڑا جیسے ہی ہٹایا گیا، ایک نسخہ "مثنوی گنج راز" کا بھی اس بنڈل سے برآمد ہوا۔ مثنوی گنج راز پر نظر پڑتے ہی ایک روشنی ہماری آنکھوں میں آگئی، نسخہ کو سینہ

سے لگالیا، دربارِ عالیہ میں داخل ہوئے، خوشی میں رو پڑے، حضرت سے عرض کیا کہ حضورؐ نے دوبارہ عنایت فرمایا ہے، بغیر آپ کی مدد کے یہ کام نہیں کر پائیں گے ! حضور نے دوبارہ کتاب دی ہے ! اس کام کو پورا کروا دیجئے۔ پھر یہی خیال لے کر ہم بمبئی واپس آگئے اور آقائی و مرشدی کے فرمان کی تکمیل کے لئے جدوجہد شروع کردی، ہماری نظر مولانا قمر سیوہاروی پر گئی جو حلقہ بگوش بھی ہیں عالم ہیں اور فارسی پر کافی دسترس رکھتے ہیں۔ ہم نے مثنوی گنج رازی پوری کہانی مولانا کو سُناتے ہوئے اُن سے کہا کہ اِس سلسلے میں تم ہماری مدد کرو۔ مولانا نے مثنوی شریف کو دیکھا، تھوڑی دیر دیکھتے رہے، قبلہ رُخ ہو کر سجدے میں چلے گئے، تقریباً آدھے گھنٹے سے زیادہ سجدے میں پڑے رہے، مولانا کے ہاتھ پیر شل ہوگئے، ہوش میں آئے، سیدھے ہو کر بیٹھے، کہنے لگے کہ حضور یہ کتاب بہت دقیق ہے اِن فارسی اشعار کو اردو اشعار میں لایا جائے گا تو اس کا مطلب فوت ہو جائے گا، مولانا نے یہ بھی کہا کہ یوں تو یہ کتاب مختصر سی چوالیس صفحات پر مشتمل ہے لیکن مصنف کو اس کی تصنیف میں دس سال کا عرصہ لگا ہے۔ اور یہ کہ قطب عالم حضرت عبدالحی شاہ قبلہ کو یہ کتاب قلمی ملی تھی. شبہ کی بنا پر آپ نے چھ سال میں مزید چار پانچ قلمی نسخے تلاش کر لئے، چار سو سال قبل کے قلمی نسخوں کا تلاش کر لینا بھی حضرت قطب عالم عبدالحیٰ شاہ صاحب کی ایک کرامات ہے۔ کچھ عرصہ گذرا ہوگا کہ مولانا قمر صاحب اپنے ہمراہ جناب مولانا ظہیر احمد سہس پوری (ضلع بجنور) کو ہمارے پاس لائے اور ہم سے کہا کہ مولانا کو ہم مثنوی شریف دکھلانا چاہتے ہیں، یہ ہمارے ہم عصر فارغ دیوبند ہیں۔ عربی اور فارسی پر ان کو اچھی دسترس ہے۔ ذہین اور ذکی آدمی ہیں۔

کتاب الماری سے نکال کر مولانا ظہیر احمد صاحب کو دکھلائی گئی اور کتاب کے بارے میں مولانا سے کہا گیا کہ اس کا اردو میں ترجمہ کرنا ہے۔ مولانا ظہیر کچھ دیر اس کتاب کو دیکھتے رہے، اپنے ساتھ لے گئے۔ ایک ماہ تک دو دو، چار چار روز کے وقفے سے آتے رہے اور کہتے رہے کہ آجکل سوائے اس کتاب کو دیکھنے کے اور کوئی دوسرا کام نہیں ہو رہا ہے۔ مولانا ظہیر صاحب نے یہ بھی کہا کہ اس کتاب کو اردو میں منتقل کرنے میں بہت کچھ دشواریاں پیش آئیں گی. بہت سی کتابوں کا مطالعہ بھی

کرنا ہوگا، یہ کتاب اردو اشعار میں نہیں ہوسکتی، اس کی تشریح کرنا ہوگی، اس کے لئے ہم نے رضامندی کا اظہار کیا اور مولانا ظہیر احمد صاحب بھی کتاب کی شرح کرنے کیلئے تیار ہوگئے اور ماہ جنوری ۱۹۷۶ء میں مولانا ظہیر نے کام شروع کردیا، آج خیر سے ماہ جنوری ۱۹۸۴ء ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے مولانا ظہیر کے ہاتھوں اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچادیا۔

اس سلسلے میں مولانا ظہیر صاحب کو تقریباً پانچ سو ۵۰۰ سے زائد کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا، اور پانچ سال تک اس کتاب کے سلسلے میں سفر میں رہے۔ سہارن پور، دیوبند، خانقاہ رحمانیہ، خانقاہ قمریہ پٹنہ، خانقاہ عمادیہ منگل تالاب، خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، خانقاہ ابوالعلائیہ منعمیہ گیا، علاوہ ازیں خدابخش لائبریری پٹنہ ایک سال، رضا لائبریری رامپور ایک ماہ، کانپور پندرہ دن، لکھنؤ ایک ہفتہ، اس کے علاوہ بہت سے مقامات پر انفرادی طور سے اہل علم حضرات سے ملاقاتیں بھی کیں۔

ہم مولانا قمر اور مولانا ظہیر دونوں حضرات کیلئے دعاگو ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو علم نافع عطا فرمائے، اور تاحیات جسمانی اور روحانی صحت کلی عطا فرمائے، دین اور دنیا میں سرخ رو رکھے، اور عاقبت درست فرمائے۔ آمین۔ ہمارے حضرت نے جو کام ہمارے سپرد فرمایا تھا وہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ پورا کرادیا۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بصد عجز ونیاز دعا ہے کہ طالبان حق کے لئے اس کتاب کو مشعل راہِ عمل بنادے اور ہمارے متعلقین کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرماکر اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نوازدے۔ آمین یارب العالمین برحمتک یاارحم الراحمین۔

عرضِ مؤلّف

حمداً و صلوٰۃً! اس میں کوئی شک نہیں کہ وادیٔ تصوّف بہت مقدس اور قابلِ احترام وادی ہے یہاں پر قلب و نظر کو آداب کی رفعتوں سے ہمکنار ہونے کے بعد ہی گذرنے کی اجازت ملتی ہے ہر قدم اخلاص و ادب کی ترازو میں تول کر رکھنا پڑتا ہے، ہمہ وقت یہ فکر دامنگیر رہتی ہے کہ کہیں جنبشِ یک قلم جرأتِ یک نظر، غفلتِ یک نفس منزل سے دُوری کا سبب نہ بن جائے۔ زیرِ نظر "مثنوی گنجِ راز" راہِ سلوک میں ایسا روشن چراغ ہے جس کے ذریعہ منزلِ مقصود تک رسائی بہت سہل ہو گئی ہے مستند اور مختصر اشغال کا یہ بیش بہا خزانہ سالکانِ راہِ معرفت کے لئے مشعلِ عرفان و آگہی ہے جس کی تشریح و تسہیل وقت کی ایک اہم ضرورت تھی۔

یہ اعتراف کرنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ مجھ جیسے بے مایہ کے دوشِ ناتواں، اس بارِ عظیم کے متحمل نہیں تھے، صرف فضلِ خداوندی اور سیدی و مرشدی کی توجّہات کا فیضان تھا کہ قطرہ کو سمندر کی وسعت عطا کی اور ایک بے دست و پا کو بحرِ بیکراں کی غوّاصی کی سعادت بخش دی۔

موجودہ دور میں ہی نہیں بلکہ عرصۂ دراز سے تصوّف کا موضوع مرکزِ اختلاف بنا ہوا ہے، اور یہ بھی درست ہے کہ ہر ذی شعور اور بالغ نظر کو اختلافِ رائے رکھنے کا حق ہے، اِس حق کو کوئی چھین نہیں سکتا، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اختلاف میں مخالفت کا رنگ نہ جھلکنے پائے، مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا، اور اختلاف نے مخالفت کی وہ صورت اختیار کر لی کہ افہام و تفہیم کی خلیج کم ہونے کے بجائے وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی، جس کا لازمی نتیجہ مادیت، لادینیت اور دہریت کے سیلاب کی صورت میں برآمد ہوا، یہ سیلاب علمِ دین کی عظمت، عملِ صالح کی رفعت اور اقدار کے احترام کی روایات کو ایسے موڑ پر چھوڑ کر چلا گیا کہ وہاں سے ان کی واپسی اسباب اور مسبب الاسباب سے مضبوط ترین

رابطہ قائم کرنے کے بعد ہی ممکن ہے۔

جن افراد کو خداوند قدوس نے بصارت کے ساتھ بصیرت سے بھی نوازا ہے، انھوں نے اس منزل کی یافت کے لئے قرآن و سنت سے روشنی لیکر ایسے طریقے وضع کئے جن کے ذریعہ روحانی اقدار کو زندہ کرکے ذہنی مغلوبیت کو ختم کیا جاسکتا ہے، اور خودشناسی و خودآگہی کا شعور بیدار کرکے تلاش حق میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کا رشتہ خالق اور مقصدِ تخلیق سے قائم کیا جاسکتا ہے۔

مثنوی گنجِ راز کی عروسِ فارس کو اُردو لباس میں تشریح کے ساتھ پیش کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ اشغال کے ذریعہ سالکانِ راہِ طریقت تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کی کیفیات اپنے اندر پیدا کرکے معرفت کی راہ سے واقف ہوجائیں۔ یہ بات بھی پیش نظر تھی کہ فارسی زبان میں بصورت نظم صرف کتاب کے ذریعہ اشغال کی ترتیب اور پس منظر کی مکمل تصویر نہیں بن پاتی تھی، اس نقطۂ نظر کو حضرت سیدی و مرشدی نے خاص طور پر ملحوظ رکھنے میں ہر مرحلہ پر احقر کی رہنمائی فرمائی اور یہ حقیقت بھی ہے کہ آپ کی توجہ کے بغیر اس چشمۂ فیض کا جاری ہونا ممکن نہ تھا، اللہ تعالیٰ آپکے فیض کو عام فرمائے۔ آمین

کتاب کی ترتیب میں متعدد وجوہ کی بناء پر کافی تاخیر ہوگئی۔ آغازِ کار میں ترتیب کا یہ طریقہ متعین کیا گیا تھا کہ جس سلسلہ کا شغل ہوگا، اس کی ترکیبِ عمل کے ساتھ سلسلہ کا حوالہ اور ماخذ کی نشان دہی بھی کردی جائے، اس طرح کتاب ضخیم ہونے کے ساتھ ساتھ اہلِ علم کی نظر میں زیادہ باوزن بھی ہوجاتی، اس نہج پر کافی کام بھی کر لیا تھا۔ تلاش و جستجو کے لئے رضا لائبریری رامپور حاضر ہوا، شہر میں ایک کرم فرما کے یہاں قیام کے دوران، مسودات کی اٹیچی جس میں دیگر قیمتی معلومات اور ضروریات سے متعلق کاغذات داشیار تھیں، کسی نے ان کے مکان سے رات کے وقت غائب کردی تلاش بسیار کے بعد بھی سامان نہ مل سکا، تو حضرت مرشد کے فرمان کے مطابق موجودہ ترتیب کے ساتھ ترجمہ و تشریح کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

اس سلسلے میں خدابخش لائبریری پٹنہ، خانقاہ قمریہ پٹنہ، خانقاہ عمادیہ پٹنہ، خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، جامعہ رحمانیہ مونگیر، داناپور، آرہ، خانقاہ ابوالعلائیہ منعمیہ، گیا،

خانقاہ ابوالخیر دہلی، اور لکھنؤ، کانپور، مرادآباد، دیوبند، سہارنپور وغیرہ سفر کرنے کے علاوہ انفرادی طور پر بھی اہلِ علم حضرات کی خدمت میں حاضر ہو کر معلومات فراہم کرتا رہا۔ کرم فرماؤں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن جن حضرات نے بہت زیادہ خلوص و رافت کا معاملہ اس بندۂ ناچیز کے ساتھ فرمایا ان کے نقوش توانمٹ ہیں، میں بارگاہ خداوندی میں ان تمام حضرات کیلئے اجرِ جزیل کی درخواست پیش کرتا ہوں۔ خصوصًا حضرت مولانا صوفی قمر صاحب، مولانا پرواز اصلاحی صاحب محمود سروش صاحب، محمد مصطفےٰ صاحب خانقاہ منعمیہ ابوالعلائیہ گیا، صاحب سجادہ خانقاہ عمادیہ پٹنہ، شمیم صاحب خانقاہ قمریہ پٹنہ، مولانا زین العابدین صاحب بیگوسرائے، مولانا سید عبدالاحد صاحب سابق ناظم جامعہ حمادیہ ڈھاکہ، مولانا عبدالسلام صاحب رامپور، جناب ماسٹر سید مرتضیٰ علی صاحب سہسوری رحمۃ اللہ علیہ اور والدِ محترم مولانا حکیم نذیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے اس کتاب کی تالیف میں مؤلف کی مدد فرمائی، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور دین و دنیا میں اپنی خوشنودی کی سعادت سے نوازے۔ آمین۔

✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارفِ کتاب

"مثنوی گنج راز فارسی" صوفی عبدالرحمٰن صاحب فتح آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ شاہکار منظوم تصنیف ہے جس میں تصوف کے اسرار و معارف، سلاسل صوفیاء کے اوراد و اشغال اور ان تمام چیزوں کے لئے قرآن و سنت سے استدلال کا مشکل کام بڑی سلاست، علمیت، خوبی اور کمال کے ساتھ کیا گیا ہے۔

مثنوی گنج راز کی اردو تشریح و تفہیم کی اشاعت کے موقعہ پر ضروری تھا کہ حضرت مصنفؒ اور ان کی شاہکار منظوم تصنیف کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی جائیں، لیکن افسوس ہے کہ ساڑھے چار سو برس کی طویل مسافت نے حضرت موصوف کی شخصیت کو تاریخ کے اوراق میں اس طرح چھپالیا ہے کہ کافی تلاش و جستجو کے بعد بھی تفصیلات تک رسائی نہیں ہوتی۔

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کتاب ۹۶۶ھ میں تصنیف فرمائی ہے اور اس کے اشعار میں سموئے ہوئے عرفان و عبادت کے لازوال مضامین سے خود موصوف کے بارے میں یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ بحر معانی میں غواصی کی یہ مہم ساحل سمندر پر بیٹھ کر انجام نہیں دی گئی ہے، بلکہ معانی کے ان آبدار موتیوں کو الفاظ کی لڑی میں پرونے والے نے پہلے خود معرفت کے بحر ناپیداکنار میں حضرت شاہ لطف اللہ صاحب قدس سرہ کے زیر سایہ ماہرانہ غواصی کی مہم انجام دی، پھر قدرت کلام اور مبدأ فیاض سے ملنے والی معجزانہ صلاحیت کے مظاہرے کے طور پر ان آبدار موتیوں کو نظم کی صورت میں رقم فرمایا، اور اس کے بعد سے بلاشبہ موصوف کی یہ مایۂ ناز کاوش وادیٔ تصوف کے ہر مسافر کے لئے چراغ راہ کا کام دیتی رہی۔

سلسلہ ابو العلائیہ قادریہ کے ایک مستند بزرگ عالم اور صوفی حضرت الحاج شاہ عبدالحی صاحب قبلہ چاٹگامی رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف مقامات سے اس کتاب کے مختلف قلمی نسخے جمع کر کے بڑی

تحقیق کے ساتھ اس کتاب کی اشاعت فرمائی۔

مصنف رحمۃ اللہ علیہ فتح آباد صوبہ بنگال کے رہنے والے تھے لیکن اس مقام کی تعیین میں اہلِ تاریخ کی رائے میں اختلاف ہے، معتبر تاریخوں کی معلومات کے مطابق یہ مقام بڑا متبرک اور نشاط افزا رہا ہے، یہاں اہلِ علم و فضل اور اربابِ بصیرت کی ایک بڑی جماعت پیدا ہوئی ہے، یہاں کی عمارتیں شاندار اور تاریخی رہی ہیں اور اولیاء کرام کے مزارات سے بھی یہ خطہ معمور ہے، اس خطہ کو "بہادر شاہ" کے دورِ حکومت میں مرکزیت حاصل رہی ہے، بہادر شاہ، جلال الدین اکبر کے عہد میں ۹۶۲ھ سے ۹۷۲ھ تک بنگال کے حکمراں رہے ہیں، انہی کے عہد میں یہ شاندار علمی و اصلاحی کارنامہ انجام پذیر ہوا، مصنف مرحوم نے ان کے عہد میں امن و امان کے فروغ کا ذکر کیا ہے۔

عرصہ دراز تک مصنف کی اس شاہکار منظوم تصنیف کے قلمی نسخے صوفیاء کرام کے درمیان متداول رہے، پھر حضرت مولانا شاہ عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کاوش سے اس کے متعدد نسخے جمع کئے گئے اور ایک دوسرے سے مقابلے، تنقیح اور تصحیح کے بعد اس کی اشاعت کا اہتمام کیا گیا سیدنا و مرشدنا حضرت الحاج صوفی محمد حسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ اس کتاب کو معمول میں رکھتے تھے، اور آپ کی تمنا تھی کہ ان کے تمام حلقہ بگوش اس کتاب کو حرزِ جان اور اپنی زندگی کا معمول بنالیں، چنانچہ انھوں نے اس کتاب کا ایک نسخہ اپنے مجازِ خاص سیدی و مرشدی صوفی احمد حسن شاہ صاحب قبلہ مدظلہٗ العالی کو اردو ترجمہ و تشریح کے لئے عطا فرمایا، اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اولیائے عظام کی دعاؤں کے طفیل حضرت قبلہ سیدی و مرشدی الحاج صوفی احمد حسن شاہ صاحب کی زیرِ نگرانی یہ کام پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ اور اب افادۂ عام کی غرض سے اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔

دعا ہے کہ خداوندِ ذوالجلال مصنفِ کتاب صوفی عبدالرحمٰن صاحب، تقدیم کنندہ سیدی و مرشدی الحاج صوفی احمد حسن شاہ صاحب اور شارح مولانا ظہیر احمد صاحب اور اس کی اشاعت کے سلسلے میں سعی کرنے والے تمام اربابِ محبت کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔

(مولانا) صوفی قمر شاہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمۃ الکتاب

(از مؤلف)

اَلحَمدُ لِوَلِیّہٖ وَالصَّلٰوۃُ لِاَھلِھَا۔ اَمَّا بَعد! اسلام کی آفاقیت جغرافیائی حدود بندی سے آزاد ہے۔ اپنے وجود کی طرح اس کا پیغام بھی ازلی و ابدی ہے، ابوالبشر سے لیکر سید البشر تک تمام انبیاء علیہم السلام شاہراہِ مستقیم پر اسی قانون کی مشعل روشن کرتے رہے، یہی وہ دستور العمل ہے جو احکم الحاکمین کی بے مثال بارگاہ سے اِنَّ الدِّینَ عِندَ اللّٰہِ الاِسلَامُ کی تصدیقی سند کے ساتھ نافذ ہوا، حضرت آدم علیہ السّلام سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک دین کا نہج ایک ہی رہا البتہ شریعتیں بدلتی رہیں، اور اب شریعتِ محمدی قیامت تک کے لئے نافذ العمل رہے گی۔ یہ شریعتِ مطہرہ اس قدر معتبر اور ہمہ گیر ہے جس میں دین اور دنیا کی تفریق فکری اور عملی اعتبار سے نہیں تھی، اس نے اَلدُّنیَا مَزرَعَۃُ الاٰخِرَۃِ کا تصور پیش کرکے اپنے ماننے والوں کا تعلق معاش اور معاد سے قائم کردیا۔ اور اس کی عملی تشریح اس انداز میں کی کہ مومن کا ہر ایک دنیوی امر اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ہوگا۔ تو وہ عبادت ہے۔ مومن کا کاروبار، پڑھنا لکھنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، چلنا پھرنا، اور دیگر ضروریات جب سنّتِ محمدی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوں گی تو دربارِ خداوندی میں یہ تمام امور عبادت کے دفتر میں درج کئے جائیں گے۔

دین اور دنیا کے توافق کا یہ نظریہ مافوق العمل نہیں تھا جو صرف تصور اور فلسفہ تک ہی محدود رہتا بلکہ پیغمبر اسلام آقائے کائنات حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اس امتزاج کا بے مثال نمونہ تھی، آپ نے زندگی کے ہر ایک شعبہ میں قول و عمل کے درمیان ایسی مطابقت عملی طور پر پیش کی جس کا نمونہ تخلیقِ کائنات سے آج تک کسی بھی قوم کا کوئی بھی فرد نہ پیش کرسکا۔

آپ بیک وقت دین کے رہنما بھی تھے اور دنیوی معاملات، تہذیب و سیاست بھی آپ کے زیر قیادت تھی، آپ کی خلوت اور جلوت میں ایسی شانِ یکتائی تھی کہ چونسٹھ سالہ حیاتِ طیبہ میں کوئی بڑے سے بڑا مخالف ایک بھی تجزیہ ایسا نہ پیش کر سکا جس میں قول و عمل یا جلوت و خلوت میں تضاد کی جھلک ہی نظر آجائے۔

خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی دین و دنیا کی قیادت میں امتزاج کا فکری اور عملی طریقۂ کار عمل فرما رہا، اس کے بعد بنو امیہ اور بنو عباس کے دورِ اقتدار میں عملی طور پر اس تصور میں وحدت باقی نہ رہی اور عملی اعتبار سے دین و دنیا میں تفریق ہو گئی جبکہ فکری اعتبار سے نہ تفریق اس وقت تھی اور نہ آج ہے۔ اِس تفریق کے اسباب و عوامل تو ہمارا موضوعِ سخن نہیں ہے، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافتِ راشدہ میں بیعت کے سلسلے میں جو دین و دنیا کے امتزاج کا تصور تھا، وہ اب ختم ہو گیا۔ بدلتے ہوئے حالات کے رُخ کو دیکھتے ہوئے علماء اور صلحاء نے تنذیر و تبشیر اور وعظ و نصیحت کے عمل کو انفرادی طور پر شروع کر دیا، لوگوں کے دلوں میں اسلام و ایمان کی عظمت و رفعت راسخ کرنے کیلئے انھوں نے بیعت کا وہ سلسلہ شروع کیا، جو بیعتِ خلافت میں اُمورِ دینی سے متعلق تھا کیونکہ اگر دین و دنیا کے امتزاج کے ساتھ اس تصورِ بیعت کو شروع کیا جاتا تو لازمی طور پر اربابِ حکومت سے معارضہ کی صورت پیش آتی۔ اس خون خرابے سے بچنے کے لئے صُلحائے امت نے اربابِ اقتدار کے ساتھ مصالحت اور مخالفت سے بے نیاز اور الگ رہ کر رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّ بِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلًا کے عقیدہ پر علمی و عملی انداز پر لوگوں کو قائم رکھنے کی بھرپور جدوجہد کی، اس سلسلے میں یہ حضرات اُمت کے لئے روحانی طبیب ثابت ہوئے، انھوں نے لوگوں کے قلوب کا رابطہ مُقَلِّبُ الْقُلُوْب سے اس طرح قائم کرا دیا کہ اس سِلْسِلَةُ الذَّهَب سے متعلق ہر شخصیت اپنی جگہ دین و دنیا کے امتزاج کا نمونہ بن گئی، ان حضرات کا یہ بے لوث اور خالص اسلامی علم و عمل معاشرہ کے لئے روشنی کا مینار بن گیا، جس سے بعد میں آنے والا ہر ایک کارواں انوار و برکات کے فیوض حاصل کرتا رہا۔ ان سب حالات کے ظہور پذیر ہونے کے باوجود مذہب اسلام کے ماننے والے اربابِ اقتدار اور

زیرِ اقتدار افراد کی نظروں سے یہ روشن پہلو کبھی اوجھل نہ ہوا کہ شریعت کی بالادستی اور رفعت میں کسی قسم کی کوئی کمی راہ نہ پائے۔ البتہ دین و دنیا کی اس تفریق میں یہ نقصان ضرور ہوا کہ اجتماعی طور پر اسلام کو ایسا معاشرہ تسلسل کے ساتھ مہیا نہ ہو سکا جو عملی اعتبار سے اسلام کی ہمہ گیری و آفاقیت کا ترجمان ہوتا، اور اسلام کے مثبت اثرات کو عملِ صالح کے ذریعہ اپنے اندر جذب کر کے سوادِ اعظم کی انسانیت کے لیئے دامنِ اسلام میں پناہ لینے کی تڑپ پیدا کرتا۔

اگرچہ اسلام کی حقانیت تسلیم کر لینے کے بعد قبولِ اسلام کے واقعات، افراد اور خاندانوں سے بڑھ کر شہروں پر بھی محیط ہیں، اور تاریخ کے صفحات ان واقعات سے مزین ہیں، نیز باعتبارِ قوم قبولِ اسلام کے تین چار واقعات عظمتِ اسلام کے شاہد ہیں۔ اور ان تمام مراحل پر اہلِ قلب و نظر علماء و صلحاء کے نشاناتِ قدم ملتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے ان مراحل سے گذر کر فکری، علمی اور عملی طور پر قلب و دماغ کی بیداری کے لیئے وہ راہیں ہموار کیں جن کے ذریعہ خود آگہی کا شعور روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا اور باطل کا اندھیرا چھٹ کر حق کی روشنی پھیل گئی۔ ان تمام حالات کا جب ایک مورخ تجزیہ کرتا ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ بے عملی کے باوجود شریعت کی رفعت و بالادستی کے نقوش اسلام کے ماننے والوں کے ذہن میں مرتسم تھے۔

جیسا کہ خدا کا تصور تو آج بھی بہت سے ملکوں کے افراد اور قوموں میں پایا جاتا ہے اور وہ مسلمانوں کی خیر خواہی اور مخلصانہ دعوت کے بہت زیادہ ضرورت مند ہیں کیونکہ خدا سے ان کا تعلق اتنے فاصلہ پر ہے کہ خاص خاص موقعوں کے علاوہ یہ تصور شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے، نیز خدا کے ساتھ ان کا یہ رسمی رابطہ اس انداز سے ہے جس کو عقلِ سلیم آج بھی قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ ستم ظریفی تو دیکھیئے کہ نیکی اور بدی کا تصور اور پھر ارتکابِ جرم کے بعد اس کی تلافی کے تمام قوانین تو خود ساختہ ہیں، لیکن ان کو عنوان دیدیا گیا "خدائی قانون" کا۔ بریں عقل و دانش بباید گریست

اِن تمام حقائق کا سنجیدگی اور غیر جانبداری کے ساتھ جائزہ لینے کے بعد حقیقت پسند نظر اگر کہیں ٹھہرتی ہے تو ایک ہی مرکز پر اور وہ مرکز ہے "شریعتِ محمدی" جس کے ذریعہ نیکی و بدی کا

صحیح تصور، انصاف وظلم کا صحیح توازن اور معاش ومعاد کا صحیح توافق ملتا ہے، کائنات کی حقیقت، اور اپنی حیثیت کا گہرائی کے ساتھ تجزیہ کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔

کیونکہ شریعت ہی وہ دستور العمل ہے جس پر عمل کرکے انسان اپنے خالق ومالک کی رضا وقربت حاصل کرسکتا ہے، شریعت کی تعریف بزرگانِ دین نے یہ فرمائی ہے کہ شریعت نام ہے علم اور عمل اور اخلاص کا، علم کے تحت اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور دیگر چیزوں کا جاننا اور دل سے ماننا آتا ہے، اسی کو ایمان کہتے ہیں، اس کے بعد عمل کے ضمن میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جن کا تعلق جسم کے ظاہری اعضاء سے ہے اور تیسری چیز اخلاص ہے یعنی یہ تمام کام جو قلب اور قالب کے ذریعہ انجام دیے جائیں ان سب کا تعلق اللہ سے ہو، ہر ایک کام صرف اسی کی رضا جوئی کے لئے کیا جائے، اس میں کسی قسم کی تصنّع، ریاکاری اور نمائش کو دخل نہ ہو، گویا مومن کے سامنے تمام امور کی انجام دہی کے موقع پر صرف ذاتِ وحدہٗ لاشریک کا تصوّر رہے، اسی کا نام احسان ہے، جس کا حدیثِ جبریل میں اس طرح ذکر فرمایا گیا ہے اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ (یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ تصوّر قائم نہ ہوسکے تو یہ سمجھو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے)۔ اس درجۂ احسان کو صوفیا حضرات کی اصطلاح میں تصوّف کا عنوان قرار دیا گیا ہے اور روحانی وقلبی کیفیات اور تزکیۂ اخلاق، محبت وخشیت، یقین وتوکل کو اس کا ثمرہ قرار دیا گیا ہے، ان حضرات نے تصحیح عقائد اور اعمالِ ظاہری کے بعد تزکیۂ نفس اور دیگر اعمال کو جزو لازم مانا، تاکہ شریعت کا مکمل طور پر تحقق ہوسکے۔

اور جس طرح علم کا وہ حصّہ جو عقائد کے تحت آتا ہے اس کی خدمت کے لئے ائمہ عقائد نے اصول وضوابط مرتب فرمائے، اسی طرح اعمال ظاہریہ شرعیہ کی تدوین کا کام ائمہ فقہ نے انجام دیا تو شریعت کے تیسرے جز اخلاص کی تشریح کا فریضہ مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ محققین صوفیا کرام نے انجام دیا انھوں نے یہ بات صاف بیان فرمادی کہ اصل مقصود ذاتِ واحد کی رضا وقربت ہے اور اس مقصد کے حصول کیلئے ذاتِ پاک سے محبت، خشیت، اخلاص واحسان اور اسی پر بھروسہ کرنا،

وغیرہ جیسی صفات کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ ان خصوصیات کو حاصل کرنے کیلئے ذکر و فکر کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ قرآن و احادیث میں متعدد مقامات پر مختلف انداز میں اس کی تلقین و تعلیم دی گئی ہے وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرو تاکہ تم کو فلاح و کامرانی ہو) وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (اور بیشک اللہ کا ذکر بہت بڑا ہے) بلکہ ذکر کرنے پر خداوند قدوس نے اتنے بڑے انعام کا اعلان کیا جس کی حقیقت معلوم ہو جائے تو ذکر کرنے والا ہزار مرتبہ زندگی کا طالب ہو جائے اور کوئی لمحہ بھی اس کے ذکر سے خالی نہ رہے، قرآنِ پاک ہی میں خداوند قدوس ارشاد فرماتا ہے فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ (تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا) غور و فکر کا مقام ہے کہ جسکو شہنشاہِ مطلق، احکم الحاکمین، ربّ العالمین یاد کرے اس کی سعادت کا کیا ٹھکانہ ہے، احادیث میں کتاب الدعوات میں ذکر، تحمید، تسبیح و تہلیل کے ابواب میں ذکر کے الفاظ، اوقات، تعداد اور نتائج کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (سب سے بہترین ذکر لا الٰہ الا اللہ ہے)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو کلمات ہیں جن کی ادائیگی زبان کے لئے آسان ہے اور میزانِ عدل میں ان کا وزن بہت زیادہ ہے اور بارگاہ خداوندی میں بہت محبوب ہیں وہ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيمِ ہیں، اسی طرح ذکر جہری اور خفی کا تذکرہ بھی قرآن و احادیث میں موجود ہے، یہ تمام اذکار وہ ہیں جن کی تلقین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اُن صحابہ کو فرمائی جن کو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ (کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے) کا تمغۂ امتیاز عطا کیا جا چکا تھا، اور جو آفتابِ نبوت سے انتہائی قربت سے اکتسابِ نور کر رہے تھے۔

قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ بات تو واضح ہو گئی کہ ذکر و اذکار کا سلسلہ تو اس قدر مستند ہے جس میں کسی بھی قسم کی شک و شبہ کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں۔ البتہ ذاکر کو اس بات پر پوری پوری توجہ رکھنا ضروری ہے کہ ذکر سے مقصود محبوبِ حقیقی کی رضا و قربت کا حصول ہے، کسی قسم کی لذت و کیفیت کا حاصل ہونا، کشف و کرامات کا ظاہر ہونا، انوار و برکات کا مشاہدہ ہونا، فنا، بقا، قطبیت

اور غوثیت کے مراتب پر فائز ہونا، یہ تمام کے تمام غیر مقصود ہیں، اور راہِ سلوک میں نشانِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں، منزل کی نہیں، جان بوجھ کر ان امور کی طرف متوجہ ہونا، یا ان کی طلب کرنا، غیر مقصود کے حصول میں عمرِ عزیز کو گنوانا ہے۔

فراق و وصل چہ خواہی رضائے دوست طلب　　　　که حیف باشد از و غیر ایں تمنّائے

(فراق اور وصل کی جستجو کیوں کرتا ہے، محبوب کی رضامندی کی تلاش کر، کہ محبوب کی بارگاہ سے محبوب کے سوا کسی اور شئے کی تمنّا کرنا بڑے افسوس کی بات ہے)

ذکر میں جہر اور ضرب کے جو طریقے بعض سلاسل میں معمول ہیں فنِ طب اور علم النفس کی روشنی میں ان کی افادیت اور تاثیر بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ اذکار و اشغال اپنے اندر کیفیات اور تاثّرات پیدا کرنے کا طبّی اور نفسیاتی طریقہ ہیں۔ نفی اور اثبات کے ساتھ ذکر کا معاملہ تو فرمانِ رسالت کی روشنی میں اَفضَلُ الذِکر ہے، صرف اسم ذات کے ذکر کے ساتھ ساتھ جب تصور بھی حقیقت کا رنگ اختیار کرلے کہ حقیقتاً اِس اِسم کا مُسمّیٰ ہمارے ساتھ ہے تو پھر کسی بھی طرح کی کمزوری کے احساس کا ختم ہوجانا بالکل یقینی ہے، شرط یہ ہے کہ ذاکر ان الفاظ سے کام لیکر اور معنویت کو اپنے قلب و دماغ میں جذب کرکے اپنی تمامتر توجہ کو اللہ تعالیٰ کے انعامات، قرب و معیت، احاطت و قدرت کی طرف منتقل کردے۔ کیونکہ اس ذات پاک سے نسبت ایمانی جس قدر قوی ہوگی اسی قدر تمہارے کام آسان ہوجائیں گے، اسی نسبت ایمانی کو اُنس سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کو عشق و محبت کی شاہراہ مل گئی اس کو تمام دردِ دل کی دوا مل گئی۔

اس کے بعد جب ذکر زبان پر بے اختیار جاری ہوجائے اور لساناً ذاکرًا کی توفیق میسر ہوجائے، تو قلب کا ذکر اور اس کے بعد ذکر روحی کا سلسلہ شروع کرانے کا دستور حضرات شیوخ کے یہاں معمولات میں سے ہے، ان اذکار کے بعد اشغال کا نمبر آتا ہے جن میں ذکر روحی کے ساتھ فکر کو منسلک کیا جاتا ہے۔ ان اشغال کے سلسلے میں بعض حضرات کو یہ اشکال ہے کہ اشغالِ تصوف قرآن و سنّت سے مطابقت نہیں رکھتے، حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ مبارک میں یا دورِ خلافت اور اس کے

بعد بھی ان اشغال کا ثبوت نہیں ملتا، اسی وجہ سے یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ بدعت کا سامان ہے۔ اگر یہ مفید ہوتے تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار صحابہ کرام اور حضرات تابعین کے یہاں ان طریقوں کا وجود ہوتا۔

اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین کر لی جائے تو بہتر ہے کہ یہ اذکار و اشغال بدعت کے دائرے میں آتے ہی نہیں، کیونکہ بدعت اِحداث فی الدین کو کہتے ہیں، اِحداث للدّین کو نہیں، یعنی ایسے امور جن کی تائید قرآن و حدیث، اجماع و قیاس سے نہ ہوتی ہو، ایسے اُمور کو شریعت کے رنگ میں پیش کرنا بدعت ہے اور یہی مفہوم ہے اِحداث فی الدّین کا، اور وہ اُمور جن کی تائید قرآن و سنّت اور اجماع و قیاس سے ہوتی ہو ایسے امور کو پیش کرنا احداث للدّین کے تحت آتا ہے یعنی دین کے کاز کو تقویت پہنچانے کے لئے یہ طریقہ ایجاد کیا گیا۔

اشغال کی تائید قرآن و سنّت سے کہیں یقینی، کہیں ظنّی، اور کہیں احتمالی ہے۔ ان تینوں اقسام میں تفریق نہ کرنے کی وجہ سے اشغال کے سلسلے میں غیر شرعی ہونے کا اشتباہ ہوگیا، قرآن پاک کی وہ آیت جس میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے قَالَ اٰیَتُكَ اَنْ لَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا فرمایا گیا ہے، اس سے یکسوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے کا مفہوم واضح ہے۔ اور وہ حدیث پاک جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے وقت بحالتِ قیام اپنی نگاہ کو سجدہ گاہ پر مرکوز رکھنے کے لئے فرمایا ہے، اس سے بھی واضح طور پر یہ مقصود حاصل ہوتا ہے کہ اپنی تمامتر توجہ کو صرف ایک طرف مرکوز رکھو، مراقبہ میں بھی یہی تصور کار فرما ہوتا ہے کہ اپنی تمام توجہ کو صفاتِ ذات کی طرف مبذول کر دیا جائے اور نسبتِ اخلاص و یقین پیدا کی جائے، اس نسبت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر یقین اس انداز میں ہو جائے جس طرح جلتی ہوئی شمع کی لَو پر انگلی رکھنے سے جلنے کا یقین ہوتا ہے یقینِ کامل کی یہ کیفیت جب حاصل ہو جائے گی تو ارتکابِ گناہ کی جرات نہیں ہو سکتی، اسلئے کہ اللہ کی صفت بصیر ہے اور وہ اس صفت سے اس طرح متصف ہے کہ ہر ایک کام کو بخوبی دیکھ رہا ہے خواہ کس قدر بھی چھپ کر کیا جائے، اسی طرح جھوٹ اور غیبت سے مکمل پرہیز کرے گا،

کیونکہ پروردگار کی صفتِ سماعت اس قدر بے مثال ہے کہ جس قدر بھی آہستہ اور احتیاط کے ساتھ زبان سے اس قسم کا گناہ سرزد ہوگا، پروردگار اس کو سننے والا ہے۔ گویا اس کے احاطہ سے ایک لمحہ کے لیے بھی باہر جانے کا امکان نہیں، جب اس احاطت اور قدرت کا تصور دل و دماغ میں راسخ ہوجائے گا تو پھر وہی کیفیتِ حضوری واحسان حاصل ہوگی جس کے ذریعہ مطلوب تک رسائی آسان ہوجاتی ہے، اس مختصر جائزے سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ اس پاک مقصد کو حاصل کرنے کے ذرائع اور وسائل بھی محمود ہیں، غیر شرعی ہونے کا فیصلہ قلتِ تدبر کا غماز ہے۔

اسی طرح مراقبہ اور چلّہ کشی کے سلسلے میں بھی اعتراض سامنے آتا ہے۔ اگر اس مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے غارِ حرا کی یاد تازہ کرلی جائے تو غالباً مسئلہ کا حل ہونا مشکل امر نہ ہوگا۔

صوفیاء حضرات روحانی طبیب کی حیثیت کے ساتھ ساتھ مجتہدانہ شان بھی رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے تزکیۂ نفس اور تہذیبِ اخلاق کے سلسلہ میں قرآن وحدیث سے روشنی لیکر کچھ ایسے اصول اپنے تجربات سے مرتّب فرمائے جن میں وحدتِ تصور کا نقطۂ نظر مکمل طور پر موجود ہے، انھوں نے جب قرآنِ پاک کی اس آیت کی تلاوت کی اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن تو اس سے خود سپردگی کی نشاندہی کرتے ہوئے فنا فی اللہ کی اصطلاح وضع فرمالی، اسی طرح دیگر مقامات پر اصطلاحات وضع کی گئیں، اِن اصطلاحات کو مکمل طور پر اور صحت مندانہ انداز میں نہ سمجھنے کی وجہ سے اختلافِ رائے کی صورت پیش آئی اور یہ اختلافِ رائے بڑھتے بڑھتے مخالفت کی صورت اختیار کرتا چلا گیا جس کی وجہ سے صوفیاءِ کرام کی مساعیٔ جمیلہ کا دائرہ محدود ہوگیا، جزوی اختلاف، اصولی مخالفت کا رنگ اختیار کر گیا تو افہام وتفہیم کی قربت دوریوں میں تبدیل ہوجاتی، لوگوں نے غیر مصدقہ باتوں کو تصدیق شدہ اور ظنیات کو یقینیات کا درجہ دے کر تصوّف کے سلسلے میں ایک ایسا محاذ تیار کردیا جو تصوّف کے اذکار واشغال کو حدودِ شریعت سے تو باہر نہ نکال سکا، البتہ تصوّف کے عنوان سے اس کو وحشت ہونے لگی، اگرچہ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس خلیج کو وسیع کرنے میں وہ افراد بھی شامل ہیں جو شریعت اور طریقت میں تفریق کرکے شریعتِ محمدی کے دائرے سے باہر نکلنے کی شعوری

یا لاشعوری کوشش کرنے والوں کے ساتھ ہو گئے، ہماری تمہید کا مقصد بھی یہی تھا کہ شریعتِ محمدی ہی سب پر محیط ہے، اور اس کی عظمت و رفعت کا زندگی کے ہر شعبہ میں لحاظ رکھنا ضروری ہے، تصوف کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جن سلاسل کے ہاتھ سے دامن شریعت چھوٹ گیا تو اللہ جل شانہ کی طرف سے اس کی نصرت و حمایت بھی چھوڑ دی گئی، اسلئے جو کارواں بھی معرفت خداوندی کی راہ پر چلے گا اس کو لازمی طور پر مدینہ منورہ کی گلیوں سے گذرنا ہوگا اور اپنے ہر کام کی انجام دہی کو صرف اسی ذاتِ اقدس کے عمل کی طرف منسوب کرنا ہوگا جو ذاتِ پاک اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ باعظمت و باوقار ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

زیر نظر کتاب میں تمام اشغال کے اندر یہی روح کارفرما ہے، کوئی شغل بھی ایسا نہیں جس میں نتیجہ کے طور پر ذاتِ وحدہٗ لاشریک کے ساتھ نسبتِ یقین و اخلاص کی کیفیات نہ پیدا ہوتی ہوں۔ اپنی اس بات کے ثبوت کیلئے میں اس کتاب کے سب سے مختصر اور مفید دو شغل کی طرف طالبانِ حق کی توجہ مبذول کرانا چاہونگا پہلا شغل صـ۲۲۵ پر بعنوان "بیان نقش کردن لفظ اللہ بر دل" دوسرا شغل صـ۳۲۹ پر بعنوان "بیان نگاشتن لفظ اللہ بر تن خود"۔ ان دونوں اشغال میں سے کسی ایک میں باجازت مرشد مشغولیت سے آپکو اندازہ ہوگا کہ کس قدر تبدیلی آپ کے ظاہر و باطن میں آگئی۔ نیز صـ۲۹۷ پر حقیقتِ نماز کے عنوان سے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے جس انداز پر مقصد کی وضاحت فرمائی ہے وہ اس موضوع پر انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ وسائل اور مقاصد، مقصود اور غیر مقصود کو الگ الگ ایک خاص انداز میں ترتیب کے ساتھ بیان کرنا اور مستند سلاسل کے مفید اشغال کو جامعیت کے ساتھ نظم کی صورت میں بیان کرنا مثنوی گنج راز کے مصنف حضرت صوفی عبدالرحمٰن فتح آبادی (چاٹگام) کا عدیم المثال کارنامہ ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے مصنف کو جزائے خیر عطا فرمائے اور تمام وابستگانِ سلاسل کو اس پر عمل کی توفیق ارزانی فرما کر راہ ہدایت پر استقامت عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

خاکپائے صوفیاء ——— ظہیر احمد قریشی غفرلہٗ

بظلِ عاطفت آقائے کامل العالم الحاج صوفی میاں محمد حسن شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کلیدِ اعجاز

شرح

مثنوی گنج راز

تقدیمہ

صوفی الحاج میاں احمد حسن شاہ صاحب قبلہ مدظلہ العالی

تالیف: مولانا صوفی ظہیر احمد صاحب قریشی

ناشر

مکتبۃ الفاروق، وزیر بلڈنگ، بھنڈی بازار، بمبئی ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد بادی بیشمار از جان و دل گویم نخست ۔ کو دلم را در ھدائے حق شناسی کرد چست

ترجمہ: سب سے پہلے میں قلب و روح کی گہرائی سے اُس ہادی مطلق کی بیشمار تعریف بیان کرتا ہوں جس نے میرے دل کو معرفت حق کی راہ کیلئے مکمل طور پر آمادہ کردیا۔

تشریح: فرمانِ رسول پاک احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم (کُلُّ اَمْرٍ ذِی بَالٍ لَمْ یُبْدَءْ فِیْہِ بِحَمْدِ اللہِ فَھُوَ اَقْطَعُ وَ اَبْتَرُ) (ہر وہ کام جو حمد خداوندی کے بغیر شروع کردیا جائے وہ ناقص اور بے برکت ہوتا ہے) کی تکمیل کے پیش نظر مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اس لاجواب کتاب کو اللہ تعالیٰ عزاسمہ کے بابرکت نام سے شروع کرتے ہوئے اس بے نیاز کی بارگاہ میں سرِ نیاز خم کیا۔ اور اس بات پر اظہارِ تشکر کیا کہ اس نے اپنی رحمتِ کاملہ سے میرے دل کو اپنی معرفت کی راہ دکھائی۔ چونکہ یہ راہ، راہِ عشق ہے، اور معاملاتِ عشق" دل سے وابستہ ہیں اس لئے پہلے ہی مرحلہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کردیا "دل" جس کو قلب کہتے ہیں اس کی دو حیثیتیں ہیں ایک تو مخروطی شکل کا گوشت کا لوتھڑا جو جسم انسانی میں بائیں طرف پسلیوں کے پاس ہوتا ہے اور تمام نظام جسمانی اس سے متعلق ہوتا ہے اور دوسری حیثیت وہ نور لطیفِ ربانی و روحانی جو اس قلب کے ساتھ متعلق ہے جو حقیقتِ انسانیہ اور روح انسانی کے نام سے موسوم ہے اور یہی اللہ تعالےٰ کی تجلیاتِ انوار کے مشاہدہ کا محل واقع ہوا ہے یہاں پر مراد یہی دوسری قسم ہے اور اسی سے تمام نظامِ روحانی متعلق ہے۔ راہِ سلوک میں دارومدار اسی کی اصلاح و تربیت پر ہے، اسی کی حفاظت کیلئے تمام بکھیڑے کرنے پڑتے ہیں، نیکی اور بدی کا مرکز بھی یہی ہے، راہِ معرفت میں اولین قدم اسی کی فتحیابی پر رکھا جاتا ہے جو شخص اس دل کا تابعدار اور غلام ہوگیا وہ کام سے گیا اور جس نے اس دل کو رضائے حق کا تابعدار اور غلام بنادیا وہ کام کا ہوگیا۔ پس کسی انسان کے لئے اس سے بڑی کونسی نعمت ہوسکتی ہے کہ پروردگار عالم اس کے دل کو اپنی معرفت کی راہ پر لگادے۔ اس نعمتِ عظمیٰ پر جس قدر خداوند قدوس کی عظمت و شانِ عطا و بخشش کی تعریف کی جائے کم ہے۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ یہی نذرانۂ قلب و جان

لے کر بارگاہِ بے نیاز میں سجدہ ریز ہیں۔

ذاتِ او موجود واحد جامع وصفِ کمال　　ہم قدیم و واجب و پاک آمد از نقص و زوال

ترجمہ:۔ اسکی ذات ازل سے موجود ہے یکتا ہے، اور تمام صفاتِ کمالیہ کو جامع ہے نیز وہ قدیم ہے (ہمیشہ ہمیش سے ہے) اور واجب الوجود ہے، ہر ایک کمی اور کمتری سے پاک ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں متکلمین کے اس قول کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں اللہ تعالےٰ کی تعریف بیان کی گئی ہے کہ خدا کیا ہے؟ متکلمین (فلاسفۂ اسلام) اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ ھُوَ ذَاتٌ وَاجِبُ الْوُجُوْدِ الْمُسْتَجْمِعُ لِجَمِیْعِ صِفَاتِ الْکَمَالِ یعنی اللہ تعالیٰ ایک ایسی ذات ہے جو واجب الوجود ہے (ممکن الوجود نہیں) جو تمام صفاتِ کمالیہ کو جامع ہے۔ اللہ تعالےٰ کی یہ ایک ایسی تعریف ہے یا تعارف ہے جو مختصر اور جامع ہے۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے اس شعر میں ایسی ہی جامع و مانع تعریف کی ہے۔ اس کو بہت ہی آسان انداز میں اس طرح سمجھ لیجئے تاکہ اس کی جامعیت و مانعیت سمجھ میں آجائے۔ شعر میں پہلا لفظ "ذات" ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ "بالذات" ہے ذات اس کو کہتے ہیں جو اپنے وجود میں کسی دوسری چیز کی محتاج نہ ہو اور اللہ تعالیٰ بھی ذات ہے پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے وجود میں کسی دوسری شئے کا محتاج نہیں۔ ذات کی ضد عرض ہے، عرض اس کو کہتے ہیں جو اپنے وجود میں دوسرے کا محتاج ہو جیسے دھوپ اپنے وجود میں سورج کی محتاج ہے اور سورج اپنے وجود کے لحاظ سے دھوپ کا محتاج نہیں اگرچہ اس کا وجود بھی اللہ تعالےٰ کے حکم ہی سے ہے مگر یہاں ذات اور عرض کا مطلب بتانے کیلئے عقائد اور حقائق سے غرض نہیں بلکہ فلاسفہ اور مناطقہ کی وضع کردہ اصطلاحات کے تحت لفظی تعریف کی جارہی ہے ورنہ اللہ تعالےٰ کی ذات تو کجا، صرف صفات کی حقیقت کا دریافت کرنا بھی ممکن نہیں۔ قرآنِ پاک میں تو صاف صاف ارشاد فرمادیا گیا ہے قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ کَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (سورہ کہف) یعنی اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم آپ ان سے کہدیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں (یعنی وہ کلمات و

عبارات جو اوصاف و کمالاتِ الٰہیّہ پر دال ہوں اور اُن سے اُن کی تعبیر کی جائے لکھنے کے لئے سمندر کا پانی روشنائی کی جگہ ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے ہی سمندر ختم ہو جائے اور باتیں ختم نہ ہوں اگرچہ اس جیسے کتنے ہی سمندر ہم اس کی مدد کے لئے لے آویں"، تو یہ ہے شانِ پروردگارِ عالم کی"۔ یہاں یہ بات جملۂ معترضہ کے طور پر اس لئے عرض کر دی کہ یہ شک پیدا نہ ہو کہ جب اللہ تعالیٰ کی تعریف ناممکن ہے تو پھر مصنّف کی اس تعریف کو جامع اور مانع کیوں کہا گیا مراد اس سے یہ ہے کہ یہ لفظی تعریف ہے جس سے ذات کی طرف رہنمائی ہو جاتی ہے۔

دوسرا لفظ "موجود" ہے یعنی وہ ہمیشہ سے موجود ہے، ازل سے ہے، ایسا نہیں کہ پہلے نہیں تھا بعد میں موجود ہوا، بلکہ وہ موجودِ مطلق ہے اور جب موجودِ مطلق ہے تو قدیم ہے اور قدیم ہے تو حادث نہیں اور حادث نہیں تو فانی نہیں اور جب فانی نہیں تو ابدی ہے یعنی وہ ذات ازلی اور ابدی ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک قائم رہے گی۔

تیسرا لفظ ہے "واحد" یعنی وہ ایک ہے متعدد نہیں، قرآن کریم میں عقلی طور پر اُسکے ایک ہونے کی وجہ بتلادی گئی ہے "لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا" اگر آسمان اور زمین میں ایک خدا کے بجائے متعدد خدا ہوتے تو یقیناً آسمان اور زمین میں فساد برپا ہو جاتا) کیونکہ ایک خدا کہتا کہ میں بارش کروں گا، دوسرا حکم صادر فرماتا کہ نہیں میرا حکم یہ ہے کہ تیز دھوپ ہو، تیسرا کہتا کہ میرا ارادہ تو اس وقت ہوا چلانے کا ہے، چوتھا کہتا کہ نہیں میرا فرمان یہ ہے کہ سخت سردی ہو، غرض جتنے حاکم اتنے ہی احکام ہوتے اور یہ نظامِ سماوی اور دنیاوی جو ایک خاص ترتیب اور منظم طریقے سے چل رہا ہے ہرگز وجود پذیر نہ ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ عقلی اعتبار سے بھی خدا صرف ایک ہی ہے جو قادرِ مطلق ہے اور حاکمِ مطلق ہے اور قادر و حاکم بھی ایسا کہ کسی کو اس کے حکم میں مجالِ دم زدن بھی نہیں۔

چوتھا لفظ "جامعِ وصفِ کمال" ہے یعنی تمام خوبیوں کا جامع، وہ ذات ہر طرح کی صفت کمال یعنی خوبی، عمدگی اور اچھائی کو جامع ہے مگر صرف "جامعِ وصف" ہونے سے کام نہیں چلتا کیونکہ جامعِ اوصاف تو مخلوق بھی ہو سکتی ہے اس لئے لفظ "کمال" کہہ کر تمام مخلوقات میں سے اعلیٰ سے

اعلیٰ فرد کو بھی الگ کر دیا یعنی پروردگارِ عالم تمام صفاتِ کمال کا مکمل طور پر جامع ہے نامکمل طور پر نہیں، گویا قادر ہے تو مکمل طور پر، ایسا نہیں کہ کسی چیز پر قدرت ہے اور کسی چیز پر نہیں، خالق ہے تو مکمل طور پر، رازق ہے تو وہ بھی مکمل طور پر، غرض کہ تمام صفات مکمل طور پر ہیں جن میں ذرہ برابر نقص اور کمی نہیں ہے۔

دوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ کیلئے تاکید مزید ہے، اس طرح ایک ایک لفظ کی مختصر تشریح سے بخوبی یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے پروردگار کی ذاتِ پاک کا تعارف لفظ و بیان کی حد تک بھرپور کرایا ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ۔

یہاں ایک بات یہ بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ طریقت اور سلوک میں مقصود تو ذاتِ خداوندی ہے لیکن تفکر اور مشاہدہ صفات کا ہوتا ہے اور صفات ہی کے ذریعہ، ذات کی معرفت حاصل کی جاتی ہے اسی لئے ہمیں صرف صفات میں غور و فکر کرنے کی اجازت ہے ذات میں نہیں — ذات تک تو کسی کی رسائی نہیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت لطیف بھی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ لطیف بھی مکمل طور پر ہے پھر کس طرح اس کی ذات کی حقیقت تک رسائی ہو سکتی ہے۔

اوست بے چوں، بے چگونہ، بے نمونہ، بے نشاں   نیست غیرش ہیچ چیزے در عیاں و در نہاں

ترجمہ :- اس ذاتِ پاک کی حقیقت اور کیفیت کے بیان سے ناطقہ انسانی عاجز ہے، وہ بے مثال ہے (بظاہر) بے نشان ہے، اسکے علاوہ کوئی بھی ظاہر اور باطن میں موجود بالذات نہیں۔

تشریح :- اللہ تعالیٰ کی اصطلاحی تعریف کا بیان چل رہا ہے، مصنف فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک انسان کی عقل و فہم سے اتنی بلند و برتر ہے کہ اگر کوئی یہ سوال کرے کہ وہ کیا ہے؟ تو ہم اس کی نہ کیفیت بتلا سکتے ہیں اور نہ کمیت۔ بس قرآنِ پاک کی یہ سورت پڑھ کر کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ہم اس کے بارے میں اپنے علم کا اظہار کر سکتے ہیں، یہیں تک ہماری رسائی ہے۔ دوسری صفت "بے چگونہ" یعنی نامعلوم الکیفیت ہے۔ یعنی اگر کوئی یہ سوال کرے کہ وہ کس طرح ہوا تو ہم اس سلسلے میں بھی نہ کچھ جانتے

ہیں اور نہ جاننا ہمارے بس کی بات ہے، صرف اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہ آسمانوں اور زمینوں میں اسی کا نور جلوہ گر ہے کہہ کر سر نیاز خم کر لینا ہمارا شیوہ ہونا چاہیئے۔ تیسری صفت وہ بے مثال ہے، یہاں پر بھی لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ کہہ کر اس کی مثل پیش کرنے سے عقل انسانی عاجز اور معذور ہے۔ چوتھی صفت "بے نشان" ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر کوئی ایسی نشانی نہیں ہے کہ اس کو دیکھ کر ہم کہہ سکیں کہ یہ اللہ ہے بلکہ وہ تو ہر جگہ اور ہر چیز میں جلوہ گر ہونے کے باوجود لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ کی صفات سے مزیّن ہے بلکہ ظاہر و باطن میں صرف اسی کا جلوہ کارفرما ہے، کوئی شے بھی اپنے "ہست" ہونے کا اعلان نہیں کر سکتی کیونکہ ہستی اور وجود حقیقی تو صرف ذاتِ واحد ہی کا ہے۔ اگر ہم اس کو نہ پا سکیں تو یہ ہماری نظروں کا قصور ہے اور اس کے انتہائی لطیف و پاکیزہ ہونے کی نشانی ہے۔

یہاں پر مصنفؒ نے چار چیزوں کی طرف اشارہ کیا ہے، دو پہلے مصرعہ میں اور دو دوسرے میں، پہلے مصرعہ میں تنزیہ[۱] اور تشبیہ[۲] کا بیان ہے اور دوسرے میں وحدۃ الوجود[۱] اور وحدۃ الشہود[۲] کا۔

محققین صوفیاء نے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کے تعارف کے لئے اپنے کشف سے دو مرتبے متعین کئے ہیں، ایک مرتبۂ تنزیہہ، دوسرا مرتبۂ تشبیہ۔ مرتبۂ تنزیہہ میں ذاتِ پاک اس قدر پاک اور منزہ ہے کہ اس کا ادراک انسانی عقل سے باہر ہے، نہ اس کی کیفیت بیان کی جا سکتی ہے اور نہ کمیت، اسی مرتبہ کے بارے میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "ذاتِ پاک کی کنہ تک پہنچنے میں ہم سب کے سب احمق ہیں"۔ اور ان کی اس بات کی تائید حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے اس سوال سے ہوتی ہے کہ جس وقت سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم معراج سے مشرف ہوئے تھے تو آپ نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ "کیا آپ نے معراج میں حق تعالیٰ کو دیکھا تھا؟ آپ نے فرمایا" نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاہُ" وہ تو ایک نور ہے میں اس کو کیسے دیکھ سکتا"۔ اسی درجہ کو مرتبۂ احدیت کہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا "رَبِّ اَرِنِیْ" مجھے اپنا دیدار دکھایئے۔ جواب آیا "لَنْ تَرَانِیْ" تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔

یہ ارشاد بھی اسی مرتبہ سے متعلق ہے۔ ان حقائق کی بنیاد پر معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک مرتبۂ تنزیہہ میں اس قدر پاک و منزہ ہے کہ جس کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرا مرتبہ تشبیہ ہے جس میں ذاتِ حق سبحانہٗ قابلِ علم و ادراک ہے صوفیائے کرام کے نزدیک یہی ذاتِ پاک مختلف صورتوں میں نزول کرتی ہے مگر یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ نزول سے مراد حلول نہیں، نزول ایک اعتباری نام ہے، ذاتِ پاک جیسی کی ویسی ہی رہتی ہے وہ متاثر نہیں ہوتی اور نہ اس میں کچھ کمی پیدا ہوتی ہے۔ نزول کے بیشمار مرتبے ہیں، محققین صوفیار نے ان کو چھ مرتبوں میں حصر کیا ہے۔ ان مراتب کو تنزلاتِ ستہ کہتے ہیں، مرتبۂ اوّل "احدیت" ہے جس میں کوئی نزول نہیں اور یہ مرتبہ تنزیہہ میں داخل ہے، دوسرا مرتبہ وحدیت، تیسرا واحدیت، چوتھا روح، پانچواں مثال، چھٹا جسم، اور ساتواں انسان۔ یہ یاد رکھیئے کہ نزول درجۂ تشبیہ میں مرتبۂ وحدیت سے شروع ہوتا ہے، یہ اعتباری نزول ہے جو صوفیائے کرام نے اپنے کشف سے معلوم کیا ہے۔ جب سالک حق تعالیٰ کی ذات کا اس اعتبار سے لحاظ کرتا ہے کہ وہ ذات اپنا اجمالی علم رکھتی ہے اور اپنی ذات کا تمام شیونات کے ساتھ بطریقِ اجمال ادراک کرتی ہے کہ اَنَا وَلَا غَیْرِیْ یعنی میں ہی موجود ہوں اور میرے سوا کوئی موجود نہیں اور مجھ میں ظہور کی قابلیت موجود ہے، اس مرتبہ کو وحدت یا وحدیت کہتے ہیں، اسی مرتبہ کو "تعینِ اوّل" یا "حقیقتِ محمدیہ" بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ حقیقتِ محمدیہ، ذاتِ محمدیہ نہیں، دونوں الگ الگ حقائق ہیں کیونکہ حقیقتِ محمدیہ ذاتِ خداوندی کا مرتبۂ نزول ہے اور ذاتِ محمدیہ سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور حقیقتِ محمدیہ کو بعض نورِ محمدی بھی کہتے ہیں اس لئے لوگوں میں غلط فہمی ہوئی۔ نورِ کامل کا ظہور چونکہ ذاتِ محمدی میں ہوا اور اسی کامل نور سے اشیار کی تخلیق ہوئی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ نورِ محمدی سے تمام کائنات کی تخلیق ہوئی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ذاتِ محمدی سے تمام کائنات کی تخلیق ہوئی۔ اس فرق کو خوب سمجھ لیجیے۔ مرتبۂ تشبیہ میں باعتبار نزول دوسرا درجہ واحدیت کا ہے جب سالک حق تعالیٰ کی ذات کو اس اعتبار سے ملحوظ رکھتا ہے کہ وہ ذات اپنا تفصیلی علم رکھتی ہے اور اپنی ذات کو

بجمیع تفاصیل شیونہا و امتیاز بعضہا عن بعض" جانتی ہے یعنی اپنے اسمار و صفات و معلومات کو جملہ تفصیلات اور باہمی امتیازات کے ساتھ جانتی ہے تو اس مرتبہ کو واحدیت یا تعین ثانی، یا حقیقت انسانیہ کہتے ہیں۔ یہاں ایک بات اور ضروری ہے کہ مرتبۂ احدیت کو مطلق کہتے ہیں اور مرتبۂ وحدت کو مجمل اور مرتبۂ واحدیت کو مفصل۔ نیز مرتبۂ وحدت احدیت اور واحدیت کے درمیان ایک برزخ ہے اور وہ اس طرح ان دونوں عظیم الشان مراتب کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے، اسی لئے اس کو برزخ کبریٰ بھی کہتے ہیں اور یہ تینوں مرتبے مراتب الٰہیہ کہلاتے ہیں۔

تیسرا درجہ باعتبار نزول روح کا ہے اور چوتھا مثال اور پانچواں جسم۔ ان کو مراتب کونیہ کہتے ہیں اور چھٹا درجہ انسان ہے اور انسان کو "مرتبۂ جامعہ" کہتے ہیں۔ اس طرح یہ تنزلات چھ ہوگئے جن کو اصطلاح صوفیا میں "تنزلاتِ ستہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

وحدت اور واحدیت کو ظہور علمی اور روح، مثال، جسم، انسان کو ظہورِ عینی کہتے ہیں اور وحدت یعنی تنزلِ اول سے مرتبۂ جسم تک کو حضراتِ خمسہ بھی کہا جاتا ہے۔ نقشۂ ذیل سے تنزلاتِ ستہ کی تفصیل بخوبی واضح ہوجاتی ہے۔

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
مرتبۂ اولیٰ	مرتبۂ ثانیہ	مرتبۂ ثالثہ	مرتبۂ رابعہ	مرتبۂ خامسہ	مرتبۂ سادسہ	مرتبۂ سابعہ
ذات	تنزلِ اول	تنزلِ ثانی	تنزل ثالث	تنزلِ رابع	تنزل خامس	تنزل سادس
احدیت	وحدت	واحدیت	روح	مثال	جسم	انسان
باطن	حقیقت محمدیہ	اعیان ثابتہ	۰	۰	۰	۰
۱ تا ۳ مراتب الٰہیہ			۴ تا ۶ مراتب کونیہ			مرتبۂ جامعہ
۰	۲ تا ۶ حضرات خمسہ					۰
۰	۲ تا ۳ ظہور علمی		۴ تا ۷ ظہور عینی			
۰	۲ تا ۷ تنزلات ستہ					

پہلے مصرعہ کی تشریح کے بعد اب دوسرے مصرعہ کی تشریح بیان کی جاتی ہے، یہاں پر مصنف نے وحدۃ الوجود کے مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے، مسائل تصوف میں یہ موضوع ایک معرکۃ الآرا مبحث کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اکثر حضرات صوفیہ تو وحدۃ الوجود کے قائل ہیں اور بہت سے وحدۃ الشہود کے۔ ان حضرات میں صرف طرزِ فکر کا اختلاف ہے بنیادی اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں، یہاں پر ہم صرف ایک اجمالی خلاصہ عرض کرنے پر اکتفا کریں گے ورنہ تفصیل تو اس مسئلے کی اتنی طویل ہے کہ صرف اسی موضوع پر ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔

وحدۃ الوجود: ہمہ اوست، یعنی تمام عالم پرتوِ وحدت ہے اور سوائے اس کے کسی کی ذات موجود بالذات نہیں، جس قدر اشیاء نظر آتی ہیں اُن کا وجود اعتباری ہے اور یہ سب ذات واجب الوجود کی صفات کے تعینات ہیں، ذات موجود بالذات وہی ہے جس کے مظاہر مختلف ہیں۔ ظاہری صورت اگرچہ اشیاء کی بدلی ہوئی ہے مگر حقیقت سب کی ایک ہی ہے ایسی کوئی شے نہیں ہو سکتی جس کی اصلیت سوائے خدا کے کچھ اور ہو، جس قدر مخلوقات ہیں ان سب کی مثال ایسی ہے جیسے دریا اور اُس کے حباب و امواج۔ کیونکہ حباب و امواج حقیقتاً دریا ہیں مگر دریا کی شکل اور ہے اور حباب اور موجوں کی شکل اور ہے، اسی شکل کے بدل جانے کی وجہ سے ان کے نام بھی بدل گئے اگرچہ اصلیت دریا ہی ہے، ابتدا میں بھی دریا تھے اور انتہا میں بھی ٹوٹ پھوٹ کر دریا ہو جائیں گے۔ یہ خلاصہ ہے وحدۃ الوجود کا۔

وحدۃ الشہود: ہمہ از وست، یعنی تمام کائنات خدا کی مخلوق ہے اور وہ خالق ہے، خالق و مخلوق کی حقیقت و اصلیت و ماہیت ایک نہیں ہو سکتی، یہ ناممکن ہے کہ خالق مخلوق ہو اور مخلوق خالق ہو، تمام اشیاء اس کی پیدا کی ہوئی ہیں، پہلے نہ تھیں اور پھر وجود میں آنے کے بعد اپنے وقتِ مقررہ پر فنا ہو جائیں گی، ان میں سے کوئی شے خدا نہیں، خدا کی ذات تو واحد، یکتا، ازلی اور غیر مجسم ہے، خدا میں اور اس کی مخلوق میں کچھ ایسی ہی نسبت ہے جیسی آفتاب اور اس کے عکس میں ہے کہ زمین اور اس کی اشیاء پر اس کا عکس پڑتا ہے لیکن درحقیقت آفتاب کا عکس

یعنی دھوپ خود آفتاب نہیں، اسی طرح خدا کا جلوہ ہر چیز میں اور ہر چیز پر ہے مگر کوئی شے خدا نہیں ہے۔ یہ خلاصہ ہے وحدۃ الشہود کا۔

ان دونوں نظریات میں اختلاف لفظی ہے، حقیقت دونوں کی ایک ہی ہے کیونکہ وحدۃ الوجود کے ماننے والے حضرات اہلِ شہود کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ اس راز کو ایک مصلحت کی وجہ سے پوشیدہ رکھتے ہیں، وہ مصلحت یہ ہے کہ جاہل اور ناواقف لوگ وحدۃ الوجود کو بنیاد بنا کر اپنے آپ کو خدا نہ کہنے لگیں، اگر ایسا ہوا تو اس سے بڑی خرابیاں پیدا ہو جائیں گی، اگرچہ اہلِ شہود بھی اس سے واقف ہیں کہ خدا کے سوا کوئی شئے حقیقت میں موجود بالذات نہیں۔

اور وحدۃ الشہود کے قائل یہ کہتے ہیں کہ وجودی حضرات جو ہر چیز کو خدا کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک کیفیت ان پر ایسی طاری ہوتی ہے کہ ہر چیز ان کی نظر میں سوائے خدا کے اور کچھ نظر نہیں آتی۔ یہ کمالِ عشق کی کیفیت ہے اور انتہائے تصور میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ اُسی کی صورت ہر طرف نظر آنے لگتی ہے جیسا کہ قیس اپنے کو لیلیٰ سمجھنے لگا تھا حالانکہ وہ قیس تھا لیلیٰ نہیں۔ اہلِ وجود پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے وہ مجبوراً ایسا کہتے ہیں ورنہ وہ در حقیقت خدا نہیں اور نہ کوئی شئے خدا ہے بلکہ یہ سب مخلوق ہیں اور خالق صرف وہی ذاتِ واحد ہے جس کو تغیر و حدوث و انقلاب نہیں، دونوں گروہ ایک دوسرے کو بُرا نہیں کہتے بلکہ دونوں ایک دوسرے کو مجبور و معذور سمجھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اہلِ شہود مصلحتاً راز کو ظاہر نہیں کرتے اور اہلِ شہود کہتے ہیں کہ ان کو ایسا ہی کمالِ عشق و تصور سے نظر آتا ہے۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں اسی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے۔

بعد حمدش مصطفےٰ را ہم درود و ہم سلام ۔۔۔۔۔ بے عدد بر پیروان و آل و اصحابش تمام

ترجمہ: اللہ جل جلالہ کی حمد کے بعد سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بے شمار رحمتیں اور سلامتی ہو اور ان کے ماننے والوں پر اور آلِ پاک پر اور تمام اصحابِ کرام پر رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

تشریح: اللہ ذوالجلال والاکرام کی تعریف کے بعد سرورِ کائنات، محبوبِ رب العالمین کا ذکرِ مبارک

اور تحفۂ درود و سلام، دراصل یہ ایک روایتی چیز نہیں جیسا کہ عام طور پر متصوّر ہے بلکہ حقیقتاً یہ کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی اعتقادی و عملی تشریح ہے جس کے بغیر تکمیل ایمان اور تعمیر اسلام ہی نہیں ہوتی۔ اللہ اللہ کتنی عظیم الشان ہے ذاتِ اقدس سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کہ خدا کی توحید کا اقرار کرنے کے بعد اقرار رسالت بھی جزو ایمان ہے۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ اسی طرف اشارہ کناں ہیں۔

ذاتِ او اصلِ وجودِ کائناتِ دو جہاں نورِ اوّل، روحِ اوّل از احد ظلِ بے گماں

ترجمہ: آپ کی ذاتِ پاک دونوں جہاں کی تخلیق کا باعث اور بنیاد ہے، وہ مخلوقات میں سب سے پہلا نور اور ارواح میں سب سے پہلی روح ہے جو بیشک اللہ تعالیٰ کی ذاتِ وحدیت کا پرتو اور سایہ ہے

تشریح: پہلے مصرعہ میں اس حدیث پاک کی طرف اشارہ ہے لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ کہ اگر آپ کی پیدائش مقصود نہ ہوتی تو یہ کائنات بھی نہ ہوتی، اس سے سیدالانبیاء کی عظمت و رفعت شان نمایاں ہے، دوسرے مصرعہ میں حدیث پاک اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ اور اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ رُوْحِیْ کی طرف نسبتِ کلام کی گئی ہے اور مرتبہ وحدیت کا بیان بھی ہے کہ جب اللہ تعالے نے مرتبہ احدیت سے مرتبہ وحدیت میں نزول فرمایا تو حقیقتِ محمدی کا ظہور ہوا جیسا کہ تنزلات ستہ میں گذر چکا ہے۔

ہم دلیلِ راہِ حق شد سوئے ربّ العالمیں نعتِ پاکش ہست عین فرض بر ما بالیقیں

ترجمہ: وہی ربّ العالمین کی طرف جانے والی راہِ حق کے رہنما ہیں اس لئے اُن کی تعریف کرنا ہم سب پر یقیناً فرضِ عین ہے۔

تشریح: یہاں مصنف رحمۃ اللہ علیہ اپنے کلام کو منطقی انداز میں پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف بیان کرنا ہم سب پر فرض عین کیوں ہے؟ چونکہ انسان و جنات کی تخلیق کا مقصد قرآنِ پاک کے ارشاد کے مطابق وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ، یعنی میں نے انسانوں اور جنات کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے لیکن اس عبادت کا طریقہ اور

معبود کی معرفت کا راستہ بتانے والا کون ہے اور کس کی ذاتِ پاک ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی مرضیات ہم کو بتائیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ذاتِ اقدس سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے پس جس کا اتنا عظیم الشان احسان فرداً و اجتماعاً ہمارے اوپر ہے تو پھر اس کی تعریف و توصیف بیان کرنا بھی ہم سب پر فرضِ عین ہے

واضح ہو کہ فرض بھی دو قسم کا ہوتا ہے ایک فرضِ کفایہ، دوسرا فرضِ عین۔ فرضِ کفایہ کا مطلب یہ ہے کہ کچھ آدمی مل کر ایک کام انجام دیں اور سب کی طرف سے وہ فرض ادا ہو جائے جیسے نمازِ جنازہ، کہ چند آدمی مل کر نمازِ جنازہ ادا کر لیں تو محلہ والوں اور تمام بستی والوں کی طرف سے وہ فرض ادا ہو گیا اور فرضِ عین وہ ہے جو ہر ایک پر فرداً فرداً ادا کرنا ضروری ہوتا ہے جیسے نمازِ پنجگانہ یا روزہ وغیرہ، تو جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان بھی فرداً فرداً ہر ایک پر ہے تو اس کا بدل بھی فرداً فرداً ادا کرنا چاہیے۔ اسی لئے آپ کی تعریف و توصیف اور آپ پر درود و سلام بھیجنا بھی فرداً فرداً فرضِ عین کی صورت میں ہوگا۔ واللہ اعلم

بعد حمد و نعت گویم رازِ آں پروردگار ۔۔۔ می نگارم بہرِ طالب بر حریرِ زر نگار

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی تعریف اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف کے بعد معرفتِ خداوندی کا راز بیان کرتا ہوں جس کو میں نے طالبِ صادق کیلئے سنہرے پھولوں والی ریشم پر لکھا ہے

تشریح: حمد و نعت کے بعد مصنفؒ اپنے اس مقصد کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں جو اس کتاب کی تصنیف میں ان کے پیشِ نظر ہے کہ طالبانِ صادق کے لئے راہِ معرفت کے مسائل بہت چھان بین کے ساتھ میں نے تحریر کئے ہیں۔

بہرِ عرفانش بگویم چند بیتِ آب دار ۔۔۔ مثنوی گنج رازش نام نامی یاد دار

ترجمہ: اس کی معرفت کے لئے کچھ اشعار بڑے ہی گراں قدر کہہ رہا ہوں اور ان اشعار کے مجموعہ کا نام میں نے "مثنوی گنج راز" یعنی رازوں کے خزانے کی مثنوی رکھا ہے۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کی معرفت کا راستہ سب سے اہم ہے اس کے جو رموز و نکات مجھے اپنے راہبروں سے حاصل ہوئے ہیں اس کا اظہار میں اس طرح پر کر رہا ہوں کہ اس میں افراط و تفریط اور مبالغہ

وشہوات سے دامن بچالیا گیا اور طریقت میں شریعت کی پاکی وصفائی بھی مدنظر رکھی ہے۔

ہر کہ بینداں صحیفہ شاد گردد بالیقیں　　زانکہ در وے گشت کشفِ رازِ ربّ العالمیں

ترجمہ: جو کوئی ان صفحات کے مجموعہ کو دیکھے گا تو یقیناً اس کو مسرت وخوشی حاصل ہوگی،

کیونکہ اس میں ربّ العالمین کی معرفت کے پوشیدہ رازوں کا انکشاف کیا گیا ہے۔

تشریح: یہ انسان کی فطرت ہے کہ اگر اس کو مقصود کے حصول کے سلسلے میں کوئی چیز مددگار مل جائے تو اس کے حصول سے خوشی اور اطمینان ہوتا ہے جس طرح کوئی شخص سفر میں جائے اور پہلے سے اس کو ریزرویشن مل جائے تو اس کو ایک گونہ انبساط واطمینان ہو جاتا ہے، اسی طرح اس کتاب کے مطالعہ سے بھی طالبانِ راہِ سلوک کو مسرت اور خوشی ملے گی۔

دربیانِ احتیاجِ گرفتن پیر ومرشد

پیرومرشد کا دامن پکڑنے کی ضرورت کا بیان

دردِ باری در دلِ آں مردِ صالح کرد جا　　گو بگیر د زود پائے مرشدِ راہِ صفا

ترجمہ: جس شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کے عشق کا جذبہ پیدا ہو جائے تو تم اس سے کہو کہ وہ فوراً راہِ معرفت کے رہبر کی خدمت میں قدم بوس ہو جائے۔

تشریح: حمد ونعت کے بعد مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس کتاب کی تالیف کے مقصد کی طرف متوجہ ہیں۔ چونکہ کتاب کا تعلق معرفت، سلوک اور تصوف سے ہے اس لئے اس سلسلے میں پہلا قدم کس طرف اور کس طرح رکھا جائے؟ فرماتے ہیں کہ راہِ صفا کی توفیق عطائے خداوندی ہے، اور اللہ رحمان ورحیم ہے وہ اپنی رحمت سے جس بندہ کو اس نعمت سے سرفراز فرمائے تو بندہ کو بھی اس کی قدر کرنی چاہیئے، یہ تو ایک انمول خزانہ اس کو مل گیا ہے اگر اس کی قدر وحفاظت نہ کی تو جس طرح دنیاوی خزانہ کو حفاظت نہ کرنے پر چور ڈاکو چرا کر لے جاتے ہیں اسی طرح شیطانِ لعین بھی اس عطائے خداوندی کے انمول خزانے پر شب خون مارنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ اس لئے ضروری

ہے کہ اس کی قدر وحفاظت فوراً کرو۔ ایک لمحہ کی غفلت بھی نہ کرو۔ ورنہ اِس راہ میں تو ایک لمحہ کی غفلت بھی ہزاروں کوس منزلِ مقصود سے پھینک دیتی ہے۔ لہذا اس کا احساس ہوتے ہی کسی مرشد کامل کی خدمت میں حاضر ہو جانا چاہیئے تاکہ وہ راستہ کے نشیب و فراز بتلا کر تمھارے لئے آسانیاں فراہم کر دے۔

گرچہ اینجا شد ہویدا راز باری از نہاں   کے شود بے پیر رہبر حلِ مشکل اے جواں

ترجمہ: اگرچہ اس کتاب کے مطالعہ سے بھی معرفتِ خداوندی کے پوشیدہ راز تم پر ظاہر ہونے شروع ہو جائیں گے مگر پھر بھی بغیر راہنمائی مرشدِ کامل اِس راستہ کی مشکلات کسطرح حل ہونگی۔

تشریح: مرشد کامل کی خدمت میں حاضر ہونے کی غرض بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ راستہ اگرچہ انوار الہیہ سے بھر پور ہے اور قدم قدم پر رحمتِ باری کا ظہور ہے مگر اس راہ میں مشکلات بھی اسی قدر عظیم ہیں کہ صرف کتاب کے مطالعہ اور علم حاصل کرنے سے اس ہفت خواں کا طے ہونا مشکل ہے جب تک کہ کوئی اس راہ کا رمز شناس تمھاری راہ نمائی اور راہ بری نہ کرے۔ یہ ایک سیدھی سادی مگر بہت گہری بات مصنف نے فرمائی ہے کیوں کہ اگر صرف کتابوں سے کام چل جاتا تو پھر استاد کی ضرورت کیوں پیش آتی۔

بے دلیلے کس نیابد راہِ آساں در جہاں   رہبرے در راہ شرط و فرض آمد ہر زماں

ترجمہ: بغیر کسی نشانی کے دنیا میں آسانی کے ساتھ کون راستہ پا سکا۔ اسی لئے ہر زمانہ میں راہ نوردی کیلئے کسی راہبر کا ہونا شرط اور فرض کا درجہ رکھتا ہے۔

تشریح: مقصود جس قدر عظیم اور بلند ہوگا اس کا حصول بھی اسی مناسبت سے پُر از مشکلات اور پیچیدہ ہوگا جس طرح بحری جہاز چلانے والا سمتوں کے تعین کے لئے قطب نما اور پانی کی گہرائی ناپنے کے لئے ہائیڈرو میٹر (Hydrometer) رکھتا ہے کیونکہ سمندر کے غیر متناہی طول و عرض میں اس کے بغیر اندازہ نہیں لگا سکتا کہ جہاز کس سمت میں چل رہا ہے اور اسی طرح ہائیڈرو میٹر کے بغیر یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ جہاز کتنے گہرے پانی پر چل رہا ہے۔ اسی طرح ہوائی جہاز چلانے والا۔ بلکہ کوہ پیما جو اونچے

اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرنے کی مہم پر جاتے ہیں وہ بھی راستہ کے نشانات، نقشہ جات اور تمام آلات سے لیس ہو کر جاتے ہیں تو پھر اندازہ لگائیے کہ راہِ معرفت جو بحرِ ناپیدا کنار ہے اور اس کی وسعت و گہرائی کو تمام دنیا کی رفعتوں اور عظمتوں سے کوئی نسبت نہیں، تو کیا اس راہ میں قدم رکھنا بغیر کسی نشان کے مناسب ہوگا؟

یارِ اوّل پس قدم بر رہ نہادن شرطِ داں　　　می نگر اندر حدیث پیشوائے مرسلاں

ترجمہ: پہلے کسی کو دوست یعنی راہبر بنانا شرط ہے اس کے بعد سفر کے لئے قدم بڑھانا چاہیئے اس مفہوم پر رسولوں کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثِ پاک میں غور کرو۔

تشریح: یہاں پر مصنف ایک حدیثِ پاک کی طرف توجہ دلا رہے ہیں جو راہِ طریقت میں کسی راہبر کی طلب پر دلالت کرتی ہے، حدیثِ پاک کا ایک جزو جس کا مفہوم اَلرَّفِیْقُ قَبْلَ الطَّرِیْقِ ہے یعنی کسی بھی سفر کو شروع کرنے سے پہلے کسی ایسے شخص کو منتخب کر لو جو اس راہ کی مشکلات میں تمہارا مددگار ثابت ہو اس کے بعد قدم آگے بڑھاؤ، ورنہ راہ بھٹکنے کا اندیشہ رہے گا اور جب تذبذب اور عدمِ یقین کی کیفیت ہوگی تو منزل تک رسائی بہت دشوار بلکہ ناممکن ہوگی اور راہِ معرفت میں تو شک کا پیدا ہونا ہی کفر ہے اسلئے راہبر اور مددگار کی تلاش ضروری ہے تاکہ وہ راستہ کے تمام شکوک و شبہات دور کر کے سیدھا سیدھا راستہ بتلا دے۔

رہ پُر از آفات و اندیشہ زبیمِ رہزناں　　　بے دلیلے کے تواند در گذشتن با اماں

ترجمہ: راستہ مشکلات سے بھرپور ہے اور ڈاکوؤں کا خوف بھی ہے، پھر کس طرح بغیر کسی راہبر اور نشان کے تم بحفاظت گذر سکتے ہو۔

تشریح: اس ایک شعر میں راہِ معرفت کے تمام آثار چڑھاؤ کو اجمالی طور پر بیان کر کے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے طالبِ حق! یہ راستہ دشواریوں اور خطرات سے بھرپور ہے۔ قدم قدم پر رہزن گھات میں لگے بیٹھے ہیں، بس جوں ہی اس راستہ کی طرف قدم بڑھایا، امتحان و آزمائش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ نفسِ امّارہ" جو انسان کا بہت بڑا دشمن ہے وہ کب گوارا کرے گا کہ مجھے دھکا دے کر نفسِ لوّامہ کی معیت میں نفسِ مطمئنہ" کی طرف راہِ معرفت طے کی جائے،

یہی نفس امارہ ہزار بار کانٹے بھی کھڑے کر دے گا۔ علاوہ ازیں شیطانِ لعین جو انسان کا کھلم کھلا دشمن ازلی ہے وہ کس کس طرح سے اس راہ میں بہکاتا ہے کہ بس خدا کی پناہ۔ اس لئے اس راہِ پُر خطر میں قدم رکھنے سے پہلے کسی راہبر کا دامن تھام لو۔

گر بپا شد راہِ دنیا، خواہ باشد راہِ دیں ۔۔۔ رہبرے ہر جائے فرض و شرط آمد بالیقیں

ترجمہ: خواہ دنیا کا راستہ ہو یا دین کا راستہ ہو، اِن راہوں میں کسی نہ کسی رہبر کا ہونا یقینی طور پر فرض اور شرط ہے۔

تشریح: یہاں پر محسوسات کے ذریعہ مثال دے کر سمجھا رہے ہیں کہ دنیاوی راستہ میں جب کسی نہ کسی کی معلومات کا سہارا لینا پڑتا ہے تو راہِ طریقت میں تو اور بھی زیادہ اس کی ضرورت پیش آئے گی جیسے کوئی اجنبی شہر میں چلا جائے تو اس کو قدم قدم پر معلوم کرنا پڑتا ہے کہ فلاں محلہ، فلاں روڈ، فلاں بازار کس طرف ہے اسی طرح شہرِ طریقت میں راستوں کی نشاندہی کیلئے کسی رہبر کا ہونا بہت ضروری ہے۔

حق تعالیٰ گفت کونوا در کلامِ خویش داں ۔۔۔ ایں خطابش فرض بہرِ التزامِ صادقاں

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں فرمایا ہے کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۔ یہ حکم صادقین کی صحبتِ صالحہ اختیار کرنے کی فرضیت پر دلالت کرتا ہے۔

تشریح: دامنِ مرشد کو تھامنے کے لئے قرآن پاک کی اِس آیتِ پاک سے اشارہ فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں فرمایا ہے کہ: اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ مفسرین نے لفظ مَعَ کے معنیٰ "قرب" لکھے ہیں اور محققین صوفیاء نے قرب کی دو قسمیں بتائی ہیں ۱۔ قربِ ظاہری ۲۔ قربِ باطنی۔ قربِ ظاہری تو صادقین کی صحبت اختیار کرنے، احکامِ شریعت میں ان کا اتباع کرنے اور ان کے خصائلِ جمیلہ و اوصافِ حمیدہ کی ہر ممکن طریقہ سے پیروی کرنے سے حاصل ہوتا ہے مگر قربِ باطنی بغیر رابطۂ قلب حاصل نہیں ہوتا اور قلب کے رابطہ کے لئے ضروری ہے کہ کسی سے عشق و محبت انتہا درجہ کی ہو اور یہ بات ظاہر ہے کہ عشق کے لئے ایسی ذاتِ پاک کا انتخاب کیا جائے جو سب سے زیادہ صاحبِ جمال اور تمام صفاتِ کمالیہ و جمالیہ کو جامع ہو اور وہ

ذات صرف ذاتِ وحدہٗ لاشریک کی ہے لیکن اس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کسی ایسے رابطہ کی ضرورت ہے جو خود واصل الی اللہ ہو اور اسی واصل الی اللہ کو پیر و مرشد کہا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم کو بھی وصول الی اللہ کے لئے ایسے ہی کسی مرشد کا دامن تھامنا چاہیئے۔

امر دیگر وَابْتَغُوْا ہم فرض بر تو باز بیں ۔۔۔ زاں توسّل شد ضروری سوئے ایشاں بالیقیں

ترجمہ: دوسرا حکم وَابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ بھی تجھ پر فرض ہے اس پر بار بار غور کر، اس لئے یقیناً ایسے کامل حضرات کے وسیلے کی یافت بہت ضروری ہے۔

تشریح: اس سے پہلے شعر میں قرآن پاک کی اس آیت شریفہ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ سے مرشد کا دامن تھامنے پر دلیل قائم کی تھی، اس شعر میں قرآنِ پاک کی دوسری آیت وَابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ (اس تک پہنچنے کے لئے وسیلہ تلاش کرو) سے بھی ضرورت مرشد کے مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہاں پر ایک اور بنیادی مسئلۂ تصوف کی طرف بھی اشارہ ہے کہ سالکانِ راہ طریقت کی دو قسمیں ہیں ۱۔ مرید ۲۔ مراد۔ مرید وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قدم رکھنے کا ارادہ توفیق خداوندی کرے اور مراد وہ ہے جس کے لئے رحمتِ خداوندی دروازۂ اجابت و قبولیت وا کردے اور محبوبِ حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے دعوتِ نظارہ دی جائے چونکہ شانِ مرادیت بہت کم حضرات کے حصہ میں آئی ہے اس لئے وصول الی اللہ کے لئے ارادہ کرنا اور اس ارادہ کے ساتھ کسی واصل الی اللہ کے دامن سے منسلک ہونا ضروری ہے۔

ہر گروہے را بیامد درمیانِ راہ پیر ۔۔۔ می نگر در قولِ حق اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْر

ترجمہ: ہر گروہ میں کوئی نہ کوئی راہِ حق کی طرف رہبری کرنے والا پیدا ہوتا رہا ہے۔ اس بات کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ میں ملاحظہ کرو۔

تشریح: یہاں پر مصنفؒ انفرادیت سے آگے بڑھ کر اجتماعیت کی طرف قرآنِ پاک کی آیت سے اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دیکھو اللہ تعالیٰ نے صرف ایک فرد ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام افراد اور پوری

قوم کے لئے ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی راہبر اور پیغمبر بھیجا ہے تاکہ وہ انسانوں کو اللہ کی توحید و صفات سے متعارف کرائے اور جب ابتدائے آفرینش سے یہ سلسلۂ رشد و ہدایت تسلسل کے ساتھ جاری ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر منتہی ہو جاتا ہے اور آپ کے بعد یہ سلسلہ صحابہ و تابعین اور اسلاف کرام کی صورت میں جاری ہے تو اب ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ معرفتِ حق حاصل کرنے کے لئے انبیاء کے وارثین کے دامن تقدس میں پناہ لے۔

حق شناسی گر بآسانی بُدے اے با صفا ۔۔۔ کے شدے جبریل پیرِ حضرت خیر الورٰی

ترجمہ: اے پاک و صاف دل اور دماغ والے! اگر معرفتِ حق آسانی کے ساتھ حاصل ہونیوالی چیز ہوتی تو پھر حضرت جبریل امین علیہ السلام سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پیر کیسے ہو سکتے تھے۔

تشریح: ضرورتِ مرشد اور اس کی اہمیت و افادیت، مرید اور مراد کی وضاحت کے بعد مصنف رح اب انتہائی بلند پروازی کی طرف مائل ہیں۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں حقیقتِ مضمون تک پہنچنے کے لئے بہت سنبھل سنبھل کر چلنا ہوگا۔ اگرچہ اصطلاحاتِ مروجہ کا سہارا لے کر بہت آسانی سے گزرا جا سکتا تھا لیکن ہم نے اس کتاب کی تشریح میں ابتدا ہی سے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ ایسی بات جو خود اپنے دل کو مطمئن نہ کر سکے اس کو بیان کرنے سے گریز کیا جائے۔

اس سے پہلے وضاحت ہو چکی ہے کہ سالکانِ راہِ طریقت کی دو قسمیں ہیں ۱۔ مرید ۲۔ مراد۔ اور ان دونوں کی تعریف بھی بیان کر دی گئی ہے تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ دونوں صفات (مرید اور مراد) بدرجۂ اتم موجود ہیں بلکہ آپ مُرید بعد میں اور مراد پہلے ہیں اور مراد بھی کتنے اعلیٰ درجہ کے، کہ قربان جائیے آپ کی اس شرافت و کرامت کے کہ آپ کے قدم مبارک جہاں پہنچے وہاں دوسرے مقربین کے سر بھی نہ پہونچ سکے تو ایسی عظیم و برتر ہستی کا جس کی شان لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ ہے کوئی پیر و مرشد کیسے ہو سکتا ہے۔

تو یہاں پر دو باتوں کی طرف دھیان دینے کی ضرورت ہے

۱۔ رہنمائی کی تین صورتیں ہیں ۱۔ اِیْصَالُ اِلَی الْمَطْلُوْب یعنی منزلِ مقصود تک پہونچانا، اور

اس پر صرف اللہ تعالیٰ کو دسترس حاصل ہے۔ ۲۔ دوسرے اِرَاءَۃُ الطَّرِیْق یعنی راستہ دکھلانا اور راستہ کی طرف اشارہ کردینا یہ انبیاء علیہم السلام کا کام ہے ۳۔ تیسرے بَیَانُ الطَّرِیْق، راستہ کے نقشہ جات اور حالات بیان کردینا اور یہ عام ہے انبیاء اور غیر انبیاء میں۔ یہاں پر جبریل علیہ السلام کی حیثیت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بیان الطریق کی تھی یعنی حکم خداوندی سے جبریل علیہ السلام احکام خداوندی کو بیان کردیتے تھے ورنہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق مع اللہ تو حضرت جبریل سے اس قدر ارفع و اعلیٰ ہے کہ معراج کے موقع پر سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ کر آگے جانے سے معذوری کا اظہار، اپنی کمتری اور سید الانبیاء کی برتری کا واضح اعلان ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے دستورِ خداوندی کچھ اسی طرح سے ہے کہ جتنے بھی انبیاء آئے سب کے پاس کسی فرشتے کے ذریعہ احکاماتِ خداوندی کا نزول ہوا، لہٰذا یہ طریقہ یہاں پر بھی اسی دستورِ قدیم کے مطابق پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اور حضرت جبریل کی حیثیت پیغام رساں کی ہوئی جس کو مجازی طور پر اصطلاحاً مرشد اور پیر کہا گیا ہے۔

اس وضاحت سے ہم دو اعتراض سے بچ گئے۔ ایک تو یہ کہ کیا اللہ تعالیٰ بغیر کسی واسطے کے احکام پہونچانے پر قادر نہیں؟ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ دوسرے یہ کہ مرشد اور پیر زیادہ جاننے والا ہوتا ہے اور اس کا مرتبہ بھی مرید اور شاگرد سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ نیز اس صورت میں حضرت جبریلؑ کا مرتبہ متعین کرنے میں جو دشواری پیش آرہی تھی اس کی بھی سب سے موزوں شکل یہی تھی۔ فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ عَلٰی ذٰلِکَ۔

مصطفےٰ را جبریلؑ آمد چوں مرشد راست داں   گرچہ ہادی کرد روشن صدرِ احمد در نہاں

ترجمہ: حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت جبریلؑ مرشد مقرر ہوئے، یہ حقیقت ہے،
اگرچہ ہادیٔ مطلق نے احمد مصطفےٰ کے سینۂ مبارک کو ازل ہی میں نورِ معرفت سے روشن کردیا تھا۔

تشریح: یہ شعر اپنے ماقبل کے شعر کی تشریح و تائید ہے۔ وہ یہ کہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک تو نورِ مجسم تھی اور معصوم بھی، نیز راہِ معرفت پر عبور حاصل کئے ہوئے تھی مگر پھر بھی دنیاوی دستور کے مطابق عبد اور معبود میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے حضرت جبریل علیہ السلام

کو بیان الطریق کی حیثیت سے پیغام رساں اور آپ کا مرشد متعین کیا گیا. مقام فکر ہے کہ جب ایسی ہستی کے لیے جو "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کے شرف سے مشرف ہے مرشد متعین کیا گیا تو پھر دیگر حضرات کے لیے اس کی کس قدر شدید ضرورت ہوگی۔

اُنچہ بینی ویس قرنی راکہ شد بے پیر، پیر   او محمد را ہمید النسبت دائم دستگیر

ترجمہ: یہ جو تم دیکھتے ہو کہ حضرت اویس قرنیؓ بغیر کسی پیر و مرشد کے پیر بن گئے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ سرورِ انبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ اپنا رہنما یقین کرتے تھے۔

تشریح: یہاں دراصل ایک شک کا ازالہ مقصود ہے اس سے پہلے تمام مضامین میں ضرورت مرشد کی اہمیت و افادیت کا بیان ہوا۔ اب تم کو کہیں یہ گمان و وہم نہ ہو جائے کہ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کا کوئی مرشد اور پیر نہ تھا تو پھر وہ کس طرح منزلِ مقصود کو پہنچے؟ تو حقیقت یہ ہے کہ اصل چیز اس راستے میں قربتِ نسبت ہے یعنی رابطہ جڑا ہوا ہونا چاہیئے۔ اب یہ قربتِ نسبت خواہ ظاہری ہو یا باطنی۔ ٹیلی ویژن اور وائرلیس اس کی واضح مثال ہے کہ اگرچہ ظاہری تار یا پیغام رسانی کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا مگر چونکہ حقیقتاً ایسا کنکشن موجود ہے جس سے ہزارہا میل کی تصویر لی جا سکتی ہے اور گفتگو کی جا سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح حضرت اُویس قرنی رضی اللہ عنہ کا معاملہ ہے کہ اگرچہ انھوں نے نہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں زیارت کی اور نہ آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی مگر اس بُعدِ مکانی کے باوجود آپ کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبتِ باطنی کی جو قربت حاصل تھی اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب غزوۂ احد میں سیدالانبیاء کا دندانِ مبارک شہید ہوا تو آپ نے اپنے تمام دانت توڑ ڈالے کہ نہ معلوم میرے آقا کا کون سا دانت شہید ہوا ہے۔ اس بُعدِ مکانی کے باوجود جب نسبت کی قربت کا یہ حال ہے تو پھر کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ آپ کا کوئی راہبر اور مرشد نہ تھا بس اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ظاہر میں نہ تھا۔ یہاں ایک اور ضروری بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ نسبت کا جو لفظ عوام میں رائج ہے، سلسلۂ طریقت میں اس کی کیا اہمیت ہے؟ لغت اور اصطلاح کے اعتبار سے اس کے معنی بالکل سیدھے سادے ہیں مگر جب اس کی معنویت پر غور کیا جائے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ راہِ طریقت

کا یہ سب سے اہم سنگِ میل ہے۔ کسی کے دامن کو تھام لینا اور کسی کے سلسلۂ ارادت میں داخل ہونے کا نام نسبت نہیں ہے بلکہ جب کسی مستند اور کامل مرشد سے بیعت کا تعلّق قائم کر لیا تو اس کے رنگ میں رنگ جانے کا نام نسبت ہے۔ جب آپ نے کسی مرشد کا دامن پکڑ لیا تو احکامِ خداوندی اور سنّتِ نبوی کی پیروی مرشدِ کامل کی نگرانی میں اور مرشدِ کامل کو آئیڈیل اور نمونہ بنا کر اپنے قول و عمل کو اس کے سانچے میں ڈھال لینے کا نام نسبت ہے خواہ یہ نمونہ اور آئیڈیل آپ کی نظروں کے سامنے موجود ہو یا نظروں سے اوجھل ہو کیونکہ یہ منزل نہیں بلکہ نشانِ منزل ہے۔ منزل تو صرف ذاتِ وحدہٗ کی معرفت ہے۔

یہ شخصیت کون تھی؟ یہ وہ برگزیدہ ہستی ہے جس کے بارے میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں ایک ایسا مرد ہے جس کی سفارش پر اللہ تعالیٰ میری امت کے اتنے گنہگاروں کو قیامت کے دن بخشے گا جس قدر قبیلۂ ربیعہ یا قبیلۂ مُضر کی بھیڑوں کے بال ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، وہ کون شخص ہے اور کہاں رہتا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا، کہ اویس اس کا نام ہے، قرن میں (جو علاقہ یمن میں ہے) رہتا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ نے اس کو دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا، میں نے اس کو باطنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ آپ کا ایسا دوست، حاضرِ خدمت کیوں نہیں ہوا؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ غلبۂ حال اور تعظیمِ شریعت کی وجہ سے۔ نیز اس کی والدہ ضعیف، نابینا اور مومنہ ہیں، وہ شتربانی کر کے اُن کی خدمت بجالاتا ہے۔ پھر صحابہؓ نے عرض کیا کہ کیا ہم اس کی زیارت کر سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا "نہیں" البتہ عمرؓ اور علیؓ اس کو دیکھیں گے جب تم اس سے ملو تو میرا اسلام کہنا اور میری امّت کے حق میں دعا کے لئے کہنا: اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا مرقع اُویس قرنیؒ کو دیئے جانے کی بھی وصیّت فرمائی چنانچہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے آپ سے ملاقات کی اور وہ مرقع بھی دیا (تفصیل کیلئے "انوارالاولیاء (کامل) ملاحظہ فرمائیں)

اویس قرنی گو بظاہر چشم احمد را ندید
لیک در باطن شرابِ سیرتِ احمد چشید

ترجمہ: اویس قرنیؒ نے اگرچہ ظاہری آنکھ سے احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا لیکن باطن میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک کی شرابِ طہور سے لذت یاب تھے۔

تشریح : یہ شعر بھی اس سے پہلے شعر کی مزید تائید کے لیے بیان کیا گیا ہے۔ پہلے شعر میں نسبتِ محمدی کا دعویٰ کیا گیا تھا، اس شعر میں اس دعوے کی دلیل بیان کی گئی ہے کہ دیکھو حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگرچہ بظاہر کسی سے مربوط نہیں تھے لیکن حقیقت میں آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خُلقِ عظیم کا نمونہ تھے اور ظاہر بات ہے کہ جب تک کسی کی ذات سے انتہائی قربت کا تعلق نہ ہوگا تو کس طرح اس کی عادات و اخلاق کا نمونہ بن سکتا ہے۔

سِرّ باری، سیرتِ احمد گرفتہ در نہاں   ویس قرنی گشت فانی در بقاءِ حق بداں

ترجمہ : اللہ تعالیٰ کی معرفت کے راز اور احمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلقِ عظیم وہ اپنے باطن میں چھپائے ہوئے تھے اس لئے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اویس قرنی فنا فی اللہ کے حال سے گذر کر مقامِ بقاء پر فائز ہو گئے۔

تشریح : یہ شعر بھی مذکورہ بالا اشعار کی مزید تشریح و تاکید ہے۔ البتہ یہاں اویس قرنی کا مرتبہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ فنا کی آخری حالت فنا فی اللہ ہے۔ وہ اس سے گذر کر مقامِ بقاء سے فیضیاب تھے اور اس کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ جس کے قلب میں، کردار اور گفتار میں، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ رچ بس جائے تو پھر اس پر معرفت کے رازہائے سربستہ آشکارا ہو جاتے ہیں اور ایسا شخص فنا فی الشیخ، فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کے احوال سے گذر کر بقاء کی منزل کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔

از خیالش ہی گذر گر تو بخواہی نورِ جاں   پائے مرشد گیر و می کن بندگی چوں بندگاں

ترجمہ : اگر تو نورِ قلبی چاہتا ہے تو اس کے خیال سے گذر جا۔ اور کسی مرشد کی قدم بوسی کر، اور غلاموں کی طرح خدمت گذاری کر۔

تشریح : اب پھر مقصد کی طرف مراجعت فرماتے ہوئے مصنف رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت اویس قرنی کی نسبت ظاہری نہ ہونے کی وجہ سے تم مغالطے میں پڑ جاؤ کہ ہم کو بھی اسی طرح نسبت باطنی حاصل ہو جائے گی کیوں کہ یہ مرید نہیں مُراد تھے۔ اس لئے اگر

نورالٰہی کی معرفت چاہتے ہو تو چپ چاپ کسی مرشدِ کامل کے دامن سے وابستہ ہو کر خلوص، لگن اور للٰہیت کے ساتھ خدمت گذاری اور اطاعت شعاری کرو کہ منزلِ مقصود تک رسائی ہو جائے۔

گر کسے بے پیر کارے پیش گیرد ہوشدار　　خویش را در دستِ شیطاں میکناند سخت خوار

ترجمہ: اگر کوئی راہ طریقت میں بغیر کسی راہبر کے قدم رکھتا ہے تو ہوشیار ہو جا کہ وہ اپنے آپ کو شیطان کے چنگل میں پھنسا کر بہت ہی زیادہ ذلت و رسوائی میں ڈال رہا ہے۔

تشریح: بہت عام سی بات ہے کہ جب کوئی شخص کسی دور دراز سفر کی تیاری کرتا ہے تو راستہ کی معلومات، قیام و طعام کی سہولت اور دیگر لوازمات سفر کی چھان بین کرتا ہے۔ اس کے بعد سفر کا آغاز کرتا ہے۔ اور جو کوئی آدمی بغیر معلومات، سہولت وغیرہ کے ہوائی اڈے یا اسٹیشن پر جا کر جہاز یا ریل میں سوار ہونا چاہے گا تو اوّلاً تو سوار ہونا ہی مشکل ہو گا اور اگر ہو بھی جائے گا تو کس قدر پریشانی کا سامنا کرنا ہو گا بلکہ بغیر معلوم کئے منزل تک پہنچنا ہی ناممکن ہو گا کیونکہ راستہ میں کوئی اُچکا اور چالاک آدمی اس کو غلط راہ بتا کر سب کچھ لے کر چمپت ہو جائے گا۔ یہ تو دنیاوی سفر کا معاملہ ہے۔ اور راہِ معرفت کا سفر تو بے حد پیچیدہ اور دشوار ہے۔ اگر اس میں کوئی راہبر نہ ہو گا تو پھر شیطان لعین اس کو صحیح راستہ سے گمراہ کر کے غلط سمت کی طرف موڑ دے گا اور متاعِ ایمان و عمل پر دست درازی کر کے دنیا و آخرت کے خسارے میں ڈال دے گا اس لئے راہبر اور مرشد کی رہنمائی ضروری ہے تاکہ وہ اس راہ کے پیچ و خم سے تم کو بچا کر استقامت کی راہ بتلا سکے۔

طالبے را مرشد آمد کور را چوں عصا　　بے عصا در راہ رفتن کور را باشد خطا

ترجمہ: طالب راہِ معرفت کے لئے ذاتِ مرشد اندھے کی لاٹھی کی طرح ہے اور بغیر لاٹھی کے اندھے کو راستہ چلنے میں غلطی ہو سکتی ہے۔

تشریح: روزمرّہ کے مشاہدے کا ذکر فرما کر ضرورتِ مرشد کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔

مرشد آمد در طریقت چوں معلّم در جہاز　　می برد از بحر آفت در کنار امن باز

ترجمہ: طریقت و سلوک کے راستے میں مرشد کی حیثیت جہاز کے کپتان کی سی ہے کہ وہ

مصائب کے سمندر سے جہاز کو امن کے ساتھ کنارے لگا دیتا ہے۔

تشریح: راہِ طریقت تو ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارا ہی نہیں اور اس میں قدم قدم پر طوفان و حوادث سے سابقہ پڑتا ہے بس مرشد کامل ہی اپنے مرید کی کشتی کو ان موانع اور خطرات سے بچا کر کنارہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

گر نبودے بادبانے در بحارِ موجزن — غرق کشتی می شدے باآں تمامی مرد و زن

ترجمہ: اگر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں کشتی میں بادبان نہ ہو تو پھر کشتی تمام سوار مرد و عورت سمیت غرق ہو جائے۔

تشریح: یہاں مرشد کی مثال بادبان سے دی گئی ہے۔

مرشد آمد ابر نیساں، راز ازوے آب داں — خاطرِ سالک صدف، ہم رویت حق دُرِّ آں

ترجمہ: ذاتِ مرشد موسم کی پہلی بارش کی طرح ہے اور رازہائے طریقت اس بارش کے پانی کی طرح ہیں۔ سالک کا دل سیپ کی مانند ہے اور معرفتِ حق اس سیپ کے سچے موتی کی طرح۔

تشریح: یہاں پر مصنف عقلی طور پر ضرورتِ مرشد پر استدلال فرما رہے ہیں اور چار چیزوں میں حصر کر کے راہِ طریقت کی ابتدا اور انتہا کو بیان کر دیا ہے [۱] مرشد، کو ابرِ نیساں کی طرح خیال کرو، ابرِ نیساں اس بادل کو کہتے ہیں جو ماہِ ستمبر کی بارش کے وقت آکاش پر چھاتا ہے [۲] رازہائے معرفت، اس بادل سے جو پانی برستا ہے [۳] خاطرِ سالک یعنی مرید کا دل۔ اس سیپ کی طرح ہے جس میں اس بارش کا پہلا قطرہ گرتا ہے۔ [۴] معرفتِ حق، وہ سچا موتی جو اس سیپ کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ یعنی مرشد کی توجہ اور رہنمائی اس بادل کی طرح ہے جس سے رازہائے معرفت کی بارش ہوتی ہے اور خاطرِ سالک اس سیپ کی طرح ہے جس میں یہ پانی جمع ہو جاتا ہے اور اس بارش کا نتیجہ، سچے موتی کی پیدائش سیپ میں ہے اور مرید کے دل میں توجہِ مرشد سے معرفتِ خداوندی کا ظہور ہو جاتا ہے۔

غیر آبے نیست گوہر، غیر ابرے نیست آب — غیر مرشد کے شود کس اہلِ راز و کامیاب

ترجمہ: بغیر پانی کے سچا موتی نہیں پیدا ہو سکتا اور بغیر بادل کے پانی نہیں برستا، پھر بغیر

مرشد کے کوئی معرفت کے رازوں کا جاننے والا اور راہِ طریقت میں کامیاب کیوں کر ہو سکتا ہے۔

تشریح: یہ شعر مذکورہ بالا شعر کی مزید سائنٹفک اور استدلالی تشریح ہے کہ جب تک مرشد کی توجہ کا بادل نہ برسے گا تو رازہائے معرفت کی بارش نہ ہوگی اور جب بارشِ نیساں ہی نہ ہوگی تو صدف یعنی مرید کا دل کیسے کھلے گا اور جب دل نہیں کھلے گا تو پھر سچے موتی کی پیدائش یعنی معرفتِ حق کیونکر حاصل ہوگی اور جب معرفتِ حق کا ادراک ہی نہ ہوگا تو کامیابی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس لئے سب سے پہلے کسی مرشد کے دامن سے منسلک ہو کر اس کی توجہ کا مرکز بنو اور پھر راہِ طریقت میں قدم رکھ کر رازہائے معرفت حاصل کر کے، حصولِ معرفت سے فیضیاب ہو کر کامران و کامیاب ہو جاؤ۔

بہ ز علمِ رازِ حق علمے نہ باشد در جہاں   بالیقیں فتراکِ مرشد گیر بہرِ نورِ جاں

ترجمہ: معرفتِ خداوندی کے علم سے بہتر کوئی علم کائنات میں نہیں۔ بس یقین کامل کے ساتھ مرشد کا فتراک (شکاربند) قلب کا نور حاصل کرنے کے لئے پکڑ لو۔

تشریح: فتراک کہتے ہیں اُس پٹے کو جو شکاری لوگ گھوڑے کی گردن اور پشت میں دونوں ٹانگوں کے درمیان باندھتے ہیں تاکہ شکار کر کے اس میں لٹکا کر لے آئیں۔

یہاں پر پہلے تو یہ بتلایا گیا کہ علوم تو بہت سے ہیں اور ان میں اچھے علوم قابلِ قدر ہیں لیکن معرفتِ خداوندی کا علم ایسا ارفع و اعلیٰ ہے جس کا کوئی مقابل ہی نہیں۔ اس لئے بس اسی کو حاصل کر لو اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ مرشد کے فتراک میں ایک شکار کی طرح بندھ جاؤ۔ وہ جہاں لے جانا چاہے چلے چلو۔ اس شعر کی معنویت حضرت امیر خسروؔ کے اس شعر میں ملاحظہ فرمایئے

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بامید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد

کہ جنگل کے تمام ہرن اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے اس انتظار میں ہیں کہ ہمارا شکاری کسی نہ کسی دن

شکار کے لئے آئے گا اور ہم کو شکار کر کے لے جائے گا۔ پس اُن جنگل کے ہرنوں کی طرح سالک راہ طریقت بن کر مرشد کے فتراک میں بندھ کر تن من دھن اس پر نثار کر دو۔ انشاء اللہ الرحمٰن منزلِ مقصود مل جائیگی۔

گر خدا را دوست داری پائے مرشد زود گیر　　　تا نماید وجہِ ذاتش بے مثال و بے نظیر

ترجمہ: اگر اللہ تعالیٰ سے دوستی کرنا چاہتے ہو تو فوراً مرشد کامل کے قدموں سے لپٹ جاؤ تاکہ وہ تم کو اس ذات لامثال اور بے نظیر کی تجلیات کا مشاہدہ کرا دے۔

تشریح: یہاں اللہ تعالیٰ کی دوستی کو متعلق بالمرشد کیا ہے اور دوسرے مصرعہ میں فنا فی الشیخ کا اشارہ بھی کیا گیا ہے اس لئے کہ یہ کہا ہے کہ مرشد اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ کرا دے گا اور یہ درجہ جب ہی حاصل ہوتا ہے جب فنا فی الشیخ کا مقام حاصل ہو جائے۔

تمام اولیاء کو ابتداء سے انتہا تک جو مقامات اور منازل طے کرنا ہوتے ہیں منجملہ اُن کے تین مقامات یہ ہیں ۱۔ فنا فی الشیخ ۲۔ فنا فی الرسول ۳۔ فنا فی اللہ۔ فنا فی الشیخ کا مطلب یہ ہے کہ مرید شریعت کے احکام کی بجا آوری میں مرشد کامل کے عمل کی مکمل طور پر پیروی کرے اور اپنے تمام ظاہری و باطنی احوال کو ذات مرشد کے فیضان کی طرف منسوب کرے اور راہ معرفت میں قدم رکھنے کے بعد اپنی تمام تر خواہشوں کو شیخ کامل کے حکم کے سامنے کالعدم کر دے، مرید جب اس مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ فنا فی الشیخ کے درجہ پر فائز ہو گیا۔ اسی درجہ میں اس کو تجلیات حق کا مشاہدہ بھی ہونے لگتا ہے۔

حق شناسی می شود حاصل ز پیر راز داں　　　ہر کرا ایں پیر نے، برباد باشد دین آں

ترجمہ: معرفت حق مرشد کامل، رازہائے معرفت جاننے والے کے ذریعہ ہی سے حاصل ہوتی ہے جس شخص کا مرشد کامل نہیں ہے اس کا دین برباد ہو گیا۔

تشریح: یہاں پر یہ بتانا مقصود ہے کہ مرشد کی ضرورت تو بیشک ہے مگر مرشد کامل ہونا چاہئے جو معرفت خداوندی سے واقف اور راہ طریقت کے پیچ و خم سے خبردار ہو۔ پہلے اچھی طرح چھان بین کر کے مرید ہونا چاہیئے کیونکہ اگر مرشد کامل نہ ہوگا تو پھر حق تعالیٰ تک رسائی نہیں

ہوسکتی اور جب یہ مقصودِ اصلی ہی حاصل نہ ہو سکا تو آخرت اور دین برباد ہو گیا۔ یہاں اس بات کو بھی ضرور دھیان میں رکھیئے کہ مصنّف نے دین کی بربادی کا اظہار فرمایا ہے۔ اس لئے مرید ہونے کے وقت دین اور آخرت کی فلاح و کامرانی اور معرفتِ حق تعالیٰ ہی پیشِ نظر ہونی چاہیئے۔ جس مرشد کے ذریعہ صرف دنیا اور اس کا مال و دولت ملے تو یہ عنداللہ مقبول نہیں ہے اور ایسا مرشد معرفتِ حق سے کورا ہے اور رازہائے طریقت سے بے بہرہ ہے پھر کسی دوسرے کی راہنمائی کیسے کر سکتا ہے۔ البتہ اگر دین کے ضمن میں دنیا بھی مل جائے تو کوئی حرج تو نہیں، پھر بھی اس کی طلب بالکل نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ یہ تو فانی ہے۔

حق شناسی فرضِ عینے بر ہمہ کس در نخست ز احتلام خود چو بالغ می شود پاک و درست

ترجمہ: سب سے پہلے معرفتِ حق ہر ایک آدمی پر فرضِ عین ہے جیسا کہ بالغ کو سب سے پہلے اپنی بدخوابی سے نہا دھو کر پاک و صاف ہونا ضروری ہے۔

تشریح: یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ پاکی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک ظاہری اور ایک باطنی، باطنی پاکی کو حاصل کرنے کی مثال ظاہری پاکی سے دی گئی ہے کہ جس طرح بالغ آدمی کو رات میں بدخوابی ہو جائے تو سب سے پہلے اس کو نہا دھو کر ظاہری پاکی حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد عبادات اور دیگر معاملات کو شروع کرنا چاہیئے۔ اسی طرح ہر آدمی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے معرفتِ حق حاصل کرنے کی توجہ کر کے قلب کو پاک و صاف کر لے جب اس کا قلب مصفّیٰ ہو جائے گا تو عبادت و ریاضت میں بھی کیف و سرور پیدا ہو گا۔ نیز یہاں پر اسکی اوّلیت اس لئے بیان کی گئی ہے کہ زندگی کا تو کچھ بھروسہ نہیں۔ نہیں معلوم کہ پھر موقع ملے یا نہ ملے اسلئے اوّلین فرصت میں ہی اپنے من کی صفائی میں مشغول ہو جانا چاہیئے اور اس کے حصول کے لئے کسی مرشد کے دامن سے منسلک ہو جانا چاہیئے۔

گر نہ باشد پیر کس راہست اورا دیو پیر می برد اندر ضلال و کفر و شر کس اے فقیر

ترجمہ: اگر کسی کا مرشد و رہنما کوئی نہیں ہے تو اس کا راہنما شیطان ہے جو اس شخص

کو گمراہی، کفر اور شر کی طرف رہنمائی کرے گا۔

تشریح: ظاہر بات ہے کہ مَنْ لَا شَیْخَ لَہٗ فَشَیْخُہُ الشَّیْطَانُ یعنی جس کا کوئی شیخ اور مرشد نہیں اس کا راہنما شیطان ہوتا ہے۔ راہِ معرفت اس قدر دشوار اور پیچیدہ ہے کہ اس میں قدم قدم پر مشکلات پیش آتی ہیں اور شیطانِ لعین جو انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے جو بڑے عجیب وغریب طریقوں سے سالک کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس مردود کی چالوں سے وہی باخبر ہوتا ہے جو اس وادی پُرخار میں صحرا نوردی کر چکا ہو اور اس دریائے شور کو عبور کر چکا ہو۔ اور مرشدِ کامل کی شان یہی ہوتی ہے کہ مرید کی لغزشوں پر اس کو تنبیہ کرتا ہے اور حق و باطل میں فرق بتلاتا ہوا آگے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

حدیث پاک ہے عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، یَأْتِی الشَّیْطَانُ اَحَدَکُمْ فَیَقُوْلُ مَنْ خَلَقَ کَذَا، مَنْ خَلَقَ کَذَا، حَتّٰی یَقُوْلُ، مَنْ خَلَقَ رَبَّکَ فَاِذَا بَلَغَہٗ فَلْیَسْتَعِذْ بِاللّٰہِ وَلْیَنْتَہِ۔ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ۔ ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان بعض کے پاس آتا ہے، اور کہتا ہے کہ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا اور فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا، یہاں تک کہ پھر کہتا ہے کہ تیرے رب کو کس نے پیدا کیا (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ) سو جب اس کی نوبت پہنچے تو وہ اللہ کی پناہ مانگے یعنی اَعُوْذُ بِاللّٰہِ پڑھ لے اور سوچنے سے باز رہے (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ)

غور فرمائیے کہ یہ مردود انسان کو کس کس طرح دھوکا دیتا ہے اور مغالطے میں مبتلا کر کے گمراہ کرتا ہے۔ اگر شیخ کامل ہو تو وہ اس طرح کے وساوس کا مناسب علاج کر کے رہنمائی کرے گا، اب جو شخص یہ سمجھ لے کہ مجھے کسی راہنما کی ضرورت نہیں تو بس اسی قدم اور اسی موڑ پر شیطان نے اس کے ذہن کو گمراہ کر دیا۔ آگے کیا ہوگا اس کا اندازہ ہر ذی ہوش لگا سکتا ہے۔ اس لئے میرے بھائی دیکھ بھال کر کسی مرشدِ کامل کے دامن کو پکڑ لو اور اس کے ذریعہ بحکم خداوندی راہِ معرفت پر گامزن ہو کر منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤ۔

دربیانِ ارادتِ مُریداں بحضرتِ پیر و مرشد

پیر و مرشد کے حضور میں مُریدوں کے خلوصِ قلب کا بیان

راست دانی ایں سخن از حکم قرآن و خبر　　عبدرحمٰن باز گوید شرحِ آں را می نگر

ترجمہ: قرآن پاک اور حدیث شریف کی روشنی میں اس بات پر یقین پختہ کر، عبدالرحمٰن پھر اسی بات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

تشریح: اس سے پہلے عنوان میں ضرورت و اہمیت مرشد کا ثبوت قرآن و حدیث، طریقۂ اسلاف اور عقلی و منطقی طور پر دیا گیا ہے۔ اور مرشد کامل کی تلاش اور اس سے کسبِ فیض کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہاں پر پھر مصنف اپنی اسی بات کو دہرا رہے ہیں لیکن اس میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ مرید کس طرح مرشد کے حضور میں حاضر ہو اور کس چیز کا نذرانہ پیش کرے۔

جستنِ ایں علم فرض آمد بہ ہر پیر و جواں　　از پدر استاد بہتر، گفت احمد بہرِ آں

ترجمہ: اس علم (علم طریقت) کا حاصل کرنا ہر جوان اور بوڑھے کے لئے فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ باپ سے استادِ کامل بہتر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ارشاد فرمایا ہے۔

تشریح: استاد کا درجہ باپ سے بہتر ہونے کے سلسلے میں یہاں مفہوم حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے، کیونکہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَةٍ یعنی علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔ یہاں پر علم کو مطلق استعمال کیا گیا ہے، یہ نہیں فرمایا گیا کہ فلاں چیز کا علم حاصل کرنا فرض ہے کوئی شرط یا قید نہیں لگائی گئی بلکہ صرف طَلَبُ الْعِلْمِ کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے اور یہ اصول ہے کہ اَلْمُطْلَقُ اِذَا اُطْلِقَ يُرَادُ بِهِ الْفَرْدُ الْكَامِلُ یعنی جب کسی چیز کو مطلق استعمال کیا جاتا ہے تو وہاں پر فردِ کامل مراد ہوتا ہے جیسے کسی جگہ بہت سے مولانا حضرات تشریف لا رہے ہوں تو اس وقت اگر کوئی کہے کہ دیکھو مولانا تشریف لا رہے ہیں تو ان سب میں جو سب سے اعلیٰ درجہ کی شخصیت والا ہو گا وہی مراد ہو گا۔

اب یہاں پر جب علم کو مطلق استعمال کیا گیا تو اس سے بھی سب سے اعلیٰ درجہ کا علم مراد ہے۔ اور وہ علمِ معرفت ہے اور جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ معرفت کا علم سب سے اعلیٰ ہے تو پھر اس علم کا سکھانے والا بھی سب سے اعلیٰ درجہ کا ہوا۔ اس لحاظ سے حدیث کا مفہوم اس بات کو ظاہر کر دیتا ہے کہ استادِ کامل اور مرشد کا درجہ باپ سے زیادہ بلند ہوا کیونکہ اس کے ذریعہ اس سب سے اعلیٰ اور پاک مقصد کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔

آدمی راقمی بود دو بار زادن در جہاں　　اوّلا از صلبِ والد پس ز قلبِ رازداں

ترجمہ: انسان اس دنیا میں دو مرتبہ جنم لیتا ہے، پہلے تو باپ کی پشت سے، اور پھر مرشدِ کامل کی توجہ سے۔

تشریح: یہ شعر پہلے شعر کی عقلی اور عملی تشریح ہے کہ دیکھو باپ کی پشت سے جو مادہ نکلتا ہے اس سے اسباب کے تحت اس دنیا میں نسل کی افزائش ہوتی ہے گویا اس جسمِ انسانی کا ظہور اس کائنات میں والد کے سبب سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ چلتا پھرتا انسان اگر اپنی معرفت اور اللہ کی معرفت سے بے بہرہ ہے اور یہ نہیں جانتا ہے کہ مجھے کس نے پیدا کیا؟ کیوں پیدا کیا؟ میری تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ تو پھر یہ ایک چلتی پھرتی لاش ہے۔ اس میں اور ایک جانور میں کوئی فرق نہیں جس طرح جانور کا مقصدِ حیات کھانا پینا، سونا اور آرام کرنا ہے اسی طرح اگر انسان میں یہ صفات ہیں تو پھر اس کا مقصدِ تخلیق گم ہو گیا، اس کی منزل دور ہو گئی، اس کا دل مردہ اور روح پژمردہ ہے۔ مرشدِ کامل بھی اس مردہ دل کو زندہ کرتا ہے اور اس کے دل میں تازگی اور فرحت کا نور بھر کر اس کو معرفتِ خداوندی کی راہ دکھاتا ہے۔ اب یہ اس کا دوسرا اور اصلی جنم ہوا کیونکہ مرشدِ کامل کے ذریعہ اس نے اپنے مقصدِ تخلیق کو سمجھ لیا اور معرفتِ نفس کی طرف متوجہ ہو کر معرفتِ خداوندی حاصل ہو گئی۔ اب آپ خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ جو صرف اس چلتی پھرتی لاش کے دنیائے وجود میں آنے کا سبب ہوا، وہ زیادہ مقتدر ہے یا وہ شخصیت جس نے اس کو معرفت کی راہ دکھا کر اس کو مقصدِ اصلی اور منزلِ حقیقی تک پہونچا دیا اور دائمی اور ابدی حیات میں کامراں و کامیاب کرا دیا۔

ازآبِ صلبی شہادتہائے ظاہر حاصل است　　　　درزآبِ قلبی مراتبہائے باطن واصل است

ترجمہ: نسبی باپ سے تو صرف ظاہری طور پر نظر آنے والی چیزیں حاصل ہوتی ہیں اور روحانی باپ سے باطن کے تمام مرتبوں تک پہنچنا وابستہ کر دیا گیا ہے۔

تشریح: یہ شعر بھی اپنے ماقبل کی مزید تشریح ہے۔ فرماتے ہیں کہ جس باپ سے نسبی وابستگی ہے اس سے جو فوائد پرورش، تعلیم و تربیت اور رہائش و طعام وغیرہ کا آرام و دیگر سہولیات میسر ہوتی ہیں وہ سب ظاہری فوائد ہیں جو دنیا تک ہی محدود ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے ذریعہ جو وجود جسمانی اولاد کو ملا ہے یہ بھی فانی ہے لیکن مرشد کامل سے روحانی فوائد کی وابستگی ہوتی ہے۔ وہ فوائد ابدی اور غیر فانی ہوتے ہیں۔ اس کا سلسلہ صرف ابدی فوائد تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ وہ تو ان لافانی فوائد کے پیدا کرنے والے تک اپنی اس روحانی اولاد کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پہنچا دیتا ہے۔

زیں ظہورِ معنوی گشتند اکثر مرد ماں　　　　اولیاء اللہ بلکہ انبیاء و مرسلاں

ترجمہ: اس معنوی پیدائش کے فیض اثر سے کتنے ہی انسان اولیاء اللہ بن گئے بلکہ نبی اور رسول کے مرتبہ سے سرفراز کئے گئے۔

تشریح: یہ اصولِ خداوندی ہے کہ تمام انسان ایک ہی طریقہ پر پیدا کئے گئے۔ اگرچہ قسامِ ازل نے روزِ ازل ہی میں مراتب و درجات کی تقسیم کر دی تھی لیکن دنیا میں تو یہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ پیدائش کی ایک مقررہ مدت کے بعد نشأۃِ ثانیہ (دوسری زندگی) ہوئی۔ جتنے اولیاء اللہ اور انبیاء و رسل ہوئے ہیں ان کی ولادت باسعادت مذکورہ اصولِ قدرت کے مطابق ہوئی لیکن ان کے درجات کی بلندی اور ابدی اور بامقصد زندگی کا آغاز ایک مدت کے بعد ہوا۔ تاریخ ان صالحین کے تذکرے سے بھری ہوئی ہے۔ اولیاء اللہ ہی نہیں بلکہ انبیاء اور رسولوں کے سلسلے میں بھی یہی ظہورِ معنوی جلوہ گر ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر تجلی ہوئی، شرفِ نبوت سے آپ کو سرافراز کیا گیا۔ گویا یہ ایک نئی زندگی کا آغاز تھا۔ سید الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی چالیس برس کے بعد شرفِ نبوت کا تمغہ عطا کیا گیا۔ اس طرح ایک نشأۃِ ثانیہ اور نئی زندگی کا ظہور ہوا۔ اگرچہ تخلیق پر

نظر کی جائے تو اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ کا اعزاز بھی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی ملا تھا۔ لیکن اس دنیا میں عمرِ مبارک کے چالیس برس گذرنے کے بعد ہی دوسری زندگی عطا کی گئی۔ اسی طرح سے مرشدِ کامل کے ذریعہ سے اس حیاتِ فانی میں دوسری زندگی ملتی ہے۔

بے ارادتہائے مرشد دیدِ حق باشد محال　　　بندگی کن پائے او را تا کہ بنماید کمال

ترجمہ: مرشد کامل سے وابستگی کے بغیر تجلیاتِ خداوندی کا مشاہدہ ناممکن ہے۔ اس کے قدموں سے لپٹ جا تاکہ وہ تجھ کو کمالاتِ الہٰیہ کا مشاہدہ کرا دے۔

تشریح: سب سے پہلے ایک بنیادی اصول سمجھ لیجئے۔ وہ یہ کہ مرشد کامل سے تعلق اور رابطہ صرف معرفتِ خداوندی کے لئے ہونا چاہیئے۔ کسی ظاہری منافع اور دنیاوی فوائد کے لالچ میں نہ ہونا چاہیئے۔ مرشد کامل سے جب تیرا خلوصِ قلب کے ساتھ معرفتِ خداوندی کے لئے رابطہ ہوگا تو اس مرشد کامل کی توجہ سے تیرا قلب آئینہ کی طرح صاف شفاف ہو جائے گا اور چونکہ مرشد اللہ و رسول کی محبت میں فنا ہوتا ہے جب بھی اس رابطہ کا استعمال کیا جائے گا تجلیاتِ خداوندی کا مشاہدہ حاصل ہو جائے گا۔ اس لئے کہ شیخ سے محبت دراصل خدا سے محبت ہے۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ یہی فرماتے ہیں کہ بس تن من دھن سب مرشد کے قدموں میں نچھاور کر دے پھر دیکھ کہ وہ کس طرح تیرے قلب میں تجلیاتِ الہٰیہ کا عکس منعکس کرتا ہے۔

بہتر از چہل سالہ طاعت خدمت یک روزِ پیر　　　واصلانِ حق بگفتند ایں سخن را یاد گیر

ترجمہ: چالیس سال کی عبادت سے مرشد کی ایک دن کی خدمت زیادہ اچھی ہے، خدارسیدہ بزرگوں نے یہ بات کہی ہے اس بات کو یاد رکھ۔

تشریح: الفاظ کے ظاہری معنیٰ سے جو بات عیاں ہوتی ہے اس کے اعتبار سے یہ بات خلافِ عقل معلوم ہوتی ہے کہ چالیس برس کی عبادت ایک طرف اور مرشد کی ایک دن کی خدمت ایک طرف، اور صرف تقابل ہی نہیں بلکہ مصنف نے چالیس سالہ عبادت و ریاضت سے، خدمتِ یک روزِ مرشد کو بہتر بتلایا ہے، حالانکہ حقیقت وہی ہے جو مصنف فرما رہے ہیں، کیوں کہ یہاں

معاملہ "راہ معرفت" کا ہے۔ اور یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ راہ کس قدر پُر پیچ اور دشوار ترین ہے اور مقصود راہِ معرفت سے ذاتِ پاک ہے۔ اس کو اسطرح سمجھئے کہ کوئی شخص چالیس برس ہی نہیں عمر بھر عبادت کرتا رہے لیکن اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ان تمام مقامات سے گذر کر مقامِ بقاء تک پہنچ جائے۔ ادائیگیٔ فرائض تو حکمِ خداوندی ہے۔ اس کی حیثیت صرف ایک وفادار خادم کی سی ہے عاشق کی سی نہیں۔ شعلۂ عشق تو جب ہی بھڑکتا ہے جب مرشد کے دامن سے وابستگی ہو، جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہ لذّت جو عمر بھر کی عبادت و ریاضت میں نہ ملی ایک لمحہ میں میسّر ہو جاتی ہے۔

حقیقتِ مسئلہ اور آسان انداز میں سمجھانے کے لئے ایک معمولی سی مثال پیش کرتا ہوں کہ لکھنؤ میں ایک آثارِ قدیمہ کی عمارت ہے جس کا نام بھول بھلیاں ہے، یہ عمارت کئی منزل پیچ در پیچ راستوں سے بنائی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص اس میں داخل ہو جائے تو سارے دن چکر ہی لگاتا رہے اور باہر نکلنا نصیب نہ ہو لیکن اس عمارت کا گائیڈ اس کو ایک لمحہ میں باہر نکال سکتا ہے اس لئے کہ وہ اس راستہ کے نشیب و فراز سے واقف ہے۔ اسی طرح مرشد کامل بھی راہ معرفت کی بھول بھلیاں کا گائیڈ ہے کہ جو مرید کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ایک ہی نظر میں کہاں سے کہاں پہونچا دیتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آدمی جب بغیر کسی راہنما کے عبادت کرتا ہے تو ہو سکتا ہے اس کے دل میں یہ بات پیدا ہو جائے کہ میں بڑا عابد و زاہد ہوں اور شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہے اس کے ذہن میں تکبّر اور بڑائی پیدا کر دے۔ تو پھر اس کا خدا ہی حافظ، لیکن جب اس نے اپنے وجود کو مرشد کامل کی خدمت میں سپرد کر دیا تو گویا اس نے اطاعت و فرماں برداری کی پہلی منزل طے کر لی، کیونکہ سپردگیٔ مرشد حقیقت میں سپردگیٔ خدا ہے۔ پھر مرشد اس امانت کو مالکِ حقیقی کے سپرد کر کے راہِ معرفت پر گامزن کرا دے گا اور جو مقصودِ عبادت ہے مل جائے گا۔

مثلِ ایں راز جلال الدین رومی پند گیر　　چوں حضور پیر شمس الدیں بیاد گشت پیر

ترجمہ: اس کی مثال کے لئے حضرت جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ سے نصیحت اختیار کر

کہ جب وہ حضرت شمس الدین تبریزؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خود بھی پیر ہو گئے۔

تشریح : اس واقعہ کی پوری تفصیل تو مثنوی شریف کے مقدمہ میں ملاحظہ فرمائیں یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ مصنف کے پہلے شعر کی یہ تشریح اور تائید ہے کہ حضرت جلال الدین رومیؒ نے اپنی عمرِ مبارک کا بیشتر حصہ علم ظاہری کی تحصیل میں صرف کیا اور اپنے وقت کے علامہ ہو گئے، لیکن اس کے باوجود قلب کی آنکھیں روشن نہ ہو سکیں جس سے معرفتِ حق حاصل ہوتی لیکن جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت شمس تبریزؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا سب کچھ قربان کر کے خود کو ان کے سپرد کر دیا تو ایک ہی نظر میں آپ بھی مرشد کامل ہو گئے۔

ہست ناممکن مریدے را بغیر از پیرِ خویش　　　کو بہ بیند قبلِ فتحِ چشمِ باطن نور پیش

ترجمہ : کسی بھی ارادہ کرنے والے کے لئے بغیر مرشد کے یہ ناممکن ہے کہ وہ چشمِ باطن کے کھلنے سے پہلے اپنے سامنے کے نور کو بھی دیکھ سکے۔

تشریح : قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ہم تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ تم سے قریب ہیں) لیکن آج تک کسی انسان نے اس قربت کا احساس کیا ہے؟ کیونکہ ظاہری آنکھ سے نہ تو اس کو دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ظاہری حواس سے اس کا احساس کیا جا سکتا ہے۔ اس صورتِ حال میں اگر کوئی یہ کہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کس طرح اللہ تعالیٰ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے تو اس کا جواب یہی ہے کہ اس کو دیکھنے کے لئے ظاہری آنکھیں بند کرو اور باطن کی آنکھیں کھولو۔ جب تک باطن کی آنکھیں نہیں کھلیں گی تو تم کو اس کا نور جو تمہارے آس پاس ہے کبھی محسوس تک نہ ہو سکے گا اور چشمِ باطن جب ہی کھلے گی جب کسی مرشد کو اپنا دل دماغ، خیالات اور اپنا سب کچھ نذر کر دو۔ پھر وہ رحمتِ خداوندی سے ان تجلیاتِ الٰہیہ کا مشاہدہ کرا دے گا جن کا تم کو شعور و احساس بھی نہیں تھا۔

بلکہ بروے ہست واجب سر نہد بر حکمِ پیر　　　تا بگردد زیں سعادت دیگرے را دستگیر

ترجمہ : بلکہ مرید کے لئے ضروری ہے کہ وہ مرشد کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرے تاکہ وہ اس سعادت

کے ذریعہ دوسروں کا بھی دستگیر بن جائے۔

تشریح: مرشد کی اطاعت وفرماں برداری دراصل اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرماں برداری ہے اور مرید اپنے مرشد کی مکمل اطاعت کرے گا تو پھر مرشد بھی راہِ معرفت کے تمام رازوں سے اس کو آگاہ کر کے درجہ مرشد تک پہونچادے گا اور اللہ کی رحمت سے وہ اس قابل ہو جائے گا کہ دوسروں کو بھی اس سے فائدہ پہنچا سکے۔

پیر در قومے بیاید چوں نبی در اُمتے
یک سخن از پیر رد کردن بود صد زحمتے

ترجمہ: پیر ومرشد کی حیثیت کسی قوم کے لئے ایسی ہے جیسے کسی اُمت کا کوئی نبی ہو، مرشد کی ایک بات کے خلاف بھی کرنا سینکڑوں مصیبتوں میں ڈال سکتا ہے۔

تشریح: اَلشَّیْخُ فِی قَوْمِہٖ کَالنَّبِیِّ فِی اُمَّتِہٖ یہ بہت عمدہ کسی کا قول ہے جو حقیقت سے بہت قریب ہے اور عقل سے بھی بہت قریب تر ہے۔ غالباً اس کا ماخذ یہ حدیث پاک ہے اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ یا عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ۔ کیوں کہ یہاں علم مطلق کا استعمال ہوا ہے اس لئے جو سب سے اعلیٰ اور عمدہ علم ہوگا وہی مراد ہے وہ علم ہے معرفت کا اور جب مرشد کامل علم معرفت سے لبریز ہوتا ہے تو پھر وہی سب سے بہتر عالم قرار پایا۔ اب وراثتِ انبیاء یا بنی اسرائیل کے سے نبی کا استحقاق اس سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے اور پھر جو کام انبیاء علیہم السلام انجام دیتے ہیں توحیدِ خالص کا پیغام وہی کام مرشد بھی انجام دیتا ہے کہ وہ تمام رشتے ناتے چھڑا کر اللہ تعالیٰ سے رابطہ پیدا کرا دیتا ہے۔ جس طرح نبی کی بات کے خلاف کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے اسی طرح مرشد جو کہ نائبِ رسول ہے، اس کی بات کے خلاف کرنا اپنے آپ کو مصائب میں مبتلا کرنا ہے

از خیال کج نباید شد خلاف قول پیر
راہ جوید تا نگردد دام شیطاں را اسیر

ترجمہ: اپنی کج فہمی کی بنا پر مرشد کے فرمان کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ شیطان مردود کے جال میں پھنس جاؤ۔

تشریح: یہاں پر بھی ماقبل کی تشریح فرما رہے ہیں کہ مرشد کی اگر کوئی بات یا کوئی حکم تم کو خلافِ

عقل نظر آئے تو اس کو فوراً غلط مت سمجھو بلکہ اپنی عقل و فہم کا قصور سمجھو کہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی، ہماری عقل اس بات کی تہہ تک پہونچنے سے قاصر ہے اور اس حکم کی حقیقت دریافت کرنے سے عاجز ہے کیونکہ بعض مرتبہ مرشد کسی ایسے کام کا حکم فرماتا ہے کہ خلافِ عقل نظر آتا ہے لیکن اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے جس کو ہماری ظاہر بیں نظر دیکھ نہیں پاتی۔ ایسی صورت میں اس بات کی تردید یا حکم بجا لانے میں ٹال مٹول نہیں کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ شیطان ہر آدمی کو اسی کے راستے کے ذریعہ بہکاتا ہے۔ عالم کو علم کے ذریعہ، زاہد کو عبادت کے ذریعہ، جاہل کو جہالت کے ذریعہ، طاقتور کو طاقت کے ذریعہ کہ وہ علم کا غلط استعمال کرے اور زاہد عبادت میں ریا وغیرہ کا ارتکاب کرے اور جاہل اپنی جہالت سے شرک اور گناہ میں پھنس جائے، اور طاقتور اپنی طاقت کا مظاہرہ غلط طور پر کرے۔ لیکن مرشدِ کامل تو ان تمام گھاٹیوں سے واقف ہوتا ہے۔ وہ روحانی حکیم ہوتا ہے۔ روح میں جو امراض ہوتے ہیں انہی کے مطابق وہ علاج کرتا ہے اور کبھی کبھی یہ طریقہ علاج ظاہری اسباب کے خلاف ہوتا ہے اس لئے مرید اپنی کم علمی اور نا سمجھی کی وجہ سے اس خیالِ خام میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ کام نہیں کرنا چاہیئے۔ جب ایسا کرے گا تو مرشد اور مرید کے درمیان خلیج پیدا ہو جائے گی اور مرشد کی توجہ باطنی اس کی طرف کم ہو جائے گی اور پھر شیطان جو گھات میں لگا بیٹھا ہے اپنی کارروائی کر کے اس مرید کو اپنے جال میں پھنسا کر منزلِ مقصود سے دور پھینک دے گا۔ لہذا مرید کی طبیعت تو یہ ہونی چاہیئے ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید

کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسمِ منزلہا

گر کسے مرپیر خود را باز گوید ایں چرا است　　　رستگاری گہ نیابد گرچہ باشد اہلِ راست

ترجمہ: اگر مرشد کے حکم پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ ایسا کیوں؟ پھر بھی اپنے نقصان سے بچ نہیں سکتا اگرچہ ظاہر کے اعتبار سے یہ اعتراض کرنا درست معلوم ہوتا ہو۔

تشریح: اصول ہے کہ معلّم کی درسگاہ میں اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس وقت خاموش

رہنا بہت بڑی بے وقوفی ہے بلکہ استاد سے ایک بار نہیں دوبار معلوم کرنا چاہیئے اور بارگاہِ مرشد میں اگر کوئی بات اپنی سمجھ سے بالاتر ہے اور اپنی عقل میں نہیں آتی ہے تو اس پر لب کشائی کرنا جرم ہے کیونکہ معلّم اور استاد کی نظر آغاز پر ہوتی ہے اور مرشد کی نظر انجام پر ہوتی ہے' استاد کی نظر ظاہر پر ہوتی ہے اور مرشد کی نظر حقیقت پر ہوتی ہے اس لئے جب تم حقیقت سے بے خبر ہو انجام سے ناواقف ہو تو پھر اعتراض بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر ایسا کیا گیا تو اگرچہ تم کتنے ہی طالب صادق کیوں نہ ہو مگر اس بے ادبی اور عدول حکمی کی وجہ سے نقصان ضرور ہوگا۔

گر بگوید پیر شب را روز و طالب شک نہ دید   راست ایں تمثیل از پیراست ایمانِ مرید

ترجمہ: اگر مرشد رات کو دن کہے اور طالب و مرید نے شک نہیں کیا تو پھر یہ مثال سچ ہے کہ پیر و مرشد کے ایمان کا پرتو ہی مرید کا ایمان ہے۔

تشریح: یہاں پر بھی مرشد کے حکم کی تابعداری بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مرشد اگر رات کے وقت کہے کہ دن ہے تو بلاچون وچرا اپنی عقل کی ٹانگ اڑائے بغیر مان لینا چاہیئے۔ کیونکہ مرشد کی نظر کی وسعت، مرید کی نظر کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ ہوسکتا ہے وہ اس مقام کا مشاہدہ کر رہا ہو جہاں اس وقت سورج نکلا ہوا ہو اور دن موجود ہو، اس لئے اس کا کہنا کہ اس وقت دن ہے غلط نہ ہوگا اور مرید چونکہ محدود نظر رکھتا ہے اور حجاباتِ قلب کی وجہ سے دیوار کے اس پار کی چیز بھی نہیں دیکھ پاتا چہ جائیکہ رات کے وقت میں دن کا نظارہ۔ اس لئے اس کو مرشد کی اس بات کی تردید نہیں کرنی چاہیئے بلکہ بغیر کسی تردّد کے مرشد کی بات پر سرِ تسلیم خم کرلینا چاہیئے۔ اس قسم کے واقعات جو از قبیل کرامات ہیں بزرگوں اور خدا رسیدہ حضرات کے تذکروں میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ایسی نظر عنایت کردیتا ہے جو ہماری نظروں سے ہزاروں لاکھوں درجہ زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ اس لئے ہم اپنی عقل اور اپنی نظر پر قیاس کر کے مرشد کی بات کی تردید کریں گے تو یہ ہمارے لئے باعث خسران ہی ہوگا۔ لہٰذا جب کسی کو مرشد بنالیا تو پھر اس کی ہر بات کی دل سے تصدیق کرنی ضروری ہے۔ ورنہ فیضیاب ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

یا کند امرے خلافِ شرع سرتاپا خطا　　سر بنہ و تسلیم کن آں کار بے چون و چرا

ترجمہ: اگر مرشد کسی ایسے امر کا حکم کرے جو ظاہری اعتبار سے سراسر خلافِ شرع ہو، تو اس پر بھی سر جھکا لے اور بے چون و چرا اس کو مان لے۔

تشریح: یعنی مرشد کامل کی اتباع ہر حال میں ضروری ہے اور ظاہر بات ہے کہ جو مرشد خدا رسیدہ اور کامل ہوگا وہ کیوں خلافِ شرع حکم کرے گا۔ کسی کی کیا مجال کہ شریعتِ خداوندی کے خلاف کوئی امر کرے۔ البتہ اگر کبھی ایسا کوئی حکم کرے تو اس کی کوئی وجہ ایسی ضرور ہوگی جس کی مصلحت سے ظاہر بیں ناواقف ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کے حکم کی تعمیل میں کیوں اور کس لئے نہ کہو بلکہ جیسا وہ کہے کرو۔ اس کی مثال حضرت خواجۂ خواجگان سلطان غریب نواز معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے اس واقعہ سے دی جاسکتی ہے کہ کوئی صاحب آپ کی خدمت اقدس میں بغرض بیعت حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ کلمۂ طیبہ کس طرح پڑھتے ہو؟ اس نے کہا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ آپ نے فرمایا کہ اس طرح پڑھو۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ چشتی رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ اس شخص نے تعمیلِ ارشاد کرتے ہوئے اسی طرح پڑھا۔ آپ نے اس کو مرید کرلیا اور فرمایا کہ میرا مقصد صرف یہ دیکھنا تھا کہ تم بات کو مانتے ہو یا نہیں۔ سو اب میں تمہاری طرف سے مطمئن ہوں اور آئندہ اپنے معمول کے مطابق یعنی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہی پڑھا کرو۔

اس واقعہ کی ظاہری صورت تو سراسر خلافِ شرع تھی لیکن حضرتِ خواجہ کا مقصد جو تھا وہ ظاہری اور سطحی نظر رکھنے والوں سے پوشیدہ تھا۔ یہاں تو صرف اتباع کا امتحان لینا تھا اس لئے شروع ہی میں اتنا سخت امتحان لے لیا اور جب وہ اس میں کامیاب ہوگیا تو اس کو مرید کرکے وہ حجاب بھی دور کردیا۔

ار چہ باشد در نماز و یا کہ باشد روزہ دار　　چوں بخواند پیر آید، در گذارد جملہ کار

ترجمہ: مرید خواہ نماز میں مصروف ہو یا روزہ رکھے ہوئے ہو لیکن مرشد جب اس کو حکم دے تو سب کچھ چھوڑ کر حاضرِ خدمت ہوجائے۔

تشریح: یہاں پر بھی مزید تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ روزہ اور نماز جو شرعی فرائض ہیں اور اللہ کے لیے ہوتے ہیں، اگر ان حالتوں میں بھی مرشد اپنے مرید کو بلائے تو ان کو موقوف کر کے فوراً حاضر ہو جانا چاہیے اس لیے کہ نماز کی ادائیگی اداءً و قضاءً دونوں طرح ہو سکتی ہے اور اسی طرح روزہ کا کفارہ بھی ادا کیا جا سکتا ہے لیکن مرشدِ کامل جب بلائے گا تو اس میں ضرور کوئی ایسی مصلحت پوشیدہ ہوگی جو ظاہری نظروں سے اوجھل ہوگی جس طرح حکیم کامل اپنے کسی مریض کو روزے کے موقوف کرنے کا حکم کرے تو اس کی مصلحت وہ جانتا ہے اور مرشد تو روحانی حکیم ہوتا ہے جو اس کی مصلحت سے واقفیت رکھتا ہے اس لیے اس کی ہر بات پر سر جھکانا ضروری ہے۔

فتح رازِ حق بود دل را بقدرِ اعتقاد　　ز اعتقادِ سست یا رب ہیچ بابِ دل مباد

ترجمہ: اعتقاد کے مطابق ہی معرفتِ خداوندی کے راز دل پر آشکار ہوتے ہیں، اے ہمارے رب! کمزور اعتقاد کی وجہ سے ہمارے دل کے دروازے بند نہ کیجیو۔

تشریح: یعنی جس کا جس قدر اعتقاد پختہ ہوگا اسی قدر اس کو مرشد سے قربتِ روحانی حاصل ہوگی اور مرشد کی توجہات بھی اسی قدر زیادہ ہوں گی۔ اسی کے مطابق اس کو فیض حاصل ہوگا اور اسی کے حساب سے اس پر رحمتِ باری کا نزول ہوگا اور جس کا اعتقاد صحیح نہ ہوگا تو سب کام اس کے فضول اور بیکار ہوں گے اور فیض یابی سے محروم ہوگا۔ جب آنکھیں ہی روشن نہ ہوں گی تو ہزار سورج طلوع ہوں اندھیرا دور نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جب تک دل کی آنکھیں روشن نہ ہوں تو مرشد سے اعتقادِ کامل نہ ہوگا اور جب مرشد پر اعتقاد کامل نہ ہوگا تو اس سے اکتسابِ فیض نہیں ہو سکتا خواہ مرشد اپنی جگہ کتنا ہی کامل کیوں نہ ہو۔ یہاں پر دراصل مصنفؒ ایک بہت بڑے مغالطے کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں، عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ کسی بزرگ کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ اس کے ظاہری اعمال کو دیکھ کر دل میں تو ناگواری کا تاثر پیدا ہو گیا لیکن اس سے اپنی حاجت برآری کے لیے امید لگائے ہوئے ہیں۔ نہ اس کو جانچا پرکھا اور نہ صحبت اختیار کی بلکہ کوئی مقصد دل میں پوشیدہ ہے اور معیار یہ بنا لیا گیا کہ اگر یہ مقصد پورا ہو جائے تو یہ کامل ہے ورنہ نہیں۔ اسی

طرح کے دیگر وساوس دل میں آتے رہے جس سے اعتقاد کی بنیاد کمزور اور متزلزل ہو جائے تو پھر کس طرح سے مرشد سے فیض حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جب کسی راہنما کی راہ نمائی پر قلب مطمئن نہ ہو تو پھر کیونکر منزلِ مقصود تک رسائی ہو سکتی ہے۔ اس لئے پہلے خوش اعتقادی اور پھر صحبت نشینی اختیار کرو۔ اس کے رنگ میں خود کو رنگ لو۔ پھر ان شاء اللہ تعالیٰ ذاتِ مرشد سے بحکم خداوندی فیض دارین حاصل ہو جائے گا۔ اے اللہ! ہم سب کو اعتقادِ کامل اور یقینِ محکم عطا فرما اور ہمارے دلوں کو بداعتقادی کے سبب بند نہ کر۔ آمین

راست باید بود طالب را غلام پیر خویش ہمچو اصحاب رضؓ پیمبر کاں ہمی بودند پیش

ترجمہ: طالب معرفت کو اپنے مرشد کا سچا غلام ہونا چاہیئے جس طرح کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں پیش پیش رہتے تھے۔

تشریح: یہاں پر اخلاص نسبت کی وضاحت کرتے ہوئے اس طرف اشارہ ہے کہ مرشد کے دامن سے منسلک ہونے میں اس وقت ہی فائدہ ہوگا جب نیت میں خلوص اور اطاعت شعاری کا جذبہ بھرپور ہو جس طرح کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین آپ کے حکم کو قلبِ صمیم کے ساتھ تسلیم کرتے تھے اور ہر ایک معاملہ میں للٰہیت اور خلوص کا جذبہ بھرپور رکھتے تھے۔ ان کے کسی کام میں ریاکاری اور تصنع کو کوئی دخل نہ تھا۔ ان کا یہ یقین کامل تھا کہ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہی حق ہے اور آپ کے ارشادِ پاک کی حقانیت کو وہ اس طرح قلب و دماغ میں اتار لیتے تھے کہ کوئی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہتی تھی۔ اسی اطاعت شعاری اور خلوص و وفاداری کی وجہ سے راہِ معرفت کے دروازے ان کے لئے کھل گئے تھے۔ مرشد کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کیونکہ کسی کو مرشد اسی لئے بنایا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ راہ طریقت پر چل کر معرفت خداوندی حاصل کی جائے۔ اس لئے خلوص و للٰہیت کا جذبہ بھی مکمل طور پر ہونا چاہیئے تاکہ معرفت کا دروازہ مرید پر کھل جائے۔ اسی کا نام اخلاص نسبت ہے۔

دراصل یہ ایک بہت بڑی کمزوری کی نشاندہی کی گئی ہے جس کا احساس بہت کم لوگوں کو ہوتا

ہے اور وہ ہے تصنع اور ریا کاری۔ یعنی مرشد کے حکم کو دل سے ماننے کے لئے تیار نہیں اور نہ اس پر قلب کی گہرائی اور خلوص کے ساتھ عمل پیرا ہونے کو دل آمادہ ہے بلکہ ظاہر داری کے لئے حکم مرشد کی تعمیل کی جاتی ہے تو اس صورت میں مرشد سے فیوض و برکات کا حقیقی دروازہ نہیں کھلتا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تو دلوں کے بھید کو جانتا ہے، وہاں اگر خلوص نہ ہوگا تو کسی عبادت و ریاضت کی کوئی قدر و منزلت نہیں، چہ جائیکہ حصولِ معرفت۔ لہٰذا اس مرض کی بیخ و بن کو بالکل اکھاڑ پھینکنا چاہئے اللہ تعالیٰ ہم سب کو خلوص اور للٰہیت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ور نشستن نیم ساعت پیشِ پیراں با ادب　　تو بدانی بہتر از یکسال طاعت بہر رب

ترجمہ: مرشد پاک کی خدمت میں تھوڑی دیر ادب سے بیٹھنا عبادتِ الٰہی کے ایک سال سے بہتر سمجھو۔

تشریح: یہاں پر بھی اس سے قبل کے شعر کی مزید تاکید اور تمثیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دیکھو مرشد کی خدمت میں خلوص و للٰہیت کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھنے سے راہ معرفت کی وہ منازل طے ہو جاتی ہیں جو بغیر خلوص کی ایک سال کی عبادتِ الٰہی سے بھی طے نہیں ہوتیں۔ کیوں کہ جب تک خلوص دل کے ساتھ عبادتِ رب نہ کی جائے تو پھر اس میں کیفیت نہیں پیدا ہوگی۔ اگرچہ فرائض کی ادائیگی تو ہو جائے گی اور اس کا اجر بھی اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا لیکن قربتِ ذات اور حصولِ معرفت کا جہاں تک تعلق ہے وہ تب ہی حاصل ہوگا جب اخلاص نسبت پیدا ہوگا۔ اور مرشد چونکہ روحانی حکیم ہے وہ اس مرض پر مرید کو تنبیہ کرے گا اور صحیح راہ کی طرف راہ نمائی کرے گا۔ لیجئے تھوڑی ہی دیر میں خلوص نیت اور نسبت اخلاص کی حقیقت مرید کو معلوم ہو گئی جس سے راہ معرفت اس کے لئے آسان ہو گئی یعنی وہ کیفیت جو صرف ادائیگیٔ فرائض سے ایک سال میں مرید کو حاصل نہ ہوئی وہ مرشد کی خدمت میں تھوڑی سی دیر کی حاضری سے حاصل ہو گئی

یہاں پر ایک بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہاں مقابلہ عبادت اور عدم عبادت کا نہیں ہے اور نہ عبادت کی اہمیت سے انکار ہے بلکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ اخلاص نسبت

پیدا کرنا ضروری ہے اور یہ مرشد کی خدمت میں رہ کر اور اپنے روحانی عیوب پر آگاہی ہونے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ صرف مرشد کی خدمت میں حاضری ہو جائے اور عبادت و فرائض سے لاپرواہی برتی جائے۔

نامِ مرشد گہہ نباید خواند ہمچو عاصیاں
سبقتے درراہ ورزو یانشستن عیب داں

ترجمہ: مرشد کا اسم گرامی عام لوگوں کے نام کی طرح نہیں لینا چاہیئے۔ راستہ چلنے میں آگے بڑھنا یا بیٹھنے میں پہل کرنا بھی عیب سمجھنا چاہیئے۔

تشریح: یہاں پر احترام مرشد کا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ذاتِ مرشد، وراثتِ انبیاء کی مسند پر متمکن ہوتی ہے۔ جس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب و احترام کے سلسلے میں قرآنِ پاک میں صحابہ کرامؓ کو حکم ہوا ہے اسی طرح آپ کے نائبین کا احترام بھی ضروری ہے اور اس احترام کا اقرار دل سے ہونا چاہیئے اور اظہار اس طرح ہونا چاہیئے کہ مرشد کا اسم گرامی بھی احترام کے ساتھ لیا جائے اور چلنے میں مرشد کے آگے نہیں بلکہ پیچھے باادب چلنا چاہیئے اور جب مرشد اپنے مقام پر بیٹھ جائے تو بعد میں بیٹھنا چاہیئے۔ اس طرح کے آداب کی ادائیگی سے اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہو جاتا ہے اور بے ادب اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم ہوتا ہے۔ مثال مشہور ہے، باادب بانصیب، بے ادب بے نصیب۔

برندارد صوتِ خود را فوق بر آوازِ او
در کلام حق تعالیٰ می نگر لَا تَرْفَعُوْا

ترجمہ: مرشد کی آواز پر اپنی آواز کو بلند نہیں کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام پاک میں دیکھو فرمایا گیا ہے لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ۔

تشریح: یہاں پر بھی آداب مرشد کا ذکر مقصود ہے کہ مرشد کے روبرو بلند آواز سے یا مرشد کی آواز سے زیادہ آواز سے گفتگو نہ کی جائے جس طرح کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو قرآنِ پاک میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ مجلس نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں بلند آواز سے گفتگو نہ کریں اور اپنی آواز کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند نہ کریں۔ اسی طرح

وارثینِ انبیاء کے بارے میں ہدایت ہے۔

یہاں پر مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے آدابِ مرشد کا آخری نکتہ بتلا دیا ہے۔ پہلا درجہ تو قلب سے ادائیگی آداب کا تھا کہ اعتقادِ صادق اور اخلاصِ نسبت ضروری ہے۔ دوسرا درجہ عملی تھا کہ راستہ چلنے میں مرشد کے پیچھے رہنا چاہیئے اور بیٹھنے میں سبقت نہیں کرنی چاہیئے اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ مرشد کا اسم گرامی عام لوگوں کی طرح نہ لینا چاہیئے یہاں تک کہ مرشد کے روبرو بلند آواز میں گفتگو کرنا بھی خلافِ ادب ہے۔

پیر باشد طالبے را کام جانی بالیقیں — عبدِ رحماں عبدِ لطف اللہ قطب العالمیں

ترجمہ: یقیناً مرشد، مرید کی جان و روح کی منزلِ مقصود ہوتا ہے۔ عبدِ رحمان، حضرت لطف اللہ قدس اللہ سرہ العزیز قطبِ عالم کا غلام ہے۔

تشریح: اس کتاب کے مصنف حضرت عبدالرحمٰن فتح آبادی رحمۃ اللہ علیہ جو قطبِ عالم حضرت لطف اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمرۂ خصوصی میں ہیں فرماتے ہیں کہ جس طرح انسان کو اپنی جان کی حفاظت کے لئے احتیاط، تدبیر اور پرہیز کرنا پڑتا ہے اور حفاظتِ زندگانی کا نام آدابِ زندگانی ہے۔ اسی طرح وہ ذاتِ گرامی جو روح اور جسم کی رفعت کا سبب ہوتی ہے اس کے آداب کا تو اور بھی زیادہ خیال رکھنا ضروری ہے۔ جس قدر اس میں اہتمام کیا جائے گا مقصدِ حیات اتنا ہی اعلیٰ وارفع حاصل ہوگا۔

شرطِ پیرے بر مریداں بے حد و بے انتہاست — از ہزاراں یک نگفتم نزدِ دانا رہ صفاست

ترجمہ: مریدوں کے لئے مرشد کے آداب تو بہت زیادہ اور بے شمار ہیں۔ میں نے ہزاروں میں سے ایک بھی بیان نہیں کیا کیونکہ عقلمند انسان کے لئے یہ راہ بالکل سیدھی سادی ہے۔

تشریح: مرشد کامل کی حضوری میں تو ہر لحہ ادب واحترام کے ساتھ رہنا چاہیئے۔ ان تمام شرائط کو دائرۂ تحریر میں لانا بہت دشوار ہے۔ بس اس کی حقیقت کو وہی دانائے راز سمجھ سکتے ہیں، جو اس راہ کے آداب سے واقف ہیں۔ میں نے اتنا کچھ صرف اشارۃً وکنایۃً لکھ دیا ہے لیکن اتنا کچھ

لکھنے پر بھی گویا ایک ہزار میں سے صرف ایک حصہ کا حق ادا نہ ہو سکا۔ بس جو مرید اعتقاداً، عملاً و قولاً مرشدِ کامل کا جسقدر زیادہ احترام کرے گا اسی قدر اس کے درجات میں ترقی ہوگی۔

زیں جہت من قصر کردم راستؔ دانی اے پسر　　　آمدم بہر بیانِ رازِ باری، می نگر

ترجمہ: اے بیٹے! تو سچ مان اسی طوالت کی وجہ سے میں نے آدابِ مرشد کے بیان کو مختصر کر دیا ہے اور دیکھ اب رازہائے باری تعالیٰ کے بیان کا آغاز کر رہا ہوں۔

تشریح: ذاتِ مرشد اور اس کی ذات سے ارادت و عقیدت اور اس کی ذات کا اعتقاداً و عملاً و قولاً احترام یہ سب ذریعہ معرفتِ حق ہے۔ اصل مقصود تو ذاتِ حق ہے۔ اس لئے کچھ بنیادی اصول بتلا کر اصل منزل کی طرف رجعت فرما رہے ہیں۔

در بیانِ رازِ حق تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کی معرفت کے راز کا بیان!

رازِ آں باری تعالیٰ از ازل بشنو یقیں　　　گنجِ مخفی بود اوّل ذاتِ ربّ العالمیں

ترجمہ: ازل میں اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے کا راز یقینِ قلب کے ساتھ سنو۔ سب سے پہلے تمام جہانوں کے پالنے والے کی ذات ایک چھپا ہوا خزانہ تھی۔

تشریح: ضرورتِ مرشد اور آدابِ مرشد بیان کرنے کے بعد مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس ذاتِ پاک کی معرفت اور پہچان کے راز کی طرف متوجہ ہیں جو ذاتِ پاک اصل مقصود ہے اور جس کی معرفت کی طرف رہنمائی کے لئے مرشد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اپنے مقصد کی وضاحت کے لئے مصنف گنجِ مخفی سے ایک حدیثِ قدسی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہ کُنْتُ[1] کَنْزًا مَخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ۔ یعنی میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا پھر میں نے یہ

---

[1] اس میں محدثین نے کلام کیا ہے لیکن جب ہم قرآن پاک کی یہ آیت دیکھتے ہیں وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ یعنی میں نے جنّات اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا اور لِيَعْبُدُوْنِ کی تفسیر (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

پسند کیا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔

حدیث کے تین اجزاء ہیں ۱۔ کُنتُ کنزاً مخفیاً ۲۔ فَاَحبَبتُ اَن اُعرَفَ ۳۔ فَخَلَقتُ الخَلقَ
جب پہلے جز پر غور کرتے ہیں کہ "میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا" پروردگار عالم کی یہ شان جو ازل میں تھی آج بھی ہے۔ جس قدر اخفاء ذات وحدہٗ لاشریک میں ازل میں تھا آج بھی اسی قدر اخفاء ہے اس لیے کہ وہ ذات تغیر و تبدل، کمی و زیادتی، عروج و زوال سے منزہ ہے۔ اس لیے لامحالہ الآن کما کان کی شان سے متصف مان کر ہی اس ذات کا تصور کرنا ہے لیکن اس میں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ جب ذاتِ وحدہٗ میں اس قدر پوشیدگی ہے تو پھر اس کے تعارف کی صورت کیا ہے اس مشکل کو حل کرنے کے لیے صوفیا حضرات نے تعارفِ ذات کے دو مرتبے قائم کئے ہیں، ایک مرتبہ تنزیہہ، دوسرا مرتبہ تشبیہ۔ اور مرتبہ تنزیہہ میں ذات کی حقیقت کے ادراک کو ناممکن اور محال بتلایا ہے کیونکہ اس مرتبہ میں ذات بحث ہستی مطلق ہے جو اپنی حقیقت آپ ہے، وہی ہست اور اسی سے نیستی کا ظہور ہے، وہی ذات قائم و قیوم، ناظر و منظور، ظاہر و مظہر ہے، اس کے کل و جز ہونے کی کیفیت، مقید و مطلق، عام و خاص، وحدت و کثرت کی حقیقت، نہ کسی کو معلوم ہے اور نہ معلوم ہو سکتی ہے۔ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام کی بابت فرمایا ہے کہ ادراکِ ذات میں تمام مخلوق عاجز ہے۔ فرشتوں کے سردار حضرت جبریل علیہ السلام نے اس مقام تک نارسائی کی حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آج مجھے اللہ تعالیٰ کا بہت ہی قرب حاصل ہوا اگر پھر بھی میرے اور ذاتِ پروردگار کے درمیان

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے لیعبدون سے فرمائی ہے یعنی پہچان کے لیے۔ تو دونوں مقام پر تخلیقِ کائنات کی علتِ غائی ایک ہو جاتی ہے اور وہ ہے تعارفِ ذات، اس لیے حدیث مذکور روایت بالمعنی پر محمول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں جب کہ قرآنِ پاک کی آیت بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ صرف روایت کی بنا پر اگر خلافِ قرآن معنی مفہوم ہوں تو ان کے قبول کرنے میں مقامِ تفکر ہے لیکن قرآن کی مطابقت کے ہوتے ہوئے نیز حدیث منامی، اور حدیث بالمعنی کے مدنظر اس سے استدلال کرنا صحیح ہے۔

ستّر ہزار حجابات تھے؛ اور ان سب سے بڑھکر سید الانبیاء محبوب رب العالمین نے اس مقام کی عظمت و رفعت کی نشاندہی اس طرح فرمائی: مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ "ہم تیری شایانِ شان تیری معرفت حاصل نہ کر سکے" اور قرآن میں لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ کہہ کر عدم رسائی کا آخری فیصلہ سنا دیا گیا۔ آخر یہ کونسا مقام ہے؟ یہ مقامِ تنزیہہ ہے جس کو صوفیاء حضرات کی اصطلاح میں "مکنون المکنون" "خفاء الخفاء" "غیب الغیوب" "مقطوع الاشارہ" وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس لئے صوفیاء حضرات فرماتے ہیں کہ اس مقام تک کسی کا خیال، قیاس، گمان اور وہم تک بھی نہیں پہونچ سکتا، وہ ذاتِ پاک ان تمام کی رسائی سے بالاتر ہے۔ صرف مرتبۂ تشبیہ میں ذات کے تعارف کو صفات کے آئینہ میں صحیح قرار دیا ہے یعنی صفات کے پہچاننے سے ذات کا تعارف ہو جاتا ہے اور اسی مقام تک رسائی منتہائے مخلوق ہے اور اس مقام کا تعلق حدیث کے دوسرے جز فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ سے ہے۔ یہی ہمارا مبحث ہے اور تخلیقِ کائنات کی ابتدا بھی یہیں سے ہوتی ہے جس کی تشریح ان شاء اللہ اسی عنوان کے پانچویں شعر کے ضمن میں آئے گی۔

حدیثِ پاک کا تیسرا جز "فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ" باعتبارِ تخلیق ہمارے غور و فکر کی ابتدائی منزل ہے جس میں تفکر کے لئے قرآن و حدیث میں متعدد مقامات پر دعوت دی گئی ہے۔ اس طرح حدیث کی تشریح اس طریقہ سے کی گئی ہے کہ جزو اول تک بوجہ اعلیٰ درجہ کا خفا ہونے کے رسائی محال، تیسرا جز بہت زیادہ واضح ہونے کی بنا پر موضوعِ بحث نہیں، صرف دوسرا جز دونوں میں اشتراک کا حامل ہے۔ اسی کی تشریح "رازِ باری تعالیٰ" کے عنوان کے تحت کی جائے گی جس کو خلاصہ کے طور پر ہم اس طرح بیان کریں گے کہ میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا پس دوست رکھا میں نے یہ کہ پہچانا جاؤں۔ اسی تعارفِ ذات کے لئے مخلوق کو پیدا کیا۔ اگرچہ ذاتِ حق ازل میں اپنی ذات و اسماء و صفات کی عارف و عالم تھی اور اس وقت بھی اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے جو اسے پہچانے۔ کیونکہ ذاتِ حق اپنی کمال نورانیت میں پوشیدہ تھی اور ظہورِ کل

موقوف تھا تجلی شہودی پر، جس سے مراد ظہورِ حق بصورتِ اعیانِ ثابتہ ہے۔ پوشیدہ خزانہ کے ظہور سے یہی مراد ہے، ورنہ ادراک و شعور ہرگز ذات سے منفک نہیں اور نہ تھے، ظہور و خفا امر نسبی اور اعتباری ہیں لیکن ظہورِ ذات بصورتِ صفات، بغیر مظاہر کے جس سے مراد خلق ہے صورت پذیر نہیں ہو سکتا تھا اس لئے تعارفِ ذات کے لئے تخلیق کائنات فرمائی۔

بودِ اوّل حق تعالیٰ بود، ذاتِ او نبود　　در نہانی ذاتِ خود را بود شاہد در شہود

ترجمہ: ہستی اوّلین میں حق تعالیٰ ایک وجود مطلق تھا، اس کی ذات کی بحث نہ تھی، وہ اپنی ذات کے حجابات میں خود ہی شاہد تھا خود ہی مشہود۔

تشریح: یہاں سے اصل موضوع کا آغاز ہو رہا ہے کہ "ذاتِ وحدہٗ لاشریک" کے ازل میں موجود ہونے کا تصور کس طرح کیا جائے؟ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ "بودِ اوّل" یعنی جب ہست کا اطلاق بغیر کسی ابتدائی تعین سے ہوا جس کو ہم ازل کہتے ہیں اس وقت پروردگار، ایک "وجود مطلق" کی حیثیت سے تھا۔ اس وقت اس کی ذات بھی نہ تھی۔ ذات نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ذات کا ثبوت تو ظہورِ صفات سے ہے اور جب صفات کا ظہور ہی نہیں تو پھر ذات کے ثبوت کی بحث کہاں؟ اس لئے صرف وجودِ مطلق ہی مانا جائے گا، اور اس وجودِ مطلق کی شان یہ تھی کہ وہ اپنی ذات کے نورانی حجابات میں خود ہی شاہد تھا اور خود ہی مشہود۔ کیونکہ اس وقت وجودِ مطلق کے علاوہ کوئی دوسری شے موجود ہی نہ تھی اور مشاہدہ کی صلاحیت موجود تھی تو مشاہدہ کس چیز کا تھا؟ ظاہر ہے کہ اپنے وجود کا مشاہدہ تھا اور شاہد کون تھا؟ شاہد بھی خود ہی تھا، جس طرح کوئی شخص تنہائی میں ہو کسی دوسرے کا وجود بالکل نہ ہو اور اس میں دیکھنے کی صلاحیت بھی موجود ہو تو اس وقت وہ شخص اپنے وجود کا شاہد خود ہی ہو گا اور اسی کا وجود مشہود ہو گا۔ مشاہدہ کے اعتبار سے خود ہی شاہد خود ہی مشہود، اور چونکہ اس میں شانِ معبودیت بھی تھی اور آج بھی ہے اس لحاظ سے خود ہی معبود تھا خود ہی عابد۔ کتبِ صوفیاء میں اس قسم کے الفاظ جو ملتے ہیں کہ مقامِ احدیت میں وہ خود ہی شاہد تھا، خود ہی مشہود، خود ہی ناظر خود منظور، خود ہی ساجد خود ہی مسجود،

خود عابد، خود معبود، ناظر و منظور بھی خود، اس کا مطلب یہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے، قرآنِ پاک میں اسی طرف اشارہ ہے شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔

بے تن و بے جاں وجودِ ذاتِ وحدت زندہ بود آں زماں با اُو نبودہ، ہیچ چیزے در وجود

ترجمہ: جسم و روح کے بغیر ذات وحدہٗ کا وجودِ مطلق زندہ تھا، اُس وقت اُس کے ساتھ کوئی دوسری شے وجود میں نہیں تھی۔

تشریح: پہلے بتلایا جا چکا ہے کہ ازل میں ذاتِ وحدہٗ وجودِ مطلق تھا اور صفات کے عدمِ ظہور کی وجہ سے ثبوتِ ذات بھی نہ تھا، اسی طرح یہ وجودِ مطلق اپنی ذاتی حیات سے حیّ یعنی زندہ تھا لیکن اس کی یہ حیات جسم اور روح سے مبرّا تھی، جسم تو اس لئے نہیں کہ جسم کے لئے ابعادِ ثلٰثہ، طول، عرض، عمق ضروری ہے اور ابعادِ ثلٰثہ کے لئے کوئی چیز یعنی کوئی جگہ ضروری ہے۔ اور جب مکان ہوگا تو پھر تحدید یعنی حد بندی ہوگی جبکہ ذات وحدہٗ ان تمام عوارضات سے منزّہ ہے اور جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ اس ذاتِ پاک کے لئے نہ مکان ہے اور نہ محدودیت تو پھر روح کے قیام کا مرکز کس طرح متعین کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اس وجودِ مطلق کے لئے زندگی تو ماننی ہوگی لیکن اس انداز سے کہ نہ اس کے تن کا وجود ہے اور نہ روح کا۔

دوسرے مصرعہ میں اس بات کا اظہار ہے کہ اُس وقت صرف وہی وجودِ مطلق زندہ تھا اور اس کے ساتھ کسی دوسری چیز کا وجود بھی نہیں تھا تو اس سے یہ بات بالکل عیاں ہوگئی کہ اس وجودِ مطلق کی حیات بھی ازلی تھی اور کسی دوسرے کی عنایت کردہ نہیں تھی کیونکہ اس وقت کسی دوسری شے کا وجود ہی نہ تھا جس سے یہ شبہ ہو کہ اس کی حیات ذاتی نہیں ہے یعنی وہ اپنی حیات سے حیّ ہے اور اس کی حیات جان و تن سے منزّہ ہے۔

صرف وحدت بے بدایت بود و بے موجود ذات نورِ مطلق لَمْ یَلِدْ ذاتش وَلَمْ یُوْلَدْ صفات

ترجمہ: وہ ذاتِ واحد ابتدار کی تعیین کے بغیر اپنے ذاتی وجود کے ساتھ موجود تھی، وہ ایسا نورِ مطلق ہے کہ جس کی ذات کو نہ کسی نے پیدا کیا اور نہ صفات کو۔

تشریح : یہ تو معلوم ہو چکا کہ اس کی ذاتِ واحد جس کو وجودِ مطلق سے تعبیر کیا گیا تھا، ازل سے اپنی حیاتِ ذاتی کی صفات کے ساتھ موجود تھی اور جس طرح اس کی ذاتِ مطلق ازل سے اپنی حیات سے حیّ ، اپنے وجود سے موجود تھی اسی طرح اس کی صفات بھی ازل ہی سے موجود تھیں یعنی وہ صفات بھی اس کی ذاتی صفات تھیں اور اُن صفات کا مرکز نورِ مطلق تھا۔ ذاتِ واحد کو صوفیا حضرات نورِ مطلق سے اس لئے تعبیر کرتے ہیں کہ ایک صفت تو یہ ہے کہ اس کی ذات اس قدر لطیف ہے کہ نظروں کا اس کو دیکھنا تو درکنار، پانا بھی ممکن نہیں اور اس لطیف کو نور کی صفت سے اس لئے متصف کیا ہے کہ جب سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم معراج سے تشریف لائے تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور! آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا "نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاہُ" کہ وہ تو ایک نور ہے اس کو میں کیسے دیکھ سکتا" اس سے معلوم ہوا کہ وہ صرف نور ہی نہیں بلکہ مجسم نور ہے جس کی تجلیات کی ذرا سی جھلک سے کوہِ طور اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ وابستہ ہے۔

بہرحال اب تک یہ واضح ہوا کہ اس کی ذات وجودِ مطلق تھی اور حیاتِ مطلق کے ساتھ حیّ تھی، اور وہ وجودِ مطلق ایک نورِ مطلق کی صورت میں جلوہ گر ہے جس کی یہ صفت نورانی بھی ذاتی ہے اور ازلی ہے۔

دوسری اہم بات جس کی طرف مصنّف اشارہ کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ذاتِ مطلق کی صفات بھی ازلی ہیں اور ذاتی ہیں۔ یہ اس لئے فرمایا کہ بعض حضرات کو یہ اشتباہ ہوا کہ صفات عینِ ذات ہیں اور بعض نے یہ فرمایا کہ صفات غیرِ ذات ہیں، پھر بعض حضرات نے اس خیال کا اظہار فرمایا کہ صفات ازلی نہیں بلکہ ذات ازلی ہے۔ اس کی بحث تو بہت طویل ہے، لہٰذا مختصراً اس قدر عرض کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ ذاتِ مطلق کی طرح اس کی صفات بھی ازلی اور ذاتی ہیں، ازلی کا مطلب تو ظاہر ہے لیکن صفتِ ذاتی کا مطلب یہ ہے کہ صفات کا ظہور ذات ہی سے ہے کسی دوسرے کا مرہونِ منّت نہیں لیکن عینِ ذات بھی نہیں اور ذاتی

ہونے کے سبب غیرِ ذات بھی نہیں۔ یہی مسلکِ اہلِ حق ہے جس کو مصنف نے اختیار کیا ہے۔

عشقِ مطلق گنجِ مخفی بود ذاتش در ازل ۔۔۔ با ثبوتِ ہر صفاتِ کاملاتِ لم یزل

ترجمہ: ازل ہی سے عشقِ مطلق بھی اس ذاتِ مطلق میں ایک مخفی خزانہ کی طرح، اس کی کامل صفاتِ ازلیہ کے ثبوت کے ساتھ موجود تھا۔

تشریح: مصنف درجہ بدرجہ ایک ایک مقام کی تشریح، ترتیب کے ساتھ بیان کر رہے ہیں کہ سب سے پہلے وجودِ مطلق، پھر ذاتِ مطلق، پھر صفات اور اس کے بعد نورِ مطلق کا بیان تھا، اب یہاں عشقِ مطلق کا بیان کر کے اس طرف اشارہ ہے کہ عشقِ مطلق بھی اس کی ذات میں ازل سے موجود تھا اور اس عشق کے وجود کا ثبوت اس طرح پر ہے کہ حدیثِ پاک کے دوسرے جز میں فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ کا ذکر ہے، جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا فَاَحْبَبْتُ یعنی میں نے پسند کیا، میں نے محبوب جانا، تو اَحْبَبْتُ کا مادہ حُبّ ہے اور اس حُبّ کا تعلق کس سے ہے؟ معلوم ہوا اَنْ اُعْرَفَ یعنی تعارفِ ذات سے، گویا ذات کا تعارف محبوب ہوا اور مادہ حُبّ محبّت میں موجود تھا جس کا اظہار کیا جا رہا ہے تو بات صاف ہو گئی کہ ذات محبوب تھی اس لئے اس کا تعارف بھی محبوب ہوا اور محبت کرنے والا اس وقت کون تھا؟ وہ بھی وجودِ مطلق ہی تھا، کیونکہ ازل میں تو اس کے علاوہ کسی دوسری شئے کا وجود ہی نہ تھا، اس لئے ذات کی محبت ذات سے ثابت ہوئی اور جس طرح تمام صفات کا تعلق ذاتِ پروردگار سے اعلیٰ درجہ کا ہے یعنی جس قدر بھی صفات ذاتِ مطلق میں ہیں وہ سب کامل درجہ کی ہیں اس لئے محبت کا اعلیٰ اور کامل درجہ بھی عشق ہوا، اس لئے یہاں پر اسی محبت کو عشق سے تعبیر کرتے ہیں، اور صوفیاء حضرات تخلیقِ کائنات کا سبب عشق کو بتلاتے ہیں، اس کی علت یہی ہے، چونکہ وہ سیدھے سادے طریقے پر اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ "جب ذاتِ مطلق نے اپنے جمال پر نظر کی تو اپنی ذات پر عاشق ہوا اور عشق کے سمندر میں جوش آیا تو اس نے تخلیقِ کائنات کی" یہ بات بادی النظر میں مجذوب کی بڑ معلوم ہوتی ہے مگر اصل حقیقت تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے بغیر سوچے

سمجھے اہلِ علم اعتراض کر دیتے ہیں، اس لئے ہم نے یہ تشریح کر دی کہ صوفیار حضرات نے صرف نتیجہ بیان فرما دیا، اس کے پس منظر کی وضاحت کو ضروری نہ سمجھا، کیونکہ ان حضرات کی ہمیشہ سے قیل وقال سے اعراض کرنے کی عادت ہے، اس لئے کہ اس ذہنیت سے مقصود کی طرف رسائی میں تاخیر اور خلل واقع ہوتا ہے اس لئے صرف ضروری باتوں کی طرف ان حضرات کی توجہ ہوتی ہے، غیر ضروریہ کی طرف نہیں "۔ ہم نے صرف ان ہی اعتراضات اور شبہات کو دور کرنے کے لئے اس قدر تفصیل سے کام لیا ہے۔

عشق شد ایجادِ عالم را سبب	گوش کن اَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفْ زِ رب
نورِ وحدت گنجِ مخفی بے بدایت باکمال	بحرِ ظلمت صفتِ وحدت بے نہایت باجمال

ترجمہ: ذاتِ وحدت کا نور، مخفی خزانہ کی طرح ازل سے صفتِ کمال کے ساتھ موجود تھا اور ذاتِ وحدت کا لامحدود جمال بحرِ ظلمت میں پوشیدہ تھا۔

تشریح: یہاں پر تین باتوں کی طرف اشارہ ہے، ایک تو یہ کہ ذاتِ واحد کی طرح اس کی صفتِ نور بھی ازلی ہے اور اس نور کی شان بھی اسی طرح پردۂ خفا میں ہے جس طرح ذاتِ مطلق مکنون المکنون ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس طرح دیگر صفات درجۂ کمال رکھتی ہیں صفتِ نور بھی درجۂ کمال کے ساتھ ذاتِ وحدت سے متعلق ہے۔ تیسری بات یہ کہ نورِ وحدت لامحدودیت کی شان کے ساتھ بحرِ ظلمات میں اس طرح چھپا ہوا ہے کہ ان حجابات نے اس کی ذات کے جمال میں کوئی نقص نہیں پیدا کیا اور نہ اس کو حجاباتِ ظلمت محدود کر سکے۔

یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ صفتِ جمال کو جب لامحدود ثابت کرتے ہیں اور پھر اس جمال کو بحرِ ظلمات میں چھپا ہوا بھی بتلاتے ہیں گویا جمال مظروف ہوا اور بحرِ ظلمات ظرف، اور چونکہ بحرِ ظلمات "چھپانے والے" کی حیثیت رکھتا ہے اور جمال "چھپنے والا" کی حیثیت رکھتا ہے اور ظاہر بات ہے کہ چھپنے والی چیز، چھپانے والی" سے چھوٹی ہوتی ہے اس لئے جمال کی محدودیت اور بحرِ ظلمات کی لامحدودیت لازم آتی ہے۔

اس شبہ کا ازالہ اس طرح کر لیجئے کہ بجلی کا ایک روشن بلب اگر آپ کے سامنے رکھا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں روشنی کا مرکز دو تار ہیں جن سے روشنی کا اخراج ہوتا ہے جس کو کانچ کا حجاب گھیرے ہوئے ہے اور اس کانچ کے غلاف کے مقابلہ میں اس روشنی کا دائرہ لامحدود ہے، کیونکہ پاور کے مطابق اس کی روشنی اس غلاف سے چھن کر دور دور تک پھیلتی ہے جبکہ یہ کانچ کا پردہ اس روشنی کا حجاب اور اس مرکز روشنی کو گھیرے ہوئے ہے مگر پھر بھی روشنی لامحدود اور غلاف وحجاب محدود ہے۔ اب اگر اس روشنی کے مرکز پر آپ جس قدر بھی کانچ کا غلاف چڑھا دیں تو طاقت کے مطابق اس کی روشنی چھن چھن کر باہر آتی رہے گی اور حجابات کے مقابلہ میں اس کی لامحدودیت قائم رہے گی چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کا نور تو ایسا ہے جس کی کوئی مثال ہی نہیں دی جاسکتی۔ صرف سمجھانے کیلئے یہ مثال عرض کر دی گئی ہے

اے بروں از وہم وقال وقیل من　　　　خاک بر فرق من و تمثیل من

بے نہایت بحر ظلمت کاں سواد اعظم است　　　　نور وحدت ذات مجمل خود محیط عالم است

ترجمہ: بحر ظلمت جو کہ سوادِ اعظم ہے وہ بھی لامحدود ہے۔ وحدت کا نور جو کہ ذات مجمل ہے وہ تمام عالم کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔

تشریح: اس سے پہلے شعر میں نورِ وحدت کو گنج مخفی بتلایا گیا ہے جو بحر ظلمت میں پوشیدہ ہے، یہاں یہ بتلا رہے ہیں کہ بحر ظلمت کیا ہے؟ اس کے لئے حدیث قدسی کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیًا میں کنز مخفی سے اس مقصد کی وضاحت ہوتی ہے کہ کنز مخفی اس قدر خفاء الخفاء کے حجابات میں ہے گویا وہ خود بحر ظلمات ہے، حالانکہ بحر ظلمات کنز مخفی کی صفت ہے لیکن بطور مبالغہ اس صفت کو ذات کے لئے استعمال کر لیا گیا، محاوراتی زبان میں کسی صفت کو ذات کے طور پر استعمال کر لیتے ہیں جس طرح کسی بہت بڑے عالم کو کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو مکمل علم ہے یا کسی کسی عادل کو مکمل عدل سے تعبیر کرتے ہیں اسی طرح اس کنز مخفی کو جو کہ لامحدود حجابات میں پوشیدہ تھا بحر ظلمت سے تعبیر کیا اور اسی بحر ظلمت کو سوادِ اعظم کہتے ہیں کیونکہ مرکز کمال

یہی ہے اور اجمالی طور پر اس میں وہ سب کچھ موجود ہوتا ہے جو تفصیل میں ہے لیکن اسکی حقیقت آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے اور جو شئے آنکھوں سے اوجھل ہو اس کو لاعلمی کا درجہ دیا جاتا ہے اور لاعلمی ہی ظلمت ہے۔ اب جس جگہ یہ لاعلمی جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر ظلمت کا ظہور ہوگا۔ کنزِ مخفی میں دونوں شان بدرجۂ اتم موجود ہیں یعنی پردۂ خفا میں بھی ہے اور آنکھوں سے اس کی حقیقت اوجھل بھی ہے۔ نیز اس میں اجمالی طور پر وہ سب کچھ موجود تھا جس کی تفصیل تمام کائنات ہے، جس طرح ایک بہت چھوٹا سا بیج ایک بہت بڑے درخت کو شاخوں، پتوں پھول اور پھلوں کے ساتھ اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتا ہے لیکن صرف بیج کے دیکھنے سے اس کی پوشیدہ صلاحیت کا مظاہرہ نہیں ہو سکتا تو اس بیج کو بھی سوادِ اعظم ہی کہیں گے، اور اس موقع پر ذات کا جو تصور ہوگا وہ کنزِ مخفی کے اعتبار سے اجمالی ہوگا تو اس ذاتِ اجمالی کا نور تمام عالم کو اسی طرح محیط ہے جس طرح سوادِ اعظم لامحدود صلاحیتوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے

صفاتِ تفصیلی کا مظاہرہ تو اَحْبَبْتُ سے شروع ہوتا ہے جس کی تفصیل گذر چکی ہے کیونکہ یہاں سے عشق کا آغاز ہوا جس سے اعیانِ ثابتہ یعنی وہ صورتیں جو علمِ حق میں موجود تھیں چہرہ کشائے وجود ہوئیں تب تفصیلی مراتب کا تعین کیا گیا جس کو تنزلاتِ ستہ کی بحث میں بیان کر دیا گیا ہے

نورِ وحدت گنجِ مخفی با احاطت اندراں　　　بلکہ در وے بحرِ ظلمت با احاطت ہاست دال

ترجمہ: نورِ وحدت جو گنجِ مخفی ہے وہ محیطِ کائنات ہونے کے باوجود اس سوادِ اعظم میں موجود ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بحرِ ظلمات کے حجابات بھی نورِ وحدت کو احاطہ کرنے کے باوجود اسی سوادِ اعظم میں موجود ہیں۔

تشریح: اس سے پہلے شعر میں وجودِ مطلق کو سوادِ اعظم سے تشبیہ دی تھی اور یہ بتایا گیا تھا کہ سوادِ اعظم وہ ہے جس میں اجمالی طور پر وہ سب کچھ اس شان کے ساتھ موجود ہے جو تمام موجودات میں تفصیل کے ساتھ موجود ہوتا ہے اور اس سے پہلے بحرِ ظلمت کو اس نور کا احاطہ کرنے والا بتلایا گیا تھا تو ایک طرف بحرِ ظلمت لامحدود ثابت ہوا، دوسری طرف نورِ وحدت لامحدود ہوا جیسے

کہ تشریح کردی گئی ہے۔ اب یہاں پر یہ بتلا رہے ہیں کہ نورِ وحدت ہو یا بحرِ ظلمت، یہ سب کے سب محیط ہونے کے باوجود سوادِ اعظم ہی میں پائے جاتے ہیں، اور صحیح بات تو یہ ہے کہ سوادِ اعظم جو حقیقت نورِ ذات ہے وہ اپنی تجلیات لامحدود سے تمام ابحار کو اپنے احاطہ میں اس طرح لئے ہوئے ہے کہ ذات اور صفات میں امتیازی خط کھینچنا مشکل ہوتا ہے۔

بحرِ ظلمت، بحرِ وحدت را بدانی اے پسر نورِ وحدت گنجِ مخفی شد محیطش سر بسر

ترجمہ: حقیقت تو یہ ہے کہ بحرِ وحدت ہی کو بحرِ ظلمت سمجھنا چاہیئے جس کو نورِ وحدت جو ایک گنجِ مخفی ہے مکمل احاطہ کئے ہوئے ہے۔

تشریح: پہلے تمام چیزوں کی یعنی وجودِ مطلق، ذاتِ مطلق، نورِ مطلق، عشقِ مطلق، سب کی الگ الگ باعتبارِ مراتب تشریح کردی چونکہ مراتب کی تعیین کا تعلق صرف افہام و تفہیم سے ہے ورنہ اس کی حقیقت تو دائرۂ ادراک سے باہر ہے۔ یہاں پر یہ بتلا رہے ہیں کہ حجاباتِ ظلمات ہوں یا نورِ واحد ہو، ان سب کو نورِ وجودِ مطلق احاطہ کئے ہوئے ہے، کیونکہ نورِ وحدت تو گنجِ مخفی ہے اور گنجِ مخفی سے مراد ظلمت ہے گویا اس عدمِ روشنی میں یعنی ظلمات میں یہ مخفی خزانہ ہے لیکن اس گنجِ مخفی کا نور سب کو مکمل طور پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

در سوادِ نورِ وحدت داں نہاں آبِ حیات نورِ وحدت ذاتِ خویش آمد سیاہی وصفِ ذات

ترجمہ: نورِ وحدت کے حجابات میں ہی آبِ حیات کو پوشیدہ سمجھو۔ نورِ وحدت اپنی ذات کے لئے سیاہی کے وصف سے متصف ہو کر ظہور پذیر ہوا۔

تشریح: چونکہ نورِ ذات تمام مظاہر کی بقا کا موجب ہے اس لئے دیدۂ عقل دوربیں، ذاتِ مطلق کے جمال کے مشاہدہ سے عاجز ہے اور اس نورِ ذات کو جب رفعِ تعینات کی حیثیت حاصل ہے تو اس کی عظمت و کبریائی نقشِ غیر کو صفحۂ ہستی پر باقی ہی نہیں رکھتی، اس مقام پر نہ عقل رہتی ہے نہ عاقل، نہ مستدل کو کوئی نشان ملتا ہے نہ دلیل کی گنجائش ہے، صرف نارسائی کو رسائی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس نور کی کیفیات کا مطلقاً کوئی اندازہ نہیں ہو پاتا

تو گویا یہ نورِ ذات اُس سوادِ اعظم کی تاریکیوں میں آبِ حیات کی طرح پوشیدہ ہے۔ اس نور کو آبِ حیات سے اس لئے تشبیہ دی کہ اس قدر تاریکیوں میں پوشیدہ ہونے کے باوجود حیات کا سرچشمہ یہی ہے، اور اسی پوشیدگیٔ ذات در نورِ خویش کی بناپر اور عظمت و کبریائی کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہونے کی وجہ سے یہاں مکمل لاعلمیت کا معاملہ ہے گویا چاروں طرف صرف تاریکی ھی تاریکی ہے۔ صوفیا حضرات نے اسی مشاہدۂ تاریکی کی وجہ سے نورِ ذات کو سیاہی سے متصف مانا ہے، یہی مطلب ہے اس مصرعہ کا کہ نورِ وحدت ذاتِ مطلق کیلئے سیاہی کی صفت سے متصف ہوکر ظہور پذیر ہوا، اور سیاہی سے مراد کثیر تعینات بھی ہو سکتے ہیں جو بحسب ذات خود ظلمت و عدم ہیں اور تمام کثرتوں کا وجود اللہ تعالیٰ کی اس تجلّی سے ہے جس کا نام نور ہے، جس نور نے تمام اشیاء کی صورتوں میں ظاہر ہوکر اپنے کو عالم کے رنگ میں خود بخود اظہارِ محبّت کے طور پر نمودار کیا ہے، پس اس ظلماتِ کثرت یعنی تمام موجودات کے اندر حیاتِ حقیقی سے متصف وجودِ مطلق کا نور مخفی و پنہاں ہے جس کی وجہ سے تمام اشیاء حیات و زندگی کی نعمت سے بہرہ ور ہیں۔

از احاطتِ ذات اور ابعض ہی گفتند ذات   حق تعالیٰ پاک و برتر از بیانِ کیفیات

ترجمہ: اس نور کو محیطِ ذات ہونے کی وجہ سے بعض حضرات نے ذات کہا ہے، اللہ تعالیٰ کیفیات کے دائرۂ بیان سے بلند اور پاک ہیں۔

تشریح: یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ تمام موجودات پر ذاتِ وحدہٗ کے نور کی تجلّی ہے، یہاں تک کہ وجودِ مطلق بھی لامحدود حجاباتِ نورانی میں پوشیدہ ہے، ایک طرف تو اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ نور تمام موجودات کا احاطہ کئے ہوئے ہے، دوسری طرف جب یہ دیکھتے ہیں کہ تمام موجودات کا قیام، ذاتِ حق ہے اور نور بھی اس ذات ہی کی ایک صفت ہے اور صفت اپنے وجود میں موصوف کی محتاج ہے تو پھر اس صفت کی ذات کے مقابلہ میں محدودیت لازم آتی ہے تو جن حضرات نے مشاہدۂ انوار کیا اور صرف نورانی حجابات تک ان کی رسائی ہوئی، انھوں نے صرف ان صفاتِ نورانی ہی کو ذات سے تعبیر کیا ہے اور ان کا اس انداز سے سوچنا صحیح ہے،

کیونکہ یہی ان کا مشاہدہ ہے ۔ اسی لئے مصنف رحمۃ اللہ علیہ لفظ "بعض" کا استعمال کر رہے ہیں کیونکہ سب کا اتفاق اس پر نہیں ہے ، اور جن حضرات نے وجودِ مطلق کے فیض سے نور کا ظہور سمجھا ہے وہ یہی کہتے ہیں کہ ذات ہی سب کو محیط ہے ۔ ان تمام باتوں کے علاوہ حقیقت یہ ہے کہ ذاتِ حق احاطۂ عقل و فکر و قیاس سے اور دلیل سے بہت ہی اعلیٰ و ارفع ہے ، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو چیزیں بھی وسیلۂ معرفت ہیں ان تمام اشیاء کا وجود بھی تو وجودِ مطلق کے فیض کا مرہونِ منت ہے ، اور وجودِ مطلق لامحدود ہے جبکہ یہ وسائلِ معرفت محدود ہیں ، محدود ، لامحدود کا کس طرح احاطہ کر سکتا ہے ؟ اس لئے مصنف نے بعض صوفیاء حضرات کا مشاہداتی نقطۂ نظر بیان کرنے کے بعد اظہارِ حقیقت بھی کر دیا کہ وہ ذات پاک اس قدر منزہ اور پاک ہے اور اعلیٰ و ارفع ہے جس کی کیفیات کا بیان کرنا کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں ، چنانچہ فرماتے ہیں ۔

کے تواند کرد شرحِ ذات اور اے پسر ذاتِ باری پاک عالی از بیاں شد سر بسر

ترجمہ : اس کی ذات کی تشریح کون کر سکتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات از اوّل تا آخر دائرہ بیان سے اعلیٰ اور پاک ہے ۔

تشریح : مصنف فرماتے ہیں کہ ذاتِ خداوندی کی کیفیت کا بیان کسی بھی مخلوق کے بس کی بات نہیں ، اس لئے کہ جن وسائل کو تشریحِ ذات کے لئے استعمال کریں گے وہ محدود ہوں گے اور ذات لامحدود ، دوسری بات یہ ہے کہ تمام موجودات ، ذاتِ مطلق کی صفات کا مظہر ہیں ، ان صفات کے مظاہر میں ہزارہا اشیاء ایسی ہیں جن کی حقیقت تک ہم کو رسائی نہیں حالانکہ بالکل ظاہر و باہر ہیں ، جیسے سورج کہ اس کی روشنی کو تو ہم دیکھتے ہیں لیکن اس روشنی کی حقیقت سے ناواقف ہیں ۔ اسی طرح ایک بہت بڑے درخت کا پتوں ، پھل اور شاخوں کے ساتھ وجود ایک چھوٹے سے بیج میں ہوتا ہے لیکن صرف بیج کو دیکھنے سے اس کی حقیقت کا اندازہ نہیں ہو سکتا ۔ تو جب مظاہرِ صفاتِ ذات کے ادراک کا یہ حال ہے تو حقیقتِ ذات تک رسائی تو محال اور ناممکن ہے ۔ صوفیاء حضرات نے اس مرتبۂ ذات کو مرتبۂ تنزیہہ قرار

دیا ہے اور اس کے ادراک کو ناممکن اور محال قرار دیا ہے۔ قرآن پاک میں دونوں طرح کی، یعنی تنزیہہ اور تشبیہ کی مثالیں موجود ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مرتبۂ تشبیہ میں بھی اوصاف کے ذریعہ اس ذات تک رسائی مشکل ہے۔ اس مقام میں بھی جہاں تک رحمتِ باری نواز دے تو رسائی ہو جائے۔ جب صفات کا یہ حال ہے تو ذات کی رفعت و بلندی کا کیا کہنا، جس کو مصنف "سربسر" سے بیان کر رہے ہیں، کہ اس مقام تک رسائی کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں۔

زیں جہت ممنوع شد فکرے بذاتش بالیقیں　　ذاتِ حق در بحرِ ظلمت بودہ باشد ہمقریں

ترجمہ: اسی وجہ سے ذاتِ پاک کی کیفیات میں تفکر اور جستجو کرنے کے لئے منع کر دیا گیا، کیوں کہ ذاتِ پاک ازل سے بحرِ ظلمت سے ہمقرین ہے۔

تشریح: سب سے پہلے تو یہ سمجھئے کہ تفکر کہتے ہیں امور معلومہ مناسبہ کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ان کے ذریعہ غیر معلومہ امور تک رسائی ہو جائے۔ یہاں امور معلومہ کے ساتھ مناسبت کی قید اس لئے لگادی کہ مطلق معلومات کی ترتیب ہی غیر معلوم تک رسائی کا ذریعہ نہیں بن سکتی، چونکہ ذاتِ حق ازل سے بحرِ ظلمت یعنی پردائے جلال میں پوشیدہ ہے اور اس خفار کی وجہ سے خیال، قیاس، گمان و وہم کی رسائی یہاں تک نہیں ہے۔ تو پھر معلومات کا ذریعہ کون سی شئے بنے گی۔ ظاہر بات ہے کہ حقیقتِ ذات۔ چوکہ غیر معلوم ہے۔ تک رسائی کے لئے کسی کی معلومات کے ذرائع ایسے نہیں جو ذات سے مناسبت رکھتے ہوں اور جب معلومات میں مناسبت ہی نہیں تو پھر تفکر کا صحیح نتیجہ ہی نہیں برآمد ہوگا، اس لئے ذات میں غور و فکر سے منع کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ جب صحیح نتیجہ برآمد نہ ہوگا تو غلط نتیجہ نکلے گا اور اس غلط نتیجے کی پیروی باعث ضلالت ہوگی۔ چونکہ بطریق استدلال باتفاق حکمار و متکلمین ادراکِ حقائق اشیار نہایت دشوار ہے اس لئے کہ استدلال میں نتائج کا ظہور موقوف ہوتا ہے مقدمات کی صحیح ترتیب پر اور مقدمات کی صحیح ترتیب موقوف ہے معلومات کی تصحیح پر۔ پس اگر کہیں بھی غلطی کا امکان رہ گیا تو نتائج برعکس برآمد ہوں گے، اس لئے صوفیا حضرات تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کو ضروری قرار دیتے

ہیں تاکہ تصفیہ اور تجلیہ سے مناسبت باصفات ہوجائے اور معرفت کشفی شہودی حاصل ہوجائے اور اس معرفت کا حصول صفات کی شہودی کیفیت پر مرتبۂ تشبیہ میں ہی مانتے ہیں۔ ذات تک رسائی ہو ہی نہیں سکتی تو اس میں غور و فکر کو بھی منع کرتے ہیں اور تَفَکَّرُوا فِی صِفَاتِہٖ وَ لَا تَتَفَکَّرُوا فِی ذَاتِہٖ کو اپنا معمول بناتے ہیں۔

بحرِ ظلمت وصفِ وحدت ہست زیں گفتند ذات　　　کاؤ فتاد از ذاتِ وحدت روشنائی بر صفات

ترجمہ: بحرِ ظلمت، ذات وحدۃ کا وصف ہے اسی لئے اس کو ذات سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ ذاتِ وحدت ہی سے صفاتِ ذات پر روشنی پڑتی ہے۔

تشریح: اس سے پہلے شعر میں ذاتِ حق کو بحرِ ظلمت کے ساتھ مقرون بتلایا گیا تھا گویا جہاں ذات ہے وہاں وہاں بحرِ ظلمات ہیں، اس لئے ذاتِ وحدت اور بحرِ ظلمت میں اندماجی تعلق ہونے کی وجہ سے بحرِ ظلمت یعنی صفات کو ذات تسلیم کیا گیا ہے حالانکہ یہ بحرِ ظلمت کے حجاباتِ نورانی ہیں جو فی الحقیقت ذات نہیں بلکہ صفاتِ ذات ہیں لیکن تجلیات ذات کے معائنہ میں گم ہونے کی وجہ سے مشاہدہ اس طرح کا ہوا کہ یہی تجلیات بعینہٖ ذات ہیں، اس لئے انھوں نے صفات کو ذات قرار دیدیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سالک جب مکاشفہ اور مشاہدہ کے مقام سے گذر کر مقامِ معائنہ میں پہونچتا ہے تو حجابات اٹھنے شروع ہوجاتے ہیں۔ جب ایک حجاب اٹھتا ہے تو سالک یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے بعد معائنۂ ذات ہوجائے گا؛ لیکن اس حجاب کے اٹھنے کے بعد پھر ذاتِ مطلق کی صفات کا ظہور نئی شان سے ہوتا ہے اس کے بعد اور ترقی درجات ہوئی تو سالک نے پھر یہ محسوس کیا کہ اب کی بار ارتفاعِ حجاب کے بعد تجلّیٔ ذات ہوگی لیکن پھر بھی وہ دائرۂ صفات ہی میں رہا اسی طرح لامحدود تجلّیاتِ ذات کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے تو اس مشاہدہ کی وجہ سے ہی بعض حضرات نے کہدیا کہ یہی تجلّیات صفاتِ ذات ہیں۔ ایک بات کا ذکر کرنا یہاں فائدہ سے خالی نہیں، وہ یہ کہ سالک کی رسائی صفات کے لامحدود حجابات تک ہی محدود رہتی ہے، اس لئے کہ ادراکِ ذات محال ہے، تو اس سے یہ نہ سمجھ

لینا چاہیئے کہ جب ذاتِ مطلق تک رسائی نہ ہوئی تو پھر مقصود حاصل نہ ہوا۔

بحرِ وحدت بحرِ ہاہوتی ولاہوتی یکیست نیست فرقے ذاتِ یک را صد عبارت گر شکیب

ترجمہ: بحرِ وحدت، بحرِ ہاہوت اور بحرِ لاہوت سب ایک ہی ہیں۔ اس ذاتِ واحد کی شانِ وحدت میں کوئی فرق نہیں اگرچہ طریقۂ تعبیر سینکڑوں ہوں۔

تشریح: اس سے پہلے مصنف علیہ الرحمہ نے ذاتِ وحدت کی کیفیات کو بحرِ ظلمت کی صفت سے موصوف بیان کرکے اندماجی حقیقت کا بیان کر دیا تھا، اب یہاں یہ بتلا رہے ہیں کہ جس طرح صفات کے لامحدود ہونے پر وحدتِ ذات متاثر نہیں ہوتی اسی طرح وجودِ مطلق نے مراتبِ تعیین قبول کر لئے تب بھی اس کی شانِ وحدت میں کوئی فرق نہ آئے گا، کیونکہ فی الحقیقت یہ تمام مدارج ذاتِ واحد ہی سے منسلک ہیں جیسے ہاہوت، لاہوت، جبروت، ملکوت اور ناسوت ان میں سے کسی کے ذریعہ ذات کا تعارف کرایا جائے تو کثرتِ ذات لازم نہیں آئے گی بلکہ ذات واحد ہی رہے گی وہ اس طرح کہ سب سے پہلا مقام تو وجودِ مطلق کا ہے جہاں پر کسی بھی صفت کا نشان و پتہ نہیں، اس مقام کو مقامِ لاہوت کہتے ہیں، اس کے بعد ثبوتِ ذات کیلئے صفات کا ظہور ضروری ہے تو اگر صفات کا یہ ظہور اجمالی طور پر ہے تو اس مقام کو مقامِ لاہوت کہتے ہیں اور اگر ظہورِ صفات تفصیلی طور پر ہے تو اس کو مقامِ جبروت کہتے ہیں۔

بہرحال یہ صرف عبارت کی تعبیر کا فرق ہے ورنہ ان تمام صورتوں میں ذات تو واحد ہی ہے جس کی وحدت میں ہاہوت ولاہوت وجبروت کی شان کے ظہور سے کوئی فرق نہیں واقع ہوتا۔

بود پنہاں حق تعالیٰ در ازل چیزے نبود خود بذاتش گنج مخفی بود خلّاقِ وجود

ترجمہ: حق تعالیٰ ازل میں پوشیدہ تھا اور کوئی دوسری شے موجود نہ تھی، تمام موجودات کو پیدا کرنے والے کی ذاتِ مطلق بھی ایک مخفی خزانہ تھا۔

تشریح: یہ شعر پہلے شعر کی مزید تشریح ہے کہ ازل میں وجودِ مطلق شانِ کَنْزاً مَخْفِیًّا کے ساتھ موصوف تھا اور ذاتِ قدس نے کسی قسم کی تعیین وتقیید کو قبول نہیں کیا تھا، اور وہ

مرتبۂ تنزیہہ میں اس قدر رفعت و عظمت پر فائز تھا کہ اس وقت اس کے ساتھ کسی دوسری شئے کا وجود بھی متصور نہ تھا، نہ کسی قسم کی صفات کا ظہور تھا، کیونکہ خلاقِ عالم اور وجودِ اشیار کا مرکز خود ہی گنجِ مخفی تھا، اس کی کیفیات کا پتہ ہی نہ تھا چہ جائیکہ اس کو مراتب ہاہوت و لاہوت سے منسوب کرنا۔

در ازل ایں حالتِ باری تعالیٰ در نہاں   راست بود و ہست اکنوں نیز باشد ہمچناں

ترجمہ: ذاتِ باری تعالیٰ کے ازل میں پوشیدہ ہونے کی جو نوعیت تھی، ٹھیک اسی طرح آج بھی وہی ہے اور آئندہ بھی اسی طرح رہے گی۔

تشریح: یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ ازل میں ذاتِ وحدہٗ لاشریک لہٗ جس شانِ یکتائی اور تنزیہہ کے ساتھ موجود تھی وہ اسمار و صفات اور اعیانِ ثابتہ کی صورتوں میں جلوہ گر ہونے کے باوجود اسی یکتائی اور تنزیہہ سے متصف ہے، تعیناتِ صفات کے قبول کر لینے سے ذات کی وحدت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ اَلْاٰنَ کَمَا کَانَ کی شان کے ساتھ آج بھی متصف ہے اور آئندہ بھی متصف رہے گی یعنی ازل میں بھی اس شان سے متصف ہے اور اب بھی ہے اور ابد تک رہے گی۔

بے تبدل بے تغیر عشقِ مطلق ذات بود   در حریمِ عینِ وحدت بود دریائے وجود

ترجمہ: کسی تبدیلی اور کمی زیادتی کے بغیر ذاتِ مطلق کا عشق موجود تھا، ذاتِ وحدت کے حجابات میں دریائے وجود موجزن تھا۔

تشریح: اس سے پہلے شعر میں ذاتِ خداوندی کی صفت ازلی و ابدی بتلائی تھی، ازلی تو یہ ہے کہ مسبوق بالعدم نہ ہو یعنی اس سے پہلے عدم نہ ہو، اور ابدی وہ جس کی انتہا نہ ہو، جس طرح دائرہ، کہ جس کی نہ کوئی ابتدار ہے اور نہ انتہا ہے، اور جب ازلی و ابدی ہے تو پھر "ذاتِ مطلق" زمانے کے تعینات سے یعنی ماضی، حال، استقبال کی صفت سے بھی متصف نہ ہوگی اور جب اتصافِ زمانہ نہیں پایا جائے گا تو پھر تغیر و تبدل بھی نہ ہوگا، پھر دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جب

وجودِ مطلق اپنے ذاتی عشق کے ساتھ موجود تھا تو اس وقت کسی دوسری شئے کا وجود ہی نہ تھا پھر کسی کے تاثر اور اثر قبول کرنے کا معاملہ کہاں ؟

بحرِ وحدت بحرِ لاہوت اُست و جبروتی از و بحرِ ظلمت بحرِ جبروت است و ملکوتی از وست

ترجمہ : بحرِ لاہوت ، بحرِ وحدت ہے اور بحرِ لاہوت سے بحرِ جبروت ہے ، بحرِ جبروت بھی بحرِ ظلمت ہے اور جبروت سے ہی ملکوت ہے۔

تشریح : یہاں بحرِ وحدت سے مراد "وجودِ مطلق" ہے اور مقام کے اعتبار سے یہ "مقامِ ہاہوت" ہے ، اس مقامِ ہاہوت میں صرف ذات کا تصور ہوتا ہے اور ذات کا بھی اس شان کے ساتھ کہ جس کو وجودِ مطلق کہتے ہیں ، اس کے بعد جب اس وجودِ مطلق نے اپنے شیونِ ذاتیہ کی طرف بالاجمال توجہ فرمائی تو عالمِ لاہوت کا ثبوت ہوا اور جب اس اجمال میں تفصیل کا رنگ بھرا تو عالمِ جبروت کا ثبوت ہوا ۔ یہاں تک تو وجودِ مطلق کی شیونِ ذاتیہ اجمال و تفصیل کے مطابق تھیں ، ابھی ان کا ظہور نہ ہوا تھا ، پھر جب ان شیونِ ذاتیہ کو پردۂ غیب سے نکال کر منصّۂ شہود پر جلوہ فگن کیا تو عالمِ ملکوت کا ثبوت نہیں بلکہ ظہور ہوا یعنی عالمِ لاہوت و جبروت تک کا تعلق ثبوت کا تھا اور عالمِ ملکوت سے ظہورِ صفات ہوا ہے ۔

نورِ احمد بحرِ ملکوت است دانی بالیقیں جملہ موجودات از وے کرد ربّ العالمیں

ترجمہ : اس بات کو یقین کے ساتھ جان کہ نورِ احمد ہی بحرِ ملکوت ہے ، ربّ العالمین نے تمام موجودات کو اسی نور سے پیدا کیا ہے ۔

تشریح : اس سے پہلے شعر میں شیونِ ذاتیہ کا ثبوت ، اجمالی طور پر عالمِ لاہوت میں اور تفصیلی طور پر عالمِ جبروت میں مصنف نے بیان کیا تھا ، یہاں شیونِ ذاتیہ کا ظہور ہے ، کیونکہ جب وجودِ مطلق کو اپنی ذات کے تعارف سے عشق ہوا ۔ "لفظ عشق" کا مفہوم فَاَحْبَبْتُ سے متبادر ہے کیونکہ اَحْبَبْتُ کا مصدر حُبّ ہے جس کی نسبت ذاتِ مطلق سے ہوگی تو اس محبت میں ایسی صفت کا اضافہ کیا جائے گا جو شایانِ شانِ ذاتِ مطلق ہو اور محبت کی اسی اعلیٰ نوع کا نام

عشق ہے"۔ بہرحال اپنی ذات کے تعارف سے جب اس کو عشق ہوا تو حقیقتِ محمدی کا اجمالی ثبوت عالمِ لاہوت میں ہوا اور تفصیلی ثبوت عالمِ جبروت ہی میں ہوا۔ عالمِ لاہوت میں حقیقتِ محمدی کا وجود اور عالمِ جبروت میں نورِ محمدی کی تخلیق ہوئی اور اس تخلیقِ نور کا ظہور عالمِ ملکوت میں ہوا۔ پھر اس نور سے تمام کائنات کا ظہور ہوا۔ اس کے بعد وجودِ محمدی کا ظہور عالمِ ناسوت میں ہوا، تو گویا تمام مخلوق پر نورِ محمدی جلوہ فگن ہے، اور تمام موجودات کا وجود اسی نورِ پاک سے ہے۔ یہاں ایک بار پھر اس بات کو ذہن نشین کر لیجئے کہ سب سے پہلے وجودِ مطلق ہے جس سے عالمِ ہاہوت کو نسبت ہے اس کے بعد حقیقتِ محمدی کا وجود ہے جس کا تعلق عالمِ لاہوت سے ہے۔ اس کے بعد نورِ محمدی کی تخلیق ہے جس کا تعلق عالمِ جبروت سے ہے۔ اس کے بعد نورِ محمدی کا ظہور ہے جس کا تعلق عالمِ ملکوت سے ہے اس کے بعد وجودِ محمدی کا ظہور ہے جس کا تعلق عالمِ ناسوت سے ہے، ان تمام مراتب میں فرق کرنا ضروری ہے۔ صوفیا حضرات نے اسی ترتیب کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سب سے پہلا درجہ وجودِ مطلق یعنی عالمِ ہاہوت کا ہے۔ اس کا سایہ عالمِ لاہوت ہے اور عالمِ لاہوت کا سایہ عالمِ جبروت ہے اور عالمِ جبروت کا سایہ عالمِ ملکوت ہے، اور عالمِ ملکوت کا سایہ عالمِ ناسوت ہے۔

پس ہمہ از بحرِ ملکوت است پیدا اے پسر بحرِ لاہوت آں را است دانی سر بسر

ترجمہ: پس تمام موجود بحرِ ملکوت سے ظاہر ہوئے ہیں خود بحرِ ملکوت سے ظاہر ہوا ہے وہ از اوّل تا آخر بحرِ ناسوت ہے۔

تشریح: اس کی تفصیل تو گذر ہی چکی ہے، نیز یہاں صرف اس بات کا بیان ہے کہ جو کچھ موجودات ہیں ان میں عالمِ ملکوت کا پرتو ہے۔

ایں ہمہ اسجار مظہر از جلالِ کبریا آفریدا و از خودی خویش بے چون و چرا

ترجمہ: یہ تمام بحر اللہ تعالیٰ کے جلال کا مظہر ہیں بے شک تمام موجودات کو اس نے اپنی مرضی سے ہی پیدا کیا ہے۔

تشریح: ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ذاتِ مطلق کی دو صفات جمال اور جلال ہیں، ان دونوں صفات میں کسی قسم کی کمی و بیشی کی کیفیت ہرگز نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ذاتِ حق پردۂ جلال و عظمت کے حجابات میں ہے اور ان حجاباتِ جلال و عظمت سے جمالِ کبریائی ظاہر ہے اور حضرتِ جلال کو اعلیٰ درجہ کا جمال اور حضرتِ جمال کو اعلیٰ درجہ کا جلال حاصل ہے، جلال جمال میں مندرج اور جمال، جلال میں مندرج ہے۔ جب صفتِ جلال کا ظہور ہوتا ہے تو صفتِ جمال برزخ ہو جاتی ہے، اس وقت استیلائے ہستی کا ظہور ہوتا ہے، لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ کا اعلان ہوتا ہے۔ اور جب صفتِ جمال کا ظہور ہوتا ہے تو اَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ کہہ کر فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ کہ میں نے تعارفِ ذات کے لئے مخلوق کو پیدا کیا، کا اعلان ہوتا ہے۔ یہاں پر مصنف نے تمام ابحار کو مظہر جلال فرما کر ایک بڑے ہی عجیب و غریب نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ صفتِ جمال میں پوشیدگی ہے کیونکہ جس وقت صفتِ جمال ظہور پذیر ہوتی ہے تو صفتِ جلال برزخ بن جاتی ہے اس لئے جمال میں اخفاء پیدا ہو جاتا ہے اسی لئے جمالِ ذات کے تعارف کے لئے ہی مخلوق کو پیدا کر کے کائنات کے ذرہ ذرہ میں عکس جمال نمایاں کر دیا گیا اور صفتِ جلال کاشف ہے اس لئے جب اس کا ظہور ہوتا ہے تو صفتِ جمال اپنی پوشیدگی کے ساتھ برزخ بنتی ہے۔ اسی کشف کی وجہ سے تمام ابحار کو مظہر جلال قرار دیا ہے۔ نیز وجودِ مطلق تو درحقیقت جلال و عظمت کے حجابات میں پوشیدہ ہے چونکہ تمام ابحار یعنی بحر لاہوت و بحر جبروت و بحر ملکوت اور بحر ناسوت سب کے سب اسی وجودِ مطلق سے جس کو بحر یاہوت کہتے ہیں وجود پذیر ہوئے ہیں اس لئے اصل کے اعتبار سے تمام ابحار کو جلالِ کبریائی مظہر قرار دیا ہے۔

اور ان تمام ابحار یا عوالم کو اس وجودِ مطلق نے بغیر کسی کی سفارش و استعانت کے پیدا کیا ہے اس لئے کہ جلالِ ذات کے رُوبرو تو کسی شے کا وجود ہی نہیں باقی رہ سکتا تو پھر کسی کی سفارش یا کسی سے استعانت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔

خود یکے ہر دو صفاتش داں جمال و ہم جلال　　　سر بے پیدا کرد از خود نورِ احمد در خیال

ترجمہ: وہ ذاتِ پاک تو ایک ہے لیکن اس کی دو صفات جمال وجلال ہیں اور نورِ احمد کی صورت میں اس نے ایک بھید کا اظہار کیا ہے۔

تشریح: یعنی خداوند قدوس کی ذات پاک تو حقیقتِ احدیت ہے لیکن اس کی ذات میں دو صفات ایسی ہیں جن سے تخلیقِ کائنات کا تعلق ہے اور وہ صفاتِ جمال وجلال ہیں صفتِ جمال نے جب تعارفِ ذات کو پسند فرمایا تو پردۂ جلال سے ایک ایسے نور کا ظہور کیا جو خالق ومخلوق کے درمیان ایک راز ہے جو خالق تو نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے لیکن خالق کے بعد سب سے بڑا درجہ اسی نورِ پاک کا ہے۔ اس راز کی مکمل حقیقت کو تو صرف اس کا خالق ہی جان سکتا ہے۔ "کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است" غالب نے اسی وجہ سے کہا ہے۔ ہم تو صرف حضرت جامی کی زبان میں یہ کہہ سکتے ہیں۔

یا صاحب الجمال و یا سید البشر　　من وجہک المنیر لقد نور القمر

لایمکن الثناء کما کان حقہٗ　　بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

دربیان پیدائش نورِ احمد صلی اللہ علیہ وسلم

نورِ احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا بیان

چوں نخستیں حق تعالیٰ خواست کاید درشناخت　　نور پیدا کرد از خود، نورِ احمد نام ساخت

ترجمہ: سب سے پہلے جب اللہ تعالیٰ نے یہ پسند کیا کہ اس کو پہچانا جائے تو اس نے اپنی ذاتِ پاک سے ایک نور ظاہر کیا جس کا نام نورِ احمد رکھا۔

تشریح: رازِ حق تعالیٰ کے بیان کے بعد مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس ذاتِ پاک کا بیان فرما رہے ہیں جس کی وجہ سے مخلوقات کی تخلیق ہوئی اور جس کے ذریعہ ہم نے ذاتِ خالق کو صفات کے وسیلہ سے پہچانا اور جو خالق اور مخلوق کے درمیان سب سے عظیم رابطہ اور راز ہے۔

حدیثِ پاک ہے اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَّیُحِبُّ الْجَمَالَ کہ خداوند تعالیٰ خوبصورت ہے اور خوبصورتی

کو پسند فرماتا ہے۔ اس صفتِ جمال نے جب جمالِ ذات کے ظہور کو پسند فرمایا تو اپنی ہی ذاتِ تشبیہی کے جمال کو اس انداز سے ظاہر فرمایا کہ اس نورِ ذات سے ایک نور ظہور پذیر ہوا جس کا نام احمد رکھا۔

رازِ باری تعالیٰ کے عنوان کے تحت اس کا تفصیلی ذکر آگیا تھا کہ تعارفِ ذات کسی علت اور کسی سبب کی وجہ سے نہیں تھا۔ بلکہ تقاضائے جمال ہے کہ اس کو چاہا جائے۔ کیوں کہ اگر ہم تعارفِ ذات کو کسی سبب سے منسوب کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے افعال بھی معلّل بالاغراض ہوجائیں گے اور جب غرض کا وجود ہوگا تو اس سے جلبِ منفعت یعنی فائدہ حاصل کرنے کا تصور پیدا ہوگا۔ جبکہ ذاتِ خداوندی کی شان اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ ہے کہ ذاتِ خداوندی تمام مخلوقات سے بے نیاز ہے اور فائدہ حاصل کرنے کی غرض تو جب ہو سکتی تھی جبکہ اس ذات کو قدرتِ کاملہ نہ ہوتی۔ حالانکہ ذاتِ خداوندی کی قدرتِ کاملہ کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ یعنی ہر ہر چیز پر قدرتِ خداوندی مکمل طور پر ہے۔ اس لئے غرض کے وجود سے بھی کوئی فائدہ حاصل نہ ہوسکا۔ معلوم ہوگیا کہ ظہورِ جمال کو تقاضائے ظہور کی وجہ سے مناسب خیال فرما کر فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ کا اعلان فرمایا۔

کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًا باری تعالیٰ گفت خویش   ز اشتیاقِ خود شناسی کرد پیدا نورِ پیش

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا کہ "میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا" اپنے تعارفِ ذات کے لئے سب سے پہلے ایک نور پیدا کیا۔

تشریح: یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ ایک پوشیدہ خزانہ تھا جب اس نے چاہا کہ اسکو پہچانا جائے تو اس نے مخلوق کو پیدا کیا اور سب سے پہلے ایک نور پیدا کیا جیسا کہ حدیث پاک ہے اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرا نور پیدا کیا۔ اور اس نور کو اپنی معرفت کا ذریعہ بنایا۔

کرد پیدا حق ز نورش نورِ احمد را نخست   پس ہمہ از نورِ احمد نقشہا آمد درست

ترجمہ: پہلے اس نور سے اللہ تعالیٰ نے احمد کا نور پیدا کیا۔ اس کے بعد تمام نقوشِ عالم

اس نور ہی سے مکمل ہوئے۔

تشریح: حدیث پاک ہے اَنَا مِنْ نُوْرِ اللّٰہِ وَالْخَلْقُ کُلُّھُمْ مِنْ نُوْرِیْ کہ میں اللہ کے نور سے پیدا کیا گیا ہوں اور ساری مخلوق میرے نور سے تخلیق کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح اسم اللہ کا مرتبہ مقدم ہے تمام اسماء وصفات پر، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ مقدم ہے کل مخلوقات پر اور جس طرح اسم اللہ متجلی ہے جمیع اسماء وصفات پر، اسی طرح نورِ احمد تمام مظاہر پر جلوہ فگن ہے اور کل موجودات نورِ احمد کے زیر سایہ ہیں (اسی نور کے سایہ میں تمام نقوش تکمیل کو پہونچتے ہیں)۔

از فروغِ ذرۂ یک نور، نورِ خاص وعام — بنگری از نار چقماق ایں مثالش را تمام

ترجمہ: نور کے ایک ذرہ کے فروغ ہی سے عام وخاص کے نور کا ظہور ہے۔ اس مثال کو بہتر طریقے پر سمجھنے کے لئے چقماق میں پوشیدہ آگ کو دیکھو۔

تشریح: یہ اسی ذاتِ احدیت کا نور ہے جس سے نورِ احمدی کا ظہور ہوا اور اسی نورِ احمدی کا ظہور تمام عام وخاص مظاہر پر ہے، اس نورِ احمدی کو نورِ احدیت کے مقابلہ میں مثال کے طور پر ایک ذرہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور حقیقتِ محمدی میں یہ نور اسی طرح چھپا ہوا ہے جس طرح چقماق میں آگ پوشیدہ ہوتی ہے، جب ایک پتھر کو چقماق سے ٹکرایا جائے گا تو اس میں سے آگ کی چنگاری کا ظہور ہوگا، پھر اس ایک چنگاری سے تم جس قدر آگ تیار کرنا چاہو کر سکتے ہو (اسی طرح جب پروردگار نے اس ذرۂ نور کو وسعت دی تو تمام مخلوقات میں ان کی استعداد کے مطابق نور کا ثبوت ہوا) (صوفیاء حضرات اسی فروغ کو سفر جزء الی الکل سے تعبیر کرتے ہیں یعنی جز کا سفر کرنا کل کی طرف) اس کی تفصیل ان شاء اللہ اشغال کے بیان میں کی جائے گی۔

ہر چہ پیدا کرد باری در سموات و زمیں — از ظہور نورِ احمد، جملہ موجودات ہیں

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ پیدا کیا ہے۔ ان تمام موجودات کا وجود نورِ احمد کے ظہور ہی سے ہے۔

تشریح : اس سے پہلے شعر میں تمام اشیاء میں نورِ احمدی کا ہونا چقماق میں آگ کے پوشیدہ ہونے کی طرح ثابت کیا تھا، اس شعر میں یہ بتلا رہے ہیں کہ جب اس نورِ احمدی کو فروغ دے کر اس کا ظہور کیا تو تمام موجودات ظہور پذیر ہوئیں اور حدیث پاک "لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ کہ اگر آپ نہ ہوتے تو آسمانوں اور زمینوں کا کسی کا کچھ وجود ہی نہ ہوتا" کے مطابق یہ تمام آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے وہ سب نورِ احمد ہی کا طفیل ہے۔

ایں روایت آشکار از خضر آمد در جہاں | ہرچہ پیدا کرد حق از نورِ احمد راست داں

ترجمہ : حضرت خضر علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ روایت دنیا میں ظاہر ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا فرمایا ہے وہ نورِ احمد سے ہی ہے۔

تشریح : حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ اور اَنَا مِنْ نُوْرِ اللّٰہِ وَالْخَلْقُ کُلُّھُمْ مِنْ نُوْرِیْ لیکن حضرت خضر علیہ السلام نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم ناسوت میں جلوہ گر ہونے سے پہلے فرمایا تھا کہ خداوند تعالیٰ سب سے آخر میں اس نبی کو مبعوث فرمائے گا جس کے نور سے تمام دنیا کے انوار مستفید ہیں اور تمام مخلوقات کی تخلیق اس کی تخلیق کی مرہونِ منت ہوگی۔

کنیت احمد ابوالارواح آمد بہر ایں | می نگر در ظاہر و باطن محمد بالیقیں

ترجمہ : احمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت "ابوالارواح" اسی وجہ سے ہوئی کہ یقینی طور پر تم فیضِ محمدی کو ظاہر و باطن میں جلوہ گر دیکھو۔

تشریح (: حدیثِ جابرؓ میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روحِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذات سے پیدا کیا اور تمام کائنات کو روحِ محمدی سے پیدا کیا، اسی لئے روحِ کلی کے طور پر تمام ارواح میں روحِ محمدی کا وجود ہے، اس لئے آپ ابوالارواح ہوئے اور روح کا تعلق چونکہ باطن سے ہے اس لئے مخلوقات کے باطن میں بھی آپ کا نور جلوہ فگن ہوا اور اسمائے الٰہیہ کے ذریعہ تمام مظاہر اشیاء میں آپ ہی کے نور کا ظہور ہے۔ اس لئے مخلوقات کا ظاہر بھی آپ ہی قرار پائے ہم

اصطلاحِ صوفیاء میں ذاتِ مطلق نے جب تعینِ اوّل میں نزول فرمایا تو کل اشیاء غیب و شہادت کا ظہور بسبیلِ امتیاز علمِ حق میں ثابت ہوگیا تو اس مقام کے بہت سے نام ہیں، ان میں ایک نام ابو الارواح بھی ہے کیونکہ یہ حقیقتِ محمدی کی تفصیل کا ظہور ہے۔

شد محمد از خدا اصلِ وجوداتِ تمام　　　ظاہرا خود شد محمد، در حقیقت وجہِ عام

ترجمہ: ذاتِ خداوندی سے ہی حقیقتِ محمدی تمام موجودات کی اصل قرار پائی، جس کا ظہور بصورت محمد ہوا جو حقیقت میں اُسی کا جلوہ ہے۔

تشریح: حقیقت میں اگر کسی کا وجود ہے تو وجودِ مطلق کا ہے اور کسی کی ذات ہے تو وہ ذاتِ خداوندی ہے لیکن جب اس وجودِ مطلق نے جس کو لاتعین کہتے ہیں مرتبۂ تعین میں نزول فرمایا اور معرفتِ ذات کے عشق سے تعینات کو قبول فرما کر مرتبۂ تنزیہہ سے مرتبۂ تشبیہ میں آیا تو اس وقت سب سے پہلے حقیقتِ محمدی کا ثبوت ہوا، اس کے بعد تمام مخلوقات کا ظہور ہوا، گویا فیضِ خداوندی بواسطۂ حقیقتِ محمدی تمام اشیاء کا مظاہر ہوا، اسی کو مصنف کہتے ہیں کہ وجود تو خداوند تعالیٰ کا ہے لیکن اسی کے ارادے سے حقیقتِ محمدی میں جو نور باعثِ تخلیقِ کائنات ہے وہ بھی اللہ ہی کا ہے، اس کی ظاہری صورت تو حقیقتِ محمدی کی ہے لیکن حقیقت میں وہ صفتِ ذات ہے۔

آنچہ پیدا کرد حق از نورِ احمد ہر کجا　　　نورِ وحدت نورِ احمد نیست فرقے مطلقا

ترجمہ: (جہاں اور جس جگہ جو کچھ خداوند تعالیٰ نے پیدا کیا ہے وہ نورِ احمد ہی سے ہے، نورِ احمد تو حقیقت میں نورِ وحدت ہی ہے، اس میں بالکل فرق نہیں)

تشریح: اس سے پہلے شعر میں حقیقتِ محمدی کا بیان تھا، اب یہ بتلا رہے ہیں کہ صورِ علمیۂ حق میں سب سے پہلے حقیقتِ محمدی کا ثبوت ہوا، اس کے بعد اس کی تفصیلی صورت کے نقوش کا اثبات ہے، اس کو ہم نورِ احمد کے ثبوت سے تعبیر کریں گے، اس طرح درجہ بدرجہ تعینات کے بیان سے ایک ترتیب قائم ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہ نور بھی نورِ مطلق کا نور ہے اور جو کچھ بھی موجود فی الخارج ہیں ان تمام اشیاء میں بواسطۂ نورِ وحدت نورِ احمدی کا جلوہ ہے

اور چونکہ نورِ ذات عینِ ذات ہے اور نورِ احمد نورِ ذات ہے جو بواسطۂ تعین اوّل مرتبۂ ثبوت میں آیا ہے اس لئے نورِ احمد اور نورِ وحدت ایک ہی ہو گئے۔

خود احد بُد میم را در خویشتن جائے بداد   از محبت خویشتن را نام احمد می نہاد

ترجمہ: وہ خود اَحَدْ تھا، پھر میم کو اپنے اندر جگہ دیدی اور اپنی محبت کی وجہ سے اس کا نام اَحْمَدْ رکھا۔

تشریح: وجودِ مطلق کی صورت میں ازل سے ذاتِ خداوندی اپنے وجود سے مَوْجُوْد، اپنی حیات سے حَیّ اور اپنے جمالِ ذاتی سے جَمِیْلْ تھی۔ ان تمام صورتوں میں وجودِ مطلق کی شان "کنزِ مخفی" کی تھی۔ اس وقت یہ کنزِ مخفی ہر قسم کے تعینات سے منزہ تھا۔ اس کو مقامِ احدیت سے تعبیر کرتے ہیں اور "خود احد تھا" کا مطلب بھی یہی ہے۔ پھر جب اس نے بتقاضائے اَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ سے اپنی ذاتِ لاتعین کو صفات کی تعینات سے آراستہ کیا تو سب سے اوّل نورِ احمدی کا ظہور کیا، یہی مطلب ہے "میم کو احد میں جگہ دینے کا" کیونکہ اس نور کا ظہور، نورِ ذات سے ہے، اور نورِ ذات عینِ ذات ہے، اس لئے کہ ان دونوں میں اندماجی تعلق ہے، ذات نے اپنا تعارف اسی آئینہ میں کیا ہے تو یہ نورِ ذات کے لئے دلیل نہیں کیونکہ ذات محتاجِ دلیل نہیں ہے، بلکہ نور کے ثبوت کے لئے ذات خود دلیل ہے اور اس کا ظہور اس طرح کیا کہ اس نور کو بغیر حلول اور اتحاد کے اپنا نور فرمایا۔ اگرچہ ظہور کے اعتبار سے یہ نور شائبۂ غیریت رکھتا تھا مگر یہ شائبہ بھی عجیب پُراسرار ہے، اسی شائبہ کے عارض ہونے سے ظہورِ کونین ہوا، اگر شکِ حقیقی واقع نہ ہوتا تو مقامِ اَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ کی رفعت و عظمت بھی عیاں نہ ہوتی۔ ؎

جز و احد بے میم نہ غیبے نہ شہودے   جز و احمد با میم نہ بودے نہ نمودے

یہاں میم کو احد میں جگہ دینے کا مطلب حلول و اتحاد نہیں اس لئے کہ کسی جنس کا غیر جنس میں داخل ہونا حلول ہے اور ایک چیز بعینہٖ دوسری شئے ہو جائے یہ اتحاد ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت لَمْ یَلِدْ اور لَمْ یُوْلَدْ بھی ہے لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ بھی اسلئے کوئی صورت حلول و اتحاد کی نہیں پیدا

ہوتی۔ یہاں پر نہ اتحاد ہے نہ حلول، بلکہ نزول ہے اور نزول بھی اعتباری ہے جو فہم سے قریب تر کرنے کیلئے صوفیا حضرات استعمال کرتے ہیں اور نزولِ ذات سے ذات کی رفعت و تنزیہہ میں کوئی فرق نہیں واقع ہوتا، خالق، خالق ہی رہتا ہے اور مخلوق، مخلوق ہی رہتی ہے۔

خود احد خود ہست احمد در حقیقت استدال   خود عیاں و آشکار آمد بشکل این و آں

ترجمہ: وہ خود ہی احد ہے اور خود احمد ہے، اس حقیقت کو سچ مانو اور خود ہی مختلف شکل میں آشکار و ظاہر ہوا ہے۔

تشریح: اس لئے کہ فی الحقیقت نور محمدی، نور ذات ہے جس کا پرتو بھی انفصالی نہیں ہو سکتا بلکہ اتصالی کہنا بھی اس مقام پر انفصال ہے کیونکہ وجود مطلق انفصال و اتصال سے پاک ہے اور ذات بحت، اطلاق سے بھی صرافت رکھتی ہے چہ جائیکہ صفت نور سے، اور اس دوئی کے پردے میں یکتائی کی عینی شہادت یہ حدیث پاک ہے (مَن رَاٰنِی فَقَدْ رَاَی الْحَقَّ جس نے مجھ کو دیکھا اس نے حق کو دیکھا اور یہی نور ذات، نور احمدی کے پردے میں اسماء و صفات کے لامحدود مظاہر میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہو گیا ہے مگر اس کثرتِ ظہور میں بھی اس کی شان یکتائی میں کوئی فرق نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے نہ ہو گا۔)

از فروغ نور احمد، ذات آدم آفرید   خود شدہ صورت گر ایں حسن و خود گشتہ پدید

ترجمہ: نور احمد کے فروغ ہی سے اس نے آدم کی ذات کو پیدا فرمایا، خود ہی اس حسن کو بنانے والا ہے اور خود ہی اس حسن میں ظاہر ہوا ہے۔

تشریح: نور احمد پرتو ہے ذات کا، اور ذات واحد ہے، اس کی صفات لامحدود ہیں، ان لامحدود صفات کے آئینہ میں ذات نے تجلی فرمائی، جب نور احمد بھی نور ذات سے متعلق ہے تو جس قدر صفات، ذات میں تھیں ان کا مجموعہ انسانِ کامل کو بنا کر تمام صفات کا پرتو انسان کو بنایا، اسی کو اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ کہا جاتا ہے، تو جب اس صورتِ جامعہ میں اپنی ہی صفات کو ظاہر فرمایا ہے تو گویا خود ذات کا ظہور فرمایا اور اس صورت کا بنانے والا کون ہے؟ ظاہر ہے

کہ خالق کے سوا اور کون ہو سکتا ہے، معلوم ہو گیا کہ جس طرح اس کو اپنی ذات کے تعارف سے عشق تھا اور صفات کے پردے میں ظہورِ ذات فرمایا اسی طرح جب حقیقتِ جامعہ میں یہ صفات ظاہر ہوئیں تو گویا خود ان صفات کے آئینہ میں وجودِ ذات ظہور پذیر ہوا ہے، حضرت شاہ تراب علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

خدا کی شکل پر آدم بنا ہے — یہ آدم کیا عجب عالم بنا ہے
تعین میں نہیں جز لاتعین — وہی بے چون سب عالم بنا ہے

متصف از دو صفتہائے جمال و ہم جلال — ظاہرش روئے جلال و باطن روئے جمال

ترجمہ: وہ دو صفات جمال و جلال سے متصف ہے۔ اس کی ظاہری صورت تو جلال ہے اور باطنی صورت جمال ہے۔

تشریح: جس طرح ذاتِ مطلق مرتبہ لاتعین میں صفتِ جمال و جلال سے متصف تھی، اسی طرح تعین اوّل کو قبول کرنے کے بعد بھی ان دونوں صفات سے اتصافِ ذات برقرار ہے اور تعین اول ہی حقیقتِ محمدی ہے، اس لئے اس وقت بھی دونوں صفات سے تعین اول متصف ہوگا۔

دوسرے مصرعے کا مطلب بھی یہی ہے کہ جس طرح جمالِ ذات لامحدود حجاباتِ عظمت و کبریائی میں جسکو جلال سے تعبیر کرتے ہیں پوشیدہ ہے اور اس کی یہ پوشیدگی جس طرح مرتبہ لاتعین میں ہے اسی طرح تعین اوّل میں بھی ہے، جمال کو مستور ہونے کی وجہ سے باطن اور جلال کو ساتر و کاشف ہونے کی وجہ سے ظاہر سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

پردہ شد روئے جمالی را جلالی بالیقیں — نیست فرق از یک دگر را بلکہ ہر دو ہمقریں

ترجمہ: بیشک چہرۂ جمال کے لئے جلال حجاب ہو گیا ہے ورنہ حقیقت میں یہ دونوں صفات اس طرح ایک دوسرے سے ہمقرین ہیں کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

تشریح: چونکہ کُنتُ کَنزًا مَخفِیًا میں جمالِ ذات کا پوشیدہ ہونا بتلایا گیا ہے اور اس پوشیدگی کو بحجرِ ظلمات اور پردہائے عظمت و جلال سے متصف کیا گیا ہے، اس لئے ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ جلال جمال کے لئے حجاب ہوگیا ہو جبکہ حقیقت یہ نہیں، کیونکہ صفات و شیونِ ذات ظہور و مظہر کے اعتبار سے اگرچہ آپس میں متفاوت اور متضاد ہیں مگر درجۂ ذات میں سب واحد ہیں اور یکساں ہیں اس لئے صفتِ جمال کو جلال میں مندرج اور صفت جلال کو جمال میں مندمج قرار دیتے ہیں اور جس طرح ان دونوں صفات کی کیفیت مرتبۂ لاتعین میں تھی، مرتبۂ تعین اوّل میں بھی ہے۔

باطنِ باطن کمالِ نورِ وحدت لازوال ظاہر آمد با صور بہر شناسائی جمال

ترجمہ: وہ ہمیشہ باقی رہنے والے نورِ وحدت کے کمال کا باطن الباطن ہے جو مختلف صورتوں میں تعارفِ ذات کے لئے ظاہر ہوا ہے۔

تشریح: نورِ وحدت کے بارے میں بتلایا جاچکا ہے کہ وہ ازلی ہے اور ابدی بھی اور جسقدر صفاتِ ذات ہیں سب درجۂ کمال میں ہیں، جس طرح ذات میں کوئی کمی بیشی اور نقص نہیں ہے، اسی طرح صفات میں یہ شانِ کمال بدرجۂ اتم موجود ہے اور چونکہ یہ نورِ ذات حجاباتِ عظمت و جلال میں مستور ہے اس لئے یہ نورِ وحدتِ لازوال اپنی شانِ کمال کے ساتھ پردۂ جلال میں ہے، نورِ ذات کی یہ کیفیتِ باطن تو اس وقت ہے جبکہ یہ مرتبۂ لاتعین میں ہے لیکن جب لاتعین، تعینِ اوّل قبول کرتا ہے تو پھر یہ نور، نورِ محمدی کے نام سے موسوم ہوتا ہے، تو اب عبارت کی وضاحت اس طرح ہوگئی کہ نورِ ذاتِ مطلق باطن تھا پردۂ جلال کا اور نورِ محمدی باطن ہے نورِ ذاتِ مطلق کا، اس لئے یہ باطن کا باطن قرار پایا جو مرتبۂ تعین میں بصورتِ جمالِ محمدی اپنے جمالِ ذات کے تعارف کے لئے اسماء و صفاتِ مختلفہ کے روپ میں ظاہر ہوا ہے۔

ظاہر اُو، باطن اُو، نقش او، نقّاش او عشق ذاتش عاشق و معشوق احدیست دو

ترجمہ: (اُو) ظاہر بھی وہی ہے باطن بھی وہی، نقش بھی وہی نقّاش بھی وہی، عشق ہی اس کی ذات ہے اس لئے عاشق و معشوق دو نہیں ایک ہی ہیں۔

تشریح: وہی ظاہر ہے، تمام مظاہر میں اسماء و صفات کے واسطے سے اسی کا ظہور ہے اور تمام

اشیاء میں اگر کسی کا وجود ہے تو وہ ذاتِ وحدت ہی کا ہے اور تمام نقوش میں بھی وہی جلوہ گر ہے اور ان نقوش کا بنانے والا بھی وہی ہے۔ اس لئے کہ جب کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًا فرماکر فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ کا اظہار کیا تھا اس وقت ذاتِ پروردگار کے علاوہ کچھ بھی موجود نہ تھا کَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ مَعَہٗ شَیْءٌ تو پھر عالم ظہور میں کون آیا اور عالمِ باطن میں کون تھا اور یہ جو نقوش عالم نظر آرہے ہیں یہ کس کے ہیں اور ان کا نقاش کون ہے۔ ان سب کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ ذاتِ واحد ہے، اسی طرح اس نے جب اپنی ذات کے تعارف کو محبوب جانا تو محب اور محبوب دونوں تو ایک ہی ہیں یعنی خود ہی عاشق ہے اور خود ہی معشوق ہے اور خود ہی اس پردے میں ظاہر ہوا ہے تو سارا معاملہ تو اسی ایک ذاتِ واحد سے متعلق ہوا، معلوم ہوا کہ ہر صورت میں خواہ وہ جمالی ہو یا جلالی، اور ہر شے میں صرف اسی ذاتِ پاک کا تصرف اور وجود ہے، اسی طرح عشق ایک ذات ہے جس کے دو ظہور ہیں، ایک مرتبہ لاتعین میں اور ایک مرتبہ تعین میں، ایک عاشق اور ایک معشوق بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ظہور حقیقی بھی ذاتِ واحد ہی کا ہے جو درجۂ تعین میں بصورتِ نورِ وحدت بہ لباسِ حقیقتِ محمدی جلوہ گر ہوا ہے ؎

عشق شاہ و عشق ماہ و عشق راہ — بر سرِ خود عشق می پوشد کلاہ

عشق صورت در جمالِ خود نمود — جملہ اشیاء در حقیقت عشق بود

اوست احمد اوست آدم شد مصور بے نشاں — بے نشانیش دلیل زاں نشانِ حق عیاں

ترجمہ: وہی احمد ہے وہی آدم ہے جس نے بے نشانی کی شکل اختیار کرلی ہے، بے نشانی ہی اس کی نشانی ہے اور اسی بے نشانی سے حق کا نشان ظاہر ہے۔

تشریح: وہی ذاتِ پاک جو مرتبۂ تنزیہہ میں وجودِ مطلق ہے اور جس کی حقیقت مکنون المکنون غیب الغیوب اور منقطع الاشارہ ہے، جس کی کُنہ کی یافت تو درکنار، وہاں تک خیال، قیاس گمان و وہم کی بھی رسائی نہیں، اس کا کوئی نشان اور ٹھکانہ نہیں، اسی ذاتِ لاتعین نے جب تعینات کے پردوں میں جلوہ گری کی تو کبھی احمد کے نور میں ظہور پذیر ہوا اور کبھی حقیقتِ جامعہ

جس کو انسان کہتے ہیں، اس کی شکل میں ظاہر ہوا، اور اس شان کے ساتھ کائنات کے ہر ذرہ میں ظاہر ہوا کہ شدتِ ظہور سے اس کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ کہاں ہے، اور کسی ایک جگہ مقید نہ ہونا اور سب جگہ موجود ہونا بھی اس کے وجود کی نشانی ٹھہری، جس طرح کہ آنکھ کی پتلی جو اپنے محاذ میں ہر شے کو دیکھتی ہے لیکن اپنے وجود سے اس قدر قریب ہے کہ اس شدتِ قربت کی وجہ سے اپنے وجود کو نہیں دیکھ سکتی۔ اسی طرح سورج کو سب دیکھتے ہیں کہ موجود ہے اور روشن ہے لیکن اس کی روشنی اس قدر واضح ہے کہ اس کی حقیقت تک پہونچنے میں بھی اس کی روشنی حجاب ہو گئی، بالکل اسی طرح ذاتِ واحد کے شدتِ ظہور کی وجہ سے اس کا نشان اور ٹھکانہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ کبھی نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد کہہ کر اس قربت کا اظہار ہوتا ہے، اور کبھی فرمایا جاتا ہے کہ فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ اور کبھی آفاق میں جلوہ ہائے ذات کا معائنہ کرنے کیلئے کہا جاتا ہے، بہرحال حقیقت یہ ہے ؎

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے — پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

بے نشانی می نگر ایں راز پاکِ کردگار — ہست در قرآن و اخبار ایں حکایت بیشمار

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی نشانی کے پاک راز کو غور سے دیکھو، اس کے واقعات قرآن وحدیث میں بہت ہیں۔

تشریح: یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز میں جلوہ گر ہے اور تمام اشیاء کی عارضی ہستی کا وجود اس ہستی مطلق کے وجود سے ظہور پذیر ہوا ہے لیکن ان تمام نشانیوں کے باوجود پروردگار کی نشانی کا پتہ نہیں چلتا، کیونکہ وہ تو لطیف ہے اور اس کی پاک ذات لامحدود ہے، پھر کس طرح کسی مخصوص مکان یا خاص شے میں اس کے جلووں کو محدود کیا جا سکتا ہے، اس کی شان تو عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے، کائنات کے ہر ذرے میں اس کا نور موجود ہے جس کی مثالیں قرآن و احادیث میں بکثرت ہیں۔

بیچگونیش چگون و بے نشانیش نشاں — می نگر در خلق خالق در عیان و در نہاں

ترجمہ: عدم کیفیت ہی اس کی کیفیت ہے اور بے نشانی ہی اس کی نشانی ہے، خالق کی

مخلوق کے ظاہر و باطن میں تم اس کی حقیقت کو دیکھ لو۔

تشریح: اس سے پہلے شعر میں بتلایا گیا تھا کہ پروردگار کی بے نشانی میں راز کیا ہے۔ یہاں پر اس کی مزید تشریح کے طور پر مصنف فرماتے ہیں کہ کسی ایک کیفیت میں اس وجودِ مطلق کی موجودگی کا احساس نہ ہونا ہی اس کی چگونگی کا مظہر ہے، کسی خاص شے میں اس کے کسی خاص نشان کا نہ پانا ہی اس کے نشان کی سب سے بڑی دلیل ہے، اس لئے کہ اس کی ذاتِ پاک دلیل سے مبرا ہے بلکہ دلیل اس کی ذاتِ پاک کی محتاج ہے کیونکہ وہ تو اس قدر ظاہر ہے کہ تمام مخلوقات میں اس کا نور ظاہر و باطن میں موجود ہے، اس کے ہی حکم سے تمام موجودات نے ظاہری روپ اختیار کیا اور ان تمام اشیاء میں اسی کی قدرتِ کاملہ کارفرما ہے تو جو ہستی اس قدر عیاں ہو اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت کیا ہے، اور جو اس قدر لامحدود ہو کہ اس کو کسی ایک شئے میں محصور نہ کیا جا سکتا ہو تو یہی عدمِ محصوریت اس کی سب سے بڑی نشانی ہے۔

بے تعدد موج نور آمد ز بحرِ بے نشاں ۔۔۔ بحر اصل و موج فرعش نیست فرقے اندراں

ترجمہ: لامحدود موجیں اس بحرِ بے نشان سے ظاہر ہوئیں، حقیقت یہ ہے کہ سمندر اصل ہے اور موج اس کی ایسی شاخیں ہیں کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

تشریح: مسئلۂ وحدۃ الوجود کا اظہار کرتے ہوئے مصنف فرماتے ہیں کہ ذاتِ مطلق تو ایک بحرِ بے نشان و بیکراں ہے اور جس طرح سمندر میں لہریں اٹھتی ہیں اور ان لہروں کا کوئی شمار نہیں، اسی طرح سے اُسی ذاتِ مطلق سے تمام اشیاء کا ظہور ہے اور تمام مخلوقات اسی کی لامحدود اسماء و صفات کے مظاہر ہیں اور جس طرح لہروں کا وجود سمندر سے شروع ہوتا ہے اسی طرح کائنات کی تمام اشیاء کا وجود بھی ذاتِ مطلق کے وجود سے وابستہ ہے اور جس طرح ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سمندر کی حقیقت اور لہروں کی حقیقت الگ الگ ہے اسی طرح ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وجودِ اشیاء یا وجودِ مخلوق خالق کے وجود سے حقیقت میں الگ ہے بلکہ اس طرح ایک ہی شئے کا مختلف مراتب میں، اور مختلف اشکال میں ظہور ہو رہا ہے جن سب کی حقیقت ایک ہی ہے۔

اوست دریا ما ہمہ ہستیم امواج اے پسر ہر کہ بیند غیر افتد در فراقے۔ الحذر

ترجمہ: وہ ذات پاک تو مثل دریا کے ہے اور ہم اس کی لہریں ہیں جو کوئی اس کو غیر سمجھے گا وہ حقیقت سے دور ہو جائے گا۔

تشریح: جس طرح امواج کا وجود دریا سے ہے اسی طرح ہمارا یعنی تمام مخلوقات کا وجود بھی اُسی ذاتِ پاک سے ہے، کیونکہ یہ تمام کائنات اس کی شیونِ ذاتیہ کی مظہر ہے، صرف ظاہری صورت بدل گئی ہے، ورنہ حقیقت میں ایک ہی ہستی مطلق کے وجود سے تمام اشیاء وجود پذیر ہیں، جس طرح دریا کی لہریں دریا ہی سے پیدا ہوتی ہیں اور دریا میں مل کر اپنے وجود کو فنا کر دیتی ہیں تو اگرچہ ان لہروں کو بعینہ دریا تو نہیں کہہ سکتے اور نہ دریا کو لہریں کہہ سکتے ہیں، دریا دریا ہے اور لہریں لہریں، ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان لہروں کا وجود ظاہری اور باطنی دریا ہی کا مرہونِ منت ہے، اگر دریا نہ ہوتا تو لہریں کہاں سے پیدا ہوتیں، اگرچہ ظہور کی حالت میں لہروں کی ظاہری صورت، دریا کی صورت سے الگ ہو جاتی ہے لیکن انجام اور آغاز یعنی لہروں کے دونوں کنارے اپنی بقاء میں اپنے وجود میں جس طرح دریا سے متعلق تھے اسی طرح اپنی فناء میں بھی دریا سے متعلق ہیں، کیونکہ ذاتِ مطلق کی صفات و شیونات ظہور میں ایک دوسرے سے ممتاز ہیں اور بعض جگہ ایک دوسرے سے متضاد ہیں مگر مآلِ کار کے اعتبار سے آغاز کی طرح وجودِ واحد سے ہی منسلک ہیں۔

جو یہ سمجھتے ہیں کہ دریا الگ ہے اور لہریں الگ ہیں تو وہ حقیقت سے بہت دور ہیں، اور دوئی کے فراق میں ہیں، خداوند تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔

تا چہ خواہی کنہ ذاتِ وحدتِ پروردگار بود ذاتِ وے نہ از عالم نشانے آشکار

ترجمہ: پھر کس طرح تم پروردگار کی ذاتِ واحد کی حقیقت تک پہونچ سکو گے، اس کی ذات تو اس وقت بھی موجود تھی جب کسی بھی عالم کا نام و نشان تک نہ تھا۔

تشریح: مصنف حسبِ عادت اپنی بات کی دلیل بیان کر رہے ہیں اور سوالیہ انداز میں کہتے ہیں کہ ہم نے موج اور دریا کو ایک کیوں کہا؟ نیز جو ہماری بات کو خلافِ حقیقت سمجھتا ہے وہ

خود ادراک حقیقت سے بہت دور ہے، اور ان دونوں کی دلیل یہ ہے کہ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ ذاتِ خالق اور مخلوق ایک دوسرے سے الگ ہے تو یہ بتلایئے کہ جب کسی بھی مخلوق کا ظہور نہیں ہوا تھا کیا اس وقت ذاتِ مطلق موجود نہ تھی؟ ظاہر بات ہے کہ وہ ذاتِ پاک ازلی و ابدی ہے، اور جب کچھ نہ تھا اس وقت بھی وجودِ مطلق موجود تھا اور جب کچھ نہ رہے گا تب بھی موجود رہے گا، اب یہ بتلایئے کہ جب وجودِ مطلق کے سوا کچھ موجود نہ تھا تو پھر ان تمام اشیاء کا اور اٹھارہ ہزار عالم کا وجود کہاں سے آیا؟ لفظ "کُن" کا حکم کس شئے پر کیا گیا؟ کیا اس حقیقت تک کوئی پہنچ سکتا ہے، ہرگز نہیں، کیونکہ ہماری طاقت، ہماری عقل اور ہمارے ذرائع محدود ہیں اور وہ ذات لامحدود ہے، اس کی حقیقت تک رسائی محال ہے، صوفیاء حضرات نے اپنے کشف سے جو مراتب تنزلاتِ ستہ کی صورت میں متعین کیے ہیں اور کُنتُ کَنزاً مَخفِیًّا کی تشریح کی ہے اسی کی روشنی میں بس یہاں تک ہم پہونچ سکے ہیں کہ وجودِ مطلق نے اپنے شیوناتِ ذاتیہ جو اس کے اندر ازل سے موجود تھیں، اُن کو کُن کا محکوم بنایا اور ظہور کا حکم فرمایا۔ فَیَکُوْنُ کی صورت میں اس کی لامحدود صفات کا ظہور ہوا، اور یہ صفات بھی اس کی ذات سے الگ نہیں بلکہ جیسا کہ ہم صفات و ذات کے بیان میں تشریح کر آئے ہیں کہ ایک کا دوسرے سے اندراج واندماج کا تعلق ہے، بس ہماری رسائی یہیں تک ہے کہ ؎

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا ۔۔۔ بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے

نیست اندر ذاتِ شے تبدیل و ہم تغیرِ حال ۔۔۔ نے کم و افزوں باوصاف است آں عین الکمال

ترجمہ: نہ اس کی ذات میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ حال میں، اور نہ اس ذات باکمال کی صفات میں کوئی کمی و زیادتی ہوتی ہے۔

تشریح: یہ بھی ایک شک کا جواب ہے، وہ یہ کہ جب ازل میں ذاتِ واحد کنزِ مخفی کی شان کے ساتھ موجود تھی اور اس وقت ذاتِ مطلق کے علاوہ کسی دوسری شئے کا وجود نہ تھا، تو اس ذاتِ پاک نے عشقِ ذات کی وجہ سے تعارفِ ذات کو پسند فرمایا اور تخلیقِ کائنات ہوئی تو اس ظہور سے

اس کی تنزیہہ کی شان میں کوئی فرق پیدا ہوا یا نہیں، یا اس قسم کے تغیرات سے اس کی ذات پر کوئی اثر واقع ہوا یا نہیں ؟ اسی کا جواب دے رہے ہیں کہ تغیر اور تبدیل کا اثر اس پر ہوتا ہے جس کا وجود اپنے موجود ہونے میں دوسرے کا محتاج ہو اس لئے کہ جس مقدار اور کیفیت کے ساتھ حالات اور اسباب ہوں گے اس شئے کا وجود اسی انداز میں تغیر پذیر ہوتا رہے گا اور یہ حقیقت ہے کہ ذاتِ واجب الوجود اپنے وجود میں کسی دوسرے سہارے کی محتاج نہیں کیونکہ وہ ازلی ہے، اور ازل وہ ہے جس کی ابتدار کی تعیین نہ کی جا سکے تو پھر کسی کے تاثر کا کیا سوال ہوتا ہے الآن کما کان کی شان اب بھی موجود ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ اور جس طرح اس کی ذات تغیر و تبدل سے پاک ہے اسی طرح اس کی صفات بھی جس کمال اور شان کے ساتھ ازل میں موجود تھیں تو ان صفات واسمار کے ظہور سے ان میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ صفات بھی اس ذات پاک کی طرح ازلی وابدی ہیں، جیساکہ اس کا بیان گذر چکا ہے۔

گر بگوئی ذاتِ او تبدیل گشتہ ایں زماں ۔۔۔ ایں سوالت را جوابات اند بیحد اے جواں

ترجمہ: اگر تم یہ کہو کہ اس وقت اس کی ذاتِ پاک میں تبدیلی واقع ہوئی ہے تو آپ کے اس سوال کے جوابات بہت زیادہ ہیں۔

تشریح: یہاں ایک نکتہ کی طرف مصنف اشارہ فرما رہے ہیں کہ حدیث قدسی میں فرمایا گیا ہے کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًّا اس میں اس ذاتِ پاک کی تنزیہہ مکمل طور پہ بیان کی گئی ہے اور آپ نے بھی اس کی حقیقت کی معرفت تک عدم رسائی کا اعتراف کر لیا ہے اور قرآن و احادیث پاک میں اس کا اعلان صراحتًا کر دیا ہے اور پھر لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْئٌ کہہ کر تمثیل کا دروازہ بھی بند کر دیا گیا تھا، پس کس طرح اس کو تنزلات کی قیود میں لا کر مرتبہ تشبیہ میں بیان کیا گیا ؟ کیا یہ تبدیلی اس کی ذات کی تبدیلی کی غماز نہیں ہے ؟

اسی کا جواب دے رہے ہیں کہ آپ کے اس سوال کے جواب تو بیشمار ہیں، مختصر طور پر ہم اس کو ذکر کرتے ہیں کہ

وادنِ تمثیلِ اصلِ ذاتِ وحدت در مجاز ہست جائز این چنیں گفتند دانایانِ راز

ترجمہ: مجاز کی صورت میں ذاتِ واحد کی حقیقت کی مثال دینا جائز ہے اور رازہائے معرفت کے جاننے والوں نے یہ کہا ہے۔

تشریح: مصنف فرماتے ہیں کہ حقیقت میں تو یہ بات صحیح ہے کہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ، کہ اُس کی طرح کوئی بھی شئے نہیں ہے، تو اس سے ذاتِ پروردگار کی عدمِ مثلیت کا ثبوت ہوتا ہے کہ اس کی مثل کوئی شئے نہیں، لیکن اس کی مثال دی جاسکتی ہے اور سمجھانے کے لئے اس ذات منزہ کو مرتبۂ تشبیہ میں بیان کیا جاسکتا ہے، جو حضرات بحرِ معرفت کے غوّاص ہیں انھوں نے مثال کے ذریعہ ذات وصفات کی تشریح کی ہے، خود قرآنِ پاک میں وَلَہُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی فرمایا گیا ہے۔ اور یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ اور اسی طرح بہت سے مقامات پر اس کو صورتِ مجاز میں تشبیہ دے کر ذہن سے قریب کیا گیا، احادیث میں بھی اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے لئے ہاتھ پاؤں، نظر اور قوتِ سماعت کا ثبوت ہے اور یہ شبہ اس لئے ہوا کہ مثل اور مثال کو مترادف سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ دونوں الگ الگ ہیں، کیونکہ واجب تعالیٰ کے لئے مثل تو ثابت نہیں، اسلئے کہ مثل کہتے ہیں مشارک فی النوع کو اور واجب تعالیٰ کے لئے کوئی نوع نہیں جس میں کسی کی مشارکت ہو سکے، اس لئے واجب تعالیٰ کے لئے اِثباتِ مثلیت محال ہے، بخلاف مثال کے کہ مثال کا اطلاق مشارک فی الوصف پر ہوتا ہے اور وصف کلّی مشکّک ہے جس میں افراد مختلف اور متفاوت ہوتے ہیں، ان میں کمی زیادتی ہوتی ہے پس واجب تعالیٰ میں جو وصف اکملیت کے ساتھ ہوگا وہ ممکن الوجود میں اضعفیت کے ساتھ ہوگا، تو اس مجازی صورت میں تشبیہ دینے کا مطلب یہ نہیں کہ حقیقتِ ذات میں کوئی کمی ہوگئی ہے بلکہ اس کی شانِ اکملیت اَلْاٰنَ کَمَا کَانَ کی شان کے ساتھ متصف رہے گی۔

از سوادِ حرف الحق ذات ایں عین است ببیں حرف را تبدیل آید در سیاہی نیست ایں

ترجمہ: تم دیکھو کہ حرف کی سیاہی سے یقیناً اس ذات کا تعارف ہوتا ہے، حروف کی شکل

تو بدل جاتی ہے لیکن سیاہی کی حقیقت تو نہیں بدلتی۔

تشریح : حقیقت کی مثال مجاز سے دینے کی صورت مصنّف اس طرح بیان فرمارہے ہیں کہ اگر آپ سیاہ روشنائی سے لفظِ اَللہ لکھیں تو یہ اسم پاک بعینہٖ ذاتِ پاک کا تعارف کرائے گا، گویا ان حروف کی حقیقت ذات کی حقیقت سے بالکل مطابقت رکھتی ہے اور اسی روشنائی سے اگر دوسرے الفاظ لکھے جائیں تو ان حروف کی شکل تو بدلتی رہے گی اور شکل حروف ہی کے اعتبار سے الفاظ ظاہری کے معنی بھی بدلتے رہیں گے لیکن ان حروف والفاظ کی تبدیلی سے سیاہی کی حقیقت تو نہیں بدل سکے گی، اور نازیبا الفاظ اسی روشنائی سے لکھے تو ان الفاظ کی نازیبائی کے اثرات روشنائی میں بھی پیدا ہو جائیں ایسا تو نہیں، سیاہی کی حقیقت تو یکساں رہے گی، الفاظ کی صورت ظہور بدلتی رہے گی۔ اسی طرح اسماء وصفات میں شانِ خداوندی کے ظہور سے، واجب الوجود کی ذات میں کوئی کمی نہیں ہوگی، یہاں اس بات کا بھی خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہے کہ صفات میں بھی کوئی تفاوت اور فرق نہیں بلکہ تمام صفات کی حقیقت بھی یکساں ہے صرف ظہور اور عدم ظہور میں فرق ہوتا ہے کہ ممکنات میں حسب استعداد ممکن صفات کا درجہ بدرجہ ظہور ہوتا ہے صفات کی حقیقت برقرار رہتی ہے۔

موج را تبدیل آمد بحر را تبدیل چیست　　　　وجہ را تغییر آمد، ذات را تغییر نیست

ترجمہ : لہروں میں تبدیلی ہوتی ہے لیکن سمندر کو تبدیلی سے کیا واسطہ، صورت میں تبدیلی ہوتی ہے، ذات میں کوئی تبدیلی نہیں۔

تشریح : یہاں پر مصنّف ایک بہت باریک فرق کا بیان فرمارہے ہیں، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ پانچ چیزیں ہیں، ایک تو حقیقتِ ذات، ایک حقیقتِ صفات، ایک ظہورِ ذات، ایک ظہور صفات، ایک مظاہر صفات۔ حقیقتِ ذات میں اور حقیقتِ صفات میں تو تبدیلی کا امکان ہی نہیں کیونکہ دونوں ازلی ابدی ہیں، اور ذات کا ظہور صفات کی صورت میں ہوا ہے اس لئے تیسری صورت بھی تبدیلی سے منزہ ہے، چوتھی صورت صفات کا ظہور، تو فی نفسہ ظہور میں صفات

بھی یکساں ہیں، فرق اگر ہے تو مظاہرِ صفات میں ہے، یعنی صفات کے مظاہر میں صفات کی شان مظہر کے استعداد کے مطابق ہوتی ہے، اسی شانِ مظہریت کو قرآن پاک میں "شَاكِلَة" سے تعبیر کیا گیا ہے اور ارشادِ باری قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ آپ فرما دیجئے کہ ہر ایک اپنی اپنی استعداد کے مطابق اکتسابِ فیض کرتا ہے، اسی مضمون کی طرف مشیر ہے۔

معلوم ہوا کہ صورتِ ظہور جس کو مظہرِ موج کہیں گے اس میں تو فرق پیدا ہو سکتا ہے کہ کوئی چھوٹی ہے، کوئی بڑی ہے اور کوئی بہت بڑی ہے مگر لہروں کے مظاہر کے تفاوت سے سمندر کی وسعت اور حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اسی طرح مظاہرِ قدرت آپ کے سامنے ہیں کہ ان میں بھی آپس میں فرق ہے، جس قدر استعداد جس میں قبولیتِ فیض کی تھی اسی قدر فیضیاب ہوا، چیونٹی کو اس کی بساط کے مطابق لوازماتِ حیات سے نوازا گیا، ہاتھی کو اس کی جسامت کے اعتبار سے نوازا گیا، تو یہ فرق فی نفسہ ظہورِ صفات میں نہیں بلکہ مظہرِ صفات میں ہے، اس کا خیال رکھنا ضروری ہے تاکہ فرقِ مراتب باقی رہے، جن کتب میں صفات کے ظہور میں فرق بتایا گیا ہے ان کا مقصد بھی یہی ہے کہ مظاہرِ صفات میں فرق ہے نہ کہ فی نفسہ ظہورِ صفات میں۔

باز اندر نور بنگر چند نوعے وجہِ آں   می شود از ذرہ افزوں نے بذاتش فرق داں

ترجمہ: پھر تم نور کی حقیقت میں غور کرو تو اس کی بہت سی صورتیں معلوم ہوں گی، ذرات کی کثرت سے مظہرِ نور میں کثرت ہو جاتی ہے حقیقتِ نور میں فرق نہیں آتا۔

تشریح: مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا یہ نظریہ ہے کہ ذات و اوصاف کی حقیقت ہر حال میں یکساں رہتی ہے اور جو فرق ظاہر میں محسوس ہوتا ہے وہ مظاہرِ اشیاء کے باہم متفاوت ہونے کی وجہ سے ہے؛ اپنے اسی مدعا کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے بحر اور موج کی مثال پیش کی تھی، اب دوسری مثال بھی اسی نظریے کی تائید میں ہے کہ نور ایک وصف ہے، اس میں فی نفسہ کمی زیادتی نہیں ہوتی، البتہ کثرتِ مظاہر سے کثرتِ اعتباری ہو جائے گی، کثرتِ ذات نہ ہوگی، اسی طرح قلتِ مظاہر سے قلتِ اعتباری ہوگی قلتِ حقیقی نہ ہوگی، مثلاً جب یہ نور ایک معمولی ذرے میں

ظہور پذیر ہوگا تو وہ ذرہ اس نور کا مظہر ہوگا، لہٰذا وہ ذرہ اپنی صلاحیت کے مطابق ہی مرکزِ نور سے فیضیاب ہوگا اور اسی اعتبار سے اس میں نور کا ظہور ہوگا اور جب بہت سے ذرات ایک جگہ جمع ہو جائیں تو ان تمام ذرات کی کثرت سے اور ان میں ظہور کے سبب نور کی حقیقت میں تو زیادتی نہیں ہوگی بلکہ یہ کثرت اعتباری ہوگی باعتبار مظاہر کے۔

باز بنگر می زنند از موم صورتہا بسے   فرق آید در صُوَر لیکن ببیں ذاتش یکے

ترجمہ: پھر تم دیکھو کہ موم سے بہت سی صورتیں بناتے ہیں، اس طرح سے موم کی ظاہری صورت میں تو فرق آجاتا ہے لیکن اس کی حقیقت ایک ہی ہے۔

تشریح: یہاں مصنف پہلی مثال سے زیادہ واضح مثال دے کر اپنے مدعا کا ثبوت پیش کر رہے ہیں کہ اوصاف و شیونات میں جو فرق محسوس ہوتا ہے وہ بعینہ اوصاف و شیونات میں نہیں ہے بلکہ یہاں بھی مظہر کے اعتبار سے فرق ہے جس طرح موم کا ایک ٹکڑا لے کر اس سے بہت سی چیزیں بنائی جائیں تو ان تمام چیزوں کی شکل وصورت تو ظاہر میں الگ الگ ہوگی اور ان ہی کی مناسبت سے ان کے ناموں میں بھی فرق ہوگا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود موم کی حقیقت ایک ہی رہے گی اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

بس کم و افزوں تبدل آید اندر در جہاں   ایں تمامی نیست ہرگز در کمالِ ذاتِ آں

ترجمہ: بس کمی زیادتی دنیا میں مظاہر کے اعتبار سے ہے اور یہ کمی بیشی اس ذات کے کمالات کو ختم کرنے والی نہیں ہے۔

تشریح: دنیا میں دو ہی قسم کی اشیاء ہیں، ایک لطیف، دوسرے کثیف، ان دونوں اقسام کی حیثیت میں کمی زیادتی باعتبار لطافت کے ہو یا کثافت کے، یہ سب اشیاء کے مظاہر کے اعتبار سے ہے اور اس کمی زیادتی سے ذاتِ شئے کے کمالات پر یعنی حقیقتِ ذات پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کی ذات کی طرح اس کے اوصاف بھی اسی شان کے ساتھ باقی رہتے ہیں جیسا کہ متعدد مثالوں سے ظاہر ہو چکا ہے۔

چوں تبدل نیست در ذات مجاز ظاہری	کے تبدل در حقیقی ذات وحدت بنگری

ترجمہ: جب ذات مجاز ظاہری میں ظہورات مختلفہ کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، تو پھر کس طرح ذات وحدت کی حقیقت میں تم کو تبدل نظر آتا ہے۔

تشریح: یعنی جب اشیائے کائنات جن کا وجود ظاہری بھی مجازی ہے اور وہ اپنے ظہور میں بھی دوسرے کی محتاج ہیں، جب یہ مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہو کر مختلف صورتیں اختیار کرتی ہیں اور ان کی حقیقت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی جیسا کہ متعدد مثالوں سے ظاہر ہو گیا ہے تو پھر وہ ذاتِ واجب الوجود جو تمام صفات سے بدرجۂ کمال متصف ہے اس میں مختلف شیونات و اوصاف میں ظاہر ہونے سے کس طرح تبدیلی ہو سکتی ہے۔

در حقیقت ذاتِ بحر و موج می باشد یکے	در تبدل غیر ایں آں نیست می داں بیشکے

ترجمہ: حقیقت میں سمندر اور موج کی ذات تو ایک ہی ہے، بے شک ظاہری صورت کے بدل جانے سے یہ موج اس سمندر کا غیر نہیں ہو جاتی۔

تشریح: جس طرح سمندر اپنے وجود میں لہروں کا محتاج نہیں بلکہ لہریں اپنے وجود میں سمندر کی محتاج ہیں اور لہروں کا وجود سمندر کے وجود سے ہے، لیکن ظاہری شکل کے اعتبار سے ایک کو سمندر کہتے ہیں، دوسرے کو موج کہتے ہیں، موج کو سمندر نہیں کہہ سکتے اور سمندر کو موج نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس ظاہری شکل میں تبدیلی کی وجہ سے یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کا غیر نہیں بلکہ جو حقیقت سمندر کی ہے بعینہ وہی حقیقت موج کی بھی ہے

کثرتِ امواج بحرے را نگرداند فزوں	گرچہ دیدی از تموج گشت کثرت رہ نموں

ترجمہ: موجوں کی زیادتی سمندر کو زیادہ نہیں بناتی اگرچہ حالتِ تموج میں دیکھنے سے سمندر بہت بڑا محسوس ہوتا ہے۔

تشریح: یہاں پر بھی اسی حقیقت کو بیان کر رہے ہیں کہ سمندر کی جو حقیقت سکون کے وقت رہتی ہے وہ حقیقت بعینہ اس وقت بھی موجود رہے گی جب اس میں جوار بھاٹا آتا ہے، اگرچہ

اونچی اونچی اور ہیبت ناک موجوں کی وجہ سے سمندر کی ظاہری صورت تو بوقتِ سکون بالکل ہی بدلی ہوئی نظر آتی ہے، لیکن ان کثرتِ امواج کی وجہ سے ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ سمندر کی ماہیت اور حقیقت ہی بدل گئی، ہاں ظاہری صورت، مظاہر کے بدلنے کی وجہ سے بدل گئی ہے۔

نے فزونی و کمی در وصفِ بحر است اے پسر   از رموزِ بحرِ وحدت گفتمت بس مختصر

ترجمہ: اے بیٹا سمندر کے اوصاف میں کمی اور زیادتی نہیں ہوتی ہے۔ میں نے تم سے مختصر طور پر وحدت کے راز بیان کر دئے ہیں۔

تشریح: نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق کے بیان کا یہ آخری شعر ہے، مصنف علیہ الرحمۃ نے وحدۃ الوجود کے دائرے میں اختصار کے ساتھ بہت ہی عمدہ انداز میں ترتیب کے ساتھ درجہ بدرجہ جو رموز بیان کئے ہیں یہ ان کی بحرِ معرفت کی غواصی پر روشن دلیل ہے

آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ مصنف نے آغازِ عنوان کے بعد شروع کے سات اشعار تک نورِ محمدی کا تعارف کرایا اور پھر اس کے بعد "شد محمد از خدا اصلِ وجوداتِ تمام" سے تنزلاتِ ستہ کی روشنی میں درجۂ وحدت کا تعین، ذاتِ لاتعین کے لئے فرما کر "نورِ محمدی" کو نورِ ذات سے متعلق فرمایا اس کے بعد "بے نشانی می نگر ایں رازِ پاک کردگار" سے اس حقیقت کی وضاحت کی کہ ذاتِ لاتعین نے احدیت سے وحدت میں نزول فرمایا تو نورِ محمدی کی حقیقت کا وجود ہوا اور پھر اس نور سے تمام کائنات کی تخلیق کی گئی تو پھر نورِ ذاتِ وجودِ مطلق ہی نورِ محمدی کے روپ میں متعارف ہوا اور جس قدر شیونات و اوصاف و اسماء ہیں ان سب میں، کائنات کے ہر ذرے ذرے میں اگر کوئی شئے موجود ہے تو وہ نورِ محمدی ہے اور یہ نورِ محمدی کس کا نور ہے، ظاہر بات ہے کہ ذاتِ مطلق کے نورِ مطلق سے ہی متعلق ہے لیکن اس سب کے بعد بھی ذاتِ خالق کی احدیت میں، اس کی صفات کی شان میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ یہ نہیں کہ تنزلاتِ ستہ میں نزول کرنے کی وجہ سے حقیقتِ خداوندی میں کسی قسم کی تبدیلی کا بھی شائبہ ہو بلکہ ذات تو اپنی تمام صفاتِ کمال کے ساتھ جس طرح ازل میں تھی، آج بھی اس قدر لامحدود اوصاف و شیونات میں ظاہر ہونے کے باوجود بھی وہی شان

وہی آن بان رکھتی ہے اور آئندہ یعنی ابد تک یہی شان باقی رہے گی۔

اسی طرح مرتبۂ وحدت میں نزول فرما کر نورِ محمدی کے روپ میں کس کا جلوہ ہے؟ بس اسی کو اصل عنوان کا موضوع سمجھنا چاہیئے اور بہت اطمینان سے مصنّف کے اس نظریے کی تفصیل پڑھنے کے بعد ہی فیصلہ کرنا چاہیئے۔ یہی وہ رموزِ وحدت ہیں جن کو مصنّف نے بہت ہی اختصار، اور جامعیت کے ساتھ بیان کر کے ایسے نازک مسئلہ کو حل کر دیا ہے جس میں ذرا سی لغزشِ قدم بھی موجبِ خسران ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق اور باطل میں تمیز کرنے کی اور فہمِ سلیم کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

روئے تو ظاہر است بعالم نہاں کجاست — گر او نہاں بود بجہاں خود عیاں کجاست

عالم شدست مظہرِ حسن و جمالِ تو — اے جاں بگو چہ مظہر و ظاہر جہاں کجاست

دربیان یقین ثلٰثہ

یقین کی تین اقسام کا بیان

موج را آں بحر داں ایں است پس علم الیقیں — می شود عین الیقینش گر بچشمِ دل بہ بیں

ترجمہ: موج کو تم سمندر ہی سمجھو، بس یہی علم الیقین ہے اور اگر دل کی آنکھ سے دیکھو گے تو پھر یہ عین الیقین ہوگا۔

تشریح: صفات کے آئینہ میں ذات کی معرفت کا تعلق انسان کی فکر سے بہت گہرا ہے فکر میں جس قدر پختگی اور قلب و دماغ میں جس قدر ہم آہنگی ہوگی اسی قدر منزلِ مقصود کا راستہ آسان ہو جاتا ہے۔ مصنّف علیہ الرحمۃ یہاں سے ان مراحلِ تصوراتی کی تشریح کر رہے ہیں جہاں سالک خیال و قیاس، وہم و گمان کے دائرے سے نکل جاتا ہے اور قال سے حال میں پہونچ جاتا ہے، اب یقین کا دروازہ اس پر کھل جاتا ہے اور قلبِ سالک پر حقائق کا انکشاف ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ وہ ترقی کرتے کرتے اس منزل تک پہونچ جاتا ہے جس مقام کے لیئے شیخ

سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے

بدرد یقیں پردہ ہائے خیال　　　نماند سراپردہ الا جلال

یقین کی تین قسمیں ہیں ۱۔ علم الیقین ۲۔ عین الیقین ۳۔ حق الیقین ۔ فرماتے ہیں کہ اگر موج کو تم یہ سمجھ لو کہ یہ بعینہ سمندر ہے تو اس علم کا نام جس سے یہ یقین حاصل ہوا ہے علم الیقین ہے یعنی اگر تم کو یہ یقین ہو جائے کہ یہ تمام کائنات وجودِ واحد کے اسمار و صفات کا مظہر ہے اور جو کچھ ہے اسی کی ذاتِ پاک سے موجود ہے تو اس کو علم الیقین کہتے ہیں اور یہ سب سے کم درجہ ایمان کا ہے اور ان لوگوں کا مقام ہے جو محسوسات کے ذریعہ معقولات کا یقین حاصل کرتے ہیں جیسے اہلِ ظواہر اور متکلّمین ۔

لیکن اگر اس منزلِ علم الیقین سے گذر کر قلبِ سالک میں تجلیات باری کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی اور قلب کی آنکھیں کھل گئیں جن کے ذریعہ مشاہدۂ تجلّیات کی توفیق مرحمت کردی گئی تو یہی عین الیقین ہے اور یہ درجہ عارفین کا ہے جن کو مشاہدہ کے ذریعہ یقین کی نعمت سے نوازا جاتا ہے اور جب عارف اس درجۂ مشاہدہ سے ترقی کر کے درجۂ معائنہ تک پہونچتا ہے تو اس کو حق الیقین کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور یہ درجہ محققین صوفیار کا ہے اور یہ آخری درجہ اس اعتبار سے ہے کہ یہاں پر احوال کی سرحد ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد جو درجات میسّر ہوتے ہیں ان میں ایسی کیفیات کا ظہور ہوتا ہے جو الفاظ کی گرفت سے آزاد ہیں جن کی تعبیر الفاظ کے ذریعہ ناممکن بھی ہے اور ممنوع بھی جس کی حقیقت یہ ہے کہ

آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

پردہ از عین الیقین تا در دلت نہ کشادہ ہاں　　　ہر چہ بینی بالیقیں در دل نہ بینی عین آں

ترجمہ: عین الیقین کے ذریعہ جب تک تمہارے قلب سے حجابات نہ اٹھائے جائیں گے اس وقت تک تم جو کچھ مشاہدہ کرو گے اس کے عین کو قلب میں نہ پا سکو گے ۔

تشریح: ذکر و فکر سے جب آئینۂ قلب صاف ہو جاتا ہے تو اس وقت جو کچھ مشاہدہ

ہوتا ہے اس پر پختہ یقین ہو جاتا ہے اور جب تک قلب پر حجابات پڑے رہیں گے اس وقت تک یہ کیفیت حاصل نہیں ہو سکتی اور جب تک یہ کیفیت حاصل نہ ہو کہ جو کچھ مشاہدات ہیں ان کا بعینہ عکس قلب میں محسوس نہ ہو اس وقت تک منزل کی طرف پیش رفت کبھی نہیں ہو سکتی بلکہ صرف علم الیقین ہی کا درجہ حاصل ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ آئینۂ قلب کو گرد و غبارِ تشکیک سے بالکل صاف و شفاف کر لیا جائے تاکہ مشاہدۂ تجلّیات کے قابل ہو جائے۔

از خودی گم شو کہ یابی نعمتِ حق الیقیں　　　محو سازی نام خود از دفترِ ہستی چنیں

ترجمہ: اپنے وجود سے تو بے خبر ہو جا کہ حق الیقین کی دولت پا سکے اور ہستی موہومہ کے دفتر سے اپنے نام کو بھی بالکل مٹا دے۔

تشریح: یہ یقین کی تیسری اور سب سے اعلیٰ قسم ہے جس کو حق الیقین کہتے ہیں، مصنفؒ کہتے ہیں کہ تو ذاتِ وحدہ کے وجود کی حقیقت کو اس طرح تسلیم کرلے کہ تیری ہستی کا کوئی وجود نہ رہے اور وجود ہی نہیں تیرا نام و نشان بھی باقی نہ رہے تو پھر تجھ کو حق الیقین کی وہ نعمت لازوال عنایت کی جائے گی جو بارگاہ ایزدی سے محققینِ صوفیاء کو عطا کی جاتی ہے۔ یہی وہ بلند مقام ہے جس کو مقامِ بقا اور مقامِ تحیّر سے موسوم کیا جاتا ہے جہاں پر سالک کا بھی کوئی نام و نشان باقی نہیں رہتا صرف وجودِ مطلق کی لامحدود تجلیات کا معائنہ ہوتا ہے اور یہ جب ہی ہوتا ہے کہ تم اپنی خودی ناسوتی و وہمی سے بھی گذر جاؤ۔

یہاں ایک بات دھیان میں رکھیے کہ یقین کے مراتب میں حصولِ فیضان کے درجہ بدرجہ شعبے ہیں مثلاً علم الیقین کے درجہ میں مکاشفہ ہوتا ہے اور عین الیقین کے درجہ میں مشاہدہ ہوتا ہے اور حق الیقین کے درجہ میں معائنہ ہوتا ہے۔

غیر گم گشتن ز خود باشد وصالِ حق محال　　　نیست و ہم گم شو ز خود تا تو رسی در ذوالجلال

ترجمہ: اپنی ہستی کو فنا کئے بغیر وصالِ حق ناممکن ہے تو نیست و نابود ہو جا، تاکہ صاحبِ جلال تک تیری رسائی ہو جائے۔

تشریح : یہ بات تو ظاہر ہے کہ وجود کے لائق تو صرف ایک ہی ذات ہے اس ذاتِ واجب الوجود کے علاوہ سب ہست نما نیست ہیں، ان کا وجودِ ظاہری صرف پردۂ امکان تک محدود ہے ، نہ اس کی صفات کو ثبات ہے نہ ذات کو، بس ذات ازلی ابدی وہی واجب الوجود ہے، اپنی ہستی کو فنا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات کے سامنے ہماری ذات کی کوئی حقیقت نہیں اور اس کی صفات کے سامنے ہماری صفات لاشئے ہیں، اس مقام فنائیت میں جس قدر بھی توفیق ایزدی شاملِ حال ہوتی ہے اس کے اعتبار سے ہی ذاتِ ممکن کالا شئے ہو کر ذاتِ واجب الوجود سے اتصال ہو جاتا ہے۔ اسی کو وصالِ ذات کہتے ہیں۔ ؎

ہو فنا ذات میں کہ تو نہ رہے　　　تیری ہستی کا رنگ و بو نہ رہے

اور ذوالجلال تک رسائی کا مطلب یہ ہے کہ تجلیاتِ ذات پر پردہ ہائے جلال کا غلبہ ہے اور جلال اپنے اندر جمال کو سموئے ہوئے ہے، جب ہستی سالک ہیبت جلال و عظمت سے فنا ہو جائے گی تو لامحالہ جمالِ ذات کا معائنہ میسّر ہوگا اور قطرہ کی معراج یہی ہے کہ وہ اپنی ہستی کو فنا کر کے سمندر کی وسعت اختیار کرے۔

باز گویم مختصر این سہ یقیں را خوشتریں　　　بے مثال وجہ ظاہر معرفت علم الیقیں

ترجمہ : میں دوبارہ یقین کی تینوں اقسام کو عمدہ طریقہ سے بیان کرتا ہوں، صورتِ ظاہری کی مثال کے بغیر کسی شے کو جاننے کا نام علم الیقین ہے۔

تشریح : مصنف رحمۃ اللہ علیہ دوسرے طریقہ سے جو بہت آسان اور عمدہ ہے یقین کی تینوں اقسام کا بیان کر رہے ہیں تاکہ سمجھنے میں اور بھی زیادہ آسانی ہو جائے۔ سب سے پہلا درجہ علم الیقین کا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کی ظاہری شکل و صورت آپ کے سامنے موجود نہ ہو، یا ظاہری شکل و صورت آپ نے دیکھی نہ ہو، صرف سننے کے ذریعہ یا پڑھنے کے ذریعہ اس کا یقین آپ کو ہو جائے اس کو علم الیقین کہتے ہیں جیسے کہ مدینہ منورہ اگرچہ آپ نے دیکھا نہیں لیکن کتابوں کے ذریعہ یا ان حضرات کے ذریعہ جنہوں نے اس مقام پاک کی زیارت

کی ہے۔ آپ کو معلوم ہوا کہ مدینہ منورہ ایک شہر ہے تو اس طرح کا یقین ہو جانا علم الیقین کہلائے گا۔

از کشودِ چشمِ دل دیدارِ حق عین الیقیں انفصال از خود بود حق الیقیں اے مردِ بیں

ترجمہ: دل کی آنکھ کھلنے سے تجلیاتِ باری کا دیدار ہونا عین الیقین ہے، اپنی ہستی سے بیگانہ ہو جانے کا نام حق الیقین ہے۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ذریعہ جب تصفیۂ قلب ہو جاتا ہے اور قلب سے تمام کدورتیں ختم ہو جاتی ہیں تو آئینۂ قلب مجلّٰی ہو جاتا ہے تو اس میں تجلیاتِ باری کا عکس قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، اس کو کیفیت مشاہدہ کہتے ہیں، جو ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ قلب کی آنکھوں سے ہوتا ہے اور قلب کی آنکھیں کھلنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اس قدر صفائی پیدا ہو جائے کہ وہ تجلیاتِ باری کا عکس قبول کرنے لگے۔ اس وقت جن تجلیات کا مشاہدہ سالک کو ہوگا تو اسی مشاہدہ کا نام عین الیقین ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جیسا اوپر ہم نے مدینہ منورہ کی مثال دی تھی وہاں صرف بذریعۂ علم اس کے وجود کا یقین حاصل ہوا تھا اور اب خود حاضر ہو کر اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا۔ اسی طرح تجلیاتِ باری کا خود مشاہدہ کر لینا عین الیقین ہے۔

تیسری منزل حق الیقین ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی ہستی جو کہ حقیقت میں نیستی ہے اور اس کی ہستی وہمی ناسوتی ہے اس سے بھی بے خبر ہو جانا اور اس بات کا یقینِ کامل ہو جانا کہ اگر کوئی موجود ہے تو ذاتِ واحد ہے، میری ذات اس کے مقابلہ میں بالکل نیست ہے جب اس حقیقت کا انکشاف ہو جائے گا تو سلوک عین حق اور حق عینِ سلوک ہو جائے گا، حق کے علاوہ کسی اور چیز کا وجود ہی نہ رہے گا، اسی کا نام حق الیقین ہے۔

شرح ایں سیر اندکے با تو بگویم از ہزار شرحِ وصل از راہِ ایقاں میکنم اے مردِ کار

ترجمہ: ہزار ہا باتوں سے انتخاب کر کے اس سیر کی تھوڑی سی تشریح میں نے تمہارے سامنے کی ہے، اب میں یقین کے ذریعہ وصال الی الحق کی تشریح کرتا ہوں۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کی معرفت کے راستے غیر محدود ہیں لیکن صوفیاء حضرات نے راہِ معرفت

میں درجہ بدرجہ ترقی کرنے اور قدم بڑھانے کو لفظ "سیر" سے تعبیر کیا ہے اور اس کے چار درجے متعین کیے ہیں، سب سے پہلا سیر مع اللہ" اس کا مطلب یہ ہے وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ یعنی جہاں کہیں بھی تم ہو وہاں وہاں خدا موجود ہے" اور یہ تجلی عمومی ہے اور جب درجہ یقین کا آغاز ہوتا ہے جس کو علم الیقین کہتے ہیں اس وقت "سَيْرٌ مِنَ اللهِ" کا درجہ ہے اور اس کے بعد جب عین الیقین کا درجہ حاصل ہوتا ہے تو یہ "سَيْرٌ اِلَى اللهِ" کا درجہ ہے، اس کے بعد سب سے آخری درجہ یقین کا جس کو حق الیقین کہتے ہیں اس وقت "سَيْرٌ فِي اللهِ" کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور یہی منزلِ مقصود ہے، اسی کو انفصال از خویش اور وصال بحق کہتے ہیں یا" فانی زخویش واصل بحق" سے تعبیر کر لیجئے، اسی وصال کی مزید تشریح مصنف فرما رہے ہیں۔

استشہاد وجہ باطن در دل است از کشفِ حال　　　انفصال از خویشتن کلّی بود نامِ وصال

ترجمہ: وارداتِ قلبی کا دل میں انکشاف ہونا، مشاہدۂ باطن کہلاتا ہے اور اپنے وجود سے مکمل طور پر بے خبر ہونے کا نام وصال ہے۔

تشریح: یہاں مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس سیر کی تشریح فرما رہے ہیں جس کا ذکر اس سے قبل شعر میں کیا ہے اور ہزار طریقوں میں سے یہ مختصر طریقہ پسند کیا ہے، اس شعر میں عین الیقین کے ذکر سے اس طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ جب تصفیۂ قلب سے تجلیاتِ باری کا نزول و انکشاف ہونے لگتا ہے تو گویا اس وقت سَيْرٌ مِنَ اللهِ شروع ہو گئی اور جب یہ سیر من اللہ بفضل ایزدی اس درجہ پر پہونچ جاتی ہے جس کو سَيْرٌ مِنَ اللهِ اِلَى اللهِ کہتے ہیں تو اس وقت آغاز بھی اللہ سے ہوتا ہے اور انجام بھی اللہ سے، جو ذات واجب الوجوب کی حقیقت ہے کہ وہ ازلی بھی ہے اور ابدی بھی، تو پھر اس صورت میں جبکہ ذات واجب الوجود شانِ ازلیت و ابدیت کے ساتھ جلوہ گر ہو جائے تو پھر کسی دوسری شئے کا وجود کہاں باقی رہ جائے گا، اس لئے کہ ذات واجب الوجود کے مقابلہ میں تو سب چیزوں کا وجود درجۂ امکان میں ہے اور جب استیلائے ہستی ہو گیا تو نیستی وہی ناسوتی خود بخود نیست ہو گئی، اب نہ ذاکر رہا نہ سالک باقی رہا نہ

ذکر رہا، بس مذکور یعنی ذاتِ حق ہی باقی رہ جاتی ہے، اس ذاتِ حق کی بقاء اور ذاتِ سالک کی فنا کا نام وصالِ ذات ہے، یہاں پر اتحاد اور حلول کا شبہ نہ ہونا چاہیئے اور نہ یہ مطلب ہے کہ سالک اپنی زندگی کو ہی ختم کر ڈالے بلکہ اپنی ہستی کو نیستی اور ذاتِ واجب الوجود کو ہستی مطلق یقین کرنا اور اپنی ہستی سے بالکل بے خبر ہو جانا، اسی کا نام وصال ہے۔

وصل دو نوع است آمد ایں روایت معتدل   نوعِ اوّل دیدنِ حق در خیال از چشمِ دل

ترجمہ: معتدل روایت کے مطابق وصال کی دو قسمیں ہیں، دل کی آنکھوں سے تصور میں تجلیاتِ باری کا مشاہدہ کرنا پہلی قسم ہے۔

تشریح: روایتِ معتدل، یعنی ایسی روایت جو افراط و تفریط سے الگ ہے، اس کے مطابق دیدارِ خداوندی کی دو صورتیں ہیں، کیونکہ وصالِ ذات کے سلسلے میں اختلاف ہے جو حضرات وصالِ ذات کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک میں لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ کا مطلب یہ ہے کہ اس کو جب نظریں پا نہیں سکتیں تو پھر کس طرح وصالِ ذات کا تحقق ہو سکتا ہے، علاوہ ازیں وہ واجب الوجود ہے اور مخلوق ممکن الوجود، واجب کا اتصال ممکن کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے، مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وصال کی دو صورتیں ہیں اور دونوں ممکن الحصول ہیں، ایک صورت تو یہ ہے کہ آئینۂ قلب میں تجلیاتِ باری کا مشاہدہ کیا جائے، اسی مشاہدۂ صفات و تجلیات کا نام وصال ہے اور دوسری قسم جنت میں دیدار کی ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

ہر کرا ایں وصل نے ہر نیک او را جرم ہاست   رویتِ حق را وصالِ ذاتِ او گفتند راست

ترجمہ: جس کسی کو یہ وصال میسر نہیں اس کی ہر نیکی بھی گناہ ہے، اسی لئے جن حضرات نے تجلیاتِ باری کو وصالِ ذات کہا ہے صحیح ہے۔

تشریح: مقصد یہ ہے کہ جب تک دل کی آنکھیں اس قدر روشن نہ ہو جائیں کہ وہ پروردگار کی تجلیات کا مشاہدہ نہ کر سکیں اس وقت تک عین الیقین نہ پیدا ہوگا اور جب تک عین الیقین کی منزل سے سالک نہ گذرے گا تو اس کی عبادت میں شانِ عبدیت نہ پیدا ہو سکے گی،

اس لئے کہ حدیث پاک میں ہے کہ خدا کی عبادت اس طرح کرو کہ اس کو تم دیکھ رہے ہو اور یہ نہ ہو سکے تو یہ تصور کرو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے اور یہ کم درجہ ایمان کا ہے۔ اس لحاظ سے جب تک سالک راہ طریقت کو پہلا درجہ حاصل نہ ہوگا تو اس کی عبادت میں للٰہیت و خلوص کی شان نہ پیدا ہو سکے گی اور جب عبادت میں خلوص و للٰہیت نہ ہوگی تو اس کی قدر و قیمت عند اللہ کچھ نہ ہوگی۔ گویا سالک نے اپنی عمر عزیز کو رائیگاں کیا اور اس انداز میں جو نیکیاں بھی صادر ہوئیں وہ قابل اجر و ثواب نہ ہوئیں تو گویا یہ بھی ایک جرم ہی ہوا۔

اسی لئے جن حضرات نے مشاہدۂ عینی کو وصالِ ذات کہا ہے بالکل صحیح کہا ہے، کیونکہ ذاتِ مطلق تک رسائی محال ہے، تجلّیات کے مشاہدہ سے جب ہستی ناسوتی کی فنا کی منازل طے ہو جاتی ہیں، اور مقام بقا حاصل ہو جاتا ہے تو گویا وصالِ ذات ہی ہو گیا کیونکہ وجود تو ایک ہی ہے، اور وہ ہے ذاتِ مطلق، جب سالک نے اپنے وجود کو نیست سمجھ لیا تو صرف ذات باقی رہ گئی، اور اس صورت میں ذاکر، مذکور، ذکر سب ایک ہی ہو جاتے ہیں، اسی کو وصالِ ذات کہتے ہیں۔

مستم چناں بکن کہ ندانم ز بیخودی　　　　در عرصۂ خیال کہ آمد، کدام رفت

دیدِ حق نوعِ دوم اندر بہشت از چشم سر　　　　نیست ذاتے را بذاتِ حق وصالِ سربسر

ترجمہ: رؤیتِ حق کی دوسری قسم جنت میں ان ظاہری آنکھوں سے حق تعالیٰ کو دیکھنا ہے لیکن وہاں بھی ذاتِ حق کا وصال مکمل طور پر نہیں ہوگا۔

تشریح: دنیا میں تو ظاہری آنکھوں سے ذات وحدہٗ کا دیدار محال ہے، صرف تجلّیات کے آئینہ میں مشاہدۂ قلبی ہی کو وصالِ ذات سے تعبیر کیا گیا تھا۔ اب دوسری صورت جنت میں دیدارِ خداوندی کی ہے۔ مصنّف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جنّت میں ان ہی آنکھوں سے دیدار ہوگا اور پروردگار عالم ان میں تاب دیدار عطا فرمائیں گے لیکن وہاں بھی دیدارِ ذات کی نوعیّت ایسی نہیں ہوگی جس کو یہ کہا جا سکے کہ ہم نے ذاتِ مطلق کے جمال کا مکمل مشاہدہ کر لیا، کیونکہ وہ ذات جس طرح کنزِ مخفی ازل میں تھی تو ابد تک اس کی یہ شانِ تنزیہہ باقی رہے گی اور جس

طرح لَا یُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ اس کی حقیقت آج ہے وہ آئندہ بھی رہے گی، اس دیدار کی نوعیت کیا ہوگی اس کے بارے میں مصنف فرماتے ہیں۔

در بہشت ایں وصلتِ نظارۂ آں کردگار بیشک وبے شبہ ہمچوں ماہِ کامل نور بار

ترجمہ: جنت میں اس پروردگار کی ذات کے وصال کا نظارہ، بے شک وبے شبہ نور بکھیرتے ہوئے ماہ کامل کی طرح ہوگا۔

تشریح: یعنی جنت میں وصال ذات بصورتِ دیدار تجلیات ہی ہوگا اور اس کی نوعیت ایسی ہی ہوگی جس طرح چودھویں رات کا چاند، کہ اس کا نور تمام اطراف میں بکھرا ہوا ہوتا ہے اور ایک عالم اس کے نور سے جگمگ جگمگ ہوجاتا ہے اسی طرح اہل جنت بھی دیدار ذات سے بہرہ ور ہوں گے، حدیث پاک میں بھی اسی طرح فرمایا گیا ہے اِنَّکُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّکُمْ کَمَا تَرَوْنَ الْقَمَرَ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ، یقیناً تم عنقریب یعنی آخرت میں اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جیسے چودھویں کے رات کے چاند کو دیکھتے ہو، اس حدیث پاک سے دیدار کی نوعیت معلوم ہوگئی۔

کس بروزے بنگرد یک بار، کس ہفتاد بار کس بسالے، کس بماہے، کس بہ بیند ہفتہ وار

ترجمہ: کسی کو دیدار خداوندی ایک دن میں ایک مرتبہ ہوگا اور کسی کو ستّر بار ہوگا، کسی کو سال میں ایک مرتبہ، کسی کو ایک ماہ میں اور کسی کو ایک ہفتہ میں۔

تشریح: یہاں پر کیفیتِ دیدار بتلاتے ہوئے مصنف فرماتے ہیں کہ جنت میں دیدار کی یہ کیفیت ہوگی کہ کسی کو دن میں ایک بار ہوگا اور کسی کو ستّر بار، اور کسی کو ایک ماہ میں، کسی کو ایک ہفتہ میں، یعنی جس قدر قرب ذاتِ خداوندی سے ہوگا اسی قدر دیدار سے فیضیاب ہوگا، اگرچہ نوعیت دیدار یکساں ہوگی لیکن حسب استعدادِ قبولیت اس کیفیت سے مشرف ہوگا۔

رویتِ حق را ہمی گویند وصلِ حق بداں ایں چنیں رویت شود اندر بہشتِ جاوداں

ترجمہ: بس دیدار حق ہی کو وصالِ حق کہتے ہیں، اس قسم کی تجلی جنت میں ہمیشہ ہوگی۔

تشریح: اور یہ وصالِ ذات جو بصورتِ تجلیات باری جنت میں ہوگا، اس کا سلسلہ بہشت

میں ہمیشہ جاری رہے گا، کیونکہ جب عالمِ ناسوت کی کثافت سے جسم پاک ہوگیا تو پھر لطافت سے سرفراز ہوگا اور اس کے بعد اس کی حیات جاودانی ہوگی، اس وقت میں جو حجاباتِ کثیف دیدارِ ذات (بصورتِ تجلیات) میں حائل تھے مرتفع ہوجائیں گے تو پھر رابطہ ہمہ وقت اسی ذاتِ پاک سے قائم رہے گا اور جس میں جس قدر لطافت وقربت ہوگی اسی قدر وہ تجلیاتِ دیدار سے فیضیاب ہوتا رہے گا اور جنت میں چونکہ خلودِ ابدی ہمیشہ ہمیش کی سکونت ہوگی اس لیے وہاں دیدارِ خداوندی جس کو وصالِ ذات کہتے ہیں اس سے ہمیشہ ہمیشہ نوازا جائے گا۔ اَللّٰھُمَّ وَفِّقْ لَنَابِہٖ۔

دربیانِ چہار منازلِ حق شناسی

اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کی چار منزلوں کا بیان

رازِ اندر راز گویم در طریق ہر چہار   بندگیِ ظاہرِ حق را شریعت می شمار

ترجمہ: رازِ معرفت کے چار طریقوں کا راز میں بیان کرتا ہوں، احکامِ ظاہری کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت کو شریعت سمجھو۔

تشریح: اس سے پہلے عنوان میں مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے یقینِ ثلٰثہ کا بیان کرکے یہ بتلایا تھا کہ تمام کائنات کا وجود سمندر کی لہروں کی طرح ہے جو سمندر کے وجود سے ظہور پذیر ہوتی ہیں، اسی طرح یہ تمام کائنات بھی واجب الوجود کی ذاتِ مطلق کے اسماء وصفات کا مظہر ہے، اس کے بعد قرب کو وصال سے تعبیر کیا تھا، اب اس قرب کے معیار کی طرف متوجہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کے چار معیار ہیں۔ سب سے پہلا اور بنیادی معیارِ قرب شریعت ہے، شریعت کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے خدا، رسول، جملہ انبیاء، کتبِ سماویہ، جملہ ملائکہ، حشر ونشر پر زبانی اقرار اور قلبی یقین کا اظہار کیا جائے، کیونکہ اس کے بغیر کوئی عمل بھی بارگاہِ خداوندی میں قابلِ قبول نہ ہوگا، ایمان لانے کے بعد جن امور کا حکم کیا گیا ہے اُن پر عمل کرنا اور جن امور سے منع کیا گیا ہے اُن سے رُک جانا اسی کو شریعت کہیں گے۔ جو بھی اس طریقۂ کار سے انکاری ہے وہ وصالِ ذات کی بُو بھی

نہ سونگھ سکے گا۔

حق شناسی را بدانی معرفت گفتند راست   باطنا دیدن جمالش را طریقت زہ صفاست

ترجمہ: یہ بات بالکل صحیح کہی ہے کہ حق شناسی ہی معرفت ہے اور باطن میں اس کے جمال کا مشاہدہ کرنا طریقت ہے۔

تشریح: دوسرا درجہ معرفت کا ہے اور تیسرا درجہ طریقت کا، جب احکام ظاہری پر عمل استوار ہو جاتا ہے اور قرب خداوندی کا پہلا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے، اب اس کو مزید ترقی عطا کی جاتی ہے وہ اس طرح سے کہ اس کو صفاتِ باری میں غور و فکر کی توفیق میسر ہو جاتی ہے اور سالک یہ سوچنے لگتا ہے کہ میں جس ذاتِ وحدہ لاشریک لہٗ کی عبادت کر رہا ہوں اس کی صفات کس قدر عظیم الشان اور بے مثال ہیں۔ اس طرح غور و فکر سے، انفس و آفاق پر نظر غائر ڈالنے سے معرفتِ صفات حاصل کر لیتا ہے لیکن ابھی تک اس کی یہ معرفت صرف علم الیقین کے درجہ میں ہے، تو اس معرفتِ صفات کو معرفتِ ذات سے تعبیر کرتے ہیں، یہ قرب کا دوسرا درجہ ہے۔

تیسرا درجہ طریقت ہے، طریقت کا مطلب یہ ہے کہ جن صفاتِ ذات کا علم اس کو ہوا تھا اب اس کے نتائج قلب پر مرتب ہونے لگے اور آئینۂ قلب میں ان صفات کی تجلیات کا عکس آنے لگا اور اس عکس تجلیات کا مشاہدہ سالک کو نگاہِ باطن سے ہونے لگا، تو یہ طریقت کے درجہ تک پہونچ گیا۔

گم شدن در دیدنش باشد حقیقت جانِ جاں   شرح کردم ہر یکے زیں چار منزل بیگماں

ترجمہ: اس کی صفات کے مشاہدہ میں گم ہو جانا حقیقت ہے، میں نے حق شناسی کی چاروں منزل کی تشریح کر دی۔

تشریح: یہاں مصنف رحمۃ اللہ علیہ چوتھا اور سب سے اعلیٰ درجہ بیان فرما رہے ہیں کہ جو تجلیات آئینۂ قلب میں منعکس ہو رہی ہیں وہ درحقیقت ذاتِ مطلق واجب الوجود کی ہیں جس کی ذات پاک ازلی و ابدی ہے اور میری ہستی اس کے مقابلہ میں نیست ہے، جب اس ہستی کا ثبوت اور اپنی

نیستی کا مکمل یقین ہو جائے گا تو گویا مجاز نے حقیقت کو پالیا، اسی کو حقیقت کہتے ہیں۔

بندگی بے معرفت شد کارِ اعمیٰ اے پسر معرفت بے دیدنِ حق کارِ غافل می شمر

ترجمہ: عبادت معرفت کے بغیر نابینا کا کام ہے اے بیٹے، اور معرفت کو مشاہدہ حق کے بغیر غافل کا کام سمجھ۔

تشریح: مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے منازلِ حق شناسی کی چار منزلوں کی جو ترتیب قائم کی تھی، اب اس کی دلیل بیان کر رہے ہیں کہ جب انسان معبود کی معرفت حاصل کیے بغیر عبادت کا فریضہ انجام دے تو اس میں وہ شان نہ پیدا ہو سکے گی جس کے بارے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اَنْ تَعْبُدَ رَبَّكَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ یعنی اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ تصور نہ ہو سکے تو کم از کم اتنا ضرور سمجھو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ اس حدیث پاک کا دوسرا جزء کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے، اس سے ذاتِ مطلق کی صفتِ قدرت، اور صفتِ بصارت، اور صفتِ احاطت کا ظہور ہوتا ہے کہ عبادت کرنے میں جب تک معبود کی صفات کی عظمت و قدرت کا یقین نہ ہوگا تو اس وقت تک اس کام کی حیثیت نابینا کے کام کی طرح ہوگی، وہ صحیح نتائج بھی پیدا کر سکتا ہے اور بیکار بھی ہو سکتا ہے۔ گویا اندھے کی لاٹھی ہے جو لگ بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔

اسی طرح حدیث پاک کا پہلا جزو "گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو" یعنی نگاہِ باطن سے اس کی صفات کا مشاہدہ آئینۂ قلب میں کر رہے ہو، اگر یہ کیفیت نہ ہوگی تو گویا جس طرح غفلت اور بے توجہی سے کام کرنے کی پوزیشن ہوتی ہے اسی طرح اس عبادت کی بھی کیفیت ہوگی اور جب یہ احساس ہوگا کہ سب سے بڑے اور زبردست حاکم کے سامنے ہم دست بستہ باادب کھڑے ہیں تو پھر ہر ایک کام بڑے قاعدے اور سلیقے سے ہوگا اور اس صورت میں غفلت اور سستی نہ ہوگی اور مشاہدہ باطن کی کیفیت کا احساس نہ ہونے کی صورت میں غافل لوگوں جیسا کام ہوگا۔

دیدنش بے گم شدن زاں نیست وصلِ کردگار ہر یکے را گم کن و شو در حضوری استوار

ترجمہ: اس کے مشاہدہ میں خودکو گم کئے بغیر وصال بحق نہیں ہے ، ہر ایک چیز کو گم کر دے اور اس کی حاضری و حضوری میں مستعد رہ۔

تشریح: یعنی جب تک ہستیٔ امکانی کے حجابات نہیں اٹھیں گے اور جبتک کیفیت مشاہدہ نہ ہوگی اس وقت تک وصال بحق کا مرتبہ حاصل نہ ہوگا اور پھر صرف اپنی ہستی کو محو کرنے سے کام نہ چلے گا بلکہ اگر ذاتِ مطلق کے علاوہ کسی دوسری شے کے وجود کا شائبہ بھی باقی رہے گا، اس وقت مقام حضوری جو مقام بقاء ہے حاصل نہ ہوگا۔ یہاں صرف بے خبری سے ہی کام نہیں چلتا بلکہ بے خبری سے بھی بے خبر ہونا پڑتا ہے ؎

تو در وگم شو وصال این ست و بس گم شدن گم کن کمال این ست و بس

در شریعت حق تعالیٰ را عبادت کردن است در حقیقت بیخودی در حق تعالیٰ بودن است

ترجمہ: راہ شریعت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ضروری ہے، راہ حقیقت میں اپنے سے بے خود ہو جانا وصال بحق ہے۔

تشریح: یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے احکامِ شریعت کی بجاآوری تو ہو سکتی ہے اور اس طرح سے مرتبۂ شریعت پر فائز ہو سکتے ہو، لیکن راہ حقیقت میں جب اپنی ہستیٔ ناسوتی و ہمی کو ذاتِ مطلق کے سامنے مکمل طور پر نیست نہ سمجھو گے اُسوقت تک درجۂ حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔

ہر کہ گیرد با حضورِ دل ہمیں راہ چہار زود باشد او یکے از واصلانِ کردگار

ترجمہ: جو کوئی ان چار راستوں کو صدقِ دل سے اختیار کرے گا وہ بہت جلد واصلانِ حق کے زمرہ میں شامل ہو جائے گا۔

تشریح: یعنی جو شخص خلوصِ دل کے ساتھ احکامِ شریعت کی بجاآوری کرے گا تو اسکی پابندی سے اس کو وہ لذت محسوس ہوگی جس کے ذریعہ حصولِ معرفت آسان ہوگی اور جب معرفتِ صفات کے ذریعہ عظمتِ ذاتِ الٰہی کے نقوش دل پر مرتسم ہو جائیں تو تصفیۂ قلب ہو کر تجلیات کا مشاہدہ بچشم باطن شروع ہو جائے گا اور جب اس مشاہدۂ باطن میں استقامت کی دولت میسّر

آجائے گی تو انکشافِ حقائق کا دروازہ کھل جائے گا اور پھر ایک دن حقیقت الحقائق سے حجابات تجلیات مرتفع ہو کر مقامِ بقار جو مقصودِ اصلی ہے حاصل ہو جائے گا۔ اس طرح درجہ بدرجہ ان راستوں کے ذریعہ واصلانِ حق میں اس کا شمار ہو جائے گا۔

از کسے اندر حقیقت بندگی ساقط نہ گشت ہر کہ ساقط گوید آں از حدِ ایماں در گذشت

ترجمہ: کسی سے بھی حقیقت میں عبادت کی ذمہ داری جدا نہیں ہو سکتی، جو کہے کہ بندگی اس سے ساقط ہوگئی وہ ایمان کی حدود سے باہر ہوگیا۔

تشریح: کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ معبودیت ازلی و ابدی ہے، کائنات کے ہر ایک ذرے پر اس کی شانِ معبودیت ظاہر ہے، تمام مخلوقات کا وہی معبودِ حقیقی ہے، اُس ذاتِ مطلق کی طرح اُس کی یہ صفت بھی محیطِ کائنات ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ حقیقتِ بندگی کا بوجھ ہمارے کاندھے پر نہیں، اس لئے کہ وہ جس کائنات میں سانس لے رہا ہے اس کا حاکمِ حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہے، حاکم کی عملداری میں اس کے احکام کی بجاآوری سے انکار اس کی حاکمیت کو چیلنج ہے اور انکارِ حقیقت ہے اور اسی کا نام کفر ہے۔

احکام و اوامر کی بجاآوری میں غفلت برتنا الگ بات ہے لیکن حقیقتِ بندگی کے سقوط کا اظہار کرنا یہ تو سراسر حقیقت کو چھپانا ہے جس کا مرتکب وہی شخص ہو سکتا ہے جو ایمان کی حدود سے باہر ہوگیا ہو۔

بندگی از انبیار ساقط نہ گشتہ ہوشدار چوں شود از اولیار ساقط بداں اے مردِ کار

ترجمہ: جب عبادت و بندگی کی ذمہ داری انبیار سے الگ نہ ہوئی، پھر تم ہی بتلاؤ کہ اولیار سے کس طرح ساقط ہو سکتی ہے۔

تشریح: یہ شعر پہلے شعر کی دلیل ہے کہ مخلوق میں سب سے زیادہ برگزیدہ اور اللہ کے مقرب بندے انبیار علیہم السلام ہیں، جن کے واصل بالحق ہونے میں ذرا بھی شک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی ہدایت اور حفاظت کی جاتی ہے، کوئی بھی مخلوق انبیار علیہم السلام کے مراتب کو نہیں پہونچ سکتی، پھر بھی عبادتِ خداوندی کا فریضہ ان سے جدا نہ ہو سکا، پھر حضرات

اولیاء اللہ جو مرتبے میں انبیاء کے برابر نہیں، انبیاء سے کم ہیں کسطرح اُن سے فریضۂ عبادت ساقط ہو سکتا ہے۔

یک پیمبر از تمامی اولیاء بہتر بداں بندگی ساقط نہ شد از سیّد پیغمبراں

ترجمہ: ایک پیغمبر تمام اولیاء سے بہتر ہے اور فرض بندگی تو پیغمبروں کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی جدا نہ ہو سکا۔

تشریح: یہ دوسری دلیل ہے اور پہلی دلیل سے بھی زیادہ باوزن ہے، کہ یہ بات سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ کسی ایک پیغمبر کے درجہ کے برابر کوئی بھی ولی نہیں پہنچ سکتا۔ جب اس پر بھی فرض بندگی عائد ہے تو کسی ولی سے کس طرح یہ فرض ساقط ہو سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیّد الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلم جو اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ پیارے نبی، جن کا نور، اللہ کا نور، جن کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے بڑا۔ جب آپ سے فرض بندگی ساقط نہیں ہوا تو کسی دوسرے سے کس طرح ہو سکتا ہے، بلکہ آپ کی شانِ عبدیت تو یہ تھی کہ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبیؐ! خداوند تعالیٰ نے آپ کی مغفرت کا وعدہ فرمالیا ہے، پھر کس لئے اس قدر عبادت آپ کرتے ہیں کہ پائے مبارک متورم ہو جاتے ہیں، تو آپ نے ارشاد فرمایا کیا میں اپنے رب کی شکر گذاری نہ کروں۔ اس قدر اعلیٰ و ارفع شان ہوتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور قول ملاحظہ کر کے خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ اب کسی مخلوق سے بندگی کا سقوط ہو سکتا ہے؟ اور جو یہ کہتا ہے اس کا کہنا کس حد تک صحیح ہے؟

رازِ آں باری تعالیٰ بیحد است و بے شمار زیں جہت من باز گشتم شغل کردم اختیار

ترجمہ: اس پروردگار کے راز لامحدود اور ان گنت ہیں، اس وجہ سے میں اس بیان کو ختم کر کے اشغال کا ذکر کرتا ہوں۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کی معرفت کے حصول کے طریقے لامحدود ہیں جن کا احاطہ کرنا محال ہے مختصر طور پر بنیادی باتیں بیان کر کے اب مصنف ان اشغال کی طرف متوجہ ہیں جو سالک کو مقصدِ اصلی تک پہنچاتے ہیں۔

دربیانِ شغلِ اعظم کہ اوّلاً بر مریداں واجب است

شغلِ اعظم کا بیان جو مریدوں پر سب سے پہلے واجب ہے

شغلِ اعظم بر مریداں ہست واجب در نخست
دیدۂ دل تا شود در جلوۂ باری درست

ترجمہ: سب سے پہلے راہِ طریقت کا ارادہ کرنے والوں کے لئے جو شغل ضروری ہے وہ شغل اعظم ہے تاکہ اس کے ذریعہ آئینۂ قلب تجلیاتِ باری کا عکس قبول کرنے کے لائق ہو جائے۔

تشریح: عنوانات میں درجہ بدرجہ ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے دامنِ مرشد سے منسلک ہونے کے بعد جب علم اور عقائد کا معاملہ درست ہو گیا تو پھر عملی طور پر طریقت میں کس طرح قدم رکھا جائے اُس کا بیان یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں شیوخِ طریقت نے کچھ اصول مرتب کیے ہیں اُن کو اذکار و اشغال کہتے ہیں تاکہ اُن کے ذریعہ مطلوبِ حقیقی کی معیت اور قربت حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ کہ تم مجھکو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کو یاد کرتے ہیں اُٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے، مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ہر وقت اُس کی یاد کرتے ہیں اور جو ان کی راہ پر چلنا چاہے وہ ہر وقت اللہ کو یاد کرے۔ حدیث پاک میں ارشاد ہے اَنَا مَعَ عَبْدِیْ اِذَا ذَکَرَنِیْ وَ تَحَرَّکَتْ بِیْ شَفَتَاہُ، اور اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ کہ جب میرا بندہ مجھکو یاد کرتا ہے اور میرے نام سے اس کے ہونٹ ہلتے ہیں میں اس کے ساتھ ہو جاتا ہوں اور جو مجھ کو یاد کرتا ہے میں اس کا ہم جلیس و ہم نشین ہوں۔ ان آیات و احادیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو ہمہ وقت ذکر مطلوب ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی یاد میں اس طرح مشغول ہو کہ اپنی خواہش نفس سے کوئی بھی کام نہ کرو۔ بلکہ ہر کام میں، ہر سانس میں اسی کا دھیان اور اسی کا ذکر ہو، محققین صوفیاء نے اذکار و اشغال کا جو سلسلہ جاری کیا ہے اس کی اصل درحقیقت شریعت ہی ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فرمایا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ

ذکر کے بہت سے اقسام ہیں لیکن سب سے بہتر ذکر لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ ہے۔ لفظ "افضل" اسی حقیقت کی طرف اشارہ کناں ہے لیکن شغل کا تعلق شریعت سے کہیں یقینی ہے کہیں ظنی ہے اور کہیں احتمالی، جس کی وجہ سے بعض حضرات کو اشتباہ ہو جاتا ہے کہ شرعی طور پر اس کی بنیاد بظاہر نظر نہیں آتی" جس طرح کہ حدیث پاک میں ہے اِجْعَلْ بَصَرَكَ حَيْثُ تَسْجُدُ یعنی بحالتِ نماز کھڑے ہونے کے وقت اپنی نظر کو سجدہ گاہ پر جمائے رکھو" تو جس طرح یہ حکم برائے تعظیم و ادب ہے اسی طرح قلب و نظر کی یکسوئی کے لئے بھی ہے۔ اسی سے صوفیاء نے یکسوئی حاصل کرنے کے لئے اذکار و اشغال کا سلسلہ جاری کیا ہے۔

اس تمہید کے بعد اذکار و اشغال کی حیثیت واضح ہو گئی، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قلب و نظر کی یکسوئی ضروری ہے تاکہ تمام طرف سے خیالات سمٹ کر ایک مرکز پر قائم ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا شغل مصنف رحمۃ اللہ علیہ "شغل اعظم" کے نام سے بیان کر رہے ہیں اور اس کا مقصد صرف اس قدر بتلا رہے ہیں کہ یہ شغل اس لئے ضروری ہے کہ اس کے ذریعہ قلب سالک میں تجلیاتِ الٰہیہ قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ گناہوں کا گرد و غبار اور اعمالِ نفسانیہ کے خس و خاشاک کو جھاڑ کر قلب کے آئینہ کو بالکل صاف شفاف کر دیا جائے، اس شغل کی جس کو مصنف رحمۃ اللہ علیہ "شغل اعظم" کے نام سے بیان کر رہے ہیں سب سے بڑی خصوصیت اور افادیت غیر اللہ سے قلب کی صفائی ہے۔

شغل اعظم وجہ مرشد دیدنی را نام داں ہمچنیں صد نام یک کم از زبانِ سالکاں

ترجمہ: مرشد کے چہرے کو دیکھنے کا نام "شغل اعظم" ہے اور اس شغل کے اہل سلوک کی اصطلاح میں ننانوے نام ہیں۔

تشریح: اس شغل کی اصل بنیاد "تصورِ شیخ" ہے کہ قلب سالک میں ہر وقت "تصورِ شیخ" کا دھیان رہے کیونکہ راہ سلوک میں سب سے پہلی منزل فنا فی الشیخ کی ہے، اس کے بعد فنا فی الرسول کی اور سب سے آخر فنا فی اللہ کی منزل ہے۔ تصورِ شیخ کا مطلب یہ ہے کہ شیخ کا چہرہ

ہر وقت اس کی نگاہ تصور میں رہے اور سالک کو یہ دھیان رہے کہ میرے ہر کام کو شیخ دیکھ رہے ہیں اور میں نے جو عہد و پیمان خدا اور رسول کی اطاعت کے سلسلے میں مرشد کے سامنے کئے ہیں اُن پر عمل کرنا میرے لئے ضروری ہے اور ان تمام امور سے مرشد باخبر ہی نہیں بلکہ وہ باقاعدہ طور پر اپنی نگرانی میں اللہ تعالیٰ تک پہونچنے والے راستے کی رہبری کر رہے ہیں، اور میرے تمام تر خیالات، گفتار و کردار کا معاملہ مرشد کے سپرد ہے، اگر مرشد کے حکم کے خلاف میں کوئی کام علانیہ یا خفیہ کروں گا تو اکتسابِ فیض کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

جب اس تصور میں ترقی ہوتے ہوتے یہ درجہ آتا ہے کہ ذاتِ سالک، مرشد کی ذاتِ مبارک کے سامنے بالکل ہیچ ہو جائے اور تمام امور میں اتباعِ شریعت و طریقت مرشد کے حکم کے مطابق ہونے لگے تو اسی کو "فنا فی الشیخ" کہتے ہیں۔

تصورِ شیخ کی سند صوفیاء حضرات قرآنِ پاک کی ان آیات سے لیتے ہیں۔ یَاۤ اَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ رہو) صادقین کا مطلب یہ ہے کہ جو صادق العلم، صادق العمل، صادق القال، صادق الحال ہوں، دوسری آیت میں ارشاد ہے (اَتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ (اس کا اتباع کرو جس کا میلان میری طرف ہو)۔ ظاہر بات ہے کہ مرشد کامل میں یہ تمام خصوصیات ہوتی ہیں، تو پھر ہر وقت شیخ کے ساتھ جسم ناسوتی اور ذہن لاہوتی کے ساتھ رہنے سے حکم باری تعالیٰ کی تعمیل اور دارین کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔

اس شغل کے بہت سے نام ہیں مگر مصنفؒ نے "شغل اعظم" اس کا نام اس لئے رکھا ہے کہ

شغل اعظم زیں جہت گفتند اکثر رازداں — کز مثال دیو خالی می شود دل اندراں

ترجمہ: اکثر محققین صوفیاء نے اس شغل کا نام "شغل اعظم" اس لئے رکھا ہے کہ اس کے ذریعہ قلب سالک شیطانی تصورات سے خالی ہو جاتا ہے۔

تشریح: چہرۂ مرشد کے ہمہ وقتی تصور کو اکثر محققین صوفیاء شغل اعظم اس وجہ سے کہتے ہیں

کہ انسان کے دل پر جو شیطانی اثرات ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ہر وقت اس کا دل دنیا کی رنگ رلیوں میں پھنسا رہتا ہے، رفتہ رفتہ زائل ہونے لگتے ہیں۔ کیونکہ قلبِ انسانی دو چیزوں سے مرکّب ہے۔ نفس اور روح سے۔ نفس میں کثافت ہے اور روح میں لطافت، کثافت کا تعلق سیئات سے ہے اور لطافت کا حسنات سے، جو دل ذکرِ الٰہی سے خالی ہوتا ہے اس پر نفس کا غلبہ ہوتا ہے، تو قلب بھی اس کے برے اثرات سے لازمی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ اس تاثر کی وجہ سے انسان ایسے امور میں مبتلا ہو جاتا ہے جو رحمتِ خداوندی سے بُعد کا سبب ہوتے ہیں، لیکن جب تصورِ شیخ قائم رہتا ہے تو پھر کسی بھی غلط کام کا ارادہ کرنے کے وقت مرشد کا چہرۂ انور سامنے آجاتا ہے۔ تصوراتی اعتبار سے بھی اور بعض مرتبہ جسمِ مثالی کی صورت میں، سالک جب یہ منظر دیکھتا ہے تو پھر اس کے قدم خود بخود رُک جاتے ہیں اور بطفیلِ مرشد قلب کا رشتہ نفس سے منقطع ہو کر روح سے منسلک ہو جاتا ہے، تو گویا قلب کا تمام کام مرشد کی نگرانی میں چلتا ہے اور مرشدِ کامل چونکہ بحرِ معرفت کا غوّاص ہوتا ہے اس لئے اُس کے ہوتے ہوئے شیطان کا قابو دل پر نہیں ہو پاتا اور برے اثرات سے دل محفوظ رہتا ہے۔

شغلِ اکبر، شغلِ اکمل نام شد ایں شغل را — زیں بآسانی نماید روئے مولیٰ ہر کجا

ترجمہ: اس شغل کا نام شغلِ اکبر اور شغلِ اکمل بھی ہے، اس شغل کے ذریعہ ہر جگہ تجلیاتِ باری کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

تشریح: یہاں پر مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس شغل کا نام شغلِ اکبر اور شغلِ اکمل بتلا رہے ہیں اور اس سے پہلے اس کا نام شغلِ اعظم بتلایا تھا، اس ترتیب میں ایک خاص نکتہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ اعظم، اکبر، اکمل اگرچہ ظاہری لفظ کے مفہوم سے قریب المعنیٰ ہیں مگر حقیقتاً یہ سب علیحدہ علیحدہ ہیں، باطن کی بڑائی کو عظمت اور ظاہر کی بڑائی کو اکبر کہتے ہیں اور اکمل اس بڑائی کو کہتے ہیں جو باطن اور ظاہری اعتبار کو جامع ہو اور یہ تینوں صفات اس شغل میں پائی جاتی ہیں، وہ اس طرح کہ تصورِ شیخ کے بعد ہی فنا فی الشیخ کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور فنا فی الشیخ کی کیفیت

حاصل ہونے کے بعد فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کے مراتب حاصل ہوتے ہیں، اسی لئے اس شغل کا نام شغل اعظم، شغل اکبر اور شغل اکمل ہے ۔

بشکل شیخ دیدم مصطفےٰ را   نہ دیدم مصطفےٰ را بل خدا را

وجہ حق در وجہ مرشد می نگر در دل مدام   مومن است آئینہ مومن مراد ایں کلام

ترجمہ: ہمیشہ دل میں چہرہ مرشد کے ذریعہ تجلیات باری کا مشاہدہ کر، اس کلام کا مقصد یہ ہے کہ مومن، مومن کا آئینہ ہے ۔

تشریح: اس شغل کی صورت یہ ہے کہ مرید کے دل ودماغ میں یہ خیال راسخ ہوجائے کہ مرشد کی ذات میرے سامنے ہے اور ہر وقت میں اس کی نگرانی میں ہوں، اس کے حضور میں حاضر ہوں اور مرشد کے قلب مبارک کے محاذ میں میرا دل ہے۔ جو فیضان تجلیات باری کا مرشد کے قلب پر بلاواسطہ ہو رہا ہے میرے دل پر بعینہ وہی فیضان قلب مرشد کے واسطے سے ہو رہا ہے، جس طرح آئینہ کے محاذ میں جو چیز آتی ہے اس کا مکمل عکس آئینہ میں منعکس ہوجاتا ہے، اسی طرح مرشد کامل کے قلب مبارک کے آئینہ کے محاذ میں جب مرید کا قلب ہوگا تو تجلیات باری کا مشاہدہ قلب مرشد کے واسطے سے مرید کے قلب میں ہوگا ۔

وجہ مرشد سے یہاں صرف چہرہ مراد نہیں ہے بلکہ ذات شیخ جس کو تصور شیخ سے تعبیر کیا جاتا ہے مراد ہے اور اَلْمُؤْمِنُ مِرْاٰۃُ الْمُؤْمِنِ کا مطلب بھی یہی ہے، کیونکہ ایمان کی لذت سے آشنا قلب ذاکر یعنی ذکر کرنے والا دل ہوتا ہے اور اسی قلب ذاکر میں تجلیات باری کا مشاہدہ بچشم دل ہوتا ہے پس جب ایک مومن کا قلب دوسرے مومن کے محاذ میں ہوجاتا ہے تو قلب اعلیٰ سے قلب ادنیٰ میں انعکاس تجلیات ہوجاتا ہے، اسی کو اَلْمُؤْمِنُ مِرْاٰۃُ الْمُؤْمِنِ کہتے ہیں ۔

حکم ایں معنیٰ بداں مرطالباں را لا کلام   پیر را سازند ایشاں مسجد بیت الحرام

ترجمہ: اس مفہوم کی حقیقت کو تم اس طرح سمجھ کہ بے شک طالبان حق اپنے مرشد کو مسجد بیت الحرام کی طرح لائق احترام قرار دیتے ہیں ۔

تشریح: پہلے شعر میں "وجہ مرشد" کو اپنے قلب میں ملاحظہ کا حکم دیا گیا تھا، اس شعر میں اس حکم کی حقیقت بیان کر رہے ہیں کہ طالبانِ حق، مسجد بیت الحرام کی طرح اپنے مرشد کو قابلِ احترام کیوں سمجھتے ہیں؟ اس لئے کہ اس مسجد میں عبادت کا ثواب، دیگر مساجد سے ستر ہزار گنا زیادہ ہے، اور کثرتِ ثواب کی وجہ یہ ہے کہ نزولِ رحمتِ باری سے اس مسجد کو ایک خاص تعلق ہے، اسی طرح مرشد کامل کو بھی رحمتِ باری سے ایک خاص نسبت ہوتی ہے اور یہی نسبتِ شیخ مرید کے حق میں ایصال الی المطلوب کے اعتبار سے بہت اہم ہے، اسی لئے ذاتِ شیخ بھی قابلِ احترام ہے۔

مرشدش را آئینہ سازد مرید اندر رواں　　وجہِ باری بنگرد در سجدہ کردن بے گماں

ترجمہ: مرید روح کے اندر اپنے مرشد کو ایک صاف آئینہ کی طرح تصور کرتا ہے اور سجدہ کرنے کی حالت میں بے شک وہ تجلیات باری کا مشاہدہ کرتا ہے۔

تشریح: مصنف رحمۃ اللہ علیہ یہاں سے ایک ایسی حالت کا اظہار کر رہے ہیں جو تصورِ شیخ کے سلسلہ میں اس شغل میں پیدا ہو جاتی ہے، اس حال کو "سجدہ تعظیمی" کے نام سے پکارا جاتا ہے، چونکہ یہ مسئلہ بذاتِ خود صوفیاء کرام کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے اس لئے اس کے دونوں پہلوؤں پر اعتدال کے ساتھ غیر جانبدارانہ روش اختیار کرنا ضروری ہے، جہاں تک سجدہ تعظیمی کے ثبوت کا تعلق ہے تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے ایسے حضرات جن کی بزرگی، تقویٰ، دینداری اور دینی علم اور مسائل شریعت پر بھی گہری نظر تھی اور وہ اس کے قائل تھے اور ایسے حضرات بھی گروہِ صوفیاء میں ہوئے ہیں جو اس کے قائل نہ تھے[ل]، مصنف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس شغل میں

ل حضرت مجدد الف ثانی سجدہ تعظیمی کے قائل نہ تھے اور جہانگیر کے دربار میں اختلاف کی وجوہ میں سے ایک یہ وجہ بھی تھی لیکن وہ بھی مکتوبات دفتر دوم مکتوب نمبر ۹۲، صفحہ ۲۳۴ پر تحریر فرماتے ہیں کہ بعض فقہاء نے سجدہ تعظیمی کو جائز قرار دیا ہے، مگر حضرت نے اپنی رائے یہ تحریر فرمائی ہے کہ سجدہ سے مقصد اپنی عاجزی کا اظہار اور مقابل کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے، اظہارِ عاجزی کے لئے مخلوق کی ذات اور اعترافِ عظمت کے لئے سب سے زیادہ لائق وہی ذاتِ مطلق ہے اس لئے ہر قسم کا سجدہ صرف اسی کے لئے ہونا چاہیئے۔

یہ کیفیت اس لئے طاری ہو جاتی ہے کہ مرید اپنے شیخ کو مسجدِ بیت الحرام یعنی تجلیات باری کا مرکز تصور کرتا ہے اور اس مرکز میں تصورِ شیخ کو ایک آئینہ قرار دے کر اس میں تجلیات باری کا مشاہدہ کرتا ہے جب تجلیات کا غلبہ ہوتا ہے تو بے اختیار اس کا سر سجدہ کے لئے جھک جاتا ہے اور یہ سجدہ تعظیمی ہے جو مرشد کو نہیں بلکہ ذاتِ واحد ہی کو ہوتا ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

بے گماں پیش از زمانِ سیدِ خیر البشر فرضِ حق بُد سجدۂ انساں بقرآں می نگر

ترجمہ: بے شک سید خیر البشر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے پہلے حق تعظیم کی ادائیگی کے لئے سجدہ انسانی کیا جاتا تھا، اس کو قرآن پاک میں دیکھو۔

تشریح: یعنی یہ سجدۂ تعظیمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل دیگر انبیاء علیہم السلام کی امت میں بھی رائج تھا، جس طرح آداب اور تعظیم کے اظہار کے لئے مختلف مقامات پر اور مختلف زمانے میں الگ الگ طریقے ہوتے ہیں اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل یہ سجدہ تعظیمی، اظہارِ تعظیم کے لئے بہت ضروری تھا، جس کی مثال خود قرآنِ پاک میں بھی موجود ہے کہ۔

سجدہ می کردند یوسف را بہ بیں قرآن را ہر یکے بودند مرسل زادگاں لبس مقتدا

ترجمہ: قرآن پاک میں دیکھو کہ یوسف علیہ السلام کو اُن کے بھائیوں نے سجدہ کیا جبکہ یہ سب کے سب ایسے نبی کی اولاد میں سے تھے جن کا اتباع ضروری تھا۔

تشریح: پہلے شعر میں مصنف نے سجدۂ تعظیمی کو قبل بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اخلاقی فریضہ قرار دیا تھا، اور قرآن کی وہ سورت جو سورۂ یوسف کے نام سے ہے اس کا حوالہ دیا تھا، یہاں اسکی تشریح کر رہے ہیں کہ سورۂ یوسف میں وضاحت کے ساتھ موجود ہے کہ جب یوسف علیہ السلام مصر کے تخت پر جلوہ افروز ہوئے اور آپ کے وقت میں مصر اور اطرافِ مصر میں قحط پڑا تو ان کے بھائی وغیرہ غلہ اور امداد لینے کیلئے شاہی دربار میں حاضر ہوئے اس موقع پر انکے بھائیوں نے اظہارِ تعظیم کے طور پر یوسف علیہ السلام کو سجدۂ تعظیمی کیا تھا، حالانکہ سجدہ کرنے والے اور جن کو سجدہ کیا گیا سب ایک ہی باپ کے بیٹے تھے مگر چونکہ یوسف علیہ السلام نبی بھی تھے اور پھر حکومت مصر کے فرماں روا کی

حیثیت سے قابلِ احترام تھے، اس لئے اُن کے بھائیوں نے سجدۂ تعظیمی کے ذریعہ اظہارِ تعظیم کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک اخلاقی فریضہ تھا جس کو شریعت کے دائرہ میں سجدۂ عبودیت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

ہمچنیں کردند اکثر انبیاء بشنو ہمیں کارِ منہی کے شود از انبیاء صادر چنیں

ترجمہ: اور سنو کہ بہت سے انبیاء علیہم السلام نے بھی ایسا کیا ہے تو پھر جو کام ممنوع ہے وہ کس طرح انبیاء علیہم السلام سے صادر ہو سکتا ہے۔

تشریح: حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے علاوہ بہت سے انبیاء علیہم السلام کے دورِ نبوت میں اس سجدۂ تعظیمی کا رواج تھا۔ اس لئے اگر یہ امر ممنوعہ ہوتا تو پھر انبیاء سے کس طرح اس کا صدور ہو سکتا تھا؟ کیونکہ عصمتِ انبیاء تو ہر زمانہ میں مسلم الثبوت رہی ہے، جو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے خلعتِ نبوت سے سرفراز کیا گیا اس کی حفاظت بھی منجانب اللہ کی گئی کہ وہ کسی بھی امرِ غیر شرعی کا مرتکب نہ ہو سکے، معلوم ہوا کہ فی الحقیقت سجدۂ تعظیمی کا رواج عام تھا ورنہ اگر اظہارِ تعظیم کا یہ طریقہ غیر شرعی ہوتا تو انبیاء علیہم السلام سے تو اس کا صدور ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

آں ز ماں ایں فرض حق بود ست و اکنوں شد مباح ہوشداری ایں سخن را بنگری اندر صحاح

ترجمہ: اس زمانے میں اس کی ادائیگی فرض تھی لیکن اب مباح ہے، اگر تم عقل و ہوش رکھتے ہو تو احادیث کی صحیح کتابوں میں اس کو دیکھو۔

تشریح: مصنف نے پہلے قرآنِ پاک میں اس سجدۂ تعظیمی کی مثال پیش کی تھی، اس کے بعد حضراتِ انبیاء علیہم السلام کا معمول بھی بتلایا اور یہ بھی کہا کہ اس کی حیثیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل اگرچہ فرض جیسی تھی لیکن اب فرضیت ختم ہو گئی اور صرف اباحت باقی رہ گئی ہے اور اس قسم کی مثالیں احادیثِ صحیحہ میں موجود ہیں کہ بعض امور جو شریعتِ محمدی سے قبل فرض تھے، اب انکی حیثیت مباح کی ہو گئی ہے یعنی اگر کرو گے تو ثواب ملے گا اور نہ کرو گے تو کوئی مواخذہ نہیں، اسی طرح یہ سجدۂ تعظیمی بھی درجۂ اباحت میں آ گیا ہے۔

انچہ بودہ فرض حق بنگر مباحش در کتاب صوم عاشورہ است و ہم ایامِ بیض اے خوش خطاب

ترجمہ: وہ امور جو پہلے فرض تھے اور اب مباح ہیں، اُن کو حدیث کی کتاب میں دیکھو، عاشورہ کے دن کا روزہ اور ایامِ بیض کے روزے اس کی مثال ہیں۔

تشریح: دلیل کے طور پر مصنفؒ یہ دو مثالیں لائے ہیں کہ یومِ عاشورہ یعنی دسویں محرم الحرام کا روزہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے فرض تھا اور اسی طرح چاند کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ تاریخ کا جن کو ایامِ بیض کہتے ہیں روزے شریعتِ محمدی سے قبل فرض تھے لیکن شریعتِ محمدی کے نفاذ کے بعد ان کی حیثیت فرض ختم کردی گئی اور اباحت کے درجہ میں رکھا گیا ہے، اسی طرح سجدہ تعظیمی بھی شریعتِ محمدی سے قبل فرض کی حیثیت رکھتا تھا اور اظہارِ تعظیم کا ایک لازمی جزو تھا مگر اب اسکی حیثیت اباحت کی ہے۔

سجدۂ مرشد روا شد در طریقت ہوشدار　　　لیک در راہِ شریعت پیشِ قاضی کفر کار

ترجمہ: دائرہ طریقت میں مرشد کو سجدہ تعظیمی کرنا مباح ہے لیکن راہِ شریعت میں قاضیٔ شریعت کے نزدیک یہ کفر کا کام ہے۔

تشریح: اگرچہ شریعت اور طریقت دو الگ الگ شئے نہیں ہیں، نتیجہ کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں، اس لئے کہ یہ بات بالکل مسلّم ہے کہ طریقت، شریعت کے بغیر عند اللہ بالکل مقبول نہیں لیکن چونکہ شریعت کا تعلق احکامِ ظاہری سے ہوتا ہے اور طریقت کا تعلق باطن سے ہے اس لئے بعض امور میں بظاہر، عدمِ فہم کی وجہ سے ٹکراؤ محسوس ہوتا ہے، لیکن بنظرِ غائر دیکھنے سے یہ ٹکراؤ ختم ہو جاتا ہے، لیکن شریعت میں احکامِ ظاہری کے حساب سے شرعی حدود کا نفاذ ہوتا ہے، اور قاضیٔ شریعت ظاہری حالت ہی پر حکم نافذ کرے گا اس لئے جو سجدہ تعظیمی مرشد کیلئے طریقت کے دائرہ کار میں مباح تھا وہ شرعی طور پر سجدۂ عبودیت سے مشابہ ہونے کی وجہ سے قابلِ مواخذہ ہے۔

در شریعت کفر آمد سجدۂ مرشد چرا　　　تا نیفتد راز حق در خلق فاش و برملا

ترجمہ: شریعت میں مرشد کو سجدہ کرنا اس لئے کفر ہے تاکہ مخلوق کے درمیان رازِ باری تعالیٰ ظاہر نہ ہو جائے۔

تشریح: شریعت چونکہ ظاہری احکام پر عمل کرنے کا نام ہے اور ان احکام پر حسبِ توفیق سب

کو مکلف بہ عمل کیا گیا ہے اور طریقت میں عزیمت انفرادی ہے اور اس کا تعلق بھی امور باطنی سے ہے جن کا اظہار عوام الناس کے سامنے مناسب نہیں کیونکہ جب تک کسی بھی امر کی پوری حقیقت معلوم نہ ہوگی تو اس پر عمل کرنے سے نقصان کا بھی اندیشہ ہوتا ہے، سجدۂ مرشد کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ اس میں جو حکمتیں اور راز پوشیدہ ہیں ان کا اظہار ہر ایک کے سامنے نہیں کیا جا سکتا، اسی لئے اس کی ظاہری شکل چونکہ سجدۂ عبودیت کی سی ہوتی ہے، اس کو شریعت نے بالکل منع کیا ہے۔

فاش کردن راز رحماں در شریعت شد خطا | کفر گفت و داد رخصت در حقیقت مصطفٰے

ترجمہ: راز باری تعالیٰ کا ظاہر کرنا شریعت کے اعتبار سے غلطی ہے، ایک صحابیؓ نے کفریہ الفاظ کہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو معاف فرمادیا۔

تشریح: یہاں یہ بتلا رہے ہیں کہ رازہائے معرفت کا ہر کس و ناکس کے سامنے ظاہر کرنا بہت بڑی غلطی ہے اور شریعت اس کے ظاہری حال پر فیصلہ کرے گی لیکن پھر بعض حالات میں ایسے معاملات میں جو بظاہر شریعت سے متصادم معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی حقیقت شریعت کے منافی نہیں ہوتی، ایسے وقت میں حقیقت پر نظر کرتے ہوئے شریعت میں بھی معافی کا نفاذ ہو جاتا ہے، جس طرح ایک صحابیؓ کا اونٹ گم ہوگیا، تلاش بسیار کے بعد مل گیا تو فرطِ مسرت میں ان کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکل گئے اَنْتَ رَبِّیْ وَ اَنَا عَبْدُکَ کہ تو میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ ہوں، پھر جب ان کو یہ احساس ہوا کہ مجھ سے نامناسب الفاظ کی ادائیگی ہوگئی ہے تو وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور پوری بات عرض کردی، آپ نے اُن صحابی کو معذور جان کر اور بالقصد وارادہ نہ کرنے کی وجہ سے معاف فرمادیا۔ بالکل یہی معاملہ سجدۂ تعظیمی میں ہوتا ہے کہ جب مرید آئینۂ مرشد میں تجلیاتِ باری کا مشاہدہ کرتا ہے تو بے اختیار عظمتِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے چونکہ اس مشاہدہ کی وجہ سے غلبۂ حال ہو جاتا ہے، اس لئے باعتبارِ حقیقت یہ معاملہ بھی قابلِ عفو ہے۔

آمدہ روزے کسے پیش جناب مصطفٰے | از پیمبر گفت کاے سالار ختم الانبیاء

ترجمہ: ایک روز ایک صحابیؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر ہوئے

اور عرض کیا کہ اے قافلۂ انبیاء کے آخری سالار ۔

تشریح : یہاں پر مصنف رحمۃ اللہ سجدہ تعظیمی کے سلسلے میں ایک دوسری مثال پیش کر رہے ہیں جو ایک صحابی کی طرف منسوب ہے ، وہ یہ کہ :

من بہ شب در خواب دیدم سجدہ کردم مر ترا　　　گفت او را مصطفےٰ ایں صادق است ہم بجا

ترجمہ : میں نے خواب میں دیکھا کہ آپ کو میں نے سجدہ کیا ، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بات سچ اور درست ہے ۔

تشریح : یعنی ایک صحابیؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا حضور میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں آپ کو سجدہ کر رہا ہوں ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ خواب سچا ہے اور تم بھی صحیح کہہ رہے ہو ، گویا آپ نے اس فعل کی تصدیق فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ تم بھی صحیح کہہ رہے ہو ۔

باز آں کس سجدہ می کردہ بشاہِ مرسلاں　　　مصطفےٰ منعش نکردہ آں زماں ہم بے گماں

ترجمہ : پھر اُن صحابیؓ نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا ، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فعل سے اُن کو نہیں روکا ۔

تشریح : یعنی شب کو جو خواب دیکھا تھا اس کی کیفیت عرض کرنے کے بعد اُن صحابیؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ تعظیمی کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس طرح اظہارِ تعظیم کو منع نہیں فرمایا تو پھر اس سے سجدہ تعظیمی کا جواز ظاہر ہوتا ہے ۔ اگر اس میں کوئی قباحت ہوتی تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اس سے منع فرماتے ۔

در سلف اکثر مشائخ سجدۂ پیرے روا　　　داشتند از بہر تطبیق حدیث مصطفےٰ

ترجمہ : مشائخ سلف میں اکثر نے مرشد کے لئے سجدہ تعظیمی کو حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مطابقت کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے ۔

تشریح : اس سے پہلے مصنف نے سجدہ تعظیمی کے ثبوت میں قرآن وحدیث کا حوالہ دے کر ثابت

کیا تھا کہ سجدہ تعظیمی کا وجود شریعت محمدی سے قبل بھی تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں بھی اس قسم کا معاملہ پیش ہوا تو آپ نے نکیر نہ فرمائی۔

اب مصنفؒ فرماتے ہیں کہ مشائخ اسلاف کی اکثریت صرف اس حدیث پاک سے مطابقت کیلئے اپنے اس عمل کو جائز قرار دیتی ہے اس میں سجدہ عبادت کا کوئی تصور ہی نہیں ہوتا جس سے اس کا ارتکاب شرعی حدود سے باہر ہو، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ؎

کے کند انساں بسوئے خاک سجدہ بالیقیں　　سجدہ باری است سوئے کعبہ سجدہ ہمچنیں

ترجمہ: یہ بات تو یقینی ہے کہ انسان جسدِ خاکی کو سجدہ کہاں کرتا ہے بلکہ یہ تو کعبہ کی طرف رُخ کر کے اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے کی طرح ہے۔

تشریح: یہ بات تو یقینی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سجدہ تعظیمی میں بھی انسان کو سجدہ کرنے کا بالکل قصد نہیں ہوتا بلکہ اس کی ظاہری صورت ایسی ہے جس طرح بیت اللہ کی طرف بوقتِ عبادت سجدہ کیا جاتا ہے، تو یہ سجدہ اس عمارت کو نہیں ہوتا جو پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ بلکہ یہاں بھی "بیت" کے بجائے "رَبُّ البَیْت" کو سجدہ کیا جاتا ہے۔

سوئے کعبہ سجدۂ حق چوں بدانی اے پسر　　قبلہ انساں را بسازو سجدۂ حق می شمر

ترجمہ: جب تم کعبہ کی طرف رخ کر کے سجدہ کرنے کو سجدۂ باری سمجھتے ہو تو انسان کو بھی قبلہ تصور کر کے سجدہ کو بھی سجدۂ حق سمجھ لو۔

تشریح: یہاں مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سجدہ صرف ایک ہی قسم کا ہوتا ہے، اور وہ اس طرح کہ جیسے تم کعبہ کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہو اور یہ سجدہ کعبہ کو نہیں بلکہ مالکِ کعبہ کو، یعنی پروردگار کو ہوتا ہے، کعبہ کی طرف تو رُخ اس لئے کیا جاتا ہے کہ یہ اللہ کی تجلیات کا مرکز ہے اور اس مرکزِ تجلیات کی طرف رُخ کر کے صاحبِ تجلی کو ہی سجدہ کیا جاتا ہے، اسی طرح قلبِ مرشد بھی تجلیاتِ باری کا مرکز ہوتا ہے تو مرشد کی طرف رخ کر کے اگر سجدہ کیا جائے تو وہ سجدہ درحقیقت ذاتِ مرشد کو نہیں ہوگا، بلکہ مرکزِ تجلیات ہونے کی وجہ سے کعبہ کی طرح صاحبِ تجلیات کو ہی سجدہ ہوگا

تصور کیا جائے گا، اس صورت میں اب اس بات کی بھی کوئی ضرورت نہیں رہی کہ سجدہ کی دو قسمیں کی جائیں، بلکہ سجدہ کی ظاہری صورت اور باطنی حقیقت ایک ہی مان لی جائے کہ جس طرح کعبہ کو سجدہ نہیں کیا جاتا، اسی طرح انسان بھی مثل کعبہ ہے اس کو بھی سجدہ نہیں کیا جاتا۔ بلکہ دونوں صورتوں میں سجدہ تو صرف صاحب تجلیات یعنی باری تعالیٰ ہی کے لئے ہوتا ہے۔

باز گویم یک سخن از سجدۂ پیر اے جواں — از ملائک سجدۂ آدم چہ باشد شرح آں

ترجمہ: مرشد کو سجدہ کرنے کے بارے میں، ایک بات میں پھر کہتا ہوں کہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سجدہ کرنے کی کیا توجیہ کریں گے۔

تشریح: سجدۂ مرشد کے سلسلے میں مصنف یہ دلیل پیش کر رہے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے پتلے کو ملائکہ نے جو سجدہ کیا تھا، اس کی کیا حقیقت تھی؟ اور اس سجدہ کا حکم تو خود مسجود حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔ اگر اس کی ظاہری صورت کو دیکھ کر سجدۂ عبادت کا حکم لگادیں تو کیا یہ صحیح ہوگا، ہرگز نہیں، کیونکہ قرآن پاک میں تو متعدد مقامات پر فرمایا گیا ہے کہ خدائے واحد ہی کو سجدہ کرو۔ بلکہ تمام قرآن دعوت توحید پر مبنی ہے، پھر اگر اس سجدہ کی حقیقت سجدۂ عبادت کی ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کیوں فرشتوں کو حکم فرماتے۔

دوسری بات یہ کہ اس سجدہ کو اگر سجدۂ عبادت مانیں گے تو پھر شیطان نے اگر اس سے انکار کیا تو کونسا برا کیا حالانکہ وہ اسی سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے راندۂ بارگاہِ الٰہی ہوگیا۔ مصنف نے یہ استدلال ظاہر روایت سے کیا ہے ورنہ مردود بارگاہ ہونے کی وجہ عدول حکمی ہے۔

در طریقت سجدہ را دو حال باشد اے عزیز — یک تحیت یک عبادت، ہر دو را می کن تمیز

ترجمہ: دائرۂ طریقت میں سجدہ کی دو الگ الگ قسمیں ہو جاتی ہیں۔ ایک سجدۂ تحیت، ایک سجدۂ عبادت، دونوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔

تشریح: جب تمام صورتیں آپ کے سامنے آگئیں تو ان کا نتیجہ خود بخود یہ نکلا کہ سجدے کی بھی دو صورتیں ہیں، حقیقت کے اعتبار سے اگرچہ ظاہری طور پر ایک ہی صورت ہے۔ اسی لئے

مصنف رحمہ اللہ لفظِ طریقت لا کر یہ بتلا رہے ہیں کہ باطن کے اعتبار سے دو صورتیں ہیں اور ان دونوں صورتوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔

اسی فرق نہ کرنے کی وجہ سے شیطان کو سجدہ نہ کرنے پر اتنی بڑی سزا ملی کیونکہ اس نے حقیقت کو نہیں سمجھا۔ اس نے سمجھا کہ مجھے مٹی کے ظاہری پتلے کو سجدہ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے حالانکہ انسانی حقیقت تو مرکز نور کی تھی اور یہ سجدہ اسی عظمت کے اظہار کے لئے تھا۔ انسان کی عبادت کے لئے نہیں تھا۔ شیطان نے اس فرق کو نہیں سمجھا اور یہ کہہ بیٹھا کہ کیا میں اس مٹی سے بنے ہوئے پتلے کو سجدہ کروں جبکہ میری پیدائش آگ سے ہے" آگ میں بلندی ہے اور خاک میں پستی ہے اس نے یہ نہ سوچا کہ آگ کی بلندی ظاہری ہے اور خاک کی بلندی باطنی ہے۔ ورنہ یہی مشت خاکی خلیفۃ اللہ کے شرف سے کیوں نوازا جاتا۔ اس میں باطنی اعتبار سے کس قدر بلندی تھی۔

بہر مردم شد تحیت ایں سخن را صدق داں خالقے را شد عبادت سجدۂ مرشد چناں

ترجمہ: یہ بات صحیح ہے کہ آدمی کو سجدہ کرنا، سجدہ تعظیمی ہے، خالق کو سجدۂ عبادت کرنے کی طرح سجدۂ مرشد کیسے ہو سکتا ہے۔

تشریح: جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ سجدہ کی حقیقت الگ الگ ہے اور آدمی کو صرف سجدۂ تعظیمی ہی کیا جا سکتا ہے تو پھر یہ بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے لئے سجدۂ عبادت ہے، مرشد کے لئے سجدہ بھی اسی طرح اور اسی انداز کا ہوگا؟ اس لئے کہ مرشد بھی تو انسان ہے اور انسان کو سجدہ تعظیمی کیا جا سکتا ہے تو پھر مرشد کے سجدہ کی حیثیت بھی سجدہ تعظیمی ہی کی ہوگی نہ کہ سجدہ عبادت کی۔

بہتر از سر نیست چوں در دست طالب ھدیۂ می نہد سر پیش مرشد تا بود خوش تحفۂ

ترجمہ: جب طالب حق کے پاس اپنے سر سے بہتر کوئی ہدیہ ہی نہیں ہے، اس لئے بطور تحفہ وہ اپنے سر کو مرشد کی خدمت میں پیش کر دیتا ہے

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اس سجدہ تعظیمی کے پس منظر میں عبادتِ مرشد کا تو کوئی تصور ہی

نہیں ہوتا، بلکہ اس کی ادائیگی کی یہ وجہ ہے کہ مرشد کامل نے جب اس کو معرفت کی منزل کی طرف رہنمائی کی تو مرشد کی خدمت میں مرید کیا تحفہ پیش کرے، اس کے پاس سب سے عمدہ تحفہ سر ہی ہے وہی خدمتِ مرشد میں پیش کردیتا ہے۔ کیونکہ دستور ہے کہ عشق مجازی میں محبوب کے لیے عاشق نذرانۂ قلب وجان پیش کرتے ہیں اور سالک کا قلب تو عشقِ الٰہی سے معمور ہوگیا تو گویا قلب تو اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کردیا، رہ گیا قالب تو اس کو مرشد کی خدمت میں پیش کردیا، اب سالک کا نہ قلب رہا نہ قالب رہا یہی منزلِ فنا ہے جس کے بعد بقا میسر ہوتی ہے۔

شرحِ ایں بسیار داں ہم بے قیاس و بیشمار   وجہِ مرشد می نگر در دل چہ بینی کردگار

ترجمہ: اس مضمون کی شرح تو بہت زیادہ اور طویل ہے، بس دل میں مرشد کا تصور قائم کرو تاکہ تجلیاتِ باری کا مشاہدہ ہوجائے۔

تشریح: یہاں پر مصنف پھر اپنے مقصد کی طرف رجوع کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ موضوع ایسا ہے کہ اگر اس کی مکمل تشریح کی جائے اور اعتراضات و جوابات تحریر کیے جائیں تو سلسلۂ بحث بہت طویل ہوجائے گا اور سالکِ طریقت الفاظ ہی میں رہ جائے گا۔ روح تک اس کی رسائی نہ ہوگی، حالانکہ اس راہ میں مقصود معانی ہیں الفاظ نہیں، اسی لئے صوفیا حضرات بحث و تمحیص سے دامن بچاتے ہیں، مصنف بھی اپنے کلام کو مختصر کرتے ہوئے اصل مقصد اس شغل کا بتلاتے ہیں کہ اپنے تمام خیالات کو سمیٹ کر ذاتِ مرشد پر مرکوز کرلو اور مرشد کا تصور ہر وقت اپنے دل میں کرلو۔ اس طرح تم اپنے دل کو مرکزِ تجلیات محسوس کروگے۔

شو مراقب، باش ملحوظ رخِ مرشد را بسر   بنگری دیدار آں باری تعالیٰ زود تر

ترجمہ: مراقبہ میں مشغول ہوجاؤ اور ذاتِ مرشد کو بالکل اپنے سامنے خیال کرو، پھر اس کے بعد بہت جلد اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ کروگے۔

تشریح: جو چیز اللہ تعالیٰ تک پہونچانے والی ہو اس کے خیال رکھنے کو مراقبہ کہتے ہیں، اس کا طریقہ یہ ہے کہ نمازی کی طرح دو زانو ہوکر، سر جھکا کر بیٹھے اور تمام خیالات کو دل سے نکال دے

اور یہ یقین کرے کہ میں اللہ کے سامنے حاضر ہوں اور میری تمام باتوں کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے، اور وہ میرے ساتھ ہے، پھر جس چیز کا مراقبہ کرنا چاہے کرے، یہ تو عام صورت تھی، یہاں پر مراقبہ تصور شیخ کا ہوگا، وہ اس طرح کہ دو زانو ہو کر تمام خیالات کو سمیٹ کر یہ تصور کرے کہ مرشد کامل کی ذات میرے سامنے ہے اور اپنے دل کو مرشد کے قلب مبارک کے بالکل سامنے تصور کرے، یہاں تک کہ جو تجلیات منجانب اللہ قلب مرشد پر نازل ہو رہی ہیں ان کو اپنے قلب میں محسوس کرنے لگے، اس طرح بہت جلد قلب مرید بھی مرکز ظہور تجلیات ہو جائے گا۔

روئے مرشد ہست برزخ درمیانِ حق و تو ‌‌‌‌‌‌ ‌‌‌‌ از گمان پیر بگذر تا بہ بینی روئے او

ترجمہ: اللہ تعالیٰ اور تمہارے درمیان ذات مرشد تو ایک برزخ ہے مرشد کے خیال سے آگے بڑھ جاؤ تاکہ اس کا دیدار کر لو۔

تشریح: یعنی جب تم نے اپنے دل کو مرشد کے قلب مبارک کے بالکل سامنے کر لیا، اور تم کو تجلیات کا مشاہدہ بذریعۂ قلب مرشد ہونے لگے تو پھر تم اس میں اس قدر انہماک اور توجہ کرو کہ بس تجلیات کا وجود باقی رہ جائے اور اس کے علاوہ ہر ایک چیز سے تمہارا تعلق منقطع ہو جائے، یہاں تک کہ تم کو اپنے وجود کا بھی احساس نہ رہے، کیونکہ مرشد کی ذات تو تمہارے اور پروردگار کے درمیان برزخ ہے، جب اس شغل میں اچھی طرح مشغولیت ہو جائے گی تو یہ برزخ اٹھا لیا جائے گا اور پھر سالک اور مالک کے درمیان کوئی آڑ اور حجاب نہ رہے گا، بس ہر طرف تجلیات باری ہی کا ظہور ہوگا، یہی مقام بقا اور مقام تحیر ہے جو طریقت کی آخری منزل ہے۔

روئے مرشد واسطہ باشد میانِ تو و حق ‌‌‌‌‌‌ گوش داری ایں سخن را یاد داری ایں سبق

ترجمہ: مرشد کی ذات تیرے اور پروردگار کے درمیان واسطہ ہے، یہ بات توجہ سے سنو، اور اس سبق کو یاد رکھو۔

تشریح: یعنی مرشد کی ذات مرید اور ذات واجب الوجود کے درمیان واسطہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کے ذریعہ مرید عالم ناسوت سے گذر کر عالم لاہوت میں سیر کرتا ہے، اسلئے اس کا احترام

اور مرشد کے حکم کی تعمیل ضروری ہے لیکن اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے کہ ذاتِ مرشد منزلِ مقصود نہیں ہے۔ اس لئے اس کو واسطہ کی حد تک ہی محدود رکھنا چاہیئے۔

کن فنا در پیر خود را کیں شہود رہِ دوست　　از فنا فی الشیخ گردی در بقا باقی بدوست

ترجمہ: اپنے آپ کو ذاتِ مرشد میں فنا کردو کہ یہی مشاہدۂ تجلیات کا ذریعہ ہے۔ فنا فی الشیخ کے ذریعہ ہی باقی بحق ہوکر مقامِ بقا تک پہونچ جاؤگے۔

تشریح: جس شغل کو مصنف نے "وجہِ مرشد دیدنی" یعنی تصورِ شیخ سے شروع کیا تھا، اس کا اختتام اس پر ہے کہ تم اپنی ذات کو مرشد کی ذات میں فنا کردو، یعنی مرشد کی ذات کا تصور تمہارے دل و دماغ پر اس طرح راسخ ہوجائے کہ جب اپنے قلب کو مرشد کے قلب مبارک کے محاذ میں قائم کرو اور جو کچھ تجلیات قلب مرشد سے تمہارے قلب میں پہونچ رہی ہیں اور تم ان تجلیات کا چشمِ قلب مشاہدہ کر رہے ہو تو اس وقت اس مشاہدہ میں اس قدر انہماک ہوجائے کہ تم کو اپنی ہستیٔ ناسوتی وہمی کی کوئی خبر نہ رہے، گویا ذاتِ مرشد میں تمہارا وجود کالعدم ہوگیا ہے اسکو "فنا فی الشیخ" کہتے ہیں، کیونکہ جبتک تم کو اپنے وجود کا احساس رہے گا تو فنا فی الشیخ کی کیفیت حاصل نہوگی اور جبتک اس کیفیت کا احساس نہ ہوگا تو اس سے آگے کی منزل بھی نہیں ملے گی، اس لئے پہلے اپنے وجود سے گذر کر مرشد کے وجود کے مقابلہ میں اپنے وجود کو کالعدم سمجھو اور پھر ذاتِ مرشد میں فنا کے بعد مقامِ بقار حاصل ہوجائیگا۔

یہاں مصنفؒ نے فنا فی الشیخ کے بعد ہی مقامِ بقا کا ذکر کیا ہے اور درمیانی مراتب "فنا فی الرسول" اور "فنا فی اللہ" مذکور نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ فنا فی الشیخ کے بعد دونوں مراتب میں لزومِ اتصالی ہے کہ جب فنا فی الشیخ سے گذر جاؤگے تو پھر متصلاً ہی مراتبِ فنا فی الرسول کا فیضان شروع ہوجاتا ہے اور اس کی تکمیل پر فنا فی اللہ کا مرتبہ عطا ہوجاتا ہے، بنیادی چیز فنا فی الشیخ ہے جس کا آخری مرحلہ مقامِ بقار ہے، اسی کو حضرتِ رومی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے ؎

چوں تو ذاتِ پیر را کردی قبول　　ہم خدا در ذاتش آمد، ہم رسول

یعنی جب تم نے مکمل طور پر اپنے کو مرشد کے حوالے کردیا، تو گویا اس کے ذریعہ خدا اور رسول کو پالیا۔

در بیان شغل اکبر اُمہاتی

شغل اکبر اُمہاتی کا بیان

باش اندر شغلِ اکبر اُمہاتی نام آں تابہ بینی زود تربس دجہ باری بیگماں

ترجمہ : شغلِ اکبر اُمہاتی میں مشغول ہو جاؤ، تاکہ اس کے ذریعہ یقینی طور پر، بہت جلد تجلیاتِ باری کا مشاہدہ کرلو۔

تشریح : اس سے قبل مصنف رحمۃ اللہ علیہ شغلِ اعظم کے نام سے ایک شغل بیان کر چکے ہیں جس کا مرکزی نقطۂ نظر "تصورِ شیخ" تھا جس کے ذریعہ "فنا فی الشیخ" کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے، اور پھر فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ ان فنائے ثلٰثہ کے بعد مقامِ بقا کی طرف اشارہ کیا تھا، یہ شغل جس کو شغلِ اکبر اُمہاتی کے نام سے بیان کر رہے ہیں اس کے ذریعہ مقامِ بقار کا حصول ہو جاتا ہے۔ اس میں چونکہ آٹھ ارکان ہیں اسلئے اس شغل کو ہشت رکنی بھی کہتے ہیں۔

شغلِ اعظم کے ذریعہ قلبِ سالک تجلیاتِ باری کے نزول و قبول کی صلاحیت و استعداد حاصل کر چکا تھا اور مشاہدۂ تجلیات کی کیفیات شروع ہو گئی تھیں، شغلِ اکبر میں مشاہدہ کی منزل کی تکمیل ہو جاتی ہے اور معائنہ کی منزل کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس شغل سے لطائفِ ستہ کا اجرار ہوتا ہے۔ اس شغل کی کیفیات دائرۂ تحریر سے باہر ہیں اور نہ ان کو تحریر میں لانے کی اجازت ہے۔

یہ شغل شطاریہ[1] سلسلہ کا بہت اہم شغل ہے، مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے طریقۂ نقشبندیہ عُلیا کے واسطے سے اس کی روایت کو خلیفۂ اوّل سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف نسبت دی ہے جبکہ بعض حضرات نے سیدنا و مولائی حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی اس کی روایت کو منسوب کیا ہے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں اس کے فوائد مسلم ہیں جس کا طریقہ یہ ہے۔

---

[1] حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ تمام اشغالِ شطاریہ میں یہ شغل ہشت رکنی بہت زیادہ اثر رکھتا ہے۔

باصمت شوم الغرض این هشت حرف اُمّہات ذکر و شغل کامل آمد جان و دل را تصفیات

ترجمہ: "باصمت شوم" یہ آٹھ حروف امہات ہیں جن کا مکمل ذکر و شغل، جان و دل کے لیے تمام چیزوں سے صفائی کا سبب ہے۔

تشریح: مصنف نے یہاں "باصمت شوم" ایک جملہ نما استعمال کیا ہے اس میں آٹھ حروف ہیں ب، ا، ص، م، ت، ش، و، م، "ب" سے مراد برزخ شیخ "ا" سے مراد اسم ذات، "ص" سے مراد صفات ذات "م" سے مراد "مد" "ت" سے مراد "تحت" "ش" سے مراد "شد" "و" سے مراد فوق اور دوسرے "م" سے مراد "ملاحظہ نفس واحد" ان آٹھ حروف کے مشارٌالیہ کو ذیل کے شعر میں جمع کر دیا گیا ہے سات الفاظ کے مشارٌالیہ پہلے مصرعہ میں اور آٹھواں مشارٌالیہ دوسرے مصرعے میں ہے ؎

برزخ و ذات و صفات و شد و مد و تحت و فوق ہشتمی مفہوم واحد می فزاید ذوق و شوق[1]

مذکورہ شعر میں جو اشارات بتلائے گئے ہیں ان کی تشریح کی روشنی میں اس شغل کی صورت یہ ہوگی کہ سالک بصورت احتبار یعنی گھٹنے کھڑے کرکے اکڑوں بیٹھے اس طرح کہ اس کے سرین زمین سے متصل رہیں اور دونوں کہنیوں کو دونوں گھٹنوں پر رکھ کر ہاتھ کے دونوں انگوٹھوں سے دونوں کان کے سوراخ بند کرے، شہادت کی دونوں انگلیوں سے آنکھ ڈھانک لے، اور درمیان کی دونوں انگلیاں ناک کے نتھنوں پر رکھے، باقی چار انگلیوں میں سے چھوٹی دونوں

---

[1] یہ شعر ان الفاظ کے ساتھ جس میں آٹھو الفاظ کا مشارٌالیہ مذکور ہے، ایک قلمی بیاض میں جو خانقاہ منعمیہ ابوالعلائیہ، گیا (بہار) میں ہے، مرتب کو ملا تھا، اس بیاض کے ناقل محمد کفیل صاحب اور صاحب بیاض حسین الدین احمد منعمی ابوالعلائی ہیں۔ اس بات کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اکثر کتب میں جہاں اس شعر کو استعمال کیا گیا ہے اس میں دوسرے مصرعہ میں "ہشتمی مفہوم واحد" کا لفظ نہیں ہے، بلکہ ؎

برزخ و ذات و صفات و شد و مد و تحت و فوق می نماید طالباں را کل نفس ذوق و شوق

اور اس طرح شعر کا مفہوم شغل سہ پایہ سے متعلق ہے جس میں صفات ثلثہ سمیع، بصیر، علیم کا تصور ہوتا ہے اور یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ شغل اکبر اُمّہاتی جس کو شغل ہشت رکنی بھی کہتے ہیں، اس سے پہلے شغل سہ پایہ کیا جاتا ہے تاکہ صفات سبعہ کا تصور قائم کرنے میں آسانی ہو، اس طرح خارجی اور داخلی اعتبار سے شغل سہ پایہ اور شغل اکبر علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔

انگلیاں ہونٹ کے نیچے رکھے اور چھوٹی کے برابر والی انگلیاں ہونٹ کے اوپر رکھ کر منہ بھی بند کرلے اور یہ تصور کرے کہ میرے اور ذاتِ وحدہٗ لاشریک کے درمیان مرشد کی ذات ایک برزخ اور حجاب ہے اس حجاب کا تصور "آڑ" اور رکاوٹ کی صورت میں نہیں بلکہ واسطہ اور رابطہ کی صورت میں ہوتا ہے[1]۔ اس لیئے پہلے ذاتِ مرشد کا تصور کرے گا اور جب یہ برزخ اُٹھ جائے اور یہ خیال مستحکم ہو جائے کہ تجلیاتِ باری کا فیضان نسبت مرشد کی وجہ سے براہ راست مجھ تک پہونچ رہا ہے، لیکن مرشد کی ذات میرے اور ذات وحدہ لاشریک کے درمیان حائل نہیں۔ اس کے بعد زبان کو تالو سے لگائے اور اَللّٰہُ حَاضِرِیْ اَللّٰہُ نَاظِرِیْ اَللّٰہُ مَعِیْ کو زبان و قلب سے ادا کرکے ان کے معنیٰ کا مکمل طور پر استحضار رکھے، بعدہٗ بائیں نتھنے سے اُنگلی ہٹا کر شدت کے ساتھ سانس کو ناف (لطیفۂ نفس) سے اسمِ ذات کے ساتھ اس انداز سے کھینچے کہ لفظ اَللّٰہُ (بالجزم) کے ہمزہ (الف) کا آغاز ناف سے ہو جائے، پھر اس لفظ اَللّٰہُ کو قلب مدور (لطیفۂ اخفیٰ) میں

---

[1] برزخ کا مطلب ایک ایسا حجاب ہے جس میں آمیزشِ محبت ہوتی ہے، اس لفظ کی ترجمانی اردو میں لفظ "چلمن" کر سکتا ہے، خواجہ حسن نظامی رحمۃ اللہ علیہ نے "تعلیم اسرارِ تصوف" میں صفحہ ۸۷ پر سطر ۱۹ میں "برزخ نازو ادا" کہہ کر اسی طرف اشارہ فرمایا ہے، یہ اس لیئے کہ کہیں حجاب کا مطلب آڑ اور موانع یعنی رکاوٹ نہ سمجھ لیا جائے بلکہ واسطہ اور ذریعہ تصور کیا جانا چاہیئے۔ واسطہ اور ذریعہ سے فیضیابی کے حصول کے بھی دو طریقے ہیں، ایک تو بذریعہ برزخ، یعنی برزخِ مرشد اٹھ جائے اور فیضان کا سلسلہ براہ راست شروع ہو جائے، اس صورت میں ذاتِ مرشد درمیان میں باقی نہیں رہتی، اگرچہ فیض اسی کے ذریعہ ملا ہے۔ دوسرا طریقہ "ورزشِ نسبت" کا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مرید اپنے قلب کو مرشد کے قلب مبارک کے محاذ میں تصور کرے اور بصورت مراقبہ دوزانو نشست اختیار کرکے یہ تصور کرے کہ میرے قلب پر مرشد کے قلب سے فیضان پہونچ رہا ہے اور مرشد کے قلب پر ان کے مرشد کے قلب سے سلسلۂ فیضان جاری ہے یہاں تک کہ یہ مبارک سلسلہ سیّد الانبیاء حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچ جائے، اور وہاں جو فیضانِ باری تعالیٰ براہِ راست ہو رہا ہے ان تجلیات میں سے نور کی ایک لکیر واسطہ در واسطہ ہوتے ہوئے قلب مرشد کے ذریعہ میرے دل تک پہونچ کر میرے قلب کو معمورِ انوار کر رہی ہے، اس صورت میں ذات مرشد مع سلسلۂ بالا قائم رہتی ہے اور برزخ مرشد کی صورت میں ذاتِ مرشد رابطہ کا کام دے کر الگ ہو جاتی ہے (لمعات انواریہ)

لے جاکر حبس دم کرے اور یہ تصور کرے کہ یہ لفظ اَللّٰہُ اسم ذات تمام صفات کو جامع ہے اور اس کو اندر ہی اندر دل پر ضرب کرے، یہاں تک کہ سات چیزیں حبس دم کے ساتھ تصور میں آگئیں ۱۔ برزخ مرشد، ۲۔ اسم ذات، ۳۔ اسم ذات کا تصور مستجمع لجمیع صفات ہونا، ۴۔ شدت کے ساتھ سانس لینا، ۵۔ اوپر کی طرف کھینچنا، ۶۔ نیچے کی طرف لانا یعنی ناف (لطیفۂ نفس) کی طرف لانا، ۷۔ قلب مدوّر (لطیفۂ اخفیٰ) تک لیجانا۔ یہ سات ارکان تو پورے ہوگئے، آٹھواں رکن ملاحظۂ نفس واحد رہ جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ذاتِ خداوند قدوس کی تمام صفات میں سے سات صفات ذاتی جن کو "سبعہ صفاتِ امہات" کہا جاتا ہے، ان کا علیحدہ علیحدہ ایک ترتیب کے ساتھ اس لفظ واحد یعنی اسم ذات میں اتصاف کے ساتھ تصور کرے، جیسے اَللّٰہُ سَمِیْعٌ، اَللّٰہُ بَصِیْرٌ، اَللّٰہُ عَلِیْمٌ، اَللّٰہُ حَیٌّ، اَللّٰہُ قَدِیْرٌ، اَللّٰہُ مُرِیْدٌ، اَللّٰہُ کَلِیْمٌ۔ ان صفاتِ سبعہ امہات کا اسم ذات کے ساتھ تصور کرتے وقت یہ خیال کرے کہ فیضان کا آغاز لطیفۂ نفس (ناف) سے ہوتا ہوا قلب مدوّر تک پہونچ رہا ہے اور قلب مدوّر سے پھر یہی فیضانِ سبعہ صفات لطیفۂ نفس تک آرہا ہے، اس کو نزول و عروج کہتے ہیں[1]، اس طرح اس پر عمل کرنے سے تجلیۂ روح اور تصفیۂ قلب مکمل طور پر ہوجاتا ہے، اور یہ اس لئے کہ اس شغل میں ذکر اور فکر دونوں کو جمع کردیا گیا ہے، ذکر کے ذریعہ قلب کا تصفیہ ہوتا ہے اور فکر کے ذریعہ تجلیۂ روح۔

اس شغل میں چونکہ ذکر اور شغل دونوں کو جمع کردیا گیا ہے، اس لئے ان دونوں کا فرق بھی جاننا ضروری ہے۔ **ذکر** کہتے ہیں الفاظ کے ساتھ صوتی رابطہ کو، یہ رابطہ خواہ لسانی ہو یا قلبی، جہری ہو یا خفی۔ **شغل** کہتے ہیں اس رابطہ کے پس منظر میں جو کیفیت نمایاں ہوتی ہے جس کا تعلق ادراک سے ہے۔ الفاظ میں اس کیفیت کو نہ تو بیان کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کی اجازت دی گئی ہے۔

ذکر کی منازل طے ہونے کے بعد ہی اشغال کی طرف توجہ کرنی چاہیئے، ورنہ اپنی استعداد

---

[1] یہ شغل ہشت رکنی، شغل سہ پایہ کے بعد کیا جاتا ہے جس کی تمام کیفیات اسی طرح ہیں مگر اس میں شد و مد نہیں ہوتا اور صفات سبعہ کے بجائے صفاتِ ثلٰثہ کا لحاظ رکھا جاتا ہے اس طرح کہ اَللّٰہُ سَمِیْعٌ، اَللّٰہُ بَصِیْرٌ، اَللّٰہُ عَلِیْمٌ۔ (مرتب)

سے زائد بار اٹھانے کے مترادف ہو کر جذب کی طرف میلان ہو جاتا ہے، اسی لئے تمام اذکار و اشغال طریقت مرشد کی صواب دید پر موقوف ہوتے ہیں۔ ھکذا قال مرشدی۔

ایں شہود شغل خوب و ذکر پاکِ اُمّہات ۔۔۔ دل گداز د صاف ساز د رونماید واردات

ترجمہ: یہ شغل مشاہدہ کے لئے اور یہ ذکر سبعہ صفات کا ایک بہترین طریقہ ہے جس سے قلب نرم اور صاف ہو کر تجلیاتِ باری کے مشاہدے کے قابل ہو جاتا ہے۔

تشریح: مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس شغل کی مزید توصیف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس شغل کے ذریعہ قلب نرم ہو جاتا ہے، کیوں کہ اس شغل میں حبسِ دم ہوتا ہے۔ صوفیا حضرات فرماتے ہیں کہ دل میں دو سوراخ ہوتے ہیں، ایک نیچے کی طرف، جس کا تعلق روح سے ہوتا ہے اور ایک سوراخ اوپر کی طرف، جو جسم سے متعلق ہے، شد و مد کے ساتھ ذکرِ جہری سے اوپر کا دروازۂ قلب کھلتا ہے اور روح سے متعلق نیچے کا دروازہ حبسِ دم کے ذریعہ ذکرِ خفی سے کھلتا ہے، اس لئے کہ حبسِ دم سے حرارتِ باطنی پیدا ہو جاتی ہے جس سے قلب کے چاروں طرف کی چربی پگھل جاتی ہے اور قلب تمام کثافت سے پاک ہو کر نرم اور صاف ہو جاتا ہے، قلب میں جب صفائی پیدا ہو جائے تو ظاہر بات ہے کہ پھر وہ تجلیاتِ باری کا عکس قبول کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے۔

گفتم ایں حرفِ اشارت در کتابِ گنجِ راز ۔۔۔ علمِ شطار است بہتر رازِ حقِ بے نیاز

ترجمہ: میں نے یہ اشاراتی حروف جو اس کتاب مثنوی گنجِ راز میں بیان کئے ہیں، یہ صاحبِ عزیمت لوگوں کیلئے ذاتِ بے نیاز کے راز کے سلسلے میں بہترین علم ہے۔

تشریح: مصنف رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ مسلکاً ابو العلائی ہیں (جو ابتدا میں نقشبندیہ اور چشتیہ سلسلہ پر مشتمل تھا اور اب حضرت منعم پاکباز رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلۂ قادریہ بھی ابو العلائی سلسلہ میں بنیادی طور پر داخل ہو گیا ہے)، مگر مصنف نے تمام ہی سلاسل سے وہ اشغال جو معتبر اور بہت مفید پائے ہیں، ان کا ذکر اس کتاب میں کر دیا ہے، چنانچہ یہ شغلِ اکبر بھی شطاریہ سلسلہ کا سب سے اہم شغل ہے، اس کے فوائد تو حقیقت میں مشاہدہ سے تعلق رکھتے ہیں مگر جو کچھ بزرگانِ سلسلہ

نے تحریر فرمائے ہیں اگر صرف ان کو ہی بیان کیا جائے تو سلسلۂ گفتگو بہت طویل ہو جائے گا، مختصر طور پر اس قدر ہی کافی ہے کہ لطائفِ ستّہ کا اجرار مکمل ہونے کے بعد جو کیفیتِ فنا سے بقار کی منزل کی طرف قدم اٹھتے ہیں اس میں اپنی ذات وصفات کی باگ ڈور مکمل طور پر خداوند قدوس کے قبضۂ قدرت میں علمی، عملی، اعتقادی طور پر دیدی جاتی ہے جس کو مصنّف آگے چل کر اسی عنوان کے تحت مُوتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا کے ضمن میں بیان فرمائیں گے۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ ۔

این وظیفہ انبیار را بُد ز عہدِ بو البشر — تا ابوالارواح احمد سرورِ صاحب خبر

ترجمہ: حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے تمام انبیار کا یہ شغل معمول رہا ہے، یہاں تک کہ اس کا سلسلہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچا۔

تشریح: اس سے پہلے مصنّف نے اس شغل کی مشاہداتی کیفیات کی بنار پر توصیف فرمائی تھی، اب اس شغل کی نسبت کی رفعت اور اہمیت کا اظہار اس طرح فرما رہے ہیں کہ یہ شغل تو ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے ہی سے تمام انبیار کا معمول چلا آرہا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر سیّد الانبیار ابوالارواح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بھی رہا۔

لیکن اس شغل کا جو طریقہ صوفیار حضرات نے متعین کیا ہے بعینہٖ اسی طرح یہ شغل آدم علیہ السلام سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک معمولِ انبیار رہا ہے اس کی کوئی دستاویزی سند نہیں۔

نیز اس کے برعکس نتیجہ اخذ کرنا کہ یہ شغل کسی صورت وشکل میں بھی معمولِ انبیار نہیں رہا، یہ بھی ناقابلِ تسلیم ہے، معاملہ صرف ہیئت کذائی کا ہے، اس لئے کہ جب ہم اس شغل کے پس منظر اور نتائج پر غور کرتے ہیں تو یہ چیزیں مقصدِ مصنّف کی واضح طور پر ترجمانی کر دیتی ہیں کہ اس شغل کی بنیاد مقصدِ تخلیقِ آدم سے فنائے آدم تک باقی رہے گی، اسی کی اشاعت کیلئے بعثتِ انبیار ہوئی اور اسی مسند پر امتِ محمدیہ علیہ التحیۃ کے برگزیدہ حضرات جلوہ افروز ہیں اور اب بھی ہیں آئندہ بھی رہیں گے اور وہ مقصد ہے خداوند تعالیٰ کی ذات واحد اور صفات کاملہ کا اس طرح اقرار کرنا کہ ہمارا وجود مکمل طور پر صرف اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے جیسے مردہ بدست غسّال، اور صرف

ہمارا وجود ہی نہیں بلکہ کائنات کی ہر شے پر اس کا استیلائے ہستی اسی انداز سے غالب ہے،
عالم اصغر پر جس طرح اس کا غلبہ قدرت ہے عالم اکبر پر بھی بالکل اسی انداز سے وہ قدرت مطلق رکھتا ہے

زیں عمل بوبکر صدیق است نگر بہرہ ور   افضلش خوانند بعد الانبیاء از ہر بشر

ترجمہ: اسی عمل سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مستفیض ہوئے جن کو متفقہ طور پر انبیاء کے بعد سب ہی افضل قرار دیتے ہیں۔

تشریح: انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد سب سے بڑا درجہ سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے اور قلب نبوت پر جو فیضان باری تعالیٰ براہِ راست ہوتا تھا وہ سید الانبیاء کے قلب اطہر کے واسطے سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قلب مبارک پر ہوتا تھا سید الانبیاءؐ جس شان کے ساتھ اس شغل کی برکات سے معمور و مستفیض تھے حسب استعداد منجانب اللہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی اس سے حصہ وافر ملا تھا، کیونکہ

بود حاصل معنیٔ موتش یقین دان اے پسر   چند گویم فضل او را پہ بیں اندر خبر

ترجمہ: یہ تو یقینی بات ہے کہ ان کو "حقیقتِ موت" سے آگاہی ہوگئی تھی، اس سے زیادہ فضائل ان کے دیکھنے ہوں تو احادیث میں دیکھ لو۔

تشریح: یہاں پر مصنف اس شغل کی نسبتِ رفعت بتلا رہے ہیں کہ اس پر عمل کے ذریعہ سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وہ مقام ارفع ملا کہ مُوتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوتُوا کی زندۂ جاوید مثال آپ کی ذات مبارک تھی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے بارے میں ارشاد فرمایا، "جو شخص مردہ کو زمین پر چلتا پھرتا دیکھنا چاہتا ہے ابوبکر کو دیکھ لے رضی اللہ تعالیٰ عنہ، یہی موت اختیاری تھی جس کے معنیٰ کا انکشاف سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہوگیا تھا، جس کا مظاہرہ حیات سید الانبیاء میں ہر ہر قدم پر ہوتا تھا، مثلاً جب خدا کی راہ میں گھر کا سامان دینے کا معاملہ آیا تو آپ سب سامان سمیٹ لائے اور خدمت اقدس میں حاضر کر دیا اور اثاث البیت سے اس طرح تعلق منقطع کر لیا جس طرح موت کے وقت ہوتا ہے، غارِ حرا کا منظر کس کے

سامنے نہیں، خطرناک سانپ ڈستا ہے اور آپ اس کی طرف اسی طرح توجہ نہیں فرماتے جیسے مردہ موذی جانوروں سے نہیں گھبراتا، وغیر ذالک۔ یہی خود سپردگی اور رضاء بالقضاء دراصل اس شغل کے بنیادی اثرات میں سے ہے، حضرت غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی مقام کے لیے فرماتے ہیں کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ سب میری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے یعنی اپنی تمام اختیاری حیثیت کو دست وحدت کے سپرد کر دیا، اب جو بھی فیصلہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے دربار سے ہوگا وہ مِنْ وعَنْ میت کے لیے قابلِ قبول ہوگا، صرف سر تسلیم ہی خم نہیں، قالب کے ساتھ قلب بھی راضی برضا ہے۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ۔ اسی بنا پر نقشبندیہ سلسلہ میں دس قسم کی موتِ اختیاری کا سلسلہ قائم ہے، سب سے پہلے توبہ[۱]: کوئی مطلوب خدا کے سوا نہ ہو جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے، دوسرے[۲] زہد: دنیا و مافیہا سے کچھ تعلق نہ رہے جیسا کہ بوقتِ موت ہوتا ہے، تیسرے[۳] توکل: اسباب ظاہری کو ترک کر دے جیسا کہ بوقتِ موت ہوتا ہے، چوتھے[۴]: قناعت، نفسانی و شہوانی خواہشات کو ترک کر دے جیسا کہ عند الموت ہوتا ہے، پانچویں[۵] عزلت: لوگوں سے دنیاداری کے سلسلے میں کنارہ کشی کرنا، جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے چھٹے[۶] توجہ: خدا کی طرف مکمل توجہ کرنا اور تمام اغراض کو اسی سے متعلق رکھنا۔ ساتویں[۷] صبر: تمام نفسانی لذتوں کو ترک کرنا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے آٹھویں[۸] رضا: اللہ تعالیٰ کے تمام فیصلوں پر راضی رہنا۔ نویں[۹] ذکر: اللہ تعالیٰ کے ذکر کے علاوہ تمام اذکار کو ترک کرنا جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔ دسویں[۱۰] مراقبہ: اپنی تمام قوت و اختیار کو چھوڑ دے جیسا کہ موت کے وقت ہوتا ہے۔ اب شاغل خود ہی غور کرے کہ اس شغل اکبر الٰہی کی نسبت کس قدر ارفع و اعلیٰ ہے اور اس کے فوائد کس قدر مستحکم ہیں۔

گشت ظاہر ایں ز فیضِ پیروی مصطفےٰ[۱] | در حواشی می نگر ایں داستانِ باصفا

ترجمہ: اس شغل کا فیضان حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے ظہور پذیر ہوا تھا اہل صفا کے اس قسم کے واقعات تم کتابوں میں دیکھ لو۔

لہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے مطابق یہ طریقہ لکھا گیا ہے۔ (منقول از قلمی بیاض حبیب الزبیرا)

تشریح: سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ تمام فیض حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرماں برداری سے حاصل ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کو مکمل طور پر فرمانِ آقا کے سپرد کر دیا تھا، قولی، عملی، اعتقادی اعتبار سے کہیں بھی، کسی مقام پر بھی اطاعتِ مصطفےٰ سے سرمو انحراف کا تصور بھی قلبِ صدیق سے الگ تھا۔ عشق ذات ہی نہیں بلکہ حقیقتِ محمدی سے عشق تھا یہی وجہ تھی کہ حیاتِ طیبہ کے بعد بھی حقیقتِ محمدی کے عشق کے مقام پر صدیقِ اکبر نمایاں حیثیت سے جلوہ افروز تھے۔ اسی طرح اگر مرید بھی اپنے مرشد کے احکام کا پابند، اطاعت میں مستعد، اعتقاد میں مستحکم ہوگا تو ان شاء اللہ تعالیٰ یہ فیضان حسبِ استعداد و توفیق خداوندی ذاتِ مرشد پہونچ کر رہے گا، اطاعتِ شیخ کی برکات سے کتابیں پُر ہیں، ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

ایں سخن گر نظم سازم ور بیارم با تمام | دور اُفتم از بیانِ شرطِ خلوت لا کلام

ترجمہ: اس موضوع کو اگر میں نظم کروں اور تمام حقائق بیان کروں، تو بیشک شرائطِ خلوت کے بیان کرنے سے میں بہت دور ہو جاؤں گا۔

تشریح: مختصر طور پر اس شغل کے طریقۂ کار اور فوائد کو بتلا کر مصنف اپنی بات کو ختم کر رہے ہیں اور اب تنہائی میں چلہ کشی کے بیان کی طرف متوجہ ہیں۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ کسی بھی شغل کی کیفیت الفاظ کے دائرے سے باہر ہے، کس قدر عمدہ الفاظ اور نپے تلے انداز میں محققانہ طور پر بیان کرنے کے بعد بھی تشنگی ہی رہ جاتی ہے، کیوں کہ یہ سب کچھ قال کی چیز نہیں ہے بلکہ سراسر حال ہے اور حال کو کون بیان کر سکا ہے۔

اس کے ذریعہ عجیب طرح کی حرارت، لطافتِ غریب، شوقِ عظیم، روشنی لطیف نہ صرف دل بلکہ پورے وجود میں پیدا ہو جاتی ہے، غفلت مکمل طور پر دور ہو جاتی ہے اور بے انتہا ذوق و شوق پیدا ہو جاتا ہے جو بیکار کاموں سے بالکل روک دیتا ہے لیکن اس شغل کے لئے تنہائی درکار ہے کیونکہ اس سے قلب میں عجیب طرح کی آوازیں محسوس ہوتی ہیں جس کے بارے میں مولانا روم فرماتے ہیں ؎

برلبش قفل ست و در دل رازہا | لب خموش و دل پُر از آوازہا

در بیان شرائط ہشتگانہ در خلوت نشینی اربعین

تنہائی میں چلہ کشی کی آٹھ شرطوں کا بیان

شرط خلوت ہشت آمد در نشست اربعین　　بے شرائط کار کردن پُر خطا داں بالیقین

ترجمہ: تنہائی میں چالیس دن بیٹھ کر کسی شغل میں مصروف رہنے کی آٹھ شرطیں ہیں،

شرائط کی ادائیگی کے بغیر کوئی بھی کام کرنے میں لازمی طور پر غلطیاں ہوتی ہیں۔

تشریح: مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے جو اشغال بیان کیئے ہیں یا آئندہ بیان کریں گے ان پر عمل پیرا ہونے کی بھی کچھ شرائط ہیں، کسی بھی کام کو مکمل طور پر انجام دینے کے لئے سب سے پہلے دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک شرط، دوسرے شطر۔ شرط کسی کام سے متعلق ان چیزوں کو کہتے ہیں جو داخل شئے تو نہ ہوں لیکن اس کی تکمیل کے لئے لازمی ہوں جیسے نماز کے لئے وضو شرط ہے، حالانکہ وضو داخل نماز نہیں لیکن بحالت صحت وعدم عذر بغیر وضو کے نماز نہیں ہوتی۔ اسی کو شرط شئے کہتے ہیں، جو خارج از شئے ہو اور لازم بھی ہو اور شطر شئے کہتے ہیں اُن چیزوں کو جو داخل شئے ہوں جیسے نماز میں قیام، رکوع، سجود وغیرہ۔

اسی طرح سالک جب کسی شغل کا ارادہ کرے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ داخلی کیفیات کے علاوہ خارجی قواعد اور شرائط کا بھی لحاظ رکھے۔

یہاں ایک بات اور بھی سمجھ لیجئے کہ اکثر امور میں صوفیاء نے چالیس دن کا اعتبار کیا ہے، یہاں تک کہ نشست اربعین یا چلہ کشی تقریباً جزو لازم ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص چالیس دن تک خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے خلوت اختیار کرے تو علم کے چشمے اس کے قلب سے جوش زن ہو کر اس کی زبان سے ظاہر ہوں گے۔ اس کے علاوہ چالیس کے عدد کو بہت سی جگہ مانا گیا ہے جیسا کہ عقل انسانی بھی چالیس سال میں مکمل ہوتی ہے اور نطفہ بھی شکم مادر میں چالیس چالیس

دن کے وقفہ سے مختلف اشکال اختیار کرتا ہے ، بہر حال چالیس دن کی تعیین کی بنیاد یہ تمام چیزیں ہیں ۔ ان چالیس دن میں جو شرائط صوفیا رحضرات نے مقرر فرمائی ہیں ان کے مطابق ہی شغل میں مشغول ہونا چاہیئے ، اگر اپنی مرضی سے اس راہ میں قدم رکھا گیا تو غلطیوں کا بہت زیادہ امکان ہے جس کے سبب منزل سے قریب ہونے کے بجائے دوری ہو جائے گی اور مرشد کامل کی نگرانی میں شرائط کے ساتھ مشغول ہونے میں کامیابی کی راہ کھلتی ہے ۔

درشست اربعیں باشی بجنگ از دشمناں　　بے سلاح و تیغ و خنجر نیست ممکن فتح آں

ترجمہ : چلہ کشی میں تو گویا دشمنوں سے باقاعدہ جنگ کرنی پڑتی ہے اور تلوار و خنجر سے مسلح ہوئے بغیر دشمن پر کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں ۔

تشریح : یہ تو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ قلب انسانی نفس اور روح سے عبارت ہے ، نفس میں کثافت ہے اور روح میں لطافت ہے اور قلب تجلیاتِ باری کے مشاہدہ کا مرکز جب ہی ہوتا ہے جب اُس سے کثافت کو دور کر کے لطافتِ روحی کے تابع کر دیا جائے ، اسی کو تصفیۂ قلب کہتے ہیں ، لہذا جب کوئی سالک راہ طریقت میں قدم رکھتا ہے تو سب سے پہلے اس کو اپنے داخلی دشمنوں سے جن کا مرکز نفس انسانی ہے ، مقابلہ کرنا پڑتا ہے ، جس طرح خام لوہے کو آگ کی بھٹی میں گرم کر کے درجہ بدرجہ اعلیٰ درجہ کا فولاد بنایا جاتا ہے اسی طرح چلہ کشی میں بھی نفس کی کثافت کو روح کی لطافت میں ڈھالا جاتا ہے ، ظاہر بات ہے کہ اس صورت میں نفس کی تمام خواہشاتِ جلی و خفی سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے اور یہ کس قدر مشکل کام ہے ، اس کا اندازہ اس راہ میں عملی طور پر قدم رکھنے ہی سے ہو سکتا ہے ، نیز اس نفس کی کارفرمائیاں جب جلوت میں اس قدر ہیں تو خلوت میں تو اور بھی کہیں زیادہ ہوتی ہیں ، اس لیئے اتنے بڑے دشمن کے مقابلہ کے لیے چلہ کشی ایک میدان گاہ کی حیثیت رکھتا ہے اور میدانِ جنگ ذشست اربعین ، میں دشمن کو شکست دینے کے لیے اسلحہ کی ضرورت پیش آتی ہے ، اگر دشمن صورتِ مادی سے تعلق رکھتا ہے تو اس کے مقابلہ کے لیئے اسلحہ بھی مادی درکار ہوتے ہیں اور دشمن غیر مادی ہے تو اس کے مقابلہ کے لیئے

ہتھیار بھی اُسی قسم کے درکار ہوں گے تب ہی مخالف کے مقابلہ میں کامرانی ہو سکتی ہے۔

ہشت شرطِ آں ضروری مثل تیغ ہم سناں   گیر اوّل پس بشو قائم بجنگِ دشمناں

ترجمہ: وہ آٹھ شرائط تلوار و خنجر کی طرح ضروری ہیں، پہلے ان سے مسلح ہو کر دشمنوں کے مقابلہ میں ڈٹ جاؤ۔

تشریح: یعنی جس طرح ایک مجاہد میدانِ جنگ میں اسلحہ سے مسلّح ہو کر دشمن کے مقابلہ کے لئے جاتا ہے، اسی طرح سالک کو بھی ان روحانی اسلحہ سے مسلح ہو کر راہِ معرفت میں قدم رکھنا چاہیئے اس لئے کہ نفس کا تعلق جن دل چسپیوں اور خواہشوں سے ہے وہ ایسے مہلک دشمن ہیں جو ہر لمحہ مسلّح رہتے ہیں، اسلئے ایسے چالاک دشمن کے مقابلہ میں مکمّل طور پر مسلّح ہو کر ہمہ وقت چوکنّا رہنا پڑتا ہے ورنہ

ع یک لمحہ غافل بودم و صد سالہ منزل دور شد

گر کنی ایں جنگِ اکبر، باش ہر دم دل قوی   فتح یابی و رسی در شہرِ دل سلطاں شوی

ترجمہ: ہر وقت دل کو مضبوط رکھو اگر تم یہ جنگِ اکبر لڑنا چاہتے ہو، اس طرح تم کامیاب ہو کر شہرِ قلب پر بادشاہت کرو گے۔

تشریح: نفس کے ساتھ جہاد کو حدیثِ پاک میں "جہادِ اکبر" فرمایا ہے، اس جہاد میں شرکت کرنے کیلئے جس قدر قوی قلب کی ضرورت ہوگی وہ بھی ظاہر ہے، اس لئے ہر وقت، ہر لمحہ عزم بالجزم کے ساتھ، یقینِ مستحکم کے ساتھ اس جنگ کو لڑنا ہے، کسی بھی مرحلہ پر نفس کی خواہشات کے سامنے نہ جھکنا، بس یہ تصوّر کر لینا کہ ؎

حوادث کتنے ہی ہمت شکن ہوں   جنوں کا حوصلہ بھی کم نہیں ہے

بس اسی طریقۂ کار پر عمل کر کے تم حکومتِ قلب پر حکمرانی کر سکتے ہو اور اس کو مرضیاتِ رب کے مطابق چلا سکتے ہو، کیونکہ تمام دار و مدار قلب کی اصلاح پر ہی ہے، جس نے اس پر قابو حاصل کر لیا وہ کام کا ہو گیا اور جو قلب کی خواہشات سے مغلوب ہو گیا وہ کام سے گیا۔

شرطِ اوّل پاکیٔ جسم و دوم صوم نہار   پس سکوت از قول سوم چارمش خلوت شمار

ترجمہ: پہلی شرط ظاہری جسم کی پاکی اور دوسری شرط دن کو روزہ رکھنا تیسری شرط خموشی اور چوتھی شرط تنہائی اختیار کرنا۔

تشریح: اب یہاں سے مصنف چلہ کشی کی آٹھ شرائط بیان فرما رہے ہیں کہ سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ جسم ظاہری ہر وقت پاک رہے یعنی ظاہری صفائی کے ساتھ ساتھ پاک بھی رہے، پاک رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت باوضو رہے یہاں تک کہ اگر پانی میسر نہ ہوسکے تو پانی کی دستیابی تک تیمم ہی کرے، حدیث پاک میں ہے کہ مومن ہی وضو کی محافظت کرتا ہے یعنی مومن ہر وقت صاف اور پاک رہتا ہے، اور یہ ایمان کی ایک علامت ہے، اور یہ بات بھی مسلّم ہے کہ ظاہری بدن کی پاکی کا اثر باطن پر ضرور ہوتا ہے، ایک دوسری حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلطُّهُوْرُ نِصْفُ الْاِيْمَانِ یعنی پاکیزگی نصف ایمان ہے، قرآن پاک میں بھی خداوند جل جلالہ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ: اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو اور پاک صاف رہنے والوں کو بہت پسند فرماتا ہے، اس آیت میں دونوں طرح کی طہارتیں شامل ہوگئیں توبہ کے ذریعہ قلب کی طہارت حاصل ہوگئی اور پاکیٔ جسم کے ذریعہ قالب کی طہارت حاصل ہوگئی اور جب قلب وقالب کی طہارت حاصل ہوجائے گی تو پھر نفس و شیطان علیہ اللعنہ کا سالک پر زور نہ چل سکے گا۔ نیز یہ امر بھی ہے کہ ظاہری طہارت کا باطن پر جب اثر ہوتا ہے تو قالب کے ساتھ ساتھ قلب بھی متاثر ہوگا اور جب قلب میں لطافت کا تاثر پیدا ہوگا تو پھر اس کا تعلق روح سے مضبوط ہوجائے گا اور پھر روحانی کیفیات کا سلسلہ قائم ہونے کی وجہ سے قلب سالک تجلیاتِ باری کا مرکز ہوجائے گا اور یہی مقصود اصلی ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ ہمیشہ روزہ رکھے، افطار وسحر کو معمول میں لائے تاکہ متابعت سنت ہو لیکن دونوں مواقع پر غذا کا استعمال بقدرِ کفایت ہی کرے، اس لئے کہ غذائے ظاہری سے نفس کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور جب نفس قوی ہوگا تو اس کے اثرات بھی غالب ہوں گے عبادت میں سستی، نیند کا غلبہ ہوگا، خلوت میں اس کے خراب اثرات اور بھی زیادہ نمایاں

ہوتے ہیں، اور سب سے بڑی بات ہے کہ صوم نام ہے ترکِ اکل وشرب وتلذذ مباشرت کا، اور یہ خداوندِ قدوس کا ہی وصف ہے، سالک اتنے وقت تک تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کا نمونہ بنا رہتا ہے اور رحمتِ باری کے بہت ہی قریب اس کا مسکن ہوتا ہے۔

تیسری شرط خموشی اختیار کرنا، خاموش رہنے کا مطلب یہ ہے کہ ذکر اسم ذات کے علاوہ کسی دوسرے امر میں اپنے وقت کو استعمال نہ کیا جائے، اگر بالفرض ضرورت بھی پیش آئے تو حسب ضرورت ہی کلام کرے، عام طور پر بھی کثرتِ کلام کوئی امر مستحسن نہیں پھر نشستِ اربعین میں تو اس کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہر لحہ ہر وقت صرف اسی کی یاد کا غلبہ ہو ؎

اُن کا ذکر، اُن کی تمنا اُن کی یاد وقت کتنا قیمتی ہے آج کل

چوتھی شرط، تنہائی اختیار کرنا۔ چلہ کشی کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ دنیاوی علائق سے قلب کو فارغ کرکے صرف ذات واحد کی یاد میں منہمک ہو جائے، کیونکہ اگر تنہائی اختیار نہ کی جائے گی تو خیالات میں یکسوئی پیدا کرنا مشکل ہے، دنیاوی مشاغل سے جب تک قلب ودماغ خالی نہ ہونگے اسوقت تک ہجوم افکار کی وجہ سے لذتِ ذکر وفکر سے فیضیاب ہونا مشکل ہے، اس لئے تنہائی اس انداز سے اختیار کرے کہ قلب ودماغ بھی فارغ ہوں۔ سیدالانبیا حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو باوجود ہمہ وقت حضوری کے غارِ حرا میں تشریف لے جاتے تھے اور کئی کئی دن تک یگانہ وبیگانہ سے الگ رہتے تھے۔

ربطِ دائم پنجمیں، شد نفیٔ خاطر بعد ازیں آمدہ شرطِ ششم، آں ربطِ دل داں ہفتمیں

ترجمہ: پانچویں شرط ہمیشہ ذکر میں مشغول رہنا اور دل سے خطرات کی نفی کرنا چھٹی شرط ہے اور ساتویں شرط مرشد سے قلب کا رابطہ رکھنا۔

تشریح: پانچویں شرط یہ ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مصروف رہے، کیونکہ نشست اربعین کا مقصد تو معرفت ہے اور معرفت کا ذریعہ معیت ہے اور معیت کے حصول کا ذریعہ ذکر ہے، حدیث پاک میں ہے اَنَا جَلِیْسُ مَنْ ذَکَرَنِیْ یعنی میں اس کا ہم نشین ہوں جو میرا ذکر

کرے، اس کے علاوہ قرآن واحادیث دیگر میں بھی ذکر کے فضائل موجود ہیں، اس لئے ذکر کے ذریعہ جس قدر بھی قربت حاصل کرلی جائے بہتر ہے۔

چھٹی شرط یہ ہے کہ دل میں خطرات ووساوس کے آنے کو روکے کیوں کہ خطرات ووساوس قلب کو تاریک کرتے ہیں اور اس سے قلب ودماغ میں پراگندگی پیدا ہوتی ہے جس سے شیطان کو اپنے اثرات پھیلانے کے مواقع حاصل ہوجاتے ہیں، اور وہ اپنے مکائد کے ذریعہ سالک کو مقصدِ اصلی سے بہت دور پہونچادیتا ہے۔

ساتویں شرط یہ ہے کہ قلب کا رابطہ شیخ سے رکھے، اس اعتقاد کے ساتھ کہ شیخ صفاتِ خداوندی کا مظہر ہے اور ذاتِ احدیت کا فیضان بواسطہ شیخ میرے قلب پر ہورہا ہے، اور خداوند تعالیٰ نے شیخ کو میرے اوپر نگراں بنایا ہے اور اسی واسطہ کے ذریعہ معرفتِ ذات تک رسائی ہوسکتی ہے، یہ تمام تصوراتِ ذاتِ شیخ سے منسلک رکھے، اس کے بعد ان شاءاللہ تعالیٰ فیضانِ باری کا دروازہ کھل جائے گا۔

شرطِ ہشتم ترکِ اعتراض از قضائے کردگار   شرح کردم شرط خلوتہا ہر یک یاد دار

ترجمہ: آٹھویں شرط یہ ہے کہ اپنی تمام خواہشات کو حکم خدا کے سپرد کردے، میں نے چلہ میں بیٹھنے کی شرائط بیان کردی ہیں ان کو یاد رکھو۔

تشریح: آٹھویں شرط جو سب سے آخر میں ہے، یہ سب شرائط سے اہم بھی ہے، کیونکہ اس کا تعلق ایمان کی ان کیفیات سے ہے جن کو عبد اور معبود کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا ہے اور وہ آٹھویں شرط یہ ہے کہ سالکِ طریقت کے لئے ضروری ہے کہ حکم خداوندی پر یعنی فیصلۂ تقدیر پر بالکلیہ راضی رہے اور اس بات کا یقینِ کامل کرے کہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ صرف ذاتِ احدیت ہے اور جو کچھ اس کی طرف سے ہورہا ہے وہ میری منشا کے مطابق ہے، کسی قسم کی ناگواری کا ہلکا سا شائبہ بھی دل میں نہ لائے۔ اللہ تعالیٰ حکیم مطلق ہے، ان کی مصلحتوں کو ذہنِ انسانی نہ سمجھ سکا ہے اور نہ سمجھ سکتا ہے، اس لئے بظاہر خلافِ منشا امور میں بھی سرِ تسلیم خم کرے۔

ترکِ اغراض کا یہ مطلب نہیں کہ پروردگار سے دعا، مناجات کا سلسلہ منقطع کر دیا جائے، بلکہ اس کی بے نیازی کے سامنے اپنی نیازمندی کا اظہار کرنا ہمیشہ ضروری ہے، اب جو بھی اس دربار سے بھیک مل جائے اس کو سر آنکھوں پر رکھ کر اظہارِ تشکر ضروری ہے۔ دنیا طلبی نہ کرے۔

مصنف نے چلہ کشی کی یہ تمام شرائط مختصر اور جامع انداز میں بیان کر دی ہیں، سالک کے لئے ان کا خیال رکھنا ضروری ہے اور ان پر پابندی کرنا بھی۔

زیں فزوں گر شرح سازم ہر یکے را این ماں — باز مانم از بیانِ نور پیدا، اندر اں

ترجمہ: شرائطِ خلوت نشینی کی اگر اس سے زیادہ تفصیل بیان کروں گا تو خلوت نشینی میں جو انوار محسوس ہوتے ہیں ان کے ذکر میں تاخیر ہوگی۔

تشریح: چلہ کشی کی بنیادی شرائط تو یہ آٹھ ہی ہیں البتہ ان کی جزئیات کی تفصیل اور بھی بیان کی جا سکتی تھی جو کتابوں میں مذکور ہے چونکہ یہ شرائط فی نفسہ مقصود نہیں اس لئے جس قدر ضروری باتیں تھیں مصنف نے بیان کر دیں، اب اس عنوان کے بعد دوسرے عنوان کی طرف متوجہ ہیں جس میں اس نشستِ اربعین کے نتائج کا بیان کریں گے۔

نور پیدا چوں شود در وقتِ ذکر و شغلات — می شنو اکنوں بگویم بوالعجائب کیفیات

ترجمہ: ذکر اور شغل کے وقت جس طرح کے انوار ظاہر ہوتے ہیں ان عجیب و غریب کیفیات کا ذکر اب مجھ سے سنو۔

تشریح: چلہ کشی میں جو نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں ان میں کچھ تو مقصود ہیں اور کچھ بذاتِ خود مقصود تو نہیں البتہ معاونِ مقصود ضرور ہیں، یہاں سے مصنف ان نتائج کی طرف جو معاونِ مقصود ہیں اشارہ کر رہے ہیں کہ چلہ کشی میں جب قلب میں لطافت کا غلبہ ہو جاتا ہے تو اس کا تعلق بھی لطائف سے ہو جاتا ہے اور ایسے عجیب و غریب انوار کا احساس ہوتا ہے جس کا ادراک تو صرف مشاہدہ ہی سے ہو سکتا ہے البتہ مختصر طور پر رہنمائی کے لئے یہاں ہم ان انوار کا بیان کریں گے چونکہ یہ انوار بھی بذاتِ خود مقصود نہیں ہیں اس لئے ان میں بھی الجھ کر رہ جانا مناسب نہیں۔

دربیانِ نورِ رحمانی درشغلات

دورانِ شغل نورِ رحمانی کے ظہور کا بیان

نورِ رحمانی وشیطانی شود پیدا دراں　　　　می نگر آں را کدامی جانبت گردد عیاں

ترجمہ: چلہ کشی کے دوران رحمانی اور شیطانی دونوں قسموں کے نور کا ظہور ہوتا ہے اس لئے اس بات کا لحاظ رکھو کہ وہ نور کس طرف سے ظاہر ہو رہا ہے۔

تشریح: چلہ کشی کے دوران چونکہ سالک کا مشغلہ صرف ذکر و فکر رہتا ہے، اس لئے جب سالک تمام شرائط کے اہتمام کے ساتھ للّٰہیّت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے لگتا ہے اس وقت ذکر تمام اعضاء میں سرایت کرنے لگتا ہے جس کو اجرائے لطائفِ ستّہ کہتے ہیں، اس وقت اس کا دل غیر خدا سے پاک وصاف ہو جاتا ہے اور قلب کو روحانیت سے ایک خاص تعلق ہو جاتا ہے تو انوارِ الٰہی کا ظہور ہونے لگتا ہے اور وہ انوار کبھی اپنے اندر نظر آتے ہیں اور کبھی باہر سے آتے ہیں، ان تمام کی تفصیلات مصنف بیان فرمارہے ہیں، یہاں ایک بات کا خاص خیال رکھنا چاہیئے کہ یہ انوار بذاتِ خود منزلِ مقصود نہیں ہیں، اس لئے ان سے گذر جانا چاہیئے، اور اصل مقصود کی طرف متوجہ ہونا ہی بلندیٔ مقامات کی دلیل ہے۔

یہاں مصنف نے دو قسم کے انوار بیان کئے ہیں، ایک رحمانی اور دوسرے شیطانی، نورِ رحمانی تو ظاہر ہے کہ مرکزِ نور سے متعلق ہے لیکن نور کا انتساب شیطانِ ملعون کی طرف کس طرح صحیح ہے کیونکہ وہ تو مرکزِ ظلمت ہے، تو اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ جب ذاکر ذکرِ خدا میں ترقی کرتے کرتے ان مقامات تک پہونچ جاتا ہے جہاں انوار کا ظہور ہوتا ہے تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کے نور کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے تو شیطان جو انسان کا کھلّم کھلا دشمن ہے وہ کب گوارا کریگا کہ یہ مشتِ خاکی مورد الطاف وعنایات ہو سکے، اس لئے وہ نقلی مال لے کر بازارِ معرفت میں آجاتا ہے، بزرگانِ دین جو بتوفیقِ خداوندی کامل العیار ہیں انھوں نے اصلی اور نقلی کی پہچان اسی لئے سالک کو

بتادی ہے کہ وہ اصلی اور نقلی میں فرق کر سکے اور دونوں میں امتیاز کر کے گمراہی کے راستے سے محفوظ رہے۔ یہاں مصنف پہلے انوارِ رحمانی کا بیان فرمار ہے ہیں۔ شیطان کی طرف نور کی نسبت بطور طنز ہے۔

رنگ چونش شکل چونش نیز آں را بنگری تا بدانی آں کدامی نور ہیئی ظاہری

ترجمہ: یہ دیکھو کہ اس نور کا رنگ اور شکل وصورت کیسی ہے تاکہ یہ سمجھ سکو کہ جو نور ظاہر ہو رہا ہے وہ کون سا ہے۔

تشریح: اشغال کے دوران جو انوار، شاغل کو نظر آئیں گے ان کے رنگ بھی الگ الگ ہوں گے جس طرح کہ لطائف کے رنگ علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور ان کی شکل وصورت بھی جدا جدا ہوتی ہے۔ اس لیے انوار کی ظاہری شکل وصورت اور رنگت کو دھیان میں رکھنا چاہیے تاکہ ان کے ذریعہ اصلی اور نقلی نور میں امتیاز کیا جا سکے اور شیطان کے مکروفریب سے بچا جا سکے۔

گرچہ از کتفِ یمیں آں نور دارد اتصال از کراما کاتبیں بے شبہ دارد انتقال

ترجمہ: اگر داہنے شانے کے متصل وہ نور ظاہر ہو رہا ہے تو اس نور کی منتقلی بے شک وشبہ کاتب فرشتوں سے ہے۔

تشریح: یعنی ذاکر اگر داہنے شانے سے نور کا ظہور دیکھ رہا ہے تو وہ نور ان فرشتوں کا ہے جو ہر ایک انسان کے دونوں شانوں پر موجود رہتے ہیں اور اس شخص کے اچھے برے اعمال کا اندراج کرتے رہتے ہیں جن کو کراماً کاتبین کہتے ہیں، گویا یہ نور بھی مبارک نور ہے جو غلبۂ اعمالِ صالحہ کی علامت ہے اور ان اعمالِ صالحہ کا بارگاہِ خداوندی میں مقبول ہونا بھی ظاہر ہوتا ہے۔

می نویسد مر ترا اعمالِ نیکی گوش دار اتصالِ نورِ چپ از کاتبِ بد ہوش دار

ترجمہ: توجہ اور یقین سے سنو کہ وہ تمہارے نیک اعمال لکھ رہا ہے، بائیں شانے سے متصلاً نور کا ظہور برائی لکھنے والے فرشتے کی طرف سے ہے۔

تشریح: پہلے شعر میں داہنے شانے سے نور کے ظہور کا ذکر کیا تھا، اس شعر میں اس کی تشریح ہے کہ یہ نور اس فرشتے کی جانب سے ظاہر ہو رہا ہے جو نیکیاں لکھنے پر مامور ہے اور اس کے ظاہر

ہونے سے اعمالِ صالحہ کا عنداللہ مقبول ہونا ظاہر ہوتا ہے اور اگر بائیں شانے سے متصل نور ظاہر ہو رہا ہے تو اس فرشتے کی طرف سے ہے جو برائیاں لکھنے پر مامور ہے اور سالک کیلئے منجانب اللہ تنبیہ ہے کہ وہ اپنے معمولات پر نظرِ ثانی کرے اور جہاں کہیں کمی ہو اس کو درست کرے۔

گر بہ بینی نور مطلق در یمیں ظاہر شود ۔۔۔ نور مرشد را بیقیں دانی تجلی می شود

ترجمہ: اگر مطلقاً داہنی جانب سے نور ظاہر ہوتا ہوا دیکھو، تو یقین کے ساتھ سمجھ لو کہ یہ مرشد کا نور جلوہ گر ہے۔

تشریح: یعنی اگر دائیں شانے کی طرف سے اس انداز سے نور آ رہا ہے کہ نہ زیادہ متصل ہے اور نہ منفصل، نہ زیادہ نیچے ہے اور نہ زیادہ اوپر بلکہ اس طرح ہو گویا مرشد، شاغل کی داہنی جانب بیٹھے ہوئے ہیں، تو یہ نور مرشد کا ہے، گویا نسبتِ رابطہ کی بنا پر فیضانِ مرشد بشکل نور ظہور پذیر ہے۔

نورِ مرشد گر ہے رارہنما آمد پداں ۔۔۔ در حقیقت شد رفیق و ہادی رہ آں زماں

ترجمہ: مرشد کا نور راستے سے بھٹک جانے پر رہنمائی کے لئے ظاہر ہوتا ہے، حقیقت میں اسی کا نور راہِ طریقت کا ہمسفر اور ہادی ہوتا ہے۔

تشریح: جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ نورِ مرشد نسبتِ رابطہ کی علامت ہے جس وقت سالک نشستِ اربعین میں ہوتا ہے تو اس کے لئے شیطان کی ساری طاقت اس امر پر مذکور ہوتی ہے ہوتی ہے کہ کسی طرح یہ نسبت ختم ہو جائے اور اس نسبت کو ختم کرنے کے لئے وہ مختلف قسم کے اوہام و وساوس اُس کے ذہن میں ڈال کر خلجان اور شورش برپا کرتا ہے جس کی بنا پر سالک کے راہِ طریقت سے بھٹکنے کا اندیشہ قوی ہو جاتا ہے، ایسے وقت میں مرشد کا نور ظہور پذیر ہو کر سالک کے لئے طمانیتِ قلب کا سبب بن جاتا ہے۔

برزخ کبریٰ شود آں شکل و نورش بالیقیں ۔۔۔ از برائے رہبری طالبے آمد فریں

ترجمہ: بے شک مرشد کی وہ شکل اور اس کا نور برزخِ صغریٰ ہوتی ہے جو بلاشبہ طالب معرفت کی رہبری کے لئے ظہور پذیر ہوا ہے۔

تشریح: اس عنوان کے شروع میں یہ وضاحت کی گئی تھی کہ جو نور نظر آئے اس کی شکل اور سمت کی طرف دھیان دینا ضروری ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس کی نوعیت کیا ہے یہاں پر جس نور کا بیان ہو رہا ہے وہ مرشد کا نور ہے جو سالکِ طریقت کی راہبری کے لئے ظہور پذیر ہوا ہے جس کی وضاحت اس سے پہلے شعر میں کر دی گئی تھی، اس شعر میں برزخِ صغریٰ کہہ کر اس نسبتِ رابطہ کی وضاحت کر رہے ہیں کہ جو شغلِ اعظم کے دوران تصورِ شیخ سے مرید حاصل کر چکا تھا اس نسبتِ رابطہ کا فائدہ یہاں محسوس ہو رہا ہے کہ سالکِ طریقت پر جس وقت بھی آثارِ لغزش کا تاثر ہوگا اس وقت مرشد صورتِ مثالی میں بھی ظاہر ہو کر سالک کو گمراہی کے راستے سے بچا لیتا ہے، اسی کو برزخِ صغریٰ کہتے ہیں اور صورتِ مرشد نورانی صورت میں ظاہر ہو کر بھی رہنمائی کرتی ہے اور اس کا احساس کہ یہ نورِ مرشد ہی کا نور ہے خود اس کے قلب کی گواہی سے ہو جاتا ہے کیونکہ:

صورتِ مرشد گرفتن ہست شیطاں را محال ۔۔۔ نورِ مرشد ہم تمثل گشتنش باشد محال

ترجمہ: شیطان کے لئے مرشد کی صورت اختیار کر لینا ناممکن ہے، اسی طرح مرشد کے نور میں ڈھل جانا بھی شیطان کے لئے محال ہے۔

تشریح: یعنی وہ برزخِ صغریٰ جو شکلِ مرشد کی صورت میں سالکِ طریقت کی رہنمائی کیلئے ظہور پذیر ہوئی تھی، اس کے سلسلہ میں یہ فیصلہ کرنا کہ یہ حقیقت میں مرشدِ کامل ہی کی شکل ہے، اس یقین کی کیا صورت ہے؟ تو اس کی صورت قلب کی گواہی ہے کیونکہ مرشد کے علاوہ کسی دوسرے کی شخصیت یہاں دخل انداز ہو ہی نہیں سکتی حتیٰ کہ شیطان کو بھی یہ طاقت نہیں کہ وہ مرشد کی شکل بعینہٖ اختیار کر کے مرشد کی صورت مثالی میں ظاہر ہو سکے اور جب وہ صورت مثالی جو کہ بظاہر کثافت سے متعلق ہے بصورتِ مرشد اختیار نہیں کر سکتا تو پھر نورِ مرشد جو کہ سراسر لطیف ہے، اس نور میں بھی نہیں ڈھل سکتا کیونکہ:

پیرو مرشد در مریداں چوں نبی در اُمتاں ۔۔۔ نیست مدخل شکلِ شیطاں را بشکل پیرواں

ترجمہ: پیر و مرشد کا مقام مریدوں میں وہی ہے جو نبی کا مقام امتیوں میں ہے، اس

لئے شیطان کو مرشد کی شکل میں ڈھل جانے کی طاقت نہیں۔

تشریح: یہاں مصنف رحمۃ اللہ علیہ اپنے اُس دعوے کی دلیل بیان کر رہے ہیں کہ شیطان مرشد کی شکل و صورت یا نورِ مرشد میں کیوں نہیں ڈھل سکتا ہے، اس لئے کہ مرشدِ کامل کا درجہ مریدین کے درمیان ایسا ہی ہے جیسا کہ اُمتیوں کے درمیان پیغمبر کا مقام ہوتا ہے۔ اَلشَّیْخُ فِیْ قَوْمِہٖ کَالنَّبِیِّ فِیْ اُمَّتِہٖ۔ اور نبی کی شکل میں شیطان کو ظاہر ہونے کی طاقت بالکلیہ نہیں ہے حدیثِ پاک میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان میری شکل نہیں اختیار کر سکتا حتیٰ کہ اگر کوئی خواب میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارتِ پاک سے مشرف ہوگا تو وہ شبیہِ پاک آپ ہی کی ہوگی، کسی دوسرے کی نہیں، اس لئے جب نبی کی شکل شیطان اختیار نہیں کر سکتا تو پھر جانشینِ پیغمبر جو عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ کا مصداق ہیں، ان کی شکل میں بھی شیطان ظاہر نہیں ہو سکتا ہے اگرچہ عمومی شکل میں وہ عمامہ، جبّہ اور عصا کے ساتھ ریشِ دراز کی صورت اختیار کر سکتا ہے لیکن بعینہٖ مرشد کی شکل اختیار کرلے یہ بالکل ناممکن ہے، اس لئے یہ نور جو دائیں شانے کی طرف سے مطلقاً ظاہر ہو رہا ہے بے شک مرشد ہی کا نور ہے۔

گر بہ بینی صُورتِ مرشد بخاطر نور دار ۔۔۔ شک نیاری کاں تجلّی حق است ہوشیار

ترجمہ: اگر تم مرشد کی شکل کا نور کی صورت میں اپنے دل میں احساس کرو تو وہ تجلیاتِ باری کا عکس ہے اس میں بالکل شک مت کرو۔

تشریح: یعنی وہ نور جو شکلِ مرشد کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے اور تمہارا قلب اس کی گواہی دیتا ہے کہ یہ نورِ مرشد ہی کا نور ہے تو اس میں شک کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں، کیوں کہ مرشد کے نور کے سوا وہاں کسی دوسرے نور کا یعنی شیطان کی عیاری کا کوئی دخل ہی نہیں، اس لئے یقین کر لینا چاہیے کہ وہ نورِ مرشد ہی کا ہے، اور یہ نور درحقیقت تجلیاتِ باری کا ہے جو نسبتِ رابطہ کی وجہ سے آئینۂ قلبِ مرشد سے منعکس ہو کر سالکِ طریقت کی رہنمائی کے لئے ظاہر ہوا ہے۔

تجلیاتِ باری کا لفظ استعمال فرما کر مصنف علیہ الرحمۃ نے حتمی فیصلہ فرمایا کہ یہ نور، نورِ رحمانی

ہے شیطانی نہیں۔

گر بہ بینی سوئے قبلہ نورِ معمور و منیر راست دانی برزخ نورِ محمدؐ اے فقیر

ترجمہ: اگر قبلہ کی طرف سے بھرپور اور چمکتا ہوا روشن نور دیکھو تو بلاشک و شبہ مان لو کہ وہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا برزخ ہے۔

تشریح: نشستِ اربعین میں رُخ قبلہ کی طرف ہوتا ہے اگر اس سمت سے ایسا نور ظاہر ہو رہا ہو جو تمام موجودات کو منور کر رہا ہو اور خود اس نور میں بھی ایسی روشنی ہو جس کا صرف احساس کیا جا سکتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا تو یہ برزخِ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو حجاب مرتفع ہونے کی صورت میں راہِ ہدایت پر استقامت کی خوش خبری کے طور پر ظاہر ہو رہا ہے اور یہ علامت ہے کہ سالک اس وقت فنا فی الرسول کے مقام پر فائز ہے، اسی لئے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ذکر مرشد کے نور کے بعد فرمایا ہے کہ برزخِ مرشد سے گذر کر فنا فی الشیخ کے بعد برزخِ محمدی کا آغاز ہو جاتا ہے اور فنا فی الرسول کا درجہ شروع ہو جاتا ہے تو یہ نورِ پاک اسی برزخ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی علامت ہے۔

برزخِ کبریٰ است شکلش نورِ ستار کریم گشت ظاہر رہنمائے شاہراہِ مستقیم

ترجمہ: اس شکل کا نور پروردگار کا نور ہے جو کہ برزخ کبریٰ ہے جو استقامت کی راہ پر چلنے والے کی رہنمائی کے لئے ظاہر ہوا ہے۔

تشریح: برزخِ صغریٰ سے مراد برزخ شیخ ہوتا ہے اور برزخ کبریٰ سے نورِ محمدی جس کا مقام ملکوت ہے مراد ہے، یہاں پر قبلہ کی جانب سے جو نورِ معمور محسوس ہو رہا ہے یہ نورِ محمدی ہے جو سالک اور ذاتِ خداوندی کی تجلیات کے درمیان برزخ ہے، جب یہ برزخ اُٹھ جائے گا تو پھر تجلیاتِ باری کا براہِ راست مشاہدہ شروع ہو جاتا ہے، یہاں پر یہ نور اس لئے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک طرح کی خوش خبری ہے سالک کے لئے کہ سالک توفیق خداوندی راہ ہدایت پر مستقیم ہے، یہ بھی دھیان رکھنا چاہیئے کہ برزخ کبریٰ کے ارتفاع کے بعد مقام فنا فی اللہ شروع

ہو جاتا ہے جس طرح برزخ صغریٰ کے ارتفاع کے بعد ہی مرتبہ فنا فی الرسول کا آغاز ہو گیا تھا۔

در حقیقت ہر دو ہادی سوئے راہِ واحد ست — پیر اوّل مصطفےٰ و پیر ثانی مرشد است

ترجمہ: حقیقت میں دونوں ایک ہی راستے کے رہبر ہیں، مرشد اولین تو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور دوسرے رہبر مرشد ہیں۔

تشریح: منزلِ مقصود معرفت ہے اور اس کی طرف رہنمائی فرمانے والے سید الانبیاء ہیں جن پر احکامِ ہدایت براہ راست نزول ہوتے ہیں گویا ہی سب سے قوی رابطہ ہیں عبد اور معبود کے درمیان جس کو برزخ کبریٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور شیخ بھی راہِ معرفت کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں، لیکن بواسطہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم، اسی لئے برزخ صغریٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ دونوں پیر اول یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور پیر ثانی یعنی مرشد، راہِ معرفت کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں۔

برزخ صغریٰ بود نائب ز پیر دستگیر — راہ از وے، وصل از وے ایں سخن را یاد گیر

ترجمہ: برزخِ صغریٰ بھی قائم مقام پیرِ دستگیر کے ہے اسی کے ذریعہ راہِ معرفت کا حصول ہوتا ہے، اسی کے واسطے سے وصال میسر ہوتا ہے۔

تشریح: اس سے پہلے شعر میں پیرِ اول اور پیر ثانی کو راہِ واحد کا ہادی بتلایا گیا تھا، یہاں اس کی تشریح فرقِ مراتب کے اعتبار سے کر رہے ہیں کہ پیر دستگیر یعنی سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم برزخ وجوب و امکان ہیں اور حق بصورتِ حقیقتِ محمدی بہ لباس حقیقتِ جامعہ انسانیہ وجودِ محمدی میں ظاہر ہے اس لئے آپ کی ہدایت بھی براہ راست ہے اور پیر ثانی یعنی مرشد جس کو برزخ صغریٰ کہا جاتا ہے یہ اگرچہ صفاتِ مذکورہ کا جامع نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے مگر پھر بھی اسی ذاتِ اقدس کی قائم مقامی کا اس کو شرف حاصل ہے اس لئے سالکِ طریقت کو راہِ معرفت ابتداءً اسی سے حاصل ہوتی ہے اور اس کے بعد وصال الی الحق کا ذریعہ بھی مرشد ہی بنتا ہے، اس لئے کہ مرشد بھی نورِ محمدی ہی سے فیضیاب ہے جیسا کہ فرماتے ہیں ؎

نورِ مرشد نورِ ذاتِ مصطفیٰؐ ہر دو یکے　　راست ذاتی نورِ باری بے خلاف و بے شکے

ترجمہ: مرشد کا نور اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ایک ہی ہیں بلکہ بے شک و شبہ دونوں نور حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے نور ہیں۔

تشریح: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخصوص بہ تجلّی ذاتی ہیں اور تمام مظاہرِ کائنات آپ کے نور کے مظہر ہیں اس لئے نورِ مرشد بھی مظہرِ نورِ محمدی ہوا۔ مظاہر کے اعتبار سے دونوں نور ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ ہیں ورنہ باعتبارِ وجود کے دونوں نور ایک ہی ہیں اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور جس کو نورِ محمدی کہا جاتا ہے وہ باعتبارِ ثبوتِ حقیقتِ محمدی عالمِ لاہوت سے تعلق رکھتا ہے اور باعتبارِ وجود عالمِ جبروت اور باعتبارِ ظہور عالمِ ملکوت سے متعلق ہے تو اس نور کا تعلق براہِ راست سب سے اونچے درجہ یعنی عالمِ لاہوت میں نورِ باری سے ہے اس لئے مرشد کا نور جو مظہرِ نورِ محمدی ہے اور حقیقتِ جامعہ انسانیہ کی صورت میں ظہور پذیر ہے یہ بھی نورِ باری قرار پایا۔ تنزلاتِ ستّہ کے اصول کے پیشِ نظر اس تفصیل کو سمجھنے سے آسانی ہو جائے گی جس کی تفصیل گذر چکی ہے۔

گر بہ بینی نور ظاہر بے جہاتی می شود　　وقتِ دیدن بعد رفتن شوقِ خاطر می بود

ترجمہ: اگر تم دیکھو کہ بلا کسی جہت کے نور ظاہر ہو رہا ہے، اس کے دیکھنے کے وقت یا اس کے بعد قلب میں شوقِ عبادت پیدا ہو۔

تشریح: یعنی اگر ظہورِ نور کی کوئی سمت متعین نہیں کہ کس طرف سے آ رہا ہے بلکہ جدھر بھی نظر جائے نورانی کیفیت کا احساس ہو تو اگر اس کے دیکھنے کے وقت اور اس کا ماحول ختم ہو چکنے کے بعد حضورِ باطن ہو

ور درونِ دل دراں ذوقے بیابی بے شمار　　راست ذاتی نورِ آں مقصود جانِ پروردگار

ترجمہ: اس نور کے دیکھنے سے دل میں بے انتہا عبادت کا ذوق و شوق محسوس ہو تو یقین کے ساتھ سمجھ لو کہ وہ نور مقصودِ اصلی یعنی پروردگار کا نور ہے۔

تشریح: اور صرف حضورِ باطن ہی نہیں بلکہ ذوق و شوقِ عبادت میں بہت زیادہ اضافہ محسوس ہو تو یقینِ کامل کے ساتھ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ تجلیاتِ باری کا ظہور ہے اور یہ اسی ذاتِ پاک کا

نور ہے جس کی معرفت مقصدِ اوّل و آخر ہے۔

ور بہ بینی نور فوقِ قلبِ مخروطی دراں   نورِ فیضِ روحِ سالک ہست دانی بے گماں

ترجمہ: اور اگر نشستِ اربعین کے دوران قلبِ مخروطی کے اوپر نور دیکھو تو بے شک وہ سالک کی روح کے فیض کا نور ہے۔

تشریح: یعنی اگر قلبِ سالک کے اوپر نور کا ظہور ہے تو پھر یہ نور سالک کی روح سے مستفیض ہے کیونکہ قلب کا تعلق نفس اور روح سے ہے، نفس میں کثافت اور روح میں لطافت ہے نفس کا میلان عصیان کی طرف اور روح کا میلان رحمان کی طرف ہے اور نشستِ اربعین میں قلب پر روح کا غلبہ ہو جاتا ہے، نفس مغلوب ہو جاتا ہے، اس لئے یہ نور روح سالک کے فیضان کا ہے جس نے طالب کے دل میں تجلّی کر کے اپنی ہستی کو ظاہر کیا ہے۔

گر بہ بینی صورتِ خورشید باشد نورِ جاں   یا بہ بینی صورتِ مہتاب نورِ دل بداں

ترجمہ: اگر تم آفتاب کے رنگ کا نور دیکھو تو وہ بھی روح کا نور ہے اور اگر چاند جیسا نور دیکھو تو وہ دل کا نور ہے۔

تشریح: اس سے پہلے قلب مخروطی کے اوپر نور کا ظہور پذیر ہونا، اس بات کی علامت تھی کہ سالک کا لطیفۂ روح نور لایزال سے فیضیاب ہو کر جلوہ گر ہو رہا ہے لیکن اگر سامنے سے نور کا ظہور ہو رہا ہے اور اس نور کا رنگ آفتاب کی طرح ہے تو وہ بھی روح کا نور ہے۔ اور اگر چاند جیسا نور ہے تو وہ دل کا نور ہے، ان دونوں انوار میں فرق باعتبارِ باطن یہ ہے کہ آفتاب جیسا نور ظاہر ہونے پر روح کا غلبہ مانا گیا ہے اور چاند جیسا نور ظاہر ہونے پر اگرچہ یہ بھی نورِ رحمانی ہے مگر سالک ابھی کثافت قلب یعنی نفس کے ساتھ بھی متعلق ہے اور اس میں ہنوز غلبۂ روح کی شان پیدا نہیں ہوئی ہے کیونکہ آفتاب اپنے نور میں ماہتاب کا محتاج نہیں اور ماہتاب اکتساب نور میں آفتاب کی طرف متوجہ ہے۔ اسلئے سالک کو مزید دلجمعی کے ساتھ اوراد و اشغال میں مصروف رہنا چاہیئے تاکہ غلبہ روح ہو جائے۔

ایں ہمہ انوارِ رحمانی سفید و پُر ضیا   پر تو ایں نورِ ذاتی بے مثال و باصفا

ترجمہ: یہ تمام رحمانی انوار ہیں جو سفید اور چمک دار نظر آتے ہیں، درحقیقت یہ تمام ذاتِ پاکِ بے مثال کے انوار کا سایہ ہے۔

تشریح: یعنی جس قدر انوار کی اقسام بیان کی گئی ہیں وہ سب حقیقت میں تجلیاتِ رحمانی ہیں جو سالکِ راہِ طریقت کی ہدایت اور خوش خبری کے طور پہ ظاہر ہوئے ہیں لیکن ان تمام انوار میں ایک بات مشترک ہے کہ ان میں چمک اور سکون کی کیفیت بوقتِ ظہور اور بعد ظہور باقی رہتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تمام انوار رحمانی یعنی انوار صفات سے متعلق تھے، نورِ ذات نہیں بلکہ پرتوِ نورِ ذات تھے، مصنف نے ذاتِ مطلق کے نور کا ذکر نہیں فرمایا، عنوان کی مناسبت سے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ نورِ ذات کا بھی ذکر کر دیا جائے، تو معلوم ہونا چاہیئے کہ نورِ ذات کا رنگ متفقہ طور پر سیاہ چمکدار ہے اور اس کی کیفیت جو بتلائی گئی ہے وہ اس انداز میں ہے جیسے بہت زیادہ شدت کی روشنی کا کوندا آنکھوں کے سامنے آجائے تو اس کے دیکھنے کے بعد آنکھوں کے سامنے ایکدم اندھیرا چھا جاتا ہے اور چاروں طرف سیاہ چمکدار روشنیوں کے لہریئے نظر آتے ہیں، کچھ ایسی ہی کیفیت نورِ ذات کی ہوتی ہے، ورنہ حقیقت کے اعتبار سے نور تو نور ہی ہے مگر کثرتِ ظہور کی شدت کی وجہ سے مشاہدہ ایسا ہی ہوتا ہے اسلئے صوفیائے مشاہدین نے ذات کے نور کو متصف بہ سیاہی فرمایا ہے۔

تیسری بات یہ کہ سالک پر بوقت مشاہدہ دو کیفیتوں میں سے ایک کیفیت غالب ہوتی ہے، یا تو نفی کی کیفیت غالب ہوگی یا اثبات کی تو جس وقت سالک مقامِ نفی میں ہوتا ہے اس وقت نورِ نفی کے ظہور سے اللہ تعالیٰ کے ماسوا سے قلب صاف ہو جاتا ہے اور تجلی افعالی و تجلی صفاتی میں محویت ہو جاتی ہے اور فنا کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور یہ وہ درجہ ہے جو منزلِ مقصود یعنی مقامِ بقا کا آغاز ہے، اس نورِ نفی کی صورت کاجل کی سیاہی کی طرح تاریک اور اس کے گرد چمک دار لہریئے ہوتے ہیں۔ دوسرا نور اثبات ہے جس کے ظہور کے بعد مقامِ بقا جو اصل منزلِ مقصود ہے حاصل ہو جاتا ہے، اس نور کی صورت آنکھ کی سیاہی کے مانند صاف شفاف ہوتی ہے اور اس کے چاروں طرف سیاہ نورانی خطوط نہیں ہوتے یہ نور تجلی ذات کا نور ہے جو عطائے خاص ہے۔

در بیان نورِ شیطانی علیہ اللعن

شیطانِ ملعون کے اجالے کا بیان

گر بہ بینی نور مطلق در چپ از ابلیس داں   از پئے تلبیس خاطر گشت حاضر اندراں

ترجمہ : اگر بائیں طرف سے کسی رنگ کا نور دیکھو تو وہ شیطان کا نور ہے جو سالک کے قلب کو وساوس میں ڈالنے کیلئے ظاہر ہوا ہے۔

تشریح : انوارِ رحمانی کے بعد مصنف اس روشنی کا ذکر کر رہے ہیں جو شیطانِ ملعون سالکِ طریقت کو گمراہ کرنے کے لیئے نور کی صورت میں ظاہر کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں کی نظروں کو حقائق شناسی عطا فرمائی جس کے ذریعہ وہ اصلی اور نقلی میں بخوبی فرق محسوس کر لیتے ہیں، کتبِ تصوف اس قسم کے واقعات سے خالی نہیں ہیں جہاں اس قسم کے واقعات کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ نور کے ذریعہ شیطان کے دھوکا دینے کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے خصوصًا ان کا جو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے راہِ ہدایت پر گامزن ہیں اس لیئے وہ اُسی راستے سے گمراہی کے اسباب لے کر داخل ہوتا ہے جس طرف میلانِ طبع ہو، اگر علم کی طرف میلانِ طبع ہو تو علم کے ذریعہ ایسے ایسے نکات وساوس کے طور پر ذہن میں پیدا کرے گا جس سے راہِ ہدایت سے الگ ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اگر زہد کی طرف میلان ہے تو اس کے مناسبات کے ذریعہ گمراہ کرنے کی سعی کرے گا، سخاوت کی طرف طبیعت رجوع ہے تو اس میں اس انداز سے رخنہ ڈالے گا کہ خلوص اور للٰہیت نہ رہے، غرضیکہ اصلی چیزوں میں نقلی چیزوں کی ملاوٹ سے وہ گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، یہاں چونکہ انوارِ رحمانی کا بیان چل رہا تھا اس لیئے ظاہری طور پر شیطان کے اجالے کو بھی نور کہہ دیا گیا ہے ورنہ شیطان تو منبع ظلمت ہے اس سے نور کا ظہور کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا۔

اس تمہید کے بعد مصنف کا منشا سمجھنے میں ان شاء اللہ تعالیٰ آسانی ہو جائے گی مصنف فرماتے

کہ اگر بائیں طرف سے نور ظاہر ہو رہا ہو اور وہ شانے سے دور ہو تو اس کی رنگت خواہ کیسی ہو تو وہ نور اصلی نہیں ہے بلکہ شیطان مردود کا نور ہے جو سالک طریقت کو راہ معرفت سے دور ہٹانے کی غرض سے لے کر آیا ہے۔

گر کسے دستار بستہ با عصا سبحہ بدست　　　می شود حاضر بدانی صورت ابلیس ہست

ترجمہ: اگر کوئی دستار باندھے ہوئے عصا اور تسبیح ہاتھ میں لئے ہوئے حاضر ہو تو سمجھ لو کہ وہ شیطان کی صورت ہے۔

تشریح: یعنی اگر کسی نور کی ظاہری شکل و صورت ایسی ہو گویا کوئی دستار باندھے ہوئے عصا ہاتھ میں لئے ہوئے اور تسبیح ہاتھ میں لٹکائے ہوئے ظاہر ہو تو یہ بھی شیطان ملعون کی صورت ہے۔

یہاں پر چونکہ انوار کا بیان ہو رہا ہے اور مصنف انوار رحمانی کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں کہ نور کی ایک شکل تو صورت مثالی کی ہوگی، دوسرے نورانی کیفیت ہوگی جیسے شکل مرشد نورانی صورت مثالی میں ظاہر ہو، اسی طرح نقلی صورت میں شیطان مردود ریش دراز، تسبیح و عصا لے کر حاضر ہوتا ہے اور سالک کے قلب پر یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اب تمہاری جدوجہد کی منزل مکمل ہو گئی، حالانکہ وہ ابھی ابتدائی منازل میں ہوتا ہے چنانچہ وہ کسی غیر معین شکل میں ظاہر ہوگا اس وقت اس کے مکر و فریب سے بچنا چاہیئے اس لئے کہ یہ بظاہر نورانی ہیولا شیطان کا ہے۔

یا بہ بینی نور ظاہر بے جہت دہشت دراں　　　اندرون دل نماید نیز از ابلیس آں

ترجمہ: یا تم بغیر کسی جہت کے نور ظاہر ہوتا ہوا دیکھو اور اس میں خوف ہو اور اس خوف کا احساس دل میں ہو تو یہ بھی ابلیس ہی کا نور ہے۔

تشریح: یعنی بغیر کسی سمت کی تعیین کے یہ نور ظاہر ہو رہا ہو اور اس کے دیکھنے کے وقت دل میں خوف اور تکدر پیدا ہو نیز اس کیفیت کے رفع ہو جانے کے بعد باطنی حضوری نہ رہے تو وہ بھی شیطان کا نور ہے۔

آں خس بدبخت ملعول سرگروہ دشمناں　　　کو نخواہد ساختن گمراہ طالب اندراں

ترجمہ: وہ کمینہ بدنصیب، ملعون، ابن آدم کے دشمنوں کا سردار، یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح

سے طالبِ حق کو راہِ معرفت سے بھٹکا دے۔

تشریح: یہ بات تو ظاہر ہے کہ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے اور کبھی نہیں چاہتا کہ ابنِ آدم کارِ خیر میں متوجہ اور مصروف ہو خصوصاً مذاہبِ حقانیہ کے پیروکار ہر زمانہ میں اس کا نشانہ رہے ہیں، پھر ان میں جو حضرات توفیقِ خداوندی ریاضت و مجاہدہ کی مشعل لے کر راہِ معرفت پر گامزن ہوتے ہیں ان نفوسِ قدسیہ سے تو اس ملعون کی جنگ بڑے پیمانہ پر ہوتی ہے، اس لئے سالکِ طریقت کے لئے ضروری ہے کہ اس مردود کے تمام حربوں سے آشنا ہو تاکہ اس کے وار کی کاٹ کی جا سکے۔

گر بہ بینی نور فوقِ سینہ یا بالائے ناف — نورِ خناس است بارنگِ سیاہ بشناس صاف

ترجمہ: اگر تم سینہ کے اوپر یا ناف کے اوپر نور دیکھو تو وہ سیاہ رنگ کا نورِ خناس یعنی غفلت سے فائدہ اٹھا کر وسواس میں مبتلا کرنے والے شیطان کا نور ہے۔

تشریح: خناس سے مراد شیطان ہے جو غفلت کی حالت میں انسان کو طرح طرح کے وسوسوں میں مبتلا کرتا ہے اور جب انسان ہوشیار اور متنبہ ہو جاتا ہے تو پیچھے کھسک جاتا ہے، یہاں مصنفؒ فرما رہے ہیں کہ اگر سینہ کے اوپر یا ناف کے اوپر سیاہ رنگ کا نور نظر آئے تو یہ بھی غفلت سے فائدہ اٹھانے والے شیطان ہی کا نور ہے، اس نور کی سیاہی میں دھوئیں جیسا منظر ہوگا چمک نہیں ہوگی، اور اس کو دیکھنے کے وقت حضورِ باطنی کے بجائے تکدر پیدا ہوگا۔

نورِ شیطان با کدورت رنگِ آتش میشود — گر دو از لاحول خواندن دور می دان مستند

ترجمہ: شیطان کا نور آگ کے رنگ کی طرح کدورت اور کثافت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اور یقیناً لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ پڑھنے سے دفع ہو جاتا ہے

تشریح: یعنی جس طرح دھوئیں میں گھٹن اور آگ کی قربت سے تپش اور گھبراہٹ ہوتی ہے اسی طرح اس نور کی قربت میں بھی یہ دونوں خصوصیات ہوتی ہیں، اس کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اگر شیطانی نور ہے تو لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ پڑھنے سے یہ کیفیت بالکل زائل

ہوجاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کلمات میں یہ تاثیر رکھی ہے کہ شیطان ان کے اثر سے بھاگ جاتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ اَکْثِرُ مِنْ قَوْلِ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ کَنْزِ الْجَنَّۃِ یعنی لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا ورد رکھو کہ یہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے اور یہ کہ جب بندہ اخلاص کے ساتھ لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اَسْلَمَ عَبْدِیْ وَاسْتَسْلَمَ یعنی میرے بندے نے کائنات کے تمام امور میرے سپرد کردیئے اور خود اپنے آپ کو بھی میرے سپرد کردیا۔ ظاہر ہے کہ بندہ کی جب یہ کیفیت ہوگی تو شیطان کو اس کے مقابلہ میں راہ فرار اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔

نامِ پیرِ خویش را ہم گر بگوئے بر زباں دور گردد آں لعین و شاد باشی آں زماں

ترجمہ: اپنے مرشد کا نام اگر اس وقت زبان پر لاؤ گے تو وہ مردود فوراً بھاگ جائے گا اور تم قلبی مسرت محسوس کروگے۔

تشریح: یعنی اس قسم کا نور دیکھنے کی صورت میں جو دھوئیں جیسی کثافت اور سیاہ رنگت کا ہو اور اس کے دیکھنے سے گھبراہٹ محسوس ہوتی ہو تو یقین کرلینا چاہیئے کہ یہ نور شیطان کا ہے، جس کو دفع کرنے کی ایک صورت تو لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ پڑھنا ہے اور اگر وہ کسی ریش دراز کی صورت میں ہے تو اس وقت اگر مرشد کا نامِ پاک لیا جائے گا تو فوراً یہ مردود دفع ہو جائے گا اور نسبتِ مرشد سے رابطہ قائم ہوجائے گا اور تصورِ مرشد اس وقت ہادی و رہبر کی حیثیت سے ظاہر ہوکر گمراہی سے بچالے گا۔

زیں زیادہ گر بگویم طول گردد در کلام باز مانم از بیانِ شغلِ دیگر لا کلام

ترجمہ: اس سے زیادہ اگر میں اپنی بات کو تفصیل سے بیان کروں تو بے شک میں دوسرے اشغال کے ذکر سے رُکا رہوں گا۔

تشریح: یہاں مصنف اس موضوع کو ختم کر رہے ہیں کیونکہ تفصیلِ جزئیات میں سلسلہ گفتگو بہت طویل ہوجائے گا، راہبری کیلئے اتنا ہی کافی ہے، باقی مرشد کی خدمت سے حاصل ہوجائے گا۔ ان شاء اللہ

در بیانِ سِرّ گومگو

شغلِ سِرِّ گومگو کا بیان

شغلِ دیگر ہست سِرِّ گومگو نامش بداں زود گردد قلب صاف از استدامت اندراں

ترجمہ: یہ ایک شغل ہے جس کا نام شغلِ سِرِّ گومگو ہے، پابندی کے ساتھ اس میں مشغول ہونے سے بہت جلد تصفیہ قلب ہو جاتا ہے۔

تشریح: یہاں پر مصنف رحمۃ اللہ علیہ ایک اور شغل بیان کر رہے ہیں جس کا نام شغلِ "سِرِّ گومگو" ہے چالیس دن تک پابندی، یکسوئی، اور دل جمعی کے ساتھ اس شغل میں مشغول ہونے سے تمام چیزوں سے تصفیہ قلب ہو جاتا ہے۔

دور باشد خطرۂ نفسانی شیطاں ازیں شغل برتر گر بداری با حضورِ دل قریں

ترجمہ: اس شغل سے نفس سے شیطانی وساوس دور ہو جاتے ہیں، اگر حضورِ قلب کے ساتھ یہ شغل کیا جائے تو بہت اعلیٰ مرتبہ کا شغل ہے۔

تشریح: معاملہ یہ ہے کہ نفس ہمیشہ ان خواہشوں میں مشغول رہتا ہے جو محسوسات سے متعلق ہیں جب اس کی کشش غالب ہوتی ہے تو وہ قلب کو بھی اپنا ہم رنگ بنا لیتا ہے، اگرچہ قلب کے لئے یہ حالت موجب رنج والم ہے۔

عقل کو محسوسات سے حظ نہیں آتا وہ معقولات پر فریفتہ رہتی ہے جب اس کی کشش غالب ہوتی ہے تو قلب کو اپنا ہم مشرب بنا لیتی ہے اور تصورات وتخیلات کا مزہ چکھاتی ہے، یہ حالت قلب کے لئے باعث انبساط ومسرت ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ قلب کے لئے رنج والم اور انبساط ومسرت دونوں ہی زنجیریں ہیں جو اس کو عالم خلق کے حبس بیجا میں مقید رکھتی ہیں، جب قلب عقل اور نفس دونوں ہی کے پھندوں سے نکل جاتا ہے تب ہی اس کا تعلق اپنی اصلیت سے ہوتا ہے اور قلب کی

اصلیت اور مرکز روح ہے، اس شغل سے روح میں تقویت پیدا ہوجاتی ہے جس کی بنا پر قلب کا رجحان روح کی طرف ہوجاتا ہے اور اس میں روح کی طرح لطافت اور صفائی پیدا ہو جاتی ہے جب قلب کا تصفیہ ہوجاتا ہے تو یہ تجلیاتِ باری کا آئینہ ہوجاتا ہے، شرط یہی ہے کہ پابندی کے ساتھ حضورِ قلب سے اس شغل کو جاری رکھا جائے۔

صفا گردد دل ز شغلِ راز بر تر اے جواں   در چہل روزے نماید روئے آں آرامِ جاں

ترجمہ: شغلِ راز میں مشغول رہنے سے دل صاف ہوجاتا ہے چالیس دن میں اُس آرامِ جاں کی تجلیات کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے۔

تشریح: اس لئے کہ قلب ہی موجبِ رستگاری ہے اور وہی باعثِ گرفتاری بھی، اگر وہ ہستیٔ موہوم کے جال میں پھنس گیا تو قبر سے زیادہ تنگ و تاریک وادیوں میں اتر گیا اور اگر اس جال کو توڑ کر اُڑ گیا اور روحِ قدسی سے واصل ہوگیا تو اس کو بہشتِ جاودانی یعنی دیدارِ الٰہی کی نعمتِ بے پایاں مل جاتی ہے۔ چالیس دن کی قید عام طور پر جو صوفیا حضرات لگاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عدد میں ایک طرح کی برکت ہے جیسا کہ حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص چالیس دن تک خلوص کے ساتھ اللہ کے لئے خلوت اختیار کرے گا تو علم کے چشمے اس کے قلب سے جوش زن ہوکر اس کی زبان سے ظاہر ہوں گے، نیز بہت سے امور اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو ترتیب اور سلیقہ سکھانے کی وجہ سے چالیس دن میں مکمل فرمائے ہیں بہر حال دلجمعی اور پابندی کے ساتھ اس شغل کا اثر بھی چالیس دن میں انشاء اللہ نمایاں ہوجاتا ہے۔

چند گویم خاصۂ ایں شغل بر تر ایں چنیں   سرِّ مشغولی شنو از من کنوں گویم ہمیں

ترجمہ: اس اعلیٰ شغل کے فوائد کہاں تک میں بیان کروں، اس لئے اب اس میں مشغول ہونے کا راز میں تم سے کہتا ہوں۔

تشریح: یہ شغل مختصر ہے مگر اس کے فوائد بیان سے باہر ہیں صرف مشاہدے سے تعلق رکھتے ہیں، کیونکہ اس شغل کا تعلق عالمِ لاہوت سے ہے اور جس طرح روح ذاتِ پاک کا آئینہ ہے

اسی طرح قلب اسمار وصفات کا آئینہ ہے ، جو تجلی روح میں مجمل ہے وہ قلب میں مفصّل ہے ، پس قلب روح کی طرح عالم بے پایاں ، بے حد و بے جہت اور لامکان ہے اور اس وقت اس کا مقام عرش الٰہی سے بھی زیادہ بلند ہو جاتا ہے اور اس شغل میں بھی سارا دار و مدار قلب پر ہے ، اسی قلب کے بارے میں فرمایا گیا ہے ؂

ارض و سمار کہاں تری وسعت کو پاسکے میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

اس لئے مصنف اب اس شغل میں مشغول ہونے کا طریقہ بتلا رہے ہیں۔

ہُو ہُو است اندر دلِ ہمچوں صنوبر ہر زماں زود بینی جلوہ باری تعالیٰ اندراں

ترجمہ : قلب صنوبری میں ہر وقت ہُو ہُو کا تصور قائم کرو ، اس تصور کے ذریعہ بہت جلد تجلیات باری کا مشاہدہ کروگے۔

تشریح : اذکار و اشغال کے صوفیار حضرات نے چار مراتب متعین کئے ہیں ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ یہ ذکر ناسوت ہے اور پہلا مرتبہ ہے ، اِلَّا اللّٰہ دوسرا مرتبہ ہے اور یہ ذکر ملکوت ہے ، اَللّٰہ مفرد ، یا اَللّٰہُ اَللّٰہ تیسرا مرتبہ ہے اور یہ ذکر جبروت ہے اور اَللّٰہ سے الف لام ہٹادیا تو صرف ہُ رہ گیا جس کا تلفظ ھُو سے کیا جاتا ہے ، یہ چوتھا مرتبہ ہے اور ذکر لاہوت ہے ، یہ مقام سب سے بلند ہے ، اس لئے کہ اس کے بعد مقامِ ھاھُوت ہے جہاں پر ذکر ، ذاکر ، مذکور کچھ بھی نہیں رہتا ، صرف ذاتِ مطلق کی تجلیاتِ ذات ہی ہیں جس کو اصطلاحًا ، "وجودِ مطلق" کہا جاتا ہے۔

اس شغل کا طریقہ یہ ہے کہ نشستِ اربعین یعنی چلہ کشی کے ارادے سے کسی پاک اور مقام تنہائی کا انتخاب کرے ، بعدہٗ دوزانو مراقبہ میں بیٹھ کر اَللّٰہُ حَاضِرِیْ اَللّٰہُ نَاظِرِیْ اَللّٰہُ مَعِیْ کو زبانِ قلب سے مفہوم کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ادا کرے ، اس کے بعد قلب کی طرف متوجہ ہو اور یہ تصور کرے کہ میرے قلب میں صرف وہی وہ ہے اور اس کی تجلیات کا نور ایک شجر کی صورت میں قلب میں موجود ہے جس کی شاخوں نے تمام قلب کی راہوں کو منور کر دیا ہے

اس میں دُو ھُوھُو ہیں، ایک کا تصور سانس لیتے وقت کرے اور دوسرے کا سانس باہر نکالنے کے وقت، جس طرح پاس انفاس خفی میں اللہ اللہ کا ذکر سانس لیتے وقت اور باہر نکالتے وقت کیا جاتا ہے، اس میں صرف سانس کی آمد و رفت کے ساتھ قلب کی دھڑکن سے اس شغل میں مشغول ہوتا ہے، لسانِ ظاہری یا لسانِ قلب سے بھی اس شغل کو الگ رکھا جاتا ہے، اس طرح پابندی، دل جمعی اور یکسوئی کے ساتھ کم از کم چالیس دن شرائط چلہ کشی کے مطابق یہ عمل کرنے سے جو فوائد محسوس ہوں گے ان کا بیان دائرۂ تحریر سے باہر ہے۔

بے تکلف راز گفتم کشف کردم از نہاں　　از علیؓ ظاہر شد ایں از سیّد السادات داں

ترجمہ: اس چھپے ہوئے راز کو میں نے بے تکلف بیان کر دیا، سرداروں کے سردار یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ راز مولائے کائنات حضرت علیؓ کے واسطے سے ظاہر ہوا۔

تشریح: مصنف نے اس شعر میں تین باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، ایک تو یہ کہ یہ شغل ایک راز پوشیدہ تھا جس کو میں نے بیان کر دیا۔

دوسرے مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اس شغل کی روایت کی نسبت،

تیسرے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اس کا بیان فرمایا۔

بھید اس ذکر میں یہ ہے کہ یہ ایسا شغل ہے جس کا الفاظ کے پیکر سے کوئی تعلق نہیں قلب کی دھڑکن کے احساس کے ساتھ ہی اس کا تعلق ہے، سانس کی آمد و رفت میں حضورِ قلبی سے اس میں مشغول ہونے سے جن نتائج کا ظہور ہوتا ہے ان نتائج سے کراماً کاتبین بھی واقف نہیں ہو پاتے، اس لئے کہ اس کی کوئی ظاہری شکل و صورت تو ہوتی نہیں جس کو وہ دائرۂ تحریر میں لائیں۔

بزرگانِ اولیاء نے فرمایا ہے کہ شیطانِ مردود کو بھی اس شغل کی ہوا نہیں لگ پاتی، یہ ایک راز ہے جو صرف عابد اور معبود کے درمیان رہتا ہے، اسی کے متعلق فرمایا گیا ہے ؎

میانِ عاشق و معشوق رمزیست　　کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

مصنفؒ نے افادے کی غرض سے لاگ لپیٹ کے بغیر اس شغل کو بیان کر کے ایک بہت گہرے راز کا انکشاف کر دیا۔

مولائے کائنات سے اس کی نسبت کا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا عَرَفْتُ رَبِّیْ بِرَبِّیْ، یعنی میں نے اپنے رب کو اپنے رب کے ذریعہ سے پہچانا یعنی اس کی رحمت نے دستگیری فرمائی تو اس کی معرفت حاصل ہوئی۔ یا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے مظاہر اسماء و صفات کے ذریعہ معرفت کا حصول ہوا، جس طرح مصنوع کو دیکھ کر صانع کا علم ہوتا ہے اور مرتبہ معلوم ہو جاتا ہے، اسی طرح اس شغل میں بھی اسی کی معرفت اسی کے ذریعہ حاصل ہو رہی ہے، کہ وہ صرف وہی ہے ھُوْ ھُوْ است کا مفہوم یہی ہے۔

تیسری بات یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شغل کا راز کیسے بیان فرمایا۔؟

حدیثِ پاک میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" قیامت کے دن بہت سے حضرات ایسے ہوں گے جن کے نامۂ اعمال کا حساب کتاب مکمل ہو جائے گا تو پروردگار ر علام الغیوب کا ارشاد پاک ہوگا کہ ابھی اس بندے کے کچھ اور اعمال خیر بھی اسکے نامۂ اعمال میں ہیں، فرشتے عرض کریں گے، یارب العزت! اب کچھ باقی نہیں اسب اعمال کا حساب ہو گیا، تب پروردگار ان اعمال کی اصل حقیقت کو فرشتوں کے سامنے ظاہر فرمائیں گے، اس وقت یہ فرشتے بھی حیرت میں پڑ جائیں گے کہ اس شخص کے یہ اعمال تو کہیں بھی مذکور و موجود نہیں تھے، اب کہاں سے ظہور پذیر ہو گئے، تب اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ہاں اس بندے کے یہ وہ اعمال ہیں جن کا علم میرے علاوہ اور کسی کو نہیں۔

اس کی مثال اس طرح سمجھ لیجئے جس طرح مائیکرو فلم ہوتی ہے جو ۱۰×۱۰ انچ کی تحریر کو بذریعہ فوٹو مختصر کر کے ۱×۱ انچ بنا لی جائے، اب اس تحریر کو آپ کسی سے پڑھنے کے لئے فرمائیں، جب تک کہ اس کو بڑا نہ کیا جائے، پڑھنے والا خواہ کتنا ہی قابل اور صاحب نظر ہو لیکن اس تحریر کو پڑھنا اس کے بس کی بات نہیں، اور پروردگار کی شانِ بصارت

تو ماورائے قیاس ہے۔

اس لیئے وہ اعمال جن کا فرشتوں کو بھی علم نہیں، ایسے اعمال کو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے، سرّ گو نگو بھی ان ہی اشغال میں سے ہے۔ یہی وہ تمام راز تھے جن کو مصنف نے اس شغل کے ذریعہ بیان کیا ہے۔

چوں تمامی داستاں اکشف سازم از نہاں دور افتم از بیان شغل دیگر بے گماں

ترجمہ: اگر میں اس شغل کے تمام پوشیدہ راز کو بیان کرنے لگوں تو بے شک میں دیگر اشغال کے ذکر سے دور رہوں گا۔

تشریح: یہاں مصنف رحمۃ اللہ علیہ مختصراً اس شغل کے فوائد بیان کرنے کے بعد ختمِ کلام کرتے ہیں کہ اس شغل کے فوائد اور کیفیات تو حقیقت میں دائرہ بیان سے باہر ہیں بس اختصار کے طور پر ان کو بیان کر دیا گیا ہے عملی اعتبار سے اس راہ میں قدم رکھنے کے بعد تمام کیفیات کا مشاہدہ ہوگا۔

اس لئے میں اس عنوان کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے پر اکتفار کرتا ہوں، اور دوسرا شغل بیان کرتا ہوں، اگر تفصیل سے اس شغل کے فوائد بیان کرنے لگوں تو ظاہر ہے کہ سلسلۂ کلام بہت طویل ہو جائے گا، اور چونکہ دیگر اشغال کا ذکر بھی ضروری ہے اس لئے مصنف دوسرا شغل بیان کرتے ہیں۔

در بیان شناختن نفس خود

اپنے آپ کو پہچاننے کا بیان

شغل دیگر می شنو گفتند آں را بے مثال   بے مثالی بے نشانی زد نشان ان باکمال

ترجمہ: ایک اور شغل سنو جس کو سالکانِ راہ طریقت نے بے مثال کہا ہے۔ بے نشان اور بیمثال ہونیکے باوجود کس قدر کمال کے ساتھ اس نے اپنی نشانیوں کو ظاہر کیا ہے۔

تشریح: یہاں پر مصنف رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسے شغل کا بیان کر رہے ہیں جو راہ طریقت میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور اس کی اساس مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ پر ہے۔ چونکہ شریعت، طریقت، حقیقت ومعرفت یہ تمام ایک دوسرے سے مربوط ہیں، جن میں شریعت کا مقام کلیدی ہے اور ان سب کا مقصد قربِ ذات کا حصول ہے لیکن جس ذات پاک کا قرب مقصود ہے وہ تو خود غیب الغیوب کی صفت سے آراستہ ہے، وہاں تک عقل تو کجا، خیال قیاس، گمان اور وہم کی رسائی بھی نہیں، اسلئے صوفیاءِ محققین نے یہ اصول مقرر فرمادیا ہے کہ صفات کے ذریعہ ہی ذات کا تعارف ہوسکتا ہے لیکن صفات کے ذریعہ رابطہ قائم کرنے میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ اس قادر مطلق نے کائنات کی ہر ایک شئے میں صفاتی جلوہ گری اس انداز میں فرمائی ہے کہ کوئی بھی شئے ایسی نہیں جو اس کی صفات کی شہادت پیش نہ کرتی ہو لیکن ان صفات کا تعین نہ ہوسکا کہ ان کی جلوہ گری کس انداز میں ہے کیونکہ وہ ذاتِ پاک تو ایسی بیمثال اور بے نشان ہے کہ کہیں سے بھی اس کا سراغ نہیں ملتا۔

انسان بھی قدرت کی جلوہ گری کا ایسا نمونہ ہے جو تمام کائنات کا خلاصہ ہے اسلئے صوفیاء حضرات نے اس سفرِ باطن کے اپنی ذات سے شروع کرنے کے عمل کو تجربہ سے بہت عمدہ اور مختصر پاکر اس کا عنوان اپنے نفس کی پہچان رکھ دیا ہے۔

بے نشانے می نگر در نفس خود از آں جمال   خود شناسی حق شناسی راست آمد لا محال

ترجمہ: اس بے نشان کو اسی جمال سے اپنی ذات میں دیکھو، بے شک اپنے آپکو پہچان لینا ہی حق کو پہچان لینا ہے۔

تشریح: کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی صفت کا مظہر ہے اور جس طرح صفاتِ خداوندی لامحدود ہیں اسی طرح ان صفات کے مظاہر بھی بے شمار ہیں اور اس میں شک نہیں کہ صفات کے ذریعہ ہی معرفتِ ذات ہوتی ہے جب صفات بھی لامحدود اور اس کے مظاہر بھی لامحدود، اور ان تمام لامحدود صفات میں اس کا ظاہری نشان و پتہ بھی موجود نہیں تو کس طرح اس کی پہچان کی جائے؟ مصنف نے اسی بے نشانی کی نشاندہی کے لئے دو بنیادیں قائم کی ہیں، ایک تو یہ کہ اس بے نشان کو اپنے ہی اندر تلاش کرو، دوسرے یہ کہ اس کی تلاش اسی کے نور و جمال سے کرو۔

یہاں پر چند امور کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے، ۱۔ اپنے اندر تلاش کرنے کو کیوں کہا، ۲۔ اس کی تلاش اسی کے نور کے ساتھ کیوں مخصوص ہے، ۳۔ اس کا طریقہ کیا ہے؟

اپنے اندر تلاش کرنے کو اس لئے کہا کہ انسان جو حقیقتِ جامعہ ہے، یہ عالمِ اصغر ہے اور تمام کائنات عالمِ اکبر ہے، کائنات میں جو کچھ تفصیل کے ساتھ موجود ہے، وجودِ انسان میں وہی سب کچھ اختصار کے ساتھ موجود ہے، اس لئے پہلے اس کی تلاش اختصار ہی میں کرو جب اس منزل میں کامیابی ہو جائے گی تو پھر تفصیلی منازل، جو اس منزل کے بعد آتی ہیں وہ بھی طے ہو جائیں گی۔ اور اس کی تلاش اسی کے نور کے ساتھ اس لئے مخصوص ہے کہ کسی بھی شئے کی یافت کے دو طریقے ہیں، ایک ظاہری، دوسرا باطنی، ظاہری طریقہ حواسِ خمسہ میں منحصر ہے جس میں سب سے اعلیٰ قسم آنکھ کی ہے، اس لئے کہ ہاتھ جب ادراک کرے گا تب لمس یعنی چھونے کا معاملہ ہوگا، اسی طرح کان جب سنے گا تب ہی ادراک کرے گا، پھر زبان چکھنے کے بعد اور ناک سونگھنے کے بعد، غرض ان سب کا دائرہ کار بہت محدود ہے، آنکھ اگرچہ دور ہی سے

دیکھ کر ادراک کرلیتی ہے لیکن یہ انسانی نور بھی محدود ہے، کیونکہ یہی روشن آنکھ اندھیرے میں دیکھنے سے عاجز ہے جب تک کہ کسی دوسری روشنی کا سہارا نہ ہوگا اس کی روشنی بھی کام نہ آسکے گی، معلوم ہوا کہ یافت کا ظاہری طریقہ بھی ناقص ہے۔

یافت کا باطنی ذریعہ عقل ہے، اسی عقل کے ذریعہ انسان کائنات کی بہت سی چیزوں کی یافت کرتا ہے لیکن اس عقل کی اتنی وسعت وعظمت کے باوجود اس کی نارسائی کا عالم یہ ہے کہ وہ پیپل کے ننھے سے بیج سے، اتنے بڑے تناور درخت کے وجود کا، مشاہدۂ ظاہری کے بغیر نہ تعین کر سکتی ہے نہ تیقن، یعنی انتہائی عقلمند انسان کو آپ پیپل کا بیج دکھلائیں جو اس کو جانتا نہ ہو اور آپ اس سے کہیں کہ اس ننھے سے بیج میں کتنا بڑا درخت مع اپنی شاخوں، پتوں اور پھلوں کے موجود ہے تو اس کو یقین آنا مشکل ہے حالانکہ یہ حقیقت ہے، معلوم ہوا کہ ہماری وہ قوت جو باطنی احوال کو ادراک کرتی ہے محدود ہے اور خداوند قدوس کا نور مطلق اور صفات لامحدود ہیں تو پھر ان صفات کو اسی کے جمال سے، اسی کے نور کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے، اسی وجہ سے مصنف نے "اسی کا نور" لاکر اس مشکل مرحلہ کو کس قدر آسانی کے ساتھ طے کرلیا، سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسی حقیقت کو عَرَفْتُ رَبِّیْ بِرَبِّیْ کے ذریعہ آشکار کیا ہے۔

اب رہ گیا اس شغل کا اصل مقصد، یعنی اس کو اپنے اندر تلاش کرنے کا طریقہ کیا ہے تو اس کے لئے مصنف نے تین درجات متعین کئے ہیں، یہی ترتیب بہت اہم اور بے مثال ہے اور اس ترتیب کی طرف رحمتِ خداوندی جس کی رہنمائی کرتی ہے، اس کو عرفان کی وہ کیفیت حاصل ہوتی ہے جس کا بیان الفاظ میں نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس کی اجازت ہے ان تین درجات میں بعض حضرات کو صرف ایک ہی درجہ میسر ہوتا ہے اور بعض درجۂ ثانیہ پر جاکر رک جاتے ہیں، بس رحمتِ خاص جس کو نوازتی ہے یہ دولتِ لازوال اسی کو میسر ہوتی ہے اس کی خاص پہچان جو صوفیائے محققین نے متعین فرمائی ہے یہ ہے کہ اس مقام

پر پہونچکر قال ختم ہو جاتا ہے اور مقامِ حال تک رسائی ہو جاتی ہے ، انھیں حضرات کے بارے میں شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ۔ع ۔ آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

اس شغل کا طریقہ اس فقیر کو بفیضانِ مرشد جو معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے سالک طہارتِ ظاہری و باطنی سے آراستہ و پیراستہ ہو کر کسی پر سکون مقام پر بصورتِ مراقبہ بیٹھے اور زبانِ قلب سے اللہ حاضری ، اللہ ناظری ، اللہ معی کہے ، جب اللہ حاضری کا تصور کرے تو آنکھ کھولے رکھے اور پلک نہ جھپکائے ، نظر دور تک رکھے اور یہ تصور کرے کہ وہ ذاتِ حق اپنی تمام شانہائے بیکراں کے ساتھ جلوہ فگن ہے اور میں اس کے حضور میں حاضر ہوں ، جب اللہ ناظری کا تصور کرے تو نظر کو نزدیک کرے اور یہ تصور کرے کہ وہی ذاتِ حق ہر شئے کو محیط ہے یعنی اس ذاتِ پاک کا لامحدود علم میرے علم ، عمل ، خیال ، قیاس ، وہم سب کو گھیرے ہوئے ہے ، میرے اس مراقبے کی حقیقت کو ، میری نیت کو ، وہ خوب جانتا ہے اور جب اللہ معی کا تصور کرے تو آنکھیں بند کر لے اور صرف اسی ذاتِ پاک کی صفات میں گم ہو جائے ، اس کے بعد اپنے وجود پر غور کرے کہ سو برس پہلے یہ کہاں تھا یہ نعمتِ وجود جو اس کو عطا کی گئی ہے اس کا مقصد کیا ہے ؟ سو برس کے بعد یہ وجود کہاں چلا جائے گا ، خالق کائنات نے مجھے عقل ، علم اور عمل کی جو دولت عطا کی ہے اُس کا مقصد کیا ہے ، میری بینائی اتنی بڑی کائنات کا ، آسمانوں کی وسعت کا نظارہ ، چھوٹی سی پتلی کے ذریعہ کرتی ہے لیکن اندھیرے میں یہی طاقت بیکار ہو جاتی ہے ، ایک طرف میری عقل نے خلاؤں کی تسخیر کر لی ، زمین کے خزانوں کو کھوج کھوج کر نکالا ، دوسری طرف یہی عقل ایک معمولی سے بیج میں درخت کے وجود کے ادراک سے عاجز ہے ، وہ یہ نہیں جانتی کہ درخت کی حقیقت مغز میں پوشیدہ ہے یا چھلکے میں ، میری ایجادات کی طاقت نے بڑے بڑے پہاڑوں کو ڈائنامیٹ کر کے زمیں بوس کر دیا لیکن ایک چھوٹا سا پتھر مجھ سے میری زندگی چھیننے کے لئے کافی ہے ، میں سمندروں کے سینے چیرتا ہوا کشتی ، اسٹیمر ، بحری جہاز چلاتا

ہوں لیکن ایک چھوٹی سی موج کے سامنے میری حیثیت ایک حقیر تنکے جیسی ہوجاتی ہے، آخر یہ عجیب تضاد، اتنی بلندی اور پستی کا مجموعہ جو مجھکو بنایا گیا ہے تو میں اپنے آپ کو کیا سمجھوں؟ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کیا میں خود کسی کا نشان ہوں؟ اگر نشان ہوں تو کس منزل کا اور وہ صاحب منزل کہاں ہے؟ بہر حال اپنے نفس یعنی اپنے وجود کے موجود ہونے کے مقصد کی تلاش ہی معرفتِ نفس کا پہلا مرتبہ ہے، اس مرتبہ میں رحمت خداوندی، طالب صادق کو تفکر کی نعمت سے سرفراز فرماتی ہے، اصطلاح صوفیا میں یہ مرتبہ علم الیقین کا ہے، جس میں تلوین کی کیفیت سے سالک دوچار ہوتا ہے، اس میں اس قسم کا اضطراب ہوتا ہے گویا محبوب چلمن کے پیچھے ہے لیکن ادراک صرف پرچھائیں کا ہوتا ہے جس کی وجہ سے یک گونہ تڑپ اور کشمکش کا احساس رہتا ہے۔

مراقبہ میں اس تصور سے یہ فائدہ ہوگا کہ سالک کو اپنے تمام اختیارات پر ایک ایسی طاقت کی حکمرانی کا یقین ہوجائے گا جس کی قدرت ذرّے سے آفتاب تک، قطرے سے دریا تک کارفرما ہے، عبودیت کا مرتبہ اسی مقام سے ظاہر ہوتا ہے۔

دوسرا درجہ جو پہلے درجہ سے بلند ہے یہ ہے کہ مراقبہ کے وقت یہ دھیان کرے کہ وہ میرے ساتھ ساتھ ہے، میں خلوت میں ہوں یا جلوت میں، تجارت میں مصروف ہوں یا عبادت میں دن رات کے ہر حصّے میں ہر جگہ اس کی قدرتِ کاملہ مجھ پر مکمل دسترس رکھتی ہے اور اس کا علم، علمِ کامل میرے ظاہر و باطن کو محیط ہے گویا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ کی حقیقت سالک کی زندگی بن جائے، ابتدا میں یہ صورتِ حال صرف مراقبہ کے وقت تک محدود رہتی ہے لیکن دلجمعی اور دوام استقلال سے جب یہ فکر قائم ہوجاتی ہے تو پھر گناہوں سے، برائیوں سے سالک کو طبعی طور پر دوری ہوجاتی ہے کیونکہ سالک کو اپنے ہر ایک قول و فعل میں یہاں تک کہ تخیل کی پرواز میں بھی خداوندِ قدوس کی معیت حاصل رہتی ہے، ظاہر ہے کہ اتنے بڑے حاکم کے روبرو کس کو جرأتِ گناہ ہوسکتی ہے، جب گناہوں سے دوری ہوگی

تو لامحالہ قوتِ روحانیہ میں اضافہ ہوگا جس کی وجہ سے کثافت میں کمی اور لطافت میں زیادتی ہوگی، اس مقام میں چاروں طرف اسی کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے. لطافت کی زیادتی کی وجہ سے تلون واضطراب کی کیفیت بھی نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے، یہ مقام عین الیقین کہلاتا ہے

تیسرا درجہ جو سب سے بلند ہے یہ ہے کہ سالک خداوندِ قدوس کی معیت کے تصور کو مراقبہ میں اس قدر قریب لے آئے کہ قرآن پاک کی اس آیت وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ یعنی خداوندِ قدوس کی ذاتِ پاک اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، شہ رگ کا وجود، انسان کی حیاتِ ظاہری سے کس قدر قربت رکھتا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر اس رگ کو کاٹ دیا جائے تو وجودِ انسانی سے حیاتِ ظاہری کا رشتہ منقطع ہوجاتا ہے، جب عالمِ اصغر یعنی اپنے وجود میں سالک کو اس کیفیت کا ادراک ہوجائے تو اس شغل میں یکسوئی کے ساتھ انہماک قائم رکھے یہاں تک کہ اس کو کائنات کی ہر شے میں شہ رگ سے بھی زیادہ قریب اس ذاتِ مطلق کے وجود کا احساس ہونے لگے گا، جب یہ کیفیت قائم ہوجائے گی تو پھر ہر شے میں صرف اسی کا جلوہ دکھائی دینے لگے گا، اپنے وجود میں بھی وہی نظر آئے گا، یہی وہ مقام ہے جہاں دریا اور موج دونوں ایک ہوجاتے ہیں، نقش اور نقاش میں دوئی کا نقش مٹ جاتا ہے، طلسم اور محرک کی یگانگت کے راز طلب سالک پر، اس مقام پر عیاں ہوجاتے ہیں۔ اَنَا الْحَق اور سُبْحَانِی مَا اَعْظَمَ شَانِی کے نظارے اسی مقام پر ہوتے ہیں، یہی وہ مقامِ اعلیٰ ہے جہاں صرف حال ہی ہے، قال اس مقام پر جرمِ عظیم ہے، اس مقام کو حق الیقین بھی کہا جاتا ہے، اسی مقام پر آکر اپنی پہچان سے رب کی پہچان کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ بعض حضرات پہلے مرتبہ میں کیفیات کے حاصل نہ ہونے کی وجہ سے دل برداشتہ ہوجاتے ہیں اور بعض دوسرے مرتبہ میں اس لاحاصلی کی کیفیت سے دوچار ہوکر ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور بعض تیسرے مرتبہ میں اپنے وجود میں اس کا جلوہ دیکھ کر مغلوب الحال ہوجاتے ہیں، انہیں دشوار گذار مراحل میں مرشد کی توجہ سے رحمتِ خداوندی رہنمائی فرماتی ہے اور دریائے شکر میں غوطہ زن ہونے کے باوجود بھی صحو کے کنارے پر دامن تر کئے بغیر لاکر کھڑا کردیتی ہے ورنہ

یہ دیکھا گیا ہے کہ اگر مرشد کی توجہ میں بُعد ہو گیا تو سنّتِ محمدی کے پیرو تو جذب کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور ریاضت کرنے والے جوگی، اس مقام پر آکر اپنے آپ کو ہی، وہی سمجھنے لگتے ہیں یعنی نزول کو حلول سمجھنے لگتے ہیں۔ ع ببیں تفاوتِ رہ از کجا است تا بکجا۔

ربّ خود را می شناسد کو شناسد خویش را — می نگر اندر حدیثِ حضرتِ خیر الوریٰ

ترجمہ: جو اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے وہ اپنے رب کو پہچان لیتا ہے، مخلوق میں سب سے بہتر ذات کی حدیثِ پاک میں اس حقیقت کو دیکھو۔

تشریح: اس ذاتِ بے مثال نے تمام اسماء و صفات سے متجلّی ہو کر حقیقتِ انسانی میں تجلّی فرمائی ہے، اس لئے انسان کو حقیقتِ جامعہ کہتے ہیں اور یہ قدرت کا ایسا سربستہ راز ہے جس کے اظہار سے زبان و قلم عاجز ہیں، صرف احساس سے ادراک کا امکان ہے کیونکہ وہ ذات تو لا تعیّن ہے اور کمالِ تعیّن کے ساتھ بغیر کسی کمی کے تعیّن کو قبول فرما کر حقیقتِ جامعہ کے لباس میں مخفی ہو کر تعارفِ ذات کا سامان کر دیا ہے، لہٰذا جس نے اس حقیقتِ جامعہ کے راز کو جان لیا گویا اس نے حق کو پہچان لیا۔ اسی مقصد کو مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ میں روایتِ حدیث بالمعنیٰ کے طور پر ملاحظہ کرنے کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔

ایں روایت نقل آمد از جنابِ مرتضیٰ — خود شناسی حق شناسی ہست گفتہ مصطفےٰ

ترجمہ: یہ روایت سیدنا حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے آپ کو پہچاننا ہی حق کو پہچاننا ہے۔

تشریح: مصنّف فرماتے ہیں کہ اس شغل کی بنیاد مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ ہے جسکے متعلق ان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ حدیثِ پاک ہے، اور اس کی روایت سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے ہے، محدّثین حضرات نے اگرچہ اس میں کلام کیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر لفظی طور پر بعینہٖ حدیثِ پاک کے الفاظ یہ نہ ہوں لیکن روایت بالمعنیٰ کو اس صورت میں جبکہ حدیث قرآن کی مؤید ہو، قبول کرنا اور معمول بہ بنانا مستحسن ہے جو صوفیاء حضرات نے اختیار کیا ہے

اس کے پیشِ نظر یہ روایت بالمعنیٰ پر محمول کی جائے گی۔

گفت باری عزّ اسمہٗ در کلام خود عیاں اوست با ما ہر کجا باشیم در ہر دو جہاں

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے جس کا نام عزّت والا ہے اپنے کلام میں خود ظاہر فرمادیا ہے کہ دونوں جہاں میں جس جگہ بھی ہم رہیں گے وہ ہمارے ساتھ ہے۔

تشریح: خداوندِ قدوس محیطِ کُل ہے کیونکہ اس کی تمام صفات تفصیلی طور پر تمام کائنات کی اشیاء کو مکمل طور پر گھیرے ہوئے ہیں، وہ رحمان ہے تو اس کی رحمت تمام اشیاء کائنات کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے، وہ علیم ہے تو اس کا علم ہر ایک شے کو محیط ہے، وہ قادر ہے تو اس کی قدرت چھوٹی سے چھوٹی، بڑی سے بڑی، کمزور سے کمزور اور طاقتور سے طاقتور تمام اشیاء پر حاوی ہے، اس طرح وہ ہر لمحہ، ہر آن کائنات کی ہر شئے کے ساتھ معیّت رکھتا ہے جس کو واضح طور پر اس نے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ لیکن اس معیّت کا احساس اس طرح ہو جانا کہ ہم کو بھی یہ حقیقت معلوم ہو جائے اسی شغل کے ذریعہ ہوگا، اسی مقام پر مرشد نے فرمایا کہ روشنی تو اس کی طرف سے آتی ہے اب یہ بندے پر منحصر ہے کہ جس قدر اپنے آئینۂ قلب کو صاف کرے اسی صلاحیت کے اعتبار سے نورِ ازلی سے فیضیاب ہوگا اور جس قدر فیضیابی ہوگی اسی قدر اپنی معرفت ہوگی، پھر اسی اعتبار سے ذات باری تعالیٰ کی معرفت ہوگی، بس اپنے آپ کو پاک صاف کرو، وہ تو ازل سے پاک صاف ہے جب تم پاک صاف ہو جاؤ گے تو اس کی صفائی کا جلوہ نظر آنے لگے گا، اس کا جلوہ تو ہر وقت ہر جگہ موجود اور عیاں ہے، بس دیکھنے کی بات ہے۔

گفت دیگر آیتے در مصحفِ خود ہم چنیں حق تعالیٰ با دلائل در تنم باشد قریں

ترجمہ: اسی طرح مکرر اپنی کتاب عزیز میں فرمایا کہ حق تعالیٰ ہمارے تن میں دلائل کے ساتھ موجود ہے۔

تشریح: اس سے پہلے شعر میں مصنف نے دونوں جہان میں ہمارے ساتھ ساتھ اس

ذاتِ مطلق کی موجودگی کا ذکر کیا تھا، یہاں پر فرمارہے ہیں کہ جس طرح ظاہر میں وہ تمہارے ساتھ تھا اسی طرح تمہارے باطن میں بھی اسی کا جلوہ ہے اور یہ دعویٰ معیّت نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ کی دلیل سے مزیّن ہے کہ اس ذاتِ لاتعیّن نے تنزیہہِ کامل کی شان سے متصف ہونے کے باوجود تعیّنات قبول فرما کر صفات میں ظہور فرمایا، اور حقیقتِ جامعہ یعنی انسان کو جس طرح اپنا ظاہری آئینہ بنایا تھا اسی طرح اس کے باطن میں بھی صرف اسی کے جلوے ہیں۔

باتنِ ما حق تعالیٰ رامعیّت ہر زماں　　نفسِ ما از بحرِ وحدت گشت موجود و عیاں

ترجمہ: ہمارے تن کے ساتھ حق تعالیٰ کی معیّت ہر زمانے میں ہے اور ہمارا وجود بھی بحرِ وحدت سے ہی وجود پذیر ہو کر ظاہر ہوا۔

تشریح: یہاں پر مصنّف نے مکمل طور پر اس بات کا اظہار کر دیا کہ ہمارا وجود ہستی، ہمارا ظہور، اور ہمارا اعدام یعنی پیدا ہونے سے پہلے، پیدا ہونے کے بعد اور اسکے بعد یعنی دوسری زندگی میں غرض کہ سب جگہ ایک ہی وجود کا ہم عکس ہیں تو اصل وجود اسی پروردگار کا ہوا جس کی معیّت ہر گھڑی ہمارے ساتھ ہے اور ہمارا وجود اسی بحرِ وحدت سے وجود پذیر ہو کر ظاہر ہوا ہے، یہاں مصنّف نے مسئلہ وحدۃ الوجود میں معیّت کی قید لگادی اور وحدۃ الشہود سے تطبیق دے کر ایک ایسا مسلک اختیار کیا ہے جس میں اختلاف نہیں ہے۔

ایں برائے نام باشد او ست دریا موج اوست　　در تمامیِ وجودِ خویش بنگر عینِ دوست

ترجمہ: یہ تو سب برائے نام ہے ورنہ وہی دریا ہے وہی موج ہے، اپنے وجود میں مکمل طور پر صرف دوست کے جلوؤں کا نظارہ کرو۔

تشریح: اس شعر سے بظاہر کئی مفہوم کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے جو بصورتِ اعتراض ہے اس سے پہلے مصنّف نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں تطبیق دے کر بہت ہی عمدہ طریقہ اپنایا تھا اور یہاں صرف وحدۃ الوجود کی تائید کر رہے ہیں، یعنی اپنی حقیقت پر غور کرو گے تو صرف دوست کا عین پاؤ گے، اسی اعتراض کو ختم کرنے کیلئے فرماتے

ہیں کہ یہ تمام مباحث وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود تو برائے نام ہیں یعنی الفاظ کی بحث ہے اور صوفیاء وسالکین راہِ معرفت صرف الفاظ کی بحث میں مشغول نہیں ہوتے بلکہ الفاظ کے ساتھ معنیٰ کی روح پر بھی اُن کی نظر ہوتی ہے۔ اس لئے تم بھی ان ظاہری مباحث میں اپنے کو نہ الجھاؤ بلکہ اصل مقصد وہ ذات پاک ہے بس اسی کے تصور کو قائم کرکے اپنے اندر اسی کے جلوؤں کو دیکھو کیونکہ

نیست چیزے در وجودت جز خدا اے اہلِ دیں　　تو طلسمی او محرک راست دانی بالیقیں

ترجمہ: اے دین دار آدمی تیرے وجود میں خدا کے سوا کوئی چیز نہیں، بے شک تو ایک طلسم ہے جس کا محرک وہی خدائے وحدہٗ لاشریک ہے۔

تشریح: یعنی جب تم نے اپنے نفس میں غور کیا اور سمجھ لیا کہ وہی وہ ہے اور ہستی ہے تو اسی کی ہستی ہے، تو اس کی ہستی کے مقابلہ میں تم نیست ہوگئے، تم خود کچھ نہ رہے اور یہی خودی جب مکمل طور پر تم سے ہٹ گئی تو پھر مکمل طور پر ہی اس وجودِ حقیقی کا وجود عیاں ہوگیا، اسی مقام کے لئے محققین صوفیاء فرماتے ہیں کہ تمہارے وجود میں سوائے خدا کے کسی اور شئے کا واہمہ بھی نہیں رہ جاتا، دل پر اس حقیقت کا انکشاف ہوجانے کے بعد یہ مشاہدہ بھی تم کو ہوجائے گا کہ تمہارا وجود تو ایک کٹھ پتلی کی طرح ہے جس کی ڈور پردے میں چھپے ہوئے ہاتھ میں ہے اور وہ ہاتھ ہی کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًّا ہے جس طرح وہ چاہتا ہے حرکت دیتا ہے اور کٹھ پتلی بھی اسی طرح حرکت کرتی ہے۔

اوست در حالِ خود و نقش خودی رامی نگاشت　　می نگر در ذاتِ خود کاں عینِ ذاتِ حق گماشت

ترجمہ: ہر حال میں وہی وہ ہے اور اس نے خود ہی اپنے نقش و نگار میں رنگ بھرا ہے اپنی ذات میں غور کرو کہ اس نے اپنی ذات کا عین متعین کردیا ہے۔

تشریح: اس ذاتِ پاک نے اَلْاِنْسَانُ سِرِّیْ وَاَنَا سِرُّہٗ کہ انسان میرا راز ہے اور میں انسان کا راز ہوں، کہہ کر تمام صفات کا نمونہ انسان کو بنایا، گویا اپنے اوپر اپنی تجلیات کا ظہور کیا، تمام تجلیات اسی کی ہیں اور تجلیات راہبر ہیں صفات کی طرف اور صفات راہبر ہیں ذات کی طرف، تو تجلیات (جس کو مصنف نقش و نگار سے تعبیر کررہے ہیں) پھر عین ذات

ہوگئیں اس لئے جب ان تجلیات کا ظہور ہوا تو استیلائے ہستی مطلق ہوا، اس استیلاء سے ممکن الوجود نیست ہوگیا اور جب ممکن الوجود ختم ہوگیا تو واجب الوجود ہی باقی رہ گیا، اس وقت میں نقش اور نقّاش، ذات اور صفات سب مرکز احدیت پر قائم نظر آتی ہیں۔

خود نماید خود بہ بیند، خود بگوید، بشنود　　　خود بگیرد، خود گذارد، بوئے خود را خود شمد

ترجمہ: خود دکھلاتا ہے خود دیکھتا ہے، خود کہتا ہے خود ہی سنتا ہے خود گرفتار کرتا ہے خود رہائی دیتا ہے اور خود ہی اپنی خوشبو سے معطر ہوتا ہے۔

تشریح: آخر میں مصنفؒ تیسرے اور آخری درجہ کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب سالک، نورِ تجلّی احدیت میں محو و فانی ہو کر عین بے خودی میں اپنے کو حقیقت کا عین دیکھتا ہے تو اسی عینیت میں وہ حق الیقین کے راز سے شناسائی حاصل کرتا ہے، اس مقام پر تمام حجاباتِ عقلیہ تجلّی جمالِ ذات سے سوخت ہو جاتے ہیں، اس وقت اس کا دیکھنا حق کی آنکھ سے ہوتا ہے، اس کا سننا حق کے کان سے ہوتا ہے، اس کا چلنا حق کے پاؤں سے ہوتا ہے، گویا سالک اس حدیثِ پاک کی تفسیر بن جاتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، میں اس کا پاؤں بنجاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔

یہی انتہائے عبدیت ہے اور اصل منزلِ مقصود بھی یہی ہے یہاں آکر اپنا کچھ باقی نہیں رہتا، سب کچھ وہی وہ رہ جاتا ہے، بس ؏

بسیار او را جستمش اکنوں نمی دانم چہ شد

کی کیفیت کا حصول ہو جاتا ہے۔ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا مَعْرِفَتَکَ کَمَا رَزَقْتَھُمْ۔

دربیان آنکہ درتنِ ہر آدمی ہیزدہ چیز است

اسکے بیان میں کہ ہر آدمی کے بدن میں اٹھارہ چیزیں ہیں

آنچہ گفتم ار بخواہی در وجودِ خود نگر چند چیزے گشت پیدا ہوشداری آں بسر

ترجمہ: وہ جو میں نے کہا تھا کہ اگر تو معرفت چاہتا ہے تو اپنے وجود میں غور کر، اس سے چند چیزیں ظاہر ہوئی ہیں جن کا خیال کرنا تجھ پر واجب ہے۔

تشریح: اس سے پہلے مصنّف نے چوبے مثال شغل بتلایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا تھا کہ بندہ اپنی ہستی اور اپنی خودی کو مکمل طور پر فنا کردے، جب راہِ فنا سے کلی طور پر گذر جائیگا تو مقامِ بقاء، پروردگارِ عالم کی طرف سے اس کو عطا کیا جاتا ہے، اس مقام پر آکر سالک ان کیفیات سے دوچار ہوتا ہے جن کے اظہار سے زبان وقلم دونوں عاجز ہیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ سالک اس عطیۂ خداوندی پر مغرور نہ ہوجائے اور اپنے اندر تجلّیاتِ باری کا معائنہ کرنے کی وجہ سے نزول کو حلول سمجھ بیٹھے، اس مقام پر شیطان لعین بھی بہکانے کی اپنی آخری کوشش کرتا ہے چونکہ یہ بہت کٹھن مقام ہے، اسلئے مصنّفؒ فرماتے ہیں کہ اپنے وجود میں غور وفکر کرنے میں مقامِ بندگی کو قائم رکھو اور ان چیزوں پر بھی غور کرو کہ تمہاری خلقت، تمہارے جسم کی ترکیب کن کن چیزوں سے ہے، تجلّیاتِ باری کی لامحدود اور اعلیٰ ترین کیفیات کا مشاہدہ کرنے کے بعد اپنی حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے، اس بیان کا یہی مقصد ہے۔

خلقتِ جسمِ بشر از ہیزدہ شئے شد عیاں از خدا دہ، چار از مرد ست و چار از زن بداں

ترجمہ: ظاہری طور پر انسان کے جسم کی بناوٹ اٹھارہ چیزوں سے ہوئی، ان میں دس اللہ تعالیٰ کی طرف سے، چار مرد کی طرف سے اور چار عورت کی طرف سے۔

تشریح: یعنی دس چیزیں انسان کے جسم میں ہیں، وہ صرف خداوند قدوس ہی کی قدرتِ کاملہ کا مظہر ہیں، اگرچہ تمام جسم اور اس میں موجود سب کچھ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، مگر دس

چیزیں ایسی ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاواسطہ عنایت ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے ان کا تعلق مادّیت اور کثافت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ جو لطیف ہے اس کی طرف سے عطا کی ہوئی یہ خاص نعمتیں بھی لطافت سے مالا مال ہیں، البتہ مرد و عورت کی طرف سے اولاد کو جو چیزیں ملی ہیں وہ مادّی اور کثیف چیزوں سے بھرپور ہیں۔

از خدا روح و دم و عقل و شم و سمع و بصر　　لمس و نطق و ذوق و نفس این جملہ از وے می شمر

ترجمہ: روح، دم، عقل، قوتِ شامہ، قوتِ سامعہ، قوتِ باصرہ، قوتِ لامسہ، قوتِ ناطقہ، قوتِ ذائقہ اور نفس، یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھو۔

تشریح: یعنی انسان کے جسم میں جو روح پائی جاتی ہے یا سانس کا آنا جانا، قوتِ عاقلہ اور سونگھنے کی قوت، سننے کی قوت، دیکھنے کی قوت، چھونے کی قوت، بولنے کی قوت، چکھنے کی قوت اور انسانی خواہشات کا پیدا ہونا، یہ تمام ایسی صفاتِ انسانی ہیں جن کا ظاہری طور پر کوئی رنگ و روپ نہیں ہے، بلکہ یہ تمام لطیف اشیاء ہیں جن کا تعلق لطیفِ مطلق سے ہے۔

از منی مرد مغز و عظم و جلد و عرق تن　　وز منی زن بود خوں، لحم و پیہ و موئے تن

ترجمہ: مرد کے مادّے سے مغز، ہڈی، کھال اور رگیں پیدا کی گئی ہیں اور عورت کے مادّے سے خون، گوشت، چربی اور بدن کے بال پیدا کیے گئے۔

تشریح: کیونکہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ماں باپ کے جو خواص اولاد میں آتے ہیں ان میں سے چار چیزوں میں مغز، ہڈی، کھال اور رگوں میں باپ کا اثر ہوتا ہے اور خون، گوشت، چربی اور بال یہ سب ماں کے مشابہ ہوتے ہیں۔

ایں ثمان و آں عشر در جسمِ ہر انساں بداں　　ظاہرا جسمِ بشر، در باطنش خلاق آں

ترجمہ: یہ آٹھ اور وہ دس چیزیں انسان کے جسم میں ہیں، ظاہری طور پر تو یہ انسان کا جسم ہیں اور باطنی طور پر یہی اس کی مربی ہیں۔

تشریح: یعنی غور و فکر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہ چیزوں سے انسان کے جسم کی ترتیب

ہوتی ہے اور یہ اٹھارہ چیزیں اس کے نظام جسمانی کی بنیاد ہیں، یہی نظام جسمانی کو قائم رکھے ہوئے ہیں، گویا ان میں سے اس کے جسم کی تربیت اور نشو ونما ہوتی ہے۔

ذاتِ باری را محیط جملہ اشیاء راست داں ہمچو مسکہ درمیانِ شیر مخلوط و نہاں

ترجمہ: یہ بات صحیح سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اِن تمام اشیاء کا احاطہ کئے ہوئے ہے جس طرح سے مسکہ (مکھن) دودھ میں ملا ہوا ہے اور پوشیدہ ہے۔

تشریح: یہاں یہ بتلا رہے ہیں کہ جب یہ تمام اٹھارہ چیزیں انسان کے جسمانی نظام کو قائم رکھے ہوئے ہیں اور ان ہی کے ذریعہ اس کے جسم کی تربیت بھی ہوتی ہے تو پھر کسی اور شے کا وجود ضروری نہیں بلکہ یہی اشیاء خالق اور مربّی ہیں اور بظاہر کسی دیگر شئے کا وجود بھی تو نظر نہیں آتا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ یہ تمام چیزیں جو مدارِ جسم انسانی ہیں یہ خود اپنے وجود میں کسی دوسرے کی محتاج ہیں اور وہ دوسری شئے وہی حقیقت ہے جو ہر ایک طاقت کا مرکز ہے، اِسی حقیقت کو اللہ کہتے ہیں، وہی ربّ الارباب ہے، اس کا وجود ہر شئے میں اس طرح چھپا ہوا ہے جیسے مکھن، دودھ کے ہر ایک قطرے میں پوشیدہ ہے، لیکن بظاہر نظر نہیں آتا جبکہ دودھ کا ایک چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی اس مسکہ (مکھن) کی حقیقت سے الگ نہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ ان اٹھارہ چیزوں میں موجود ہے، اور اس کے باوجود نظروں سے پوشیدہ ہے۔

باز بنگر نار اندر آب جوشاں است چوں کس نہ بیند روئے او را لیک سوزش را ہموں

ترجمہ: پھر تم دیکھو کہ جس طرح کھولتے ہوئے پانی میں آگ کا وجود ہے، کوئی اس کو دیکھ نہیں سکتا لیکن اس کی سوزش برقرار ہے۔

تشریح: وجودِ خداوندی کی دوسری نظیر مصنف اس طرح پیش کر رہے ہیں کہ جس طرح خوب کھولتے ہوئے پانی کو بھی پانی ہی کہا جائے گا آگ نہیں کہا جائے گا لیکن جب اس میں آپ ہاتھ ڈالیں گے تو اس وقت پانی کی اصل خاصیت ٹھنڈک کے بجائے آپ

کے ہاتھ میں جلن کا شدت سے احساس ہوگا تو جس طرح پانی میں بظاہر آگ کا وجود معلوم نہیں ہوتا تھا حالانکہ آگ اس میں پوشیدہ تھی، اسی طرح پروردگارِ عالم کا وجود ہر شئے میں موجود ہے، لیکن یہ آنکھیں اس کے ادراک سے قاصر ہیں۔

باز بنگر نشرِ بوئے صندل و گل بالیقیں　　　　در تنت ذاتش محیط و محتوی است اینچنیں

ترجمہ: پھر تم صندل اور پھول میں خوشبو کے بکھراؤ کو دیکھو، بالکل اسی طرح تیرے بدن میں اس کی ذات پیوست ہے اور احاطہ کئے ہوئے ہے۔

تشریح: تیسری مثال بھی وجودِ باری کے لئے مصنف پیش کر رہے ہیں کہ صندل میں اور پھولوں میں تم خوشبو کو دیکھو کہ وہ پھول کے اندر ہے لیکن اس خوشبو کا پھیلاؤ، پھول کے مقابلہ میں، یا صندل کی لکڑی کے مقابلہ میں کس قدر وسیع ہے، پھول کا یا صندل کی لکڑی کا جسم جتنی جگہ گھیرتا ہے وہ کتنی کم ہے اور پھول کی خوشبو اُڑ کر کہاں تک جاتی ہے، حالانکہ یہ خوشبو اسی پھول کی ذات میں پیوست ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں جزو کل سے بڑا ہے، مصنف نے یہ تین مثالیں وجودِ باری کے سلسلے میں بیان فرمائی ہیں، یہ محض تکرارِ عبارت ہی نہیں بلکہ ہر ایک مثال کو لانے کا ایک خاص مقصد ہے، مصنف علیہ الرحمہ کا ایک خاص اندازِ تفہیم ہے کہ وہ بتدریج قاری کے ذہن کے قریب آتے ہیں اور ترتیب وار اپنی بات کو اس طرح سمجھاتے ہیں کہ شک کی گنجائش نہیں رہتی، پہلی مثال (مسکہ کا وجود دودھ میں) میں جسمِ انسانی میں وجودِ باری کا موجود ہونا اور محیط ہونا بتلایا ہے، لیکن اس وجود کا علم تو درکنار، احساس بھی نہیں۔

دوسری مثال میں وجود کا موجود ہونا، اور اس کا محیط ہونا بتلایا گیا ہے لیکن اسکا احساس جب ہی ہوگا جبکہ آپ اس کھولتے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈالیں گے، دور سے اس کے وجود کا احساس نہ ہوگا۔

تیسری مثال میں خوشبو کے پھول کے اندر محصور ہونے کے باوجود دور سے ہی اس کا احساس

ہوجائے گا چنانچہ اس خوشبو کے پھیلاؤ کا دائرہ بھی پھول یا صندل کی لکڑی کی جسامت سے کہیں زیادہ ہے، یہ مثال اس لئے بیان کی ہے کہ کہیں یہ غلط فہمی نہ ہوجائے کہ جب اس کی ذات ہمارے اندر یا کسی بھی شئے میں موجود ہوگی تو مظروف ہوگی اور وہ شئے ظرف بنے گی اور ظاہر بات ہے کہ ظرف مظروف سے بڑا ہوتا ہے، تو ذات اشیاء بھی اس کی ذات سے بڑی ہوگی حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی ذاتِ پاک پھول میں خوشبو کی طرح محصور رہنے کے باوجود بھی پھول کو محیط ہے اور پھول کے مقابلہ میں خوشبو کی طرح غیر محدود ہے۔

از خیالِ خود نہ دانی عین خود را عین او　　　غیر دانستن از و لیکن بباشد کفر تو

ترجمہ: اپنے خیال میں کہیں تو اپنے وجود کو اس کا وجود نہ سمجھ لینا، لیکن اپنے کو اس سے الگ کرنا یہ بھی تیرے لئے حقیقت سے انکار کے مترادف ہے۔

تشریح: مصنف یہاں پر ایک بڑے عجیب و غریب نکتے کی بات بیان کر رہے ہیں کہ کہیں تم کو یہ گمان نہ ہوجائے کہ جب تمھارے وجود میں وہ خود موجود ہے تو دونوں ایک ہی ہیں، یہی وہ عقیدہ ہے جس کو حلول کہتے ہیں، اس کی حقیقت نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی بعض خود کو اس کا اوتار اور روپ کہنے لگے ہیں۔

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والے صوفیاء حضرات بھی ہر ایک شئے میں صرف اسی کا وجود مانتے ہیں لیکن وہ وجود کے موجود ہونے کو نزول سے تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ گمراہی کا آغاز حلول اور نزول کا باریک فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوا، اسی بنیاد پر صوفیائے محققین نے تنزلاتِ ستہ کی ترتیب دی ہے، مسئلۂ وحدۃ الوجود کے ساتھ اس نقشہ کو رکھ کر جب آپ اس مسئلہ پر غور کریں گے تو بات بالکل صاف ہوجائے گی، حضرت محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ نے وحدۃ الوجود کی حقیقت بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ خالق کتنا ہی نزول کرے مخلوق نہیں ہوسکتا اور مخلوق کتنا ہی عروج کرے خالق نہیں بن سکتی، مانا کہ وجود میں خالق اور مخلوق دونوں مشترک ہیں لیکن ایک واجب الوجود ہے دوسرا ممکن الوجود، واجب سے ممکن کا اتحاد ناممکن

ہے۔ اور پھر اگر وہ واجب الوجود ہے تو شانِ لطافت کے ساتھ ہے اور بعض مخلوق میں بھی لطافت پائی جاتی ہے، اگرچہ وہ لطافتِ مخلوق بھی ذاتی نہیں جیسا کہ ہوا۔ تو اگر کوئی یہ کہے کہ مٹی اور پانی کو ملا کر گوندھ دو، دونوں جسم ہیں، اگرچہ پانی میں مٹی کے مقابلہ میں لطافت ہے مگر دونوں مل جاتے ہیں لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ہوا کو بھی اس مرکب میں ملا دو تو یہ مشکل ہے کیونکہ وہ مٹی اور پانی کے مقابلہ میں لطیف تر ہے۔ معلوم ہوا کہ جب کثیف اور لطیف کا اتحاد ناممکن ہے تو خداوند تعالیٰ تو اس قدر لطیف ہے کہ جو قیاس و گمان سے باہر ہے، پھر کس طرح کثیف اور سب سے زیادہ لطیف کا ایک ہونا صحیح ہو سکتا ہے لیکن اس عدمِ اتحاد سے یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں کہ واجب اور ممکن میں غیریت کلی ہے۔ بس اس حقیقت کو اس طرح سمجھو کہ

نیستی عین و نہ غیری ایں سخن را صدق داں سایۂ خود چوں نہ گوئی عین و نے غیر اے جواں

ترجمہ: نہ تم اس کا عین ہو اور نہ غیر ہو، اس بات کو سچ اچھی طرح سمجھ لو، جس طرح کہ تم اپنے سائے کو نہ اپنا عین کہہ سکتے ہو اور نہ غیر۔

تشریح: اس سے پہلے شعر میں مصنف نے فرمایا تھا کہ تم کو عینیت کا مغالطہ نہ ہو جائے، اور یہ بھی نہ سمجھو کہ غیریت کلی ہے بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ جس طرح تمہارا سایہ ہے کہ اس کو نہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ تمہارا بعینہٖ وجود ہے، کیونکہ اگر اس کو مارا جائے تو تمہارے جسم کو کوئی تکلیف نہیں پہونچتی، سائے پر اگر پانی ڈالا جائے تو تمہارا وجود نہیں بھیگے گا، معلوم ہوا کہ یہ سایہ تمہارے وجود سے الگ ہے، لیکن اگر اس کو یہ کہا جائے کہ کسی دوسری شئے کا سایہ ہے تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں، آخر کار ہے تو تمہارا ہی سایہ۔ بس اسی طرح ہمارا وجود بھی ہے۔ لیکن امکان کے دائرہ میں محدود ہے، جو اپنے وجود میں واجب الوجود کا محتاج ہے، گویا کہ اسی کے وجود سے وجود پذیر ہوا ہے، بس یہی حقیقت ہے۔

یک مثال دیگر آرم پیش تو اے باخبر بار و بر عین است یا غیر از درختِ بارور

ترجمہ: اے باخبر! ایک مثال اور میں تیرے سامنے بیان کرتا ہوں، کسی پھل دار

درخت کے پھل اور پھول اس درخت کا عین ہیں یا غیر،

تشریح: یہاں مصنف عینیت اور غیریت کے درمیان کی ایک دوسری مثال بیان کر رہے ہیں، کہ دیکھو کسی پھل دار درخت، جیسے آم کا درخت ہے، اس کے پھل اور پھول کو اگر یہ کہیں کہ یہ بعینہٖ آم کا درخت ہے تو غلط ہوگا اور اگر کہیں کہ یہ آم کے درخت کا غیر ہے تو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ یہ پھل اور پھول تو اسی آم کے درخت کے ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پھل اور پھول اس درخت کی ان صلاحیتوں کا ظہور ہے جو اس درخت میں پوشیدہ تھیں اور ان صلاحیتوں کا ظہور اس انداز میں ہو رہا ہے کہ وہ نہ عین درخت ہیں اور نہ درخت کا غیر ہیں۔

باز بنگر موجِ دریا عین باشد یا کہ غیر　　این چنیں خود را بدانی در ہمہ احوال سیر

ترجمہ: تم پھر غور کرو کہ موج دریا، دریا کی عین ہے یا غیر، اسی طرح تم خود کو سمجھو، سیر کے تمام احوال میں۔

تشریح: جس طرح موج ہے کہ دریا کے پانی کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے لیکن اسکی ظاہری شکل کی وجہ سے اس کا نام دریا نہیں اور نہ اس کا نام پانی ہے بلکہ اس کو موج کہتے ہیں اور اس موج کا وجود دریا کی حقیقت یعنی پانی سے ہوتا ہے اور پھر بھی موج اس دریا کی حقیقت میں یعنی پانی میں مل جاتی ہے، کیونکہ اس کی حقیقت بھی پانی ہے لیکن ظاہری شکل و صورت کی وجہ سے دریا سے الگ معلوم ہوتی ہے، تو جس طرح ہم اس موج کو نہ عین دریا کہہ سکتے ہیں اور نہ غیرِ دریا کہہ سکتے ہیں، اسی طرح وجودِ انسانی جو کہ امکان کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے واجب الوجود کے وجود سے ظہور پذیر ہے لیکن اس وجود امکانی کو واجب الوجود کا عین قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ غیر بلکہ ممکن الوجود جہاں جہاں اور جن جن صورتوں میں موجود ہوگا اسی واجب الوجود سے اکتساب فیض کر رہا ہوگا۔

یہاں پر بھی مصنف تین مثالیں پیش کر رہے ہیں اور تیسری مثال پر مشتمل شعر کے دوسرے مصرعہ میں لفظ "در ہمہ احوال سیر" فرما کر اس نکتہ کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ سالک کو مراقبہ کی

حالت میں تین قسم کی سیر حاصل ہوتی ہے، سب سے پہلے سَیْر مِنَ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ توفیق مرحمت فرمائی جاتی ہے کہ وہ انفس و آفاق میں غور کرے، یہاں سے گویا آغازِ سفر ہوتا ہے، دوسری سَیْر اِلَی اللہ ہے، گویا پختہ یقین کرے کہ کوئی ذات حقیقت میں ایسی ہے جو کائنات کی ہر شئے میں متصرف ہے اور ہر شئے میں اسی کا جلوہ ہے، اسی کی تلاش کے لئے یہ سفر کر رہا ہے اور تیسرا اور آخری درجہ سَیْر فِی اللہ ہے یعنی اس کے جلووں کو دیکھ رہا ہے، پس مراقبہ میں سب سے پہلے مکاشفہ ہوتا ہے اور یہ سَیْر مِنَ اللہ ہے اور مکاشفہ کے بعد مشاہدہ ہوتا ہے، یہ سَیْر اِلَی اللہ ہے اور پھر معائنہ ہوتا ہے، یہ سب سے بلند درجہ ہے اور یہی سَیْر فِی اللہ ہے، تمام احوالِ سیر کا مطلب یہی ہے، گویا تم کو بحالتِ مراقبہ یقین کی پختگی میں مزید اطمینان کی کیفیت حاصل ہونی چاہیئے۔

موج شد نامش مگر از اصلِ دریا کے جداست　　　تو ز بحرِ وحدتی یک موج نامت عبد خواست

ترجمہ: اس کا نام موج پڑ گیا ہے مگر یہ دریا کی حقیقت سے جدا کب ہے، تو بھی وحدت کے سمندر میں ایک موج کی طرح ہے جس کا نام عبد پسند کیا گیا ہے۔

تشریح: ظہور میں فرق کی وجہ سے جس طرح پانی کے ایک جزو کا نام موج رکھا گیا ہے حالانکہ موج اور پانی کی حقیقت ایک ہے مگر اعتبارات میں فرق ہے وَلَوْلَا الْاِعْتِبَارَاتُ لَبَطَلَتِ الْحِکْمَۃُ یعنی اگر اعتبارات کا لحاظ نہ کیا جاتا تو حکمت بیکار ہو جاتی پس انسان بھی حقیقتِ جامعہ کے لباس میں صفاتِ باری کا ایسا مجموعہ ہے جس کا ظہور بحرِ وحدت سے ہی ہوا ہے مگر دائرۂ امکان میں آنے کی وجہ سے یہ ممکن الوجود کی صفت سے متصف ہوا اسی لئے اس کا نام بھی بحرِ وحدت سے ظہور پذیر ہونے کے باوجود عبد رکھا گیا۔

در میانِ خویش و او برگیر فرقِ بندگی　　　بندہ را شد بجا کے غیر از بیچارگی

ترجمہ: اپنے اور اس کے درمیان بندگی کا فرق قائم رکھ، بندے کیلئے عاجزی اور بیچارگی کے علاوہ اور کوئی بات درست بھی نہیں ہے

تشریح: کائنات کی ہر شے میں اسکے وجود کے ثبوت میں مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے واضح ترین مثالیں دیکر حقیقت کو عیاں کر دیا اور یہ بھی تبلادیا کہ تمام موجودات کا وجود بھی اسی کے وجود سے فیضان حاصل کر رہا ہے، انسان بھی چونکہ تمام صفات کا مظہر ہے اس کا وجود بھی اسی کے وجود سے ہے مگر ان تمام باتوں کے باوجود انسان میں "اصل" عبدیت ہے اور ذاتِ مطلق میں شانِ معبودیت ہے، اس فرق کو از اول تا آخر ملحوظ رکھنا پڑے گا، ؎ گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی۔

یاد رکھو کہ ذرا سی لغزش اس مقام پر ہو جانے سے منزل کتنی دور ہو جائے گی، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس لیۓ انسان کو جب اللہ تعالیٰ نے عبدیت کے منصب سے نوازا ہے تو اس کو اس شان کا اظہار بھی مکمل طور پر کرنا چاہیئے اور یہی وجہ ہے کہ بندگی کے تقاضوں کو پورا کرنا ہی اس کے لیۓ معراجِ کمال ہے، چنانچہ اسی طرف قرآن حکیم میں اشارہ فرمایا گیا ہے سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ الخ۔

تو ز دریا قطرۂ آبی بظرفِ خاکدان   کو ز دریا نیست عین و لیک آب از عین دان

ترجمہ: تو بھی اس مٹی سے بنے ہوۓ جسم کی صورت میں ایک پانی کے قطرے کی مانند ہے اگرچہ یہ قطرہ عین دریا نہیں ہے لیکن اس قطرہ کا پانی اس کے عین سے ہے

تشریح: یعنی تیرا یہ جسم جو مٹی سے تیار ہوا ہے یہ بھی بحرِ وحدت کا ایک قطرہ ہے کیونکہ اس وجود کی حقیقت تو وجودِ حقیقی سے قائم ہے اور وجودِ حقیقی تو صرف ایک ہی ہے باقی تمام موجودات اسی وجود سے وجود پذیر اور عیاں ہیں لیکن جس طرح کہ قطرہ دریا کا ایک جزو ہے اور پانی کے ایک قطرے کی حقیقت اور سمندر جو لا محدود قطرات کا مجموعہ ہے اس کی حقیقت ایک ہے مگر اس کے باوجود قطرہ کو دریا نہیں کہہ سکتے، اس لیۓ کہ ظاہری طور پر قطرہ اور دریا کی شکل بدلی ہوئی ہے اور اعتبارات کی تبدیلی سے احکام بھی بدل جاتے ہیں، لہٰذا مُتَّحِدْ فی الحقیقت ہونے کے باوجود قطرے اور دریا

میں ظاہری شکل کی تبدیلی کی وجہ سے عینیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

تو مثالِ حرف گشتی از سیاہی اے پسر ذاتِ حرفے را نگر عین سیاہی سر بسر

ترجمہ: تیری مثال سیاہی سے لکھے ہوئے حروف کی طرح ہے، حرف کی ذات کو دیکھو کہ وہ از اوّل تا آخر سیاہی سیاہی ہے۔

تشریح: یہاں پر حقیقتِ انسانیہ کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں کہ تم نہ عین ذات ہو اور نہ ذات کا مطلق غیر ہو بلکہ اس ذات سے تمہاری نسبت ایسی ہے جیسے سیاہی سے لکھے ہوئے حروف کہ ان تمام حروف کا وجود سیاہی کے وجود سے ہوا اور حروف کی ظاہری شکل وصورت میں شروع سے آخر تک سیاہی موجود ہے گویا حروف اور سیاہی کی حقیقت بالکل ایک ہے جس شئے سے حروف نے جسمانی صورت اختیار کی وہ شئے بعینہ سیاہی ہے مگر اس کے باوجود سیاہی کو حروف نہیں کہتے، کیونکہ ظاہری شکل بدل گئی ہے اس لئے اعتبارات بدل گئے اور اعتبارات بدلنے سے احکام بھی بدل گئے، تم حروف کی طرح ہو کہ تمہارے وجود میں صرف اسی کا جلوہ ہے مگر اس کا عین نہیں کہلا سکتے ہو۔

یا کہ ہمچوں شمع گشتے روشن و بنگر عیاں از یکے صد چند دیگر نیست نقصانے دراں

ترجمہ: یا وہ ایک روشن شمع کی مانند ہے جس سے ظاہری طور پر تم دیکھو کہ ایک شمع سے سینکڑوں شمعیں روشن کی جائیں لیکن اس ایک میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

تشریح: اس سے پہلی دو مثالوں میں ذات واجب الوجود اور ممکن الوجود میں لاعینیت ولاغیریت کی تشریح کی گئی تھی، مگر مثالوں سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ جب قطرہ کو سمندر سے الگ کیا گیا، تو سمندر میں ایک قطرہ کی کمی ہوئی اور اسی طرح جب سیاہی سے حروف لکھے گئے تو سیاہی کی ذات میں بھی رفتہ رفتہ کمی ہوتی چلی جائے گی، ان مثالوں سے کہیں ذہن میں یہ بات نہ پیدا ہو جائے کہ موجودات کی تخلیق سے اور ان میں جلوہ گر ہونے

کی وجہ سے کہیں ذاتِ مطلق میں تو کوئی کمی نہیں ہوئی، فرماتے ہیں کہ اس کی ذات ازلی وابدی، کمی وبیشی سے پاک ہے، جس طرح ایک روشن شمع سے سینکڑوں ہزاروں شمعیں جلاؤ تو اس ایک شمع کی ذات میں یا صفات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، اسی طرح تمام انوار اسی کے نورِ ذات سے مستفاد ہیں لیکن اس ذاتِ مطلق کا نور ازلی وابدی الآن کما کان یعنی جس طرح پہلے تھا اب بھی اسی شان کے ساتھ جلوہ فگن ہے

راست دانی ایں سخن را نام شد علم الیقیں　　　سِرِّ مشغولی شنو اکنوں بگویم ایں چنیں

ترجمہ: اس تمام گفتگو کا نام علم الیقین ہے، اس کو تم سچ مانو، اب میں تم کو اس شغل میں مشغول ہونے کا طریقہ بتلاتا ہوں، غور سے سنو!

تشریح: یعنی یہ تمام باتیں جو تم نے اس عنوان کے تحت پڑھی ہیں اس سے صرف علم الیقین حاصل ہوگا لیکن صرف کتاب پڑھ کر علم الیقین حاصل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں جب تک اس یقین کو عمل سے ظاہر کیا جائے اور قلب میں راسخ نہ کیا جائے علم الیقین تو منزل کی طرف سفر کی ابتداء ہے اور عین الیقین شاہراہ سفر ہے، منزل حق الیقین ہے جب تک منزل نہ ملے اس وقت تک عقلمند حضرات سفر جاری رکھتے ہیں۔

وجہِ خود بنگر دریں مرآتِ ظاہر اے پسر　　　پس مر او را دور کن ایں عکس را در دل نگر

ترجمہ: اے سالکِ طریقت اپنے چہرہ کو اس ظاہری آئینے میں دیکھ اور پھر اس کو بھی مٹا دے اور اس عکس کا اپنے دل میں نظارہ کر۔

تشریح: یہاں پر مصنف اس تمام گفتگو کو ختم کر کے فرماتے ہیں کہ جب تجھ کو اپنے وجود کی اصل حقیقت اور ترکیبی اجزاء اور ظاہری صورت کی تفصیلات معلوم ہوگئیں جو کہ مقصود بالذات نہیں تھیں بلکہ مقصود کی طرف رہبر کی حیثیت رکھتی تھیں تو اب اصل منزل کی یافت کی طرف قدم اس طرح رکھو کہ مراقبہ کی صورت میں تم یہ خیال کرو کہ تمام جہان صفاتِ خداوندی کا نمونہ اور مظہر اس طرح ہے جس طرح دودھ میں مسکہ، یا گرم پانی

میں آگ کی خاصیت، یا پھول میں خوشبو، اور اس کا بھی یقین ہو کہ تمھاری ذات بھی اسی کے حکم سے موجود ہے، اس کا مکمل اختیار تمھاری ہر شے پر ہے، جب یہ تصور قائم ہو جائے گا تو تمام کائنات کی ہر شئے میں تمکو اس کی تجلّیات کا مشاہدہ ہونے لگے گا، تجلّیات کے مشاہدہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ نور یا روشنی نظر آنے لگے بلکہ اس حقیقت پر عین الیقین کا درجہ حاصل ہو جائے کہ خداوند تعالیٰ کی تمام صفات تمام مظاہر میں موجود ہیں، جس طرح گرم پانی میں اس بات کا یقین ہے کہ اگر ہاتھ ڈالیں گے تو ہاتھ جل جائے گا، برف پر ہاتھ رکھیں گے تو ٹھنڈا ہو جائے گا، پھول میں خوشبو کی طرح اس کی قدرت پوشیدہ ہے، گلاب کے پھول میں جس طرح خوشبو کا یقین ہے اسی طرح ہر شئے میں اس کی استعدادی خاصیت کے مطابق اسی ذات پاک کا جلوہ موجود ہے، بہر حال جب یہ تصور قائم ہو جائے تو پھر اس حقیقت کو خیال کرو کہ یہ تمام صفات میرے قلب پر نزول کر رہی ہیں اور اس کی وسعت بھی صفات کی طرح لامحدود ہوتی جا رہی ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل خاص سے جب کوئی سالک یہاں تک پہنچ جائے گا تو پھر اس کو وہ کیفیات حاصل ہوں گی جن کو بیان کرنے کی نہ اجازت ہے اور نہ قدرت، اس مقام پر آکر تمام مظاہر سے یہاں تک کہ اپنی ذات سے بھی گذر جائے گا اور اس کو فناء سے بھی رستگاری ہو جائے گی، صرف اسی کا جلوہ نظر آنے لگے گا جو مقام بقاء ہے اور یہی منزلِ مقصود ہے۔

در بیانِ قلبِ مومنین

مومنین کے قلب کا بیان

ھی نگر آئینہ باری است قلبِ مومنین   روئے خود دیدن دراں باشد مگر عین الیقین

ترجمہ: غور کرو کہ ایمان والوں کا دل اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا آئینہ ہے اور اس میں اپنی صورت کا تصور کرنا عین الیقین ہے

تشریح: اس سے پہلے جسم انسانی کے اجزائے ترکیبی کا بیان گذر چکا ہے جس میں متعدد مثالوں کے ذریعہ اس بات کی مدلّل وضاحت کردی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کس انوکھے انداز سے جسم انسانی کو ظاہری اور باطنی طور پر کنٹرول کر رہی ہے۔ قلب مومنین کے عنوان کے تحت یہ بتلانا مقصود ہے کہ جسمِ انسانی میں اس قوتِ متصرفہ کا مرکز کہاں ہے قلبِ مومن آئینۂ تجلیاتِ باری کیوں ہے؟ قلب میں اپنی صورت دیکھنے کا کیا مطلب ہے اور اس سے فائدہ کیا ہے؟ مجموعی اعتبار سے مختلف انداز میں دلائل کے ساتھ یہ تمام باتیں اس عنوان میں بیان کی گئی ہیں۔

صوفیاء حضرات نے صحت جسمانی اور قوتِ روحانی کا مرکز قلب کو قرار دیا ہے اور اس کی چار قسمیں بیان کی ہیں قلبِ مدوّری، قلبِ صنوبری، قلب عنبری، قلب نیلوفری"

قلبِ مدوّری کا مقام اُمّ الدّماغ ہے، قلب صنوبری کا مقام سینے کے بائیں طرف، قلب عنبری کا مرکز جگر، اور قلب نیلوفری کا مقام معدہ کے نیچے قرار دیا ہے، قلب کی اس انداز میں جو تقسیم کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح قلوب کا مقام الگ الگ ہے، اسی طرح ان کا کام بھی الگ الگ ہے، قلبِ مدوّری کا کام قلب صنوبری کو ہدایات بھیجنا ہے کیونکہ حواس خمسۂ ظاہرہ کے ذریعہ جو معلومات مہیا ہوتی ہیں وہ سب دماغ کے ایک حصے میں جمع ہوتی ہیں، وہاں سے اپنے مقصد کی بات کو قلب مدوّری منتخب کرکے

قلبِ صنوبری یعنی مضغہ کو بھیجتا ہے، آپ کو یاد ہوگا کہ شغلِ ہشت رکنی، اور دیگر اشغال میں ناف سے یعنی قلبِ نیلوفری سے سانس کھینچ کر اُمّ الدماغ تک پہونچایا جاتا ہے، پھر وہاں سے نزول کر کے ناف تک واپسی ہوتی ہے یعنی لفظِ اللہ جو کہ اسمِ ذات ہے اس میں صفات کا ملاحظہ نزول و عروج کے طریقہ پر کیا جاتا ہے، سانس کو اُمّ الدماغ یعنی قلبِ مُدَوَّری میں لے جانے کا مطلب یہی ہے کہ وہاں سے پھر تمام لطائف تک اس کا فیضان پہونچے۔ یہ تفصیل اس لیے لکھنی پڑی کہ صوفیاء حضرات نے جس قلب کو قوتِ متصرفہ کا مرکز قرار دیا ہے وہ قلبِ صنوبری ہے اور جہاں سے تصرف کیا جاتا ہے وہ قلبِ مدوّری یعنی اُمّ الدماغ ہے۔ لفظ قلب کو اگر مجمل طور پر بیان کیا جاتا تو بنیادی بات ہی غلط ہو جاتی ہے کیونکہ عام طور سے مراد قلب سے قلبِ صنوبری ہی ہوتا ہے جبکہ قلبِ مُدَوَّری الگ ہے اور قلبِ صنوبری الگ ہے، صوفیاء حضرات کی نظر چونکہ مقصد پر ہوتی ہے اس لیے انھوں نے قلوب کی تقسیم تو کر دی لیکن قلب کو عام طور پر مجملاً بیان فرما کر قلبِ صنوبری کو جو قوتِ متصرفہ کا مرکز ہے اپنا موضوع بنایا ہے اور اسی کی اصلاح پر زیادہ توجہ فرمائی ہے، اگر یہ باریک بینی اُن کے پیشِ نظر نہ ہوتی تو قلوب کی تقسیم کی کیا ضرورت تھی، قرآنِ پاک میں جو قلوب کی تقسیم قلبِ منیب، قلبِ شہید، اور قلبِ سلیم کہہ کر فرمائی گئی ہے وہ دراصل قلبِ صنوبری کی صفاتی اعتبار سے تقسیم ہے ہم جہاں مطلق "قلب" استعمال کریں گے وہاں "قلبِ صنوبری" ہی مراد ہوگا۔

قلب کو آئینۂ تجلیات قرار دینے کے دو سبب ہیں، ایک ظاہری، ایک باطنی، ظاہری سبب یہ ہے کہ جس طرح قدرتِ خداوندی عالمِ کبیر یعنی کائنات کے نظام کو ایک ترتیب کے ساتھ چلا رہی ہے کہ کائنات میں جس قدر موجودات ہیں اُن کی استعداد اور ضرورت کے مطابق ان تمام کو اسبابِ حیات فراہم کرتی ہے اور اسی قدرت اور تربیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی صفت رَبُّ العالمین ہے اسی طرح جسمِ انسانی جو عالمِ صغیر ہے اس میں قلب بھی یہی کام انجام دیتا ہے کہ جسم کے تمام اعضاء کو اُن کی استعداد اور ضرورت کے مطابق خون سپلائی کر کے

اسبابِ حیات فراہم کرتا ہے۔ اس لئے جس طرح کائنات یعنی عالم کبیر میں قدرتِ خداوندی جلوہ گر ہے اسی طرح عالم صغیر میں قدرتِ خداوندی کا ظہور قلب کے ذریعہ ہے، لہٰذا قلب ہی تجلیاتِ باری کا مرکز قرار پایا۔

باطنی اعتبار سے قلب کو آئینۂ تجلیات قرار دینے کا سبب یہ ہے کہ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو بے نیاز ہے اس کو بندے کے یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے اور کس طرح یاد کرتا ہے اس کی کیفیت تو معلوم نہیں، البتہ اس کا کرم ہے کہ احکم الحاکمین ہونے کے باوجود اپنے بندے کو یاد فرماتا ہے، اس ذکر کی کیفیت کہ خداوند تعالیٰ اپنے بندے کو کس طرح یاد کرتا ہے حدیثِ پاک سے اس طرح ہوتی ہے کہ "جب بندہ مجھ کو اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کو اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور اس کو ثواب دیتا ہوں اور بذاتِ خود اسکا متولّی بن جاتا ہوں جس کو فرشتے بھی نہیں جانتے"۔ اس حدیثِ پاک سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ بندہ کا ذکر جس طرح کا ہوگا اس کا خالق بھی اُس کو اُسی انداز میں یاد کرے گا اور جب دونوں طرف سے ذکر ہوگا تو گویا یہ مذاکرہ کی صورت ہوگئی اور مذاکرہ میں متکلّم اور مخاطب آمنے سامنے ہوتے ہیں اس لئے مراقبہ میں تصوراتی اعتبار سے قلب میں ذکر کرنے سے دونوں قلوب آمنے سامنے ہوگئے، قلبِ خداوندی کی حقیقت تو معلوم نہیں، البتہ یہ معلوم ہے کہ جس طرح وہ ذاتِ پاک نور ہی نور ہے اسی طرح سے اس کا قلبِ پاک بھی نور ہی نور ہوگا اور اس نور کے محاذ میں جو قلب بھی آئے گا وہ بھی مرکزِ نور و تجلیات بن جائے گا، ایسا مرکز جس پر تجلیاتِ ذات براہِ راست جلوہ فگن ہوں گی، اسی ذکرِ قلبی تصوراتی کی وجہ سے مومن کا قلب بھی آئینۂ تجلیاتِ باری قرار پایا، هٰكذا قال مرشدی۔

قلب میں اپنی صورت دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ جب ذکر کے ذریعہ تصفیۂ قلب ہو جائے اور کیفیات کا ظہور ہونے لگے اُس وقت مرشد حسبِ ضرورت مراقبات کی تعلیم دیتا ہے اور

اشغال کی مشق کرائی جاتی ہے۔ جب مراقبہ کی اجازت عطا ہو جائے تو بوقتِ مراقبہ سالک تصور کرے کہ قلب ایک آئینہ ہے اور اس میں میرے جسم کی مثالی صورت موجود ہے اور اس جسم مثالی پر اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا عکس پڑ رہا ہے۔

اس شغل سے فائدہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ یہ تصور اس قدر مستحکم ہو جائے گا کہ مرکز نگاہ صرف اس کی تجلیات ہو جائیں گی اور یہ محسوس ہونے لگے گا کہ میرا وجود یعنی جسم مثالی مٹتا جا رہا ہے اور نیستی کے حجابات میں محو ہوتا جا رہا ہے، صرف اسی کی ذات کی تجلیات باقی ہیں تو اپنے وجود کی فنائیت حاصل ہو جائے گی جس کے ذریعہ مقام بقاء کا حصول ہو جائے گا جو مقصود ہے اَللّٰھُمَّ ارْزُقْ لَنَا۔

در حقیقت ظاہر و باطن توئی، فانی توئی   در بقائے حق بمانی جاوداں باقی توئی

ترجمہ: حقیقت میں ظاہر و باطن بھی تو ہے اور فانی بھی تو ہی ہے اور جب بقائے حق کے ساتھ متصف ہو جائے گا تو ہمیشہ باقی رہنے والا بھی تو ہی ہوگا۔

تشریح: یہاں پر مصنف رحمۃ اللہ علیہ، سالک سے مخاطب ہو کر اس کے لئے چار صفات کا اثبات کر رہے ہیں نمبر۱ ظاہر، نمبر۲ باطن، نمبر۳ فانی، نمبر۴ باقی، یہ بات تو عیاں ہے کہ ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، ذاتِ خداوندی ازلی و ابدی ہے اس لئے صفات بھی ازلی و ابدی ہیں، وجود سالک تو ازلی ابدی نہیں پھر کس طرح اس کو ان صفات سے متصف کرنا صحیح ہوگا، اور اگر ان صفات سے متصف کر دیا جائے تو پھر مصنفؒ سالک کو 'فانی' بھی کہہ رہے ہیں، لہٰذا صفاتِ ازلیہ و ابدیہ سے متصف ہو کر سالک فانی کس طرح ہوگا، اور اگر فانی بھی مان لیا جائے تو پھر دوسرے مصرعے کی وضاحت کے مطابق باقی کس طرح ہوگا کیونکہ فانی اور باقی دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، مصنفؒ نے ان مشکل باتوں کو جس قدر جامع اور مختصر انداز میں بیان کیا ہے یہ ان کی خداداد بصیرت پر شاہد عدل ہے۔

اس کی تشریح بہت سادہ اور مختصر الفاظ میں اس طرح ہے کہ ذات کا ظہور صفات

کے رنگ میں ہے اور کائنات کی تمام اشیاء اس کی صفات کی مظہر ہیں، ان مظاہر میں اس ذاتِ مطلق کی صفات مختلف انداز میں جلوہ گر ہیں لیکن حقیقتِ جامعہ یعنی انسان میں صفات کے ظہور کی یہ نسبت، دیگر اشیاء کائنات کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ تمام اشیاء مظہرِ صفاتِ باری ہیں اور انسان مظہرِ ذات ہے، اسی نسبتِ ظہور کی قربت اور کثرت کی وجہ سے اس کو بھی ان صفات سے متصف کر دیتے ہیں جو اصل کی صفات تھیں، لہٰذا ظاہر و باطن جو ذات کی صفات تھیں وہ مجازاً مظہرِ ذات کی صفات بھی ہو گئیں۔

لیکن اس صراحت سے کہیں یہ شبہ نہ ہو جائے کہ جو وہ ہے وہ ہم ہیں، اس لئے مصنف نے فانی تو ئی کہہ کر اس شک کو دور کر دیا، کہ ظاہر و باطن کی صفت سے متصف ہونے کے باوجود بھی تم فانی ہو اس لئے کہ تمھاری کوئی بھی صفت ذاتی نہیں ہے ورنہ حلول کا معاملہ درپیش ہو جاتا جو کہ سراسر باطل ہے کیونکہ یہ اصول مسلّمہ ہے کہ خالق چاہے جس قدر بھی نزول فرمائے یعنی تجلیاتِ باری کا کسی بھی مظہر میں چاہے جتنا ظہور ہو خالق، خالق ہی رہے گا، مخلوق نہیں ہو سکتا اور مخلوق اس کی تجلیات کی کتنی ہی اعلیٰ درجہ پر مرکز بن جائے مخلوق ہی رہے گی، خالق نہیں بن سکتی۔ اس لئے مصنف نے اس صفات کے مظہر کو وجودِ انسانی کے اعتبار سے فانی کہہ کر واجب الوجود اور ممکن الوجود کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ دیا۔ اور باقی اس وجہ سے کہا کہ جب مراقبہ کے ذریعہ قلبِ سالک میں یہ تصوّر مستحکم ہو جائے کہ اس جہانِ رنگ و بو میں صرف اُسی کا جمال جلوہ گر ہے، اُس کی ذاتِ واجب الوجود کے سوا کون و مکان میں کسی دوسرے کا وجود ہی نہیں، ہر شئے اُسی کا پتہ دے رہی ہے، ہر نشانی اس بے نشان کی حقیقت کی آئینہ دار ہے، میرا وجود فانی ہے، میری ہستی نیستی کی صفت سے متصف ہے تو اس وقت سالک کو اپنی ذات کی فنا حاصل ہو کر مقامِ بقاء تک رسائی ہو جائے گی، اِس اپنی ذات کی فناء اور بقائے حق کے تصوّر کو، بقائے حق کے ذریعہ جاودانی ہونا کہتے ہیں، اس مقام پر سالک باعتبارِ حقیقت بقاء سے متصف کیا جاتا ہے، لہٰذا اس میں شانِ بقاء بھی پائی گئی۔

می نگر اندر خلقتم للابد آمد حدیث — مصطفےٰ فرمود اینجا شک نیارد جز خبیث

ترجمہ: اس حدیث پاک میں کہ "تم ابد کے لئے پیدا کئے گئے ہو" غور کرو، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک میں بدطینت ہی شک کرے گا۔

تشریح: یہاں پر ایک حدیثِ پاک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف نے سالک کی ابدیت اور شانِ بقاء سے متصف ہونے پر دلیل پیش کی ہے، وہ حدیث پاک یہ ہے اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَ اِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ یعنی دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو، عالم آخرت چونکہ ابدیت سے تعلق رکھتا ہے اس لئے مصنف نے لِلْاٰخِرَۃِ سے لِلْاَبَدْ مراد لے کر مفہوم حدیث اخذ کیا ہے اس سے پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں جاودانی کی صفت سے مومن کو اس لئے متصف کیا ہے کہ یہ تمام کائنات وجود کے اعتبار سے فانی ہے لیکن ذکر و فکر، اعمالِ حسنہ اور اتباعِ سنت کے ذریعہ اگر تعلق مع اللہ استوار ہو جائے تو ابدیت کی تکمیل احسن طریقہ پر اس انداز میں ہوگی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت میں اُن کا داخلہ ہو جائے گا جہاں تجلیاتِ خداوندی کے نظاروں سے تسکین حاصل کرتے رہیں گے، اس سے بڑھکر ابدیت کا اور کیا تصور ہو سکتا ہے کہ محبوب کا وصل ہو اور وہ بھی ہمیشہ کے لئے۔

اگرچہ ظاہری طور پر ابدیت کی صفت سے کفار و مشرکین بھی متصف ہیں مگر عذابِ جہنم کی تکالیف میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ان کی ابدیت ناقص ہے اس لئے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب ان کو موت نہیں آئے گی پھر بھی وہ موت کی تمنا کریں گے اور یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا ان کی زبان پر ہوگا، اس لئے صحیح معنی میں اس حدیثِ پاک کے مصداق ایمان والے ہی ہونگے

ایں تنت را چار نام آمد چہ مقرون و لفیف — یک فنا و یک بقا و یک کثیف و یک لطیف

ترجمہ: تمہارے اس بدن کے قربت اور ترتیب کے اعتبار سے چار نام ہیں، ایک فانی، دوسرے باقی، تیسرے کثیف، چوتھے لطیف،

تشریح: یعنی جسمِ انسانی تو ایک ہی ہے مگر صفات کے اعتبار سے اس کے چار نام ہیں، یہ

چاروں صفات ایک خاص ترتیب کے ساتھ اس جسم سے مقرون یعنی ملی ہوئی ہیں، ایک صفت تو اس کی وجودِ ظاہری کے اعتبار سے فنا ہے کہ عمرِ طبعی مکمل ہونے پر یہ جسم معدوم و فنا ہو جاتا ہے یا اس کی فنا تصوراتی اعتبار سے ذاتِ واجب الوجود کے مقابلہ میں بحالتِ مراقبہ ہو یعنی سالک اپنے وجود کو اس کی تجلیات کے سامنے کالعدم محسوس کرے، جب اس کو یہ کیفیت مکمل طور پر حاصل ہو جاتی ہے تو اس وقت سالک کو فنائے تام حاصل ہو جاتی ہے۔ اس درجہ میں اس کو فانی کہتے ہیں، اس کے بعد جب وہ بقار کی صفت سے متصف ہو کر مقامِ بقار تک پہونچ جاتا ہے تو اس کو باقی کہتے ہیں۔ اس طرح اس جسم کی دو صفات کا ثبوت ہوا۔ اور فنائے تام کا حاصل ہونا اور مقامِ بقار پر پہونچنا اسی وقت ہوتا ہے جب گناہوں کی کثافت سے سالک اپنے دل و دماغ اور جسم کو محفوظ رکھے اور ذکر و فکر کے ذریعہ قلبی کثافت کو دور کردے اور اس میں وہ لطافت پیدا کرے جس کے ذریعہ روح سے اس کا تعلق مضبوط ہو جائے، روح چونکہ لطیف ہے اس لئے اس سے تعلق جب ہی مضبوط ہوگا جب لطافت کا غلبہ ہوگا اور جب لطافت کے اثرات اسکے تمام جسم پر قائم و دائم ہو جائیں گے تو یہ لطیف ہونے کی صفت سے متصف ہوگا تو اس کثافتِ قلبی کی بنا پر اس کو کثیف اور روح سے تعلق مضبوط ہونے کی بنا پر اس کو لطیف کہتے ہیں۔

ایں کثیفے را نگر در دل مدام و مستدام ۔۔۔ در لطیفے گم شوی تا از خودی خود تمام

ترجمہ: اس کثیف کو ہمیشہ اپنے دل میں پابندی کے ساتھ دیکھو، تاکہ تم اپنی خودی سے گذر کر لطیف میں گم ہو جاؤ۔

تشریح: کثافت کو دور کرنے اور لطافت سے رابطہ مضبوط کرنے کی کیا صورت ہے، اس کو مصنف بیان کر رہے ہیں کہ قلب چونکہ آئینۂ تجلیاتِ باری ہے اس لئے مراقبہ کی صورت میں آئینۂ قلب میں یہ تصور کرو کہ میرا یہ جسمِ کثیف جسمِ مثالی کی صورت میں مجھ کو نظر آرہا ہے اور اس پر تجلیاتِ باری کا عکس پڑ رہا ہے جس سے اس کی کثافت دور ہو کر لطافت پیدا ہوتی جا رہی ہے یہاں تک کہ اس میں مکمل طور پر لطافت پیدا ہو کر روح سے اس کا تعلق اتنا مضبوط ہو جائے

کہ وہ انوارِ الٰہی جو قلبِ سالک پر محسوس ہو رہے ہیں اُن کی لطافت میں یہ جسمِ مثالی جو یک گونہ کثیف ہے یہ بھی کالعدم ہو کر رہ جائے یہی اپنی خودی سے گذر کر لطیف میں گم ہو جانا ہے۔

می نگر ایں عکس خود را روئے حق در دل قریں — گفت احمدؐ قلبِ مومن تختِ ربّ العالمیں

ترجمہ: اپنے اس عکس کو دل میں ہمیشہ جلوہ باری تصور کرو، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کے قلب کو ربّ العالمین کا تخت فرمایا ہے۔

تشریح: یعنی جب تم کو اس مراقبۂ قلب ہی حقیقتِ فنا سے آشنائی ہو جائے تو اس میں جو اپنی صورت تم کو نظر آ رہی ہے اس کو بھی تجلیاتِ باری کا عکس سمجھو، اس لئے کہ جس طرح یہ جسمِ انسانی مظہرِ ذات ہے اور ظاہری طور پر اپنے وجود میں قلب کا محتاج ہے کہ قلب ہی سے تمام جسم اسبابِ زندگی حاصل کرتا ہے اسی طرح باطنی طور پر اس جسم کا نظام قلب کی اس صفت سے غذا حاصل کرتا ہے جس کو لطافت کہتے ہیں اور لطافت کے اتمام کی بنا پر یہ قلب تجلیاتِ باری کا مرکز قرار پایا لہٰذا اس میں جو بھی صورت نظر آ رہی گی وہ صرف تجلیاتِ باری ہو گی، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن کا قلب اللہ تعالیٰ کا تخت ہے اور ظاہر بات ہے کہ تخت پر صرف شہنشاہ ہی کا جلوہ ہوتا ہے تو پھر تمہاری یہ تصویر کیسی؟ یہ حدیثِ پاک دراصل اس سے پہلے شعر کی تائید میں ہے جس میں کہا گیا تھا کہ مراقبہ میں اپنی خودی سے گذر کر لطیف میں گم ہونا ہی مقامِ بقا ہے۔

دل گذرگاہِ حق است ایں گفت احمدِ مصطفٰےؐ — یار اینجا راست بینی یا بہ بینی در خفا

ترجمہ: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دل اللہ تعالیٰ کی گذرگاہ ہے۔ اس جگہ دوست کا جلوہ خواہ براہ راست دیکھو یا پردہ میں دیکھو۔

تشریح: حدیث میں اس سے پہلے قلب کو ربّ العالمین کا تخت فرمایا تھا، اس حدیث پاک میں قلب کو گذرگاہِ باری فرما رہے ہیں، اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ ذاتِ مطلق تو ازل سے ابد تک یکساں حالت میں ہے لیکن اس کی تجلیات کی شان ہر لمحہ اور ہر آن جُدا جُدا

ہے، تمام مظاہرِ کائنات پر اس کی جلوہ فرمائی تجددِ امثال کی طرح ہے، "ایک ہی شئے کا نئے انداز میں ظاہر ہونا لیکن آپس میں بہت زیادہ قریبی رابطہ ہونے کی وجہ سے سابق اور مسبوق میں فرق نہ ہوسکے" یہ تجددِ امثال ہے، جیسے لکڑی کے ایک سرے میں آگ لگا کر اگر آپ گھمائیں تو آگ کا ایک دائرہ سا محسوس ہوگا حالانکہ حقیقت میں یہ آگ کا دائرہ نہیں ہے، صرف لکڑی کے ایک ہی سرے میں آگ موجود ہے مگر تیزی سے حرکت کی وجہ سے دائرہ محسوس ہوتا ہے، یا جیسے چراغ کا تیل بتی کے ذریعہ آہستہ آہستہ جلتا ہے لیکن بظاہر دیکھنے میں تیل کی آمد و رفت معلوم نہیں ہوتی، گویا بتی کے ذریعہ چراغ کی لَو تک تیل کے پہونچنے میں ایسا تسلسل ہے کہ تیل کی رفتار معلوم نہیں ہوتی اور بتی تیل میں بھیگی ہوئی معلوم ہوتی ہے پھر تیل ختم ہوجاتا ہے۔

تجلیاتِ باری بھی اس قدر سرعت اور تسلسل کے ساتھ مظاہرِ کائنات پر جلوہ فگن ہیں کہ ان میں امتیاز نہیں ہوپاتا؛ اسی طرح باطن میں بھی قلبِ سالک پر تجلیاتِ باری ہر لمحہ اور ہر آن نئے انداز میں جلوہ فرما ہو رہی ہیں لیکن شدتِ اتصال کی وجہ سے ابتداء، درمیان اور انتہاء میں فرق کرنا ناممکن ہے، تجلیاتِ باری کے اس تجددِ امثال کی وجہ سے قلبِ مومن کو گذرگاہِ باری سے تعبیر فرمایا ہے۔

براہِ راست اور در پردہ تجلیات کا مشاہدہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تجلیاتِ باری کا مشاہدہ اپنے قلب پر کبھی سالک اپنی ذات کے واسطے سے کرتا ہے کہ پہلے اپنا تصور قلب میں قائم کرکے اس جسمِ مثالی کے حجاب میں اس کی تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہے یعنی اپنے اس وجودِ مثالی کو تجلیاتِ باری سمجھے گا، اور کبھی بغیر واسطے کے مشاہدہ کرتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب مراقبہ میں سالک کو مرتبۂ فنا حاصل ہوجائے، اس مقام کو جہاں تجلیاتِ باری بغیر واسطے کے دیکھتا ہے مقامِ معاینہ کہا جاتا ہے۔

ان مقامات کی ترتیب اس طرح ہوجاتی ہے، سب سے پہلے مراقبہ، اس کے بعد مکاشفہ اس کے بعد مشاہدہ، اس کے بعد معاینہ، محققین نے لکھا ہے کہ ان مقامات میں درمیان کے

دو مقام بہت مشکل ہیں یعنی مکاشفہ اور مشاہدہ کے مقام، مکاشفہ میں اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہیں سالک ایسے حالات کے رونما ہونے سے جو فہم انسانی سے بالاتر ہیں اپنی توجہ ان حالات کی طرف لگادے اس لئے کہ یہ سب ترقی کے لئے معاون تو ہیں مقصود نہیں ہیں، اس طرف سالک کی توجہ مبذول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے غیر مقصود کو مقصود بنالیا، اسی وجہ سے بہت سے حضرات کرامات کے ظہور سے خوف کھاتے تھے، دوسرا مشکل مقام، مقام مشاہدہ ہے جہاں سالک اپنے وجودِ مثالی کا تصور قلب میں قائم کر کے اس ذاتِ پاک کی تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہے، اس مقام پر سب سے زیادہ خوف اس بات کا ہوتا ہے کہ کہیں سالک تجلیات کے نزول کی وجہ سے اپنے وجودِ مثالی کو وجودِ حقیقی نہ تصور کرنے لگے شیطان لعین دشمن ازلی ہے، وہ اس بلند مقام پر انسان کو دیکھنا پسند ہی نہیں کرتا، اس کی پوری جدوجہد اس کے خلاف ہوتی ہے، اس لئے اس مقام پر اس کی پوری جدوجہد اس کے خلاف ہوتی ہے اس لئے اس مقام پر خصوصاً شیخِ کامل کی ضرورت پیش آتی ہے، بلکہ چشتیہ حضرات نے تصورِ شیخ کا طریقہ اسی لئے بتلایا ہے کہ اپنے وجود کو شیخ کے وجود میں گم کر کے اس کے ذریعہ تجلیات کا مشاہدہ کرنے سے تلبیسِ ابلیس سے سالک محفوظ رہتا ہے کیوں کہ شیخ کامل اور مرشد کی بعینہ صورت میں بھی شیطان نہیں آسکتا جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ مبارک میں آنے کی اس کو طاقت نہیں، اسی طرح آپ کے جانشینوں پر بھی عنایتِ ایزدی ہے کہ ان کے روپ میں شیطان نہیں آسکتا، کوئی دوسرا بہروپ تو بنا سکتا ہے، بعینہ مرشد کامل کے روپ میں نہیں آسکتا۔

ایں روایت کرد فاروق از جناب مصطفٰے ۔۔۔ قلبِ مومن ہست افضل تر ز عرشِ کبریا

ترجمہ: حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت بیان فرمائی کہ مومن کا قلب اللہ تعالیٰ کے عرش سے بھی زیادہ فضیلت والا ہے۔

تشریح: قرآن پاک میں ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی (رحمٰن عرش پر مستوی ہے)،

اس آیتِ پاک سے ذاتِ باری کا عرش پر مستوی ہونا تو معلوم ہوتا ہے البتّہ اس کی کیفیت معلوم نہیں، عرش بذاتِ خود ایک مقام ہے اور قلب کا تعلق تو صاحبِ مکان سے ہے، نیز قلب میں معرفتِ ذات کی جو صلاحیت خداوند تعالیٰ نے ودیعت فرمائی ہے عرشِ عظیم میں یہ صفتِ معرفت نہیں، قلب ہی عشقِ الٰہی کا گہوارہ ہے اور قلب ہی کے ذریعہ سالک فنا کے مراتب حاصل کرتا ہے اور مقامِ بقا پر پہونچتا ہے پھر قلب کے بارے میں خداوندِ قدوس کا حدیث میں یہ ارشاد قلب کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ :

گفت باری من نگنجم در سمٰوات و زمیں　　لیک گنجم در دلِ مومن، بدانی بالیقیں

ترجمہ : اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں آسمان اور زمین کی وسعت میں نہیں سما سکتا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مومن کے قلب میں سما جاتا ہوں۔

تشریح : عرشِ عظیم سے بھی زیادہ افضلیت قلبِ مومن کو حاصل ہے، اس کی تائید اس حدیثِ پاک سے ہو رہی ہے جس کی طرف مصنف اشارہ فرما رہے ہیں، حدیثِ پاک یہ ہے لایسعنی أرضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلبُ عبدی المومن یعنی میری وسعت زمین و آسمان میں نہیں سما سکتی لیکن مومن کے دل میں سما سکتی ہے کیونکہ ذاتِ مطلق تو لامحدود ہے اور تمام مخلوقات کو از اوّل تا آخر اس کی ذات احاطہ کئے ہوئے ہے، اس احاطہ میں عرش و کرسی، زمین و آسمان غرضیکہ سب کچھ آجاتا ہے، اور قلبِ مومن کو خداوند تعالیٰ نے یہ مرتبہ عطا فرمایا کہ "میں مومن کے دل میں سما جاتا ہوں، اب نوعیت یہ ہوگئی کہ ذاتِ مطلق تو سب کو احاطہ کئے ہوئے ہے اور خود ذاتِ مطلق مومن کے دل میں سمائی ہوئی ہے لہٰذا قلبِ مومن سب کو احاطہ کئے ہوئے ہے، اس میں عرش وغیرہ سب کچھ آجاتا ہے، اس لئے عرشِ عظیم کی بہ نسبت، قلبِ مومن کی وسعت کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔

یہاں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ قلبِ مومن کی وسعت سے وجودِ قلب مراد نہیں کہ قلبِ مومن کا طول و عرض اس قدر ہے بلکہ قلبِ مومن کے نور کی وسعت مراد ہے

کیونکہ قلبِ مومن کا نور، اللہ تعالیٰ کی ذات کا نور ہے اور اس نور کے حجابات میں ذاتِ مطلق مندمج ہے، جس طرح ذاتِ مطلق لامحدود ہے، یہ نورِ ذات بھی لامحدود ہے، اور جب یہ نورِ ذات لامحدود ہوا تو اس نور کا مرکز یعنی قلبِ مومن بھی لامحدود ہوا، یہی قلبِ مومن کا نورِ ذات کو اپنے حجابات میں چھپائے ہوئے ہے۔

دل فضائے اللہ جمالش نصب آنجا راست است　　زیں گذشتن از برائے طوفِ کعبہ پُرخطا است

ترجمہ: دل اللہ تعالیٰ کی ایسی فضاء ہے جہاں اس کا جمال براہِ راست جلوہ فگن ہے، اسی لئے بیت اللہ کی فضا سے طواف کیلئے گذرنا گناہ ہے

تشریح: یہاں پر قلب کو بیت اللہ سے تشبیہ دیتے ہوئے مصنف فرماتے ہیں کہ جس طرح مکۂ معظمہ میں بیت اللہ شریف میں اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا مسلسل نزول ہوتا ہے، اسی طرح قلبِ مومن پر بھی خداوند تعالیٰ کی تجلیات نازل ہوتی ہیں، اسی مناسبت کی وجہ سے قلبِ مومن کو بیت اللہ کہا جاتا ہے اور جس طرح بیت اللہ کی یہ خصوصیت ہے کہ تجلیات کے نزول کا تعلق صرف اس کے اندرونی حصے تک محدود نہیں بلکہ بیت اللہ کی ارضِ مقدس سے عرشِ اعظم تک جو خلاء ہے وہ بھی تجلیات سے معمور ہے، اسی طرح قلبِ مومن جب ذکر و فکر کے ذریعہ پاک صاف اور روشن ہوجاتا ہے تو اس کا تعلق بھی اس ذاتِ پاک کے نور سے ہوجاتا ہے جو عرش پر جلوہ گر ہے اور قلب کی فضا عرش تک نورانی ہوجاتی ہے جس طرح احترامِ نور کی وجہ سے بیت اللہ کے اوپر پرواز کرنا گناہ ہے اسی طرح قلبِ مومن کے اوپر سے گذرنا یعنی اس کو ایذاء پہنچانا گناہ ہے۔

چند گویم از صفاتِ دل بدانی ہمچنیں　　رویتِ حق جائے ایمان ست در قرآں ببیں

ترجمہ: میں کہاں تک دل کی صفات بیان کروں بس یوں سمجھو کہ یہ تجلیات کے مشاہدے کا اور ایمان کا مرکز ہے، قرآن میں اس مضمون کو دیکھو۔

تشریح: قلب کی صفات اور کیفیات بیان کرنے کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ کہاں تک

اس کی صفات گنوائی جائیں، اس کی صفات تو بے شمار ہیں، اس سے بڑھ کر قلب کی اور کیا صفت ہو سکتی ہے کہ ایمان کے خصوصی تعلق کو قلب کے ساتھ قرآنِ پاک میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے، سورہ حجرات رکوع نمبر۱ میں ہے وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل میں ایمان کی محبت ڈال دی اور اس کو تمہارے دلوں میں پیوست کر دیا) اسی سورت میں دوسرے رکوع میں ارشاد ہے قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (اعرابی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، آپ کہیئے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ ہم مسلمان ہوئے، کیونکہ ابھی تمہارے دلوں میں ایمان جاگزیں نہیں ہوا) ان دونوں آیات میں ایمان کا تعلق قلب ہی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، علاوہ ازیں دیگر مقامات میں بھی ایمان کے تعلق کو قلب کے ساتھ مُتعلّق کیا گیا ہے، قلب جب نورِ ایمان سے منور ہو جاتا ہے تو اس کے ذریعہ معرفتِ خداوندی حاصل ہوتی ہے، قلب کے سوا یہ صفت کسی اور میں نہیں پائی جاتی جب تک قلب کی گہرائی میں ایمان کے اثرات نہ پہونچیں گے اس وقت تک قلب کے بارے میں تجلیاتِ باری کا آئینہ ہونے کا یقین ہی نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس سے زیادہ قلب کی اور کیا تعریف ہو سکتی ہے کہ اس کے ذریعہ ایمان کا شعور اور تجلّیات کا ظہور ہو۔

ایں جمالِ روئے خود را می نگر در دل مدام　　　گم کنی خود را در و تا زود بینی حق بکام

ترجمہ: اپنی صورت کے اس جمال کو ہمیشہ اپنے دل میں تصور کرو اور اپنی ذات کو اس میں گم کر دو تاکہ تجلّیات کا جلد مشاہدہ ہو جائے۔

تشریح: قلب کی صفات بیان کرنے کے بعد مصنف اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہوئے مراقبۂ تجلّی کا طریقہ بیان کر رہے ہیں کہ قلب میں تجلّیاتِ باری کے مشاہدہ کا طریقہ یہ ہے کہ بحالتِ مراقبہ سب سے پہلے یہ تصوّر کیا جائے کہ اس آئینۂ قلب میں میرے وجود کا عکس موجود ہے، جب اس تصوّر پر عبور ہو جائے اور یہ اس قدر قوی ہو جائے کہ آئینۂ قلب میں تم کو اپنی

صورت نظر آنے لگے تو پھر اپنی اس صورت کو ذاتِ مطلق کے لیئے برزخ تصور کر کے درمیان سے برزخ کا پردہ ہٹا دو اور یہ سمجھو کہ میرا قلب صرف تجلیات باری کا مرکز ہے لہٰذا یہاں کسی دوسرے کی گنجائش کہاں اور میری ذات تو نیستی سے متصف تھی وہ نیست و نابود ہوگئی اب یہاں صرف وجودِ مطلق ہی کا وجود ہے اور یہ تمام تجلیات اسی کی ہیں۔ اس کیفیت کو فنائے ذاتِ سالک اور استیلائے ذاتِ مطلق کہتے ہیں، یہی مقصود بھی ہے

گر پدیدی نفس خود در دل چوں ابیت بروج   می رسیدی سوئے حق آنجا دمی کردی عروج

ترجمہ: اگر محراب میں رکھے ہوئے عکس کی طرح تم اپنے وجود کو دل میں تصور کرو گے جب اس تصور سے عروج کرو گے تو حق تک رسائی ہو جائے گی

تشریح: یعنی جب قلب میں اپنے جسمِ مثالی کا تصور محسوس کرنے لگو اور اس بات کا یقین ہو جائے کہ یہ صورتِ مثالی تمھاری اپنی صورت ہے تو اس وقت یہ غور کرو کہ تمھاری حقیقت کیا ہے اپنے وجود کا تصور قائم کر کے اس میں غور و فکر کرنا "دیدنِ بُت اندر بروج ہے"، اس دیکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ اپنی صورت کو ایک بت کی طرح قائم کر کے اس کی طرف متوجہ ہو، بہر حال جب تمہیں غور و فکر میں یہ محسوس ہونے لگے کہ تمہارا وجود تمھاری اپنی کاوش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کو کوئی ایسی طاقت کنٹرول کر رہی ہے جس نے تم کو بغیر کسی منت و احسان کے جسمانی طور پر ایسی نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے جن کا کوئی بدل نہیں تو پھر خود بخود تمھاری توجہ اس قوتِ مطلقہ اور مرکزِ طاقت کی طرف مبذول ہو جائے گی۔ اس طرح تم پر اپنی حقیقت عیاں ہو جائے گی اور اپنی ذات کی معرفت کا دروازہ کھل جائے گا اور جب یہ تصور اس قدر مستحکم ہو جائے کہ تم یہ یقین کرنے لگو کہ میرے اندر جو قوتِ متصرفہ کام کر رہی ہے یہ کس کی صفت ہے وہ ذات خود میرے اندر موجود نہیں بلکہ اس کی صفات مجھ میں متصرف ہیں، تو پھر اپنی ذات کی معرفت سے اس ذاتِ مطلق کی معرفت اِس کی صفات کے ذریعہ تم کو حاصل ہو جائے گی، اِسی کو مصنف دوسرے مصرعہ میں "اِس تصور سے عروج کر کے حق تک رسائی" سے تعبیر

کر رہے ہیں۔

دمبدم کن بُت پرستی در دل خود اے پسر — بت پرستی فرض آمد در بطانت سر بسر

ترجمہ: اے سالک ہر وقت اپنے دل میں بت پرستی کر، کیوں کہ باطن میں بُت پرستی

از اوّل تا آخر بے حد ضروری ہے۔

تشریح: یہاں اپنے دل میں بُت پرستی کرنے کو ضروری قرار دیتے ہوئے مصنف دراصل تصوّر کو ایک مرکز پر مرکوز کرنے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس کی ترغیب اس حدیث پاک میں آئی ہے اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ الخ خداوند تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ ظاہر بات ہے کہ اسی چیز کو دیکھا جا سکتا ہے جس کا وجود ظاہری آنکھوں کے سامنے ہوگا اور خداوند تعالیٰ تو وجود، مکان و زمان وغیرہ تمام قیود سے منزہ ہے پھر اس کو دیکھنے کا کیا مطلب؟ اس کو دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ تصوراتی اعتبار سے باطن کی آنکھوں سے اُس ذات باعظمت وجلال کا تصور کرنا چاہیئے جو ہر ایک شئے میں متصرّف ہے اور ہر شئے پر قادر ہے۔ اس تصوّر وجود کو صوفیا حضرات بُت سے تعبیر کرتے ہیں اور یہاں پر بھی یہی مقصد ہے کہ یہ تصور تمھارے قلب میں ہو، اگر باطن اس تصور سے خالی ہے تو پھر کس کی معرفت مقصود ہے اس اس لئے باطن میں تصوراتی وجود قائم کرکے گویا اس بُت کی پرستش کرنا ضروری ہے یعنی قلب میں اس کی قدرتِ کاملہ اور صفات پر یقینِ کامل رکھنا ضروری ہے، یہ اصطلاحی الفاظ ہیں اور ان کا مطلب اسی اعتبار سے اخذ کرنا چاہیئے۔

ظاہراً شو بت شکن لیکن بباطن بُت پرست — گر بباطن بُت پرستی می شوی از اہلِ رُشت

ترجمہ: ظاہر میں بُت شکن رہو اور باطن میں بت پرستی کرو، اگر باطن میں بت پرستی کرو گے تو نجات پانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

تشریح: بُت پرست سے مراد سالک اور بُت سے مراد مقصود قلبی، مقصود دو قسم کے ہیں، ظاہری اور باطنی، ظاہری مقصود تو دنیا کی خواہشات ہیں اور باطنی مقصود صرف اسی کی

ذات ہے، اسی لئے ظاہری طور پر ان تمام خواہشات کے بتوں کو توڑ ڈالو اور فارغ القلب ہو جاؤ اور حقیقت میں صرف ایک ہی مقصود کو اپنے باطن میں بسالو اور وہ بتِ حقیقی یعنی مقصودِ اصلی صرف ذاتِ خداوندی ہے، اگر تمہارے باطن میں اس کی قدرتِ کاملہ اور صفاتِ جامعہ کا یقین کامل ہے تو گویا وہ ذات تمہارے باطن میں موجود ہے کیونکہ معرفتِ ذات بصورتِ صفات ہی ہمارا مقصود ہے، پس اگر باطن میں اس کا وجود ہے تو نجات یافتہ ہونے میں کیا شک ہے

ہر کہ اینجا گشت بینائے بتِ خود راستاں ۔۔۔ او ببیند مر خدارا در بہشتِ جاوداں

ترجمہ: جو کوئی اس بت کو اس جگہ دیکھنے والا بن جائے گا تو یقین جانو وہ خداوند قدوس کو بہشت میں ہمیشہ ہمیشہ دیکھنے والا ہوگا۔

تشریح: یعنی جس نے اپنے قلب میں اس ذاتِ مطلق کی قدرتِ کاملہ اور صفاتِ جامعہ کا اس طرح تصور کرلیا کہ تمام کائنات اس کی قدرتِ کاملہ کا ایک مظہر ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے اور میرے قلب وجسم پر بھی اسی کا تصرف ہے، میرا قلب اس کی صفات کی جلوہ گری سے معمور ہے، اس لئے میرے تمام اعمال اس کی مرضی کے مطابق، میرے تمام اذکار اس کی یاد پر مشتمل اور میرے تمام افکار اس کی صفات کی جلوہ گری پر مرکوز ہوں گے، غرضیکہ میری تمام تر توجہ اسی مقصود کو حاصل کرنے پر ہوگی، اسی کو مصنف بیان کر رہے ہیں کہ جس کی نظر قلب کے اس مقصودِ اصلی پر مرکوز ہوگئی وہ قیامت میں خداوند تعالیٰ کا ہمیشہ ہمیشہ دیدار کرے گا، اس سے بڑھ کر اور کیا انعام ہو سکتا ہے۔

کو مبادا، ہر کہ نفسِ خود نہ بیند در جہاں ۔۔۔ کو دراں عالم نہ بیند مر خدارا در جہاں

ترجمہ: کہیں ایسا نہ ہو۔ کیونکہ جو اپنے نفس کو اس دنیا میں دیکھنے والا نہ ہوگا، وہ خدا کو اُس جہان میں جنت میں نہ دیکھ سکے گا۔

تشریح: یعنی خدا نہ کرے کہ ایسا ہو کہ ہم کو اپنے نفس کی معرفت کی توفیق نہ ہو، ہم پناہ مانگتے ہیں، کیونکہ جب کسی کو اس کا احساس ہی نہ ہوگا کہ اس کا اصلی مقصود کیا ہے تو پھر کس طرح

وہ حق اور غیر حق میں امتیاز کرے گا، ذاتِ وحدہ لاشریک کی معرفت کس طرح اس کو حاصل ہو گی، ارشادِ خداوندی ہے مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (جو اس دنیا میں اندھا ہو گا وہ آخرت میں بھی اندھا ہو گا) یعنی جس طرح وہ یہاں دار العمل میں اپنے مقصود کو دیکھنے میں اندھا ہو گا وہاں دار الجزاء میں بھی یہ حالت اس کے ساتھ رہے گی اور جنت میں وہ دیدارِ خداوندی کی اس نعمت سے محروم رہے گا جس سے صالحین کی آنکھیں روشن ہوں گی۔ اللّٰهُمَّ احْفَظْنَا۔

ہمی بود او از لقائیش آں زماں اندر حجاب راست گردد اہلِ حسرت در حسابش بے عذاب

ترجمہ: اس کے دیدار سے اس جہان میں محروم ہو کر وہ حجاب میں ہو گا اور یقیناً حساب کے دن وہ عذابِ محرومی میں مبتلا ہو کر حسرت و افسوس کرے گا۔

تشریح: ایسے لوگوں کو جو آخرت کی فکر نہیں کرتے اور اعمالِ حسنہ و تعلق مع اللہ کا راستہ اختیار نہیں کرتے ہیں ان کو آخرت میں اپنی کم مائیگی اور تہی دامنی کا احساس ہو گا، خداوندِ قدوس کی تجلی وہاں پر کھلے عام ہو گی مگر وہ اس سے بھی محروم رہیں گے کیوں کہ جس طرح آج ان کے اور ذات کے درمیان حجاب ہے اسی طرح اس دن بھی حجاب ہو گا اور سب سے بڑی نعمت یعنی دیدار سے محروم ہو کر حسرتِ دیدار کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔

ہمچو خفاشی کہ آں پاشد بروز اندر نہاں از شعاع تابِ خورشیدِ منور در جہاں

ترجمہ: چمگادڑ کی طرح کہ وہ دن میں چھپی رہتی ہے، ایسے سورج کی روشنی سے بچ کر جس سے دنیا منور ہے۔

تشریح: یعنی آخرت میں خداوندِ تعالیٰ کی تجلی عام ہو گی، گنہگار اس تجلی سے محروم ہوں گے اور اس تجلی سے ہر شخص اپنی استعداد اور درجہ کے مطابق فیضان حاصل کرے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ سورج جب طلوع ہوتا ہے تو تمام جہان روشن ہو جاتا ہے اور ہر شے اس کی روشنی سے فائدہ اٹھاتی ہے مگر چمگادڑ کا معاملہ برعکس ہے وہ اس کی روشنی سے محروم

رہتی ہے اور جب تک سورج غروب نہ ہو جائے وہ کہیں چھپی رہتی ہے، جبکہ سورج کی روشنی کا فیض سب کے لئے عام ہے مگر چمگادڑ اس عموم سے محروم ہے، اسی طرح جس کا قلب معرفتِ خداوندی سے دنیا میں محروم ہے آخرت میں بھی اس کو دیدار سے محرومی ہوگی۔

تو بصورتِ خویش دعنا روئے خالق می نگر   وانکہ روئے او نہ بیند می بود چوبِ سقر

ترجمہ: تو ظاہر میں خود کو اور باطن میں تجلیاتِ خداوندی کو دیکھ، اس لئے کہ جو اس کی تجلیات کا دیکھنے والا نہ ہوگا وہ جہنم کا ایندھن ہوگا۔

تشریح: وجودِ انسانی مرتبہ جامعہ میں ذاتِ باری کا مظہر ہے، اس وجود کی دو حیثیتیں ہیں ایک ظاہراً، ایک معنیً، ظاہری صورت میں یہ وجود تو وجودِ سالک ہے اور باطن میں باعتبار مظہرِ ذات کے تجلیاتِ باری کا عکس ہے اور تجلیاتِ باری یعنی صفات وحدۃ الوجود میں عین ذات ہیں اس لئے اس مظہرِ ذات کو معناً تجلیاتِ باری ہی سمجھ۔ ظاہر میں جب تم اپنے وجود پر غور کروگے تو ظاہر کے ذریعہ باطن تک رسائی ہو کر اپنی ذات کی معرفت تم کو حاصل ہو جائے گی اور جب اپنی معرفت سے آگاہی ہوگی تو اس کے ذریعہ اس واجب الوجود کی صفات تک رسائی ہو جائے گی اور یہی مقصودِ اصلی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ توحید کا حصول ہی نہ ہوگا اور جب توحید میسر نہ آئے گی تو اس کا نتیجہ سوائے دوزخ کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

گر تو خود را جاودانی نیک جوئی اے پسر   نفسِ خود را مستدام اندر دلِ خود می نگر

ترجمہ: اگر اے سالک! تو اپنی بھلائی مستقل طور پر چاہتا ہے تو پابندی کے ساتھ اپنے دل میں اپنے نفس کا ملاحظہ کر۔

تشریح: یعنی قلب میں اپنے وجود کے تصور کو قائم کرکے اس کے ذریعہ وجودِ حقیقی کا ہر وقت دھیان رکھ، کسی وقت، کسی آن بھی تیرا دل اس کی یاد سے، اس کے تصور سے خالی نہ رہے اسی میں سعادتِ کونین پوشیدہ ہے۔ اس راہ میں ایک لمحہ کی غفلت منزلِ مقصود سے ہزاروں میل دوری کا سبب بن جاتی ہے، اس کی رحمتِ کاملہ نہ جانے کب نواز دے، اس

لئے ہر گھڑی، ہر لحہ اس بارگاہ میں تیرا قلب سجدہ ریز رہنا چاہیئے۔

تا تو خود را بنگری خود بخود گم اندراں — می شود حاصل ترا بس موت معنا آن زماں

ترجمہ: جب تو اپنے نفس کے ملاحظہ کے ذریعہ اپنے وجود کو گم کرنے والا ہو جائے گا تو اس وقت تجھ کو موتِ معنوی کا علم حاصل ہو جائے گا۔

تشریح: جیسا پہلے بتلایا جاچکا ہے کہ آئینہ قلب میں سالک اپنے وجود کا تصور قائم کرنے کے بعد ذاتِ مطلق کا تصور قائم کرتا ہے اور جب تجلیات کے ذریعہ ذاتِ واجب الوجود کا احساس اس کو ہو جاتا ہے تو اس کا وجودِ فانی ختم ہو جاتا ہے گویا اس کو اس وقت موت معنوی حاصل ہو گئی اگرچہ جسم ظاہری باقی ہے۔

تن فراموشی است معنا موت بہر حق شناس — آں سبب فرمود باری در کتابش کن قیاس

ترجمہ: عارفِ حق شناس کے لئے اپنے وجود کا بھلا دینا ہی معنوی موت ہے۔ اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اس کی کتاب میں تلاش کرو۔

تشریح: خواہشات کو فرمانِ حق کے تابع کرنا اور اپنے وجود کو کالعدم تصور کرنا موتِ معنوی ہے، قرآنِ پاک میں متعدد مقامات پر خداوند قدوس کا فرمانِ مبارک اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے، مثلاً اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، صوفیا حضرات اس آیتِ پاک سے یہ مفہوم اس طرح اخذ کرتے ہیں کہ جب سب کچھ خالق و مالک کے سپرد کر دیا، اپنی دنیا، اپنی آخرت اور اپنی تمام خواہشات غرضیکہ سب کچھ اسی کی مرضیات کے سانچے میں ڈھال دیں تو یہی موتِ معنوی ہے کیونکہ حیات کا نتیجہ تو یہی ہے کہ اپنی ذات کے لئے اپنی مرضی اور خواہش کے تحت اسبابِ حیات سے رابطہ رکھا جائے اور جب سارے رشتے توڑ کر ایک ہی ذاتِ پاک سے رشتہ جوڑ لیا اور اپنے تن، من، دھن کا نذرانہ اس کی بارگاہ میں پیش کر دیا تو اب سالک کے پاس رہ کیا گیا، اسی سپردگی اور تن فراموشی کا نام معنوی موت ہے اور اس معنوی موت کی دس اقسام ہیں جن کی تفصیل کتبِ تصوف

ہیں ملاحظہ فرمائی جائے۔

مصطفےٰ فرمود مُوتوا در حدیث ہم چناں　　موت پل باشد رساند یار را با یار جاں

ترجمہ: حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مُوتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوتُوا، اور موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست سے ملاتا ہے۔

تشریح: یہاں موت معنوی کی وضاحت کے لئے حدیث پاک بیان کر رہے ہیں کہ ایک تو ظاہری موت ہے جس میں جسم، نفس اور روح تینوں کا تعلق اور ربط ایک دوسرے سے ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرے معنوی موت ہے جس میں جسم، نفس اور روح موجود رہتے ہیں، پھر بھی اس کو موت سے تعبیر کرتے ہیں، یہ تعبیر کرنا دراصل مجازاً ہے اور اسی مجازی موت کو موتِ معنوی کہا جاتا ہے، کیونکہ اس معنوی موت میں ظاہری موت کی طرح اپنے نفس کے فائدے اور نقصان کے ختم ہونے کا تصور کیا جاتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ، یعنی نفس کے موجود ہونے کا تصور ہی ختم کر دیا جاتا ہے اور اپنی ذات کو کالعدم قرار دے کر خواہشاتِ نفسانی کے جال سے چھٹکارا حاصل کر لیا جاتا ہے۔ مرنے سے پہلے مرنے کا مفہوم یہی ہے کہ اپنی تمام آرزوؤں اور خواہشات کو ذات وحدہٗ لاشریک کی مرضیات کے تابع کر دیا جائے اور اپنی کوئی حیثیت ہی باقی نہ رکھی جائے۔

دوسری حدیث پاک میں موت کو ایک پُل سے تشبیہ دی ہے اَلْمَوْتُ جِسْرٌ یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ یعنی موت ایک ایسا پُل ہے جو دوست کو دوست سے ملاتا ہے، اس شغل میں بھی چونکہ اپنے وجود کے ذریعہ وجودِ حقیقی تک رسائی ہوتی ہے وہ اس طرح کہ اپنے وجود کو بھلا کر اس ذاتِ واجب الوجود کی تجلیات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور یہی مشاہدۂ تجلیاتِ ذات، معرفتِ ذات ہے جو سالک کا مقصود اور مجبوب ہے۔ تو گویا اس تن فراموشی نے پُل کا کام دیا کہ دوست کو دوست سے ملا دیا۔

چوں شدی از خویشتن گم ہمدم باشی قریں　　میرسی در بحرِ وحدت ہست آں حق الیقیں

ترجمہ: جب تو نے اپنے کو بھلا دیا تو اس کی قربت کی ہمیشگی حاصل ہو گئی اور جب تو
بحرِ وحدت میں پہنچ گیا تو یہی حق الیقین ہے

تشریح: آخر میں مصنف اس بات کی وضاحت کر رہے ہیں کہ عنوان کے آغاز میں یہ کہا گیا تھا کہ اپنی صورت کا تصور آئینۂ قلب میں کرنا عین الیقین ہے، اس کے بعد اپنی اس صورت کے تصور کو ختم کر کے تجلیاتِ باری کا مشاہدہ کیا جاتا ہے، جب اس مشاہدہ میں اس قدر استغراق ہو جائے کہ اپنی ذات کا بھی دھیان نہ رہے اور استغراق میں استقلال ہو جائے، تو اس وقت سالک کو ہمہ وقتی قربت حاصل ہو جاتی ہے یعنی سالک کا قلب ہمیشہ تجلیاتِ باری کے محاذ میں رہتا ہے اور اس کی یاد سے دم بھر کے لیے بھی اس کو غفلت نہیں ہوتی، اسی کو صوفیاء حضرات "قطرے کا دریا میں مل جانا" کہتے ہیں، گویا سالک کا وجود ایک قطرہ تھا جو بحرِ وحدت میں جا کر مل گیا، یہی حق الیقین ہے۔

خود گمی گم کن، شوی با دلبرِ جاں ہمقریں　　　باز از شغلے بگویم گر بگویم بیش ازیں

ترجمہ: خود فراموشی کو بھی فراموش کر دے اور مقصودِ قلبی سے مل جا، اگر میں اس سے زیادہ تفصیل بیان کروں گا تو دوسرے شغل کے ذکر سے رہ جاؤں گا۔

تشریح: یہاں سب سے اعلیٰ اور آخری درجہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف فرماتے ہیں کہ اپنے وجود کو فراموش کر کے اس وجودِ حقیقی میں گم ہو جانا تو حق الیقین تھا لیکن اس سے بھی آگے ایک منزل اور ہے اور وہ ہے خود فراموشی کو بھی فراموش کر دینا، یہ سب سے بڑا کمال ہے کہ اس کی ذات کے مشاہدہ کے بعد جب کیفیتِ معاینہ میسر ہو تو اپنی فراموشی کا بھی دھیان اور تصور باقی نہ رہے یہ مقام معاینہ ہے اس کے بعد مقامِ حیرت شروع ہو جاتا ہے جہاں عقل و ہوش، سماعت و بصارت سب کچھ جلوۂ محبوب میں اس طرح گم ہو جاتے ہیں کہ اس گم ہونے کا بھی احساس باقی نہیں رہتا۔

تو در و گم شو، وصال این ست و بس　　　گم شدن گم کن، کمال این ست و بس

واللہ اعلم بالصواب

در بیانِ شغلِ محبوبہ

شغلِ محبوبہ کا بیان

شغلِ دیگر می شنو از من بگویم ایں چنیں ۔۔۔ نام آں را شغلِ محبوبہ بدانی بالیقیں

ترجمہ : ایک اور شغل کے بارے میں مجھ سے سنو جس کو میں اس طرح بیان کرتا ہوں، کہ اس شغل کا نام شغلِ محبوبہ ہے، اس بات کو یقین کے ساتھ سمجھ لو۔

تشریح : اس سے پہلے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے "قلبِ مومنین" کے عنوان کے تحت جو شغل بیان کیا تھا اس کا مرکزی تصور یہ تھا کہ سالک اپنی ہی صورت کا تصور اپنے قلب صنوبری میں قائم کرے جب یہ تصور اس قدر مستحکم ہو جائے کہ قلبِ صنوبری کے ہر گوشہ میں صرف سالک کی صورت باقی رہ جائے تو مرشدِ کامل اس "تصورِ نفس" کو "ذاتِ مطلق" کے تصور کی طرف منتقل کر دیتا ہے، یعنی اپنی صورت کی طرف متوجہ ہونے میں سالک کی نظر محدودیت پر جم گئی تھی، مرشدِ کامل اس نظر کو ذاتِ مطلق کی لا محدودیت سے آشنا کرا دیتا ہے، نیز یہ خیال رہے کہ یہ لا محدودیت کی شان صفات سے متعلق ہے، ورنہ اس کی ذاتِ پاک تو لا محدودیت سے ورا الورا ہے۔

"شغلِ محبوبہ" میں بھی مجاز کے ذریعہ حقیقت تک رسائی مقصود ہے، البتہ ان دونوں اشغال میں فرق یہ ہے کہ قلبِ مومنین کے بیان میں سالک اپنی ہی صورت کا تصور کرتا ہے اور بفیضانِ مرشد اپنی اس صورتِ مجازی سے حقیقت تک رسائی پالیتا ہے، "شغلِ محبوبہ" میں بے اختیار کسی دوسرے کا رُخِ زیبا مرکزِ نظر بن جاتا ہے اور اس میں شانِ محبوبیت نظر آنے لگتی ہے، چونکہ طبیعتیں اور مزاج الگ الگ ہوتے ہیں، کسی کا تصور اپنی ہی ذات پر مرکوز ہوتا ہے، اس کی یہ خود بینی اپنی ذات کے عرفان میں جب رنگ جاتی ہے، تو خالق کی صفات کا عرفان ہو جاتا ہے اور بعض افراد کو کسی دوسرے کی اچھی صورت دیکھ کر تصور

کی مرکزیت حاصل ہو جاتی ہے۔

اس شغل میں جب اس قدر انہماک ہو جاتا ہے کہ تمام تصورات سمٹ کر ایک ظاہری شکل پر مرکوز ہو جاتے ہیں تو مرشد کامل اس حسن ظاہری کی طلب کو حسن ازلی کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اسی مقام سے مجاز پر حقیقت کا رنگ ابھرنے لگتا ہے اور قطرہ اپنے اندر پوشیدہ سمندر کی لامحدودیت کے رمز سے آشنا ہو کر فنا کی منازل سے گزر جاتا ہے اور پھر فضل خداوندی سے اس کی رسائی مقام بقا تک ہو جاتی ہے۔

گر کسے را خوب رو بینی، بدانی ہست اوست   صورتش در دل ہمی بینی و میدانی کہ اوست

ترجمہ: اگر تم کسی کو ظاہری صورت میں حسین دیکھو تو اس کو اپنا دوست سمجھو، اس کی صورت کو اپنے دل میں، یہ تصور کرو کہ یہ اسی کا جلوہ ہے۔

تشریح: اس شغل کا بنیادی تصور یہ ہے کہ اگر کوئی صورت حسن ظاہر سے آراستہ ہو اور بے اختیار اس کی طرف قلب کشش محسوس کرے تو اس ایک صورت پر ہی تمام توجہ مرکوز کر دو، اور اس کا تصور قلب میں اس طرح قائم کرو کہ دیگر تمام نقوش قلب سے مٹ جائیں اور اس شبیہ کے تصور کے وقت خاص طور پر یہ دھیان رکھو کہ یہ اسی ذات وحدہ لاشریک کے نامحدود جمال کا بے نام جلوہ ہے۔ اگرچہ تمام کائنات خداوند قدوس کی صفات کا مظہر ہے اور ہر چیز میں اسی کا جلوہ ہے لیکن اس کے باوجود جو شرف انسان کو عطا کیا گیا ہے دیگر مخلوقات میں سے کسی کو نہ ملا۔ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً کا تمغۂ امتیاز عطا فرما کر فرشتوں پر اس کی عظمت ظاہری کو عیاں کر دیا گیا۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ سے تمام مخلوقات کے حسن و جمال پر اس کو فوقیت عطا کی گئی اور إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الخ سے اس کی قوت باطنی کے سامنے مخلوقات کی ہر طاقتور شئے کو مغلوب کر دیا گیا۔ بنیادی طور پر اس قدر عظمتیں کسی اور مخلوق کو عطا نہیں کی گئیں، صرف انسان کو بیک وقت یہ تین اعزاز عطا کیے گئے۔ اس لئے اگر کسی کو صرف شکل انسانی ہی میں اس ذات پاک کا جلوہ

دکھائی دے تو کیا مضائقہ ہے۔

اس تمہید سے یہ شبہ زائل ہو جاتا ہے کہ جمالِ خداوندی کی جھلک انسان ہی کی شکل میں کیوں محسوس ہوتی ہے کسی دیگر شئے میں کیوں نہیں؟ جبکہ تمام کائنات اسی کی صفات کا مظہر ہے اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ سالکانِ راہِ طریقت نے ہزارہا جلوؤں میں اس کے جمال کا مشاہدہ کیا ہے، جس کی مثالیں کتابوں میں موجود ہیں۔

اس شغل میں مشغول ہونے کی صورت یہ ہے کہ اگر کسی اچھی شکل انسانی پر بے اختیار نظر پڑ جائے اور قلب پر اس کے نقوش اس طرح جم جائیں کہ کوشش کے باوجود بھی اس کی طرف سے توجہ کسی دوسری طرف نہ ہو سکے تو مرشدِ کامل کی اجازت سے اسی کی نگرانی میں اس محبوب کی صورتِ مثالی کا تصور قلب میں اس طرح قائم کرے کہ اس کے سوا تمام خیالات دل دماغ سے مٹ جائیں، اس طرح سے جب تصور کی مرکزیت حاصل ہو جائے گی تو پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مرشدِ کامل اس تصور سے مجاز کا رنگ زائل کر کے حقیقت کی طرف اس کا رُخ پھیر دے گا۔ یہ شغل اگرچہ بہت مشکل اور پُرخطر ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے ذریعہ جس قدر تیزی کے ساتھ منزل تک رسائی ہوتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

دیدنِ رخسارِ او عرفانِ خلّاقش بداں   وجہِ اُو را وجہِ باری می نگر در دل نہاں

ترجمہ: اُس کا رُخسار دیکھنے کو اس کے خالق کی معرفت سمجھو، اور اس صورت کو اپنے دل میں تجلیاتِ باری تصور کرو۔

تشریح: یعنی اس کے حسنِ ظاہری کو دیکھ کر یہ تصور کرو کہ جب یہ مخلوق اس قدر حسین ہے خوبصورت ہے تو اس کا بنانے والا کس قدر حسین و جمیل ہوگا، اس محبوبِ مجازی کا یہ ظاہری حسن، اس کے چہرے کی یہ چمک دمک تو ایک دن ختم ہو جائے گی، کیونکہ یہ سب کچھ اس کا کمال ذاتی نہیں ہے بلکہ کسی کا عطا کیا ہوا ہے، وہ جب چاہے گا یہ سب کچھ واپس

لے لیگا۔ البتہ جس نے اس گوشت پوست کو حسن کے سانچے میں ڈھالا ہے اس کا حسن وجمال ازلی وابدی ہے، وہ ہمیشہ سے حسین ہے اور ہمیشہ حسین رہے گا، اس لئے حسن فانی میں دل کو پھنسانا خلافِ عقل ہے، دل لگانے کے قابل وہی ذاتِ اقدس ہے جو تمام حسن کی خالق ہے۔

سالک کے قلب ودماغ میں جب یہ تصور جاگزیں ہو جائے گا تو لازمی طور پر مخلوق کا حسن، خالق کے حسن کو پہچاننے کا ذریعہ بن جائے گا اور اس حسین تخلیق میں خالق کا جلوہ نظر آنے لگے گا۔ اس طرح سالک کا یہ شغل عرفانِ صفات کا بہت عمدہ ذریعہ بن جائے گا۔

وجہِ انساں وجہِ رحماں است بنگر در حدیث　　　شک نیارد کس دریں جز مبتدع فاسق خبیث

ترجمہ: حدیثِ پاک میں دیکھو کہ انسان کا چہرہ، رحمان کی تجلیات کا عکس ہے، اس فرمان میں وہی شک کرے گا جو بدعتی اور فاسق وخبیث ہو گا۔

تشریح: حدیثِ پاک ہے وَجْہُ الْاِنْسَانِ وَجْہُ الرَّحْمٰنِ یعنی انسان کی صورت رحمان کی تجلیات کی شبیہ ہے، اس حدیث میں اگرچہ تشبیہ برائے تفہیم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی شکل اور صورت سے منزہ اور پاک ہے، صرف مثال میں سمجھانے کے لئے مرتبہ تشبیہ میں اس ذاتِ بے چگونہ و بے نمونہ کیلئے ایسے الفاظ استعمال کئے جا سکتے ہیں، اسی لئے صوفیا حضرات وَجْہُ الرَّحْمٰنِ سے تجلیاتِ رحمان مراد لیتے ہیں کہ اس انسانی شکل کو، اور اس کے ظاہری حسن وجمال کو سالک اپنے قلب میں تجلیاتِ خداوندی کا عکس تصور کر لے اور یہ بات بالکل صحیح ہے کہ انسان ہی تجلیاتِ باری کا سب سے زیادہ جامع ہے جیسا کہ گذر چکا ہے، اس حقیقت سے وہی انکار کرتے ہیں جن کی طبیعت میں سلامت روی، حق پرستی اور حق طلبی نہیں ہے اور وہ بدعت، فسق اور خبث میں مبتلا ہیں۔

آدمی را کرد پیدا حق چہ با نقش و نگار　　　بر صفاتِ خویش ایں راز حدیثے گوشدار

ترجمہ: آدمی کو اللہ تعالیٰ نے کس قدر عمدہ اور متناسب صورت پر پیدا کیا ہے اور اپنی صفات سے اس کو متصف کیا، حدیث کے اس راز کو بہت غور سے سمجھو۔

تشریح : یعنی صورتِ انسان پر کسی کی فریفتگی اپنی جگہ اس لئے ہے کہ انسان کو کس قدر مناسب خدوخال اور عمدہ ڈھانچہ بنا کر اللہ تعالیٰ نے موزونیت کے ساتھ پیدا فرمایا ہے جس کا اعلان قرآن پاک میں لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ یعنی اس کی ظاہری بناوٹ بھی حسن و جمال کا بے مثال نمونہ ہے اور باطنی طور پر بھی انسان کو اپنی صفات سے متصف کر کے پیدا کیا ہے، خداوند قدوس کی صفات تو بے شمار اور لامحدود ہیں، لیکن جتنی صفات انسان کو عطا کی گئی ہیں ان سب میں اس ذاتِ پاک کی صفات کا رنگ جھلکتا ہے، فرق یہ ہے کہ اس کی صفات لامحدود ہیں اور انسان کی صفات محدود ہیں، اس ذاتِ پاک کی صفات ذاتی ہیں اور انسان کی صفات اس قادرِ مطلق کی عطا کی ہوئی ہیں، وہ بھی علیم ہے، انسان بھی علیم ہے وہ بھی بصیر ہے، انسان بھی بصیر ہے، وہ سمیع ہے، انسان بھی صفتِ سماعت رکھتا ہے اسی طرح دیگر صفات کا معاملہ ہے خَلَقَ اللّٰہُ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ، اس حدیث پاک میں صاف طور پر بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صفات سے مزین کر دیا ہے، عَلٰی صُوْرَتِہٖ کی تشریح صوفیاء حضرات عَلٰی صِفَاتِہٖ سے فرماتے ہیں، کیونکہ وہ ذاتِ پاک شکل و صورت کی تعیین سے منزہ ہے، اس تشریح سے بات بالکل صاف ہو گئی کہ انسان ہی ظاہری اور باطنی خوبیوں کا مجموعہ ہے، اس لئے اس کی ظاہری صورت کی طرف بھی رغبت و میلان ہونا فطری امر ہے

آدمی زاد است سرِ ذاتِ باری بیگماں　　خود بگفت و گشت ظاہر در میانِ ہر دماں

ترجمہ : بے شک انسان قدرتِ خداوندی کا ایک ایسا راز ہے جس کو خود اس نے ظاہر فرمایا اور وہی انسانوں میں جلوہ فرما ہو گیا۔

تشریح : انسان کی ظاہری اور باطنی خوبیاں ثابت کرنے کے بعد مصنف فرماتے ہیں کہ یہ مخلوق یعنی انسان صرف ظاہری اور باطنی خوبیوں کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ یہ تو خالق کائنات کا ایک ایسا راز ہے جس راز کو اس نے اپنی تجلیات کا مرکز بنا کر ظاہر فرما دیا ہے جیسا کہ حدیث پاک میں ہے اَلْاِنْسَانُ سِرِّیْ وَاَنَا سِرُّہٗ یعنی "انسان میرا راز ہے اور میں اس کا راز ہوں"۔ یہ راز

کیا ہے، صوفیا حضرات اس کی تشریح یہ فرماتے ہیں کہ "انسان میرا راز ہے" یعنی میری تجلیات
کا خاص مرکز ہے۔ اور "میں اس کا راز ہوں" یعنی حقیقتِ جامعہ کی صورت میں میری ہی صفات
کا ظہور ہو رہا ہے؛ اس لئے اگر کوئی کسی انسان کی ظاہری شکل و صورت پر فریفتہ ہو جائے تو
در حقیقت یہ فریفتگی اسی حسنِ لازوال پر ہے جس کا جلوہ تمام کائنات میں ہے، جس نے اس
راز کو سمجھ لیا اس کو حقیقت کا ادراک ہو گیا۔ اسی لئے فرماتے ہیں کہ:-

دل بگرداں از مجاز و در حقیقت می نگر — ایں مجازی را پُل و جسر حقیقی می شمر

ترجمہ: اپنے دل کو مجازی کی طرف سے ہٹالے اور حقیقت کی طرف اپنی توجہ کو مرکوز کر اور
اس صورتِ مجازی کو حقیقت تک پہونچنے کے لئے پُل اور واسطہ تصوّر کر۔

تشریح: یعنی جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ "انسان حقیقتِ جامعہ کے روپ میں تجلیاتِ خداوندی
کا مظہر ہے تو اس مظہر کو اپنا مقصد نہ بناؤ، کیوں کہ یہ تو مجاز ہے جس کا بذاتِ خود کوئی وجود نہیں
اس کی تمام چیزیں مجازی اور مستعار ہیں، اس کا یہ جسم، اور اس کا تناسب، خوبصورتی، غرضکہ
سب کچھ مجاز کے رنگ میں رنگا ہوا ہے اور یہ مجازی شکل و صورت تو ایک دن فنا ہو جائے
گی۔ اس لئے اس فانی کے تصور کو اپنے دل سے نکال کر ذاتِ واجب الوجود کی صفات و افعال
میں غور کرو اور اسی سے دل لگاؤ، اس صورتِ ظاہری کو صرف ایک پُل کی طرح سمجھو، جو
حقیقت تک بہ آسانی پہونچانے کا ایک ذریعہ ہے اَلْمَجَازُ قَنْطَرَۃُ الْحَقِیْقَۃِ، یعنی مجاز
حقیقت کے لئے ایک پُل ہے۔ ظاہر بات ہے کہ پُل بذاتِ خود مقصود نہیں ہوتا بلکہ منزلِ مقصود
تک پہونچانے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ منزلِ مقصود تو اسی کی ذاتِ پاک ہے۔ اس لئے
اس مجازی پُل سے گذر کر ذاتِ پاک تک بذریعۂ صفات رسائی حاصل کرنا چاہیئے اور مستقل
طور پر مجاز میں دل نہیں پھنسانا چاہیئے۔

لیک با عفت بباش و کن ز شہوت احتراز — عاشقِ آرام جانی شو چو مرد پاکباز

ترجمہ: لیکن پاکیزگی کے ساتھ رہ اور خواہشاتِ نفسانی سے مکمل پرہیز کر، پاکباز

مردِ سالک کی طرح محبوبِ حقیقی کا دل و جان سے عاشق ہوجا۔

تشریح: یہاں پر مصنف رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے مغالطہ کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں کہ اس صورتِ ظاہری کے حسن و جمال کی طرف متوجہ ہونے میں خواہشِ نفسانی کا شائبہ تک نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس توجہ میں اگر خواہشِ نفسانی کا شائبہ بھی ہوگیا تو پھر یہ عشق نہ رہے گا بلکہ اس کو فسق کہتے ہیں جو منزلِ مقصود تک رسائی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ نادان کم ہمت اور کم ظرف اس میں مبتلا ہوکر سعادتِ ابدی سے محروم ہوجاتے ہیں اور اس لذتِ فانی کے نشے میں سرشار ہوکر حسنِ ازلی کی تجلیات سے بے بہرہ رہتے ہیں اس لئے بلند ہمت اور پاکباز لوگوں کی طرح منزلِ مقصود اور مرکزِ عشق صرف اسی کی ذات پاک ہونی چاہیئے، اللہ تعالیٰ تو دلوں کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں، دیارِ عشق میں ذرا سا بھی کھوٹا سکہ نہیں چلتا۔

رخِ خوباں دیدن از پاکیٔ دل شرطِ صفاست عشقِ مجنوں بجمالِ حسنِ لیلیٰ بود راست

ترجمہ: دل کی پاکیزگی کے ساتھ محبوب کی صورت کو دیکھنا راہِ صفا کی شرطِ اولین ہے بے شک مجنوں کا عشق لیلیٰ کے حسن کے جمال سے تھا۔

تشریح: اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ "شغلِ محبوب" حصولِ معرفت کے سلسلے میں سب سے زیادہ قریب راستے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس شغل کے ذریعہ انسان کی تمام توجہات بہت جلد ایک مرکز پر قائم ہوجاتی ہیں اس لئے کہ محبوب اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ مجسم شکل میں نظروں کے سامنے ہوتا ہے جس کی وجہ سے تخیل کی دنیا ہمیشہ آباد رہتی ہے لیکن اس کے باوجود اس شغل میں یہ مرحلہ بھی بہت مشکل ہے کہ اگر سالک کی نظر حسنِ ظاہری کے حجابات سے گذر کر جمالِ باطن تک نہ پہونچ سکی تو قلب و نظر کی پاکیزگی خطرے میں پڑجاتی ہے، محققین صوفیاء حضرات نے اس شغل سے اِن ہی خطرات کے پیشِ نظر احتراز کرنے کو فرمایا ہے۔ تاہم اس شغل کی اہمیت اور اثر آفرینی کی شدت سے انکار کی گنجائش بھی نہیں۔ بس اِس بات کا خاص دھیان رہے کہ جس طرح جسمانی اعتبار سے باعفت ہونا اور شہوت سے بچنا ضروری ہے اسی طرح قلب

کی پاکیزگی بھی ضروری ہے یعنی قلب میں بھی کسی قسم کی لذت کو شئ کا شائبہ نہ ہو بلکہ محبوبِ مجازی سے عشق اس انداز کا ہو جس طرح قیس ابن عامر یعنی مجنوں کو لیلیٰ سے تھا جس کا تعلق لیلیٰ کے حسن ظاہر سے نہیں بلکہ جمالِ باطن سے تھا۔ ڈاکٹر میر ولی الدین مرحوم نے "رموزِ عشق" میں عشق حقیقی اور مجازی پر سیر حاصل بحث کی ہے تفصیلات کیلئے مذکورہ کتاب کی طرف رجوع کریں۔

پارسائی شرط آمد عاشقاں را سر بسر   سر کتماں نیز آمد در حدیثے می نگر

ترجمہ: عاشقوں کے لئے از اوّل تا آخر پارسائی کی شرط انتہائی ضروری ہے عشق تو ایک پوشیدہ راز ہے، حدیث میں اس کی تشریح دیکھو۔

تشریح: عشق مجازی میں پاکیزگی قلب و دماغ سب سے پہلی اور اہم شرط ہے، یعنی محبوب کی صورتِ ظاہری کو مظہرِ جمالِ ذات تصور کر کے جب سالک کی نظر کو مرکزی وحدت حاصل ہو جاتی ہے تو اس چاہت میں نفسانی خواہش کی ذرہ برابر لاگ نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ بغیر پارسائی کے سالک مجازی کی دلدل سے نہیں نکل سکے گا اور نہ مقصودِ اصلی تک رسائی حاصل کر سکے گا۔

حدیث پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو چاہتے ہیں یعنی اپنی چاہت کسی بندے کے دل میں پیدا کرتے ہیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرماتے ہیں کہ میں فلاں بندے کو چاہتا ہوں تو بھی اس سے محبت رکھ، جبرئیلؑ اس سے محبت کرتے ہیں اور پھر آسمان والوں میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت فرماتے ہیں اس لئے تم بھی اس سے محبت کرو، پھر اس بندے کے لئے زمین پر بھی ہر دلعزیزی اور قبولیت کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں" اس حدیث پاک سے معلوم ہو گیا کہ چاہت کا یہ تمام معاملہ ایک مستحکم راز کی بنیاد پر قائم ہے اور وہ راز ہے پارسائی یعنی نقوش ماسوا کو دل سے مٹا دیگا تو اس راز سے واقف ہو جائیگا کہ بس ——— ہر کجا می نگرم روئے ترا می بینم

پارسا شو روئے خوباں بین و دل با ہوشدار   حسن روشن حسن ذاتِ حق تعالیٰ می گمار

ترجمہ: دامن کو آلودگی سے بچا کر خوبصورت چہروں کو دیکھ اور دل کا تعلق ہوش سے رکھ،

اور محبوب کی ظاہری خوبصورتی کو حق تعالیٰ کی ذات کی تجلیات سمجھ۔

تشریح : یعنی جب قلب و نظر میں پاکیزگی کا تصور قائم ہوگا، اس وقت حُسن ظاہر کی طرف متوجہ ہونا نقصان دہ نہیں رہے گا اور یہ تصور اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جب دل و دماغ کا تعلق ہوش سے ہو۔ جب سالک تقویٰ و پارسائی کے اس مقام پر فائز ہوگا تو محبوب کا حُسن ظاہری اس کی نظر میں حسن حقیقی کا آئینہ محسوس ہونے لگے گا، یہ ایک ایسا نازک مرحلہ ہے جہاں لغزشوں کے انبار ہیں۔ اسی لئے مصنفؒ قدم قدم پہ ہدایت فرمارہے ہیں، یہاں پر بھی اِتَّقُوْا مَوَاضِعَ التُّهَمَةِ یعنی بدگمانی کے مقامات سے بھی پرہیز کرو۔ یہ درس دے کر قلب و نظر کی پاکیزگی کو ضروری قرار دے رہے ہیں۔

شغل محبوبہ است افضل در میان عاشقاں   می نگر در قصہ مجنوں بدانی شرح آں

ترجمہ : "شغل محبوبہ" عاشقانہ مزاج والوں کے لئے بہت عمدہ شغل ہے، مجنوں کے قصہ میں اس واقعہ کو دیکھ اور اس کی تشریح پر غور کر۔

تشریح : اگرچہ یہ شغل بہت مشکل ہے لیکن قدرتی طور پر انسانوں کے مزاج الگ الگ ہوتے ہیں۔ ہر ایک کی پسند جدا جدا ہوتی ہے، جو حضرات عاشقانہ مزاج رکھتے ہیں ان کے لئے یہ "شغل محبوبہ" بہت عمدہ ہے۔ کیونکہ ان میں ایک ایسا جذبہ ہوتا ہے کہ جہاں کہیں اُن کی نظر ٹک جاتی ہے، وہاں بہت جلد اُن کو تصور کی مرکزیت حاصل ہوجاتی ہے اور یہ تصور کی مرکزیت "وحدتِ تصور" تک بہت جلد سالک کو پہونچا دیتی ہے۔ یعنی حسن ظاہر کو جس کسی کی نظر منتخب کرلیتی ہے تو پھر بہت جلد وہ تمام دیگر تصورات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیتا ہے اور صرف ایک ہی محبوبِ مجازی کا تصور اس کے ذہن پر مسلط ہوجاتا ہے۔ صوفیاء حضرات نے اسی لئے اس شغل کو اَقْرَبُ الطَّرِيْق "یعنی مقصود تک پہونچانے کا سب سے قریب راستہ قرار دیا ہے۔ قیس بن عامر (جس کا لقب مجنوں پڑ گیا تھا) کے قصہ میں اس عشق ظاہری کی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ اس کے تصورات پر لیلیٰ کا تصور اس قدر غلبہ حاصل کرچکا تھا کہ لیلیٰ کے

سوائے اس کو کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ لیلیٰ کے گھر گیا تو اس کے گھر کا طواف کرنے لگا لوگوں نے پوچھا تم یہ کیا کرتے ہو، اس نے جواب دیا

اَطُوْفُ عَلَی جِدَارِ دِیَارِ لَیْلٰی　　اُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارَ وَذَا الْجِدَارَ

وَمَا حُبُّ الدِّیَارِ شَغَفْنَ قَلْبِیْ　　وَلٰکِنْ حُبُّ مَنْ سَکَنَ الدِّیَارَ

یعنی میں ظاہر میں تو لیلیٰ کے شہر کا طواف کر رہا ہوں، کبھی اس دیوار کو اور کبھی اس دیوار کو بوسہ دیتا ہوں میرا دل اس شہر کی محبت میں نہیں بلکہ اس شہر میں بسنے والے کی محبت میں سرشار ہے

یہ تو حقیقی عشق کہ سوائے محبوب کے تصور کے اور کوئی چیز پیشِ نظر ہی نہیں۔ یہ واضح رہے کہ اگر ایسا نہ ہوگا تو پھر وہ عشق نہ ہوگا بلکہ اس کو فسق کہتے ہیں، مجنوں کو لیلیٰ کی ذات سے عشق نہ تھا بلکہ وہ تو اس کے اس جمال سے عشق کرتا تھا جو لیلیٰ کے وجود میں ظاہر ہو رہا تھا۔

باز بنگر قصۂ محمود در عشقِ ایاز　　چند گویم زیں زیادہ می شوم از شغل باز

ترجمہ: پھر ایاز کے عشق کے سلسلے میں محمود کے واقعہ پر غور کرو، اس سے زیادہ میں کہوں گا تو دوسرے شغل کے ذکر سے باز رہوں گا۔

تشریح: یہ عشقِ مجازی کی ایک دوسری مثال ہے جہاں ایک شہنشاہ ایک معمولی غلام کی صفات پر فریفتہ ہو گیا۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ایاز کا حسنِ ظاہری بھی ایسا نہ تھا کہ شہنشاہ کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا۔ در اصل ایاز کی ذات میں جو خوبیاں تھیں محمود کی رغبت انہیں خوبیوں کی وجہ سے عشق کی حد تک پہنچ گئی۔ ایاز کی نگاہ میں بھی سب سے زیادہ وقعت شہنشاہ کی تھی کہ وہ اپنے آقا کے ایک اشارے پر جان نچھاور کرنے سے بھی دریغ نہ کرتا تھا، ایاز کے اسی خلوص و جذبۂ اطاعت نے ایک شہنشاہ کو اپنے اوپر فریفتہ کر لیا، محمود و ایاز کے واقعات اس حقیقت کے شاہد ہیں۔

بہر حال عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی تک اسی وقت پہونچانے والا ہوتا ہے جب اس میں قلب و نظر اور تصورات پاکیزہ ہوں اور شیخِ کامل کی رہنمائی بھی ہو تاکہ وہ اپنی خداداد بصیرت سے ان سخت مراحل سے بہ آسانی عہدہ برآ ہونے کے ساتھ وہ راستہ بتلا دے جو محبوبِ حقیقی تک جاتا ہے۔

دربیانِ شغلِ دماغی

شغلِ دماغی کا بیان

جسمِ انسانی میں جس طرح قوتِ مؤثرہ کا مرکز قلب ہے اسی طرح قوتِ متاثرہ کا مرکز دماغ ہے۔ اعصابی نظام کے ذریعہ تمام جسم میں قوتِ احساس کا ادراک دماغ کرتا ہے، اگر دماغی نظام معطّل یا مجروح ہو جائے تو اکثر اوقات حیاتِ جسمانی کے باوجود لذّتِ حیات ختم ہو جاتی ہے کیونکہ قوتِ احساس ختم ہو جانے کی وجہ سے انسانی جسم ایسے مرحلہ سے گذرتا ہے کہ نہ اس کو زندہ قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ مُردہ۔

خارجی یا داخلی طور پر جسمِ انسانی سے متعلق دماغ کی کارکردگی کا ابھی تک کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکا چہ جائیکہ دماغی نظام کی مکمل تشریح۔ یہ تو دائرۂ تحریر سے باہر کی بات ہے صرف متعینہ یادداشت کے سلسلے میں ایک محقق کا یہ اندازہ ہے کہ ایک درمیانی عمر کے آدمی کے ذہن میں اتنی یادیں ہوتی ہیں کہ اوسط درجہ کے ۲۴ ارب پچاس کروڑ صفحات اُن سے بھرے جاسکتے ہیں۔ دماغ کی ساخت میں دس بلین عصبی خلیے ہیں اور بافت میں ہزاروں ملین لحمیئہ ذرے ہیں۔ یہ ذرات معلومات کو کیمیاوی کوڈوں کی شکل میں رجسٹر کر لیتے ہیں جن میں بے شمار موجودات، ان گنت ایجادات، لامحدود محسوسات اور معقولات کا خزانہ محفوظ ہے، اسی طرح دماغی نظام کے ایک شعبہ کے ذریعہ جسمِ انسانی میں قوتِ شہوانیہ کا نظام ترتیب دیا جاتا ہے، اگر دماغ میں خلل واقع ہو جائے تو شہوت کا ادراک نہیں ہو سکتا چنانچہ پاگل آدمی جہاں اور بہت سی لذتوں کے ادراک سے محروم ہے لذّتِ شہوت کے ادراک سے بھی محروم ہے۔

دماغی نظام کے سلسلے میں یہ بہت مختصر سی تمہید اس لئے بیان کی گئی کہ مصنف رحمۃ اللہ اب جو شغل بیان کر رہے ہیں اس شغل کا عنوان "شغلِ دماغی" رکھا ہے، کیونکہ اس شغل کے

ذریعہ قوتِ شہوانیہ کو قابو میں کر کے جوہرِ حیات (مادۂ منویہ) کو صحیح طور پر استعمال کرنا مقصود ہے اور یہ اسلئے ضروری ہے کہ جوہرِ حیات کے اجزاء کی درستگی پر نظامِ جسمانی کی عمدگی کا انحصار ہے اور جسمانی نظام بھی صحیح معنی میں اسی وقت تک درست رہ سکتا ہے جب یہ جوہرِ حیات توانا اور شگفتہ اجزاء کے ساتھ جسم میں موجود ہو، اور اس توانائی اور شگفتگی کا انحصار اعضاءِ رئیسہ کی صحت پر ہے اور اعضاءِ رئیسہ کی عمدگی موقوف ہے اخلاطِ اربعہ کے اعتدال پر، اور یہ اعتدال ہی جسمانی نظام کو صحت مند رکھنے کا ذریعہ ہے، ورنہ جب جسم میں کمزوری اور پژمردگی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر عمدگی کہاں؟ دنیا اور دین کے کاروبار معدوم نہ بھی ہوں تو کالعدم ضرور ہو جاتے ہیں، جسم کے اس تمام نظام میں دماغ کے ایک شعبہ کی کارکردگی جوہرِ حیات کی پیدائش، اور اخراج ہی نہیں بلکہ اس مخصوص نظام کی تحریک میں بھی خاص درجہ رکھتی ہے، اسی لئے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اس شغل کو "شغلِ دماغی" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

شغلِ دیگر در دماغت می شنو از من خبر   بنگر آبِ زندگیت اندرونش اے پسر

ترجمہ: ایک اور شغل جس کا تعلق تیرے دماغ سے ہے اسکی تفصیل مجھ سے سن، اپنے جوہرِ حیات کی پوشیدہ حقیقت کے بارے میں غور و فکر کر۔

تشریح: اس میں کوئی شک نہیں کہ دماغ کی صلاحیتیں رحمتِ خداوندی کا بے مثال عطیہ ہیں لیکن سب سے اہم کام ان صلاحیتوں کا صحیح استعمال ہے، صوفیاء حضرات نے قلب کے ساتھ دماغ کی پاکیزگی کا تناسب بھی باقی رکھا ہے، تاکہ قوتِ مؤثرہ اور متاثرہ یکساں طور پر پاکیزہ ہو جائیں اور معرفت کے دشوار گذار مرحلوں سے سالک بتوفیقِ خداوندی آسانی کے ساتھ گذر کر منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کر لے۔ دل اور دماغ کے ہر ایک شعبہ کی تربیت صحیح اور مثبت انداز میں ضروری ہے خاص طور پر انسانی دماغ کے اس شعبے کی نگرانی جس کا تعلق قوتِ شہوانیہ سے ہے نہایت ضروری ہے، اس پر قابو پا کر صحیح

طور پر اس کا استعمال کرنا اسباب کے تحت دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود کی علامت ہے
اس شغل کا آغاز مصنف اس طرح کرتے ہیں کہ مادّہ منویہ (جوہر حیات) بصورتِ کثافت یکجا طور پر جسم میں موجود نہیں ہے بلکہ اس کا مرکز تحریکِ دماغ ہے، دماغ جب اس احساس کو نشر کرتا ہے تو تمام اعضاء جو اس مادّے کے بنانے کے ذمّہ دار ہیں اپنے اپنے کام میں لگ جاتے ہیں اور پھر سفید سیّال کی صورت میں پیچ در پیچ مرحلوں سے گذر کر یہ مادّہ باہر آتا ہے، اس مادّے میں اللہ تعالیٰ نے کیا کیا خصوصیات رکھی ہیں ان کا کچھ انکشاف آج طب جدید کے ذریعہ ہو چکا ہے، مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اپنی غور و فکر کی صلاحیت کو دماغ کے اس مرکز کی طرف منتقل کرو جہاں سے تحریک ہوتی ہے اور اس میں یہ غور و فکر کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اسمیں کتنی عظیم حکمت پوشیدہ رکھی ہے جس سے اشرف المخلوق کی تخلیق ہوتی ہے

صورتش را چوں حبابے از منی در سر نگار کاں ز بحرِ وحدت و در جسمِ خاکی ہوشدار

ترجمہ: اس کی صورت کو جوہر حیات کے ایک بلبلہ کی طرح سر میں تصور کرو اور یہ خیال کرو کہ جسم خاکی میں یہ حباب وحدت کے سمندر سے تعلق رکھتا ہے۔

تشریح: (۱) مادّہ منویہ (جوہر حیات) تو ایک کثیف صورت میں جسم انسانی سے باہر نکلتا ہے، اس کا تصور دماغ میں کس طرح کیا جا سکتا ہے، اس کے بارے میں مصنف فرماتے ہیں کہ دماغ میں اس مادّہ کی صورت کثافتِ ظاہری سے جدا ہے۔ جس طرح کہ بلبلہ ہوتا ہے کہ اس کا وجودِ ظاہری تو نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر از اوّل تا آخر لطافت ہوتی ہے، اسی طرح دماغ میں اس مادّہ کا تصور لطافت کے ساتھ ایک بلبلہ کی طرح کیا جائے گا اور اس کی لطافت کا تعلق بحرِ وحدت سے ہوگا، یعنی اس جسم خاکی میں بحرِ وحدت کا فیضان اس حباب کے ذریعہ دماغ تک پہونچ رہا ہے اور اس فیضان کو دماغ بدن کے بقیہ اعضاء تک پہونچا رہا ہے۔

(۲) اس شغل کی صورت یہ ہے کہ کسی تنہا اور پاک صاف مقام پر بصورتِ مراقبہ قبلہ رُخ

بیٹھ کر رَبِّ لَا تَذَرۡنِیۡ فَرۡدًا وَّ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡوٰرِثِیۡنَ (اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا مت چھوڑنا اور تو بہترین نگہبان ہے) کو زبان سے ادا کرے اور پھر اس کے مفہوم کے تصور سے پروردگارِ عالم سے اپنی حفاظت کی التجا کرے اور یہ خیال کرے کہ ذاتِ پاک میرے ساتھ ہر وقت موجود ہے، اس پر مداومت کرنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ جب بھی دماغ کا یہ دریچہ کھلے گا جس کا تعلق قوتِ شہوانیہ سے ہے اور جو دماغ میں بصورت حجاب کیفیتِ لطافت کے ساتھ موجود ہے تو اس کی نسبت بحرِ وحدت یعنی فیضانِ صفاتِ خداوندی سے قائم ہو جائے گی اور شاغل اس کیفیت کو قربِ خداوندی کے حصول کیلئے ہی استعمال کرے گا۔

اس سے زیادہ پاکیزہ تصورِ طریقت میں اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کیفیت کو بحرِ وحدت سے منسوب کر کے نظامِ جسمانی میں قوتِ شہوت کو مغلوب کر دیا جائے اور انسان باوجود قدرت کے اپنی خواہش کو احکم الحاکمین کے حکم کے تابع کر دے۔ پھر رحمتِ خداوندی بھی اس طرح کے مراحل میں اس کی معاون ہوتی ہے اور سالک شیطان کے ایک بڑے جال میں پھنسنے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ هٰذا فیضانُ المرشد۔

ایں منی را روحِ انسانی ہمی گفتند داں   نورِ احمد ہم اشارت زانست دانی بیگماں

ترجمہ: اس جوہرِ حیات کو بعض نے روحِ انسانی بھی کہا ہے اور بے شک یہ بات بھی جان لو کہ نورِ احمد بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔

تشریح: یعنی دماغ میں اس جوہرِ حیات کی حجابی صورت کو بعض صوفیاء حضرات نے روحِ انسانی قرار دیا ہے اور اس کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ چونکہ شکمِ مادر میں نطفہ قرار پانے کے بعد جب جسم کی ترتیب ہوتی ہے تو سب سے پہلے روح اسی مقام پر نفوذ کرتی ہے، اس مناسبت کی وجہ سے اس حجاب کو روحِ انسانی قرار دیا جاتا ہے اور جس طرح عالمِ کبیر میں نورِ احمدی کا فیضان ہے اور تمام عالم اسی نور کا پرتو ہے اسی طرح یہ روحِ انسانی بھی عالمِ صغیر میں ہمہ گیریت کے ساتھ عمل دخل رکھتی ہے۔ عالمِ صغیر میں مکمل طور پر متصرف ہونے کی وجہ سے اس روحِ انسانی

کو جو بصورتِ حباب دماغ میں اپنا مسکن بنائے ہوئے ہے نورِ احمدی کی طرف صفتِ بسیط

کی وجہ سے منسوب کر دیتے ہیں۔

ذاتِ مجمل جسم و روحش ہر یکے گفتند راست　　　　من چہ گویم می نگر تفسیر قرآں صفا ست

ترجمہ: بعض حضرات نے بجا طور پر جسم اور روح کیلئے اس حباب کو ذاتِ مجمل کہا ہے میں

اس کے بارے میں کیا کہوں، قرآن پاک کی تفسیر میں صاف صاف بیان کیا گیا ہے۔

تشریح: یہاں مصنف رحمۃ اللہ علیہ ایک اور رجحان کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس طرح بعض حضرات اس صورتِ حبابی کو روحِ انسانی قرار دیتے ہیں، اسی طرح بعض حضرات نے اس کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ اس حباب کا تعلق صرف روح سے نہیں بلکہ یہ جسم اور روح دونوں کا اجمالی طور پر مجموعہ ہے۔ مصنف فرماتے ہیں کہ یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ قرآن پاک میں بھی خداوند قدوس نے متعدد مقامات پر، مختلف انداز میں جسم انسانی کی تخلیق کا ذکر فرمایا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ جس جگہ بھی تخلیق کا ذکر ہے وہاں مادہ کثیف کا بھی تذکرہ ہے، کہیں اس تخلیق کی نسبت مٹی کی طرف کی گئی اور اس کے بعد روح کے نفخ کا ذکر ہے۔ کہیں پر مادہ منویہ (جوہرِ حیات) کی طرف اس امر کو منسوب کیا گیا ہے، کہیں پر خمیر سے پیدائش کا بیان کیا گیا ہے۔ غرضیکہ اسی طرح مختلف اندازِ بیان سے اس کی صراحت کی گئی ہے لیکن بنیادی بات ہر جگہ یہی ہے کہ یہ جسم اور روح کا مرکب اور مجموعہ ہے اور اس کا نقطۂ آغاز یہی صورتِ حبابی ہے جس میں تفکر کرنا اور جس کی حفاظت کرنا اور اس کی صلاحیت سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانا صحت جسمانی اور روحانی کا ضامن ہے اسی لئے اسکو جسم اور روح کا مجموعہ کہا گیا ہے۔

زیں منی جسم و تنت زیں آب رنگ و روے تو　　　　شد ازیں آب منی ہم عمر تو نے روے تو

ترجمہ: اس مادہ سے تیرا جسم اور بدن ہے اور اسی سے رنگ و روپ ہے لیکن اس

مادۂ منویہ سے تیری عمر اور تیری بناوٹ نہیں ہے۔

تشریح: یعنی اس حقیقت کے باوجود کہ اسباب کے اعتبار سے جسم انسانی کی طاقت اور صحت

کا دار و مدار اس مادّے کی صحت پر ہے اور چہرے پر تازگی و فرحت بھی اسی مادّے کی صحت پر موقوف ہے، لیکن تیری عمر اور جسم کی بناوٹ اس مادّے پر موقوف نہیں۔ مادّہ اپنی صفات کے اعتبار سے کمزور ہو یا طاقتور، اس کا اثر انسانی عمر اور بناوٹ پر نہیں پڑے گا، بلکہ یہ دونوں چیزیں تو براہِ راست اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی مرضی کے مطابق عطا کی جاتی ہیں، کسی ظاہری اسباب کے تحت نہ عمر کا معاملہ ہے اور نہ جسمانی ساخت کا دار و مدار ہے، جس کی عمر جتنی لکھدی گئی ہے خواہ وہ طاقتور ہو یا کمزور، بیمار ہو یا صحت مند، عمر کا تقاضہ اس کو پورا کرنا ہوگا، اسی طرح اگر مرد صحت مند اور طاقتور نہیں ہے تو یہ ضروری نہیں کہ اس سے متعلق نسل بھی صحت مند اور مضبوط نہ ہو، صرف جسم کے رنگ و روپ اور وجود کیلئے پروردگار نے یہ ذریعہ بنا دیا ہے۔

در دماغت ایں منی را نام شد آبِ حیات ۔۔۔۔۔ می نگر در قولِ باری تا بیابی واضحات

ترجمہ: تیرے دماغ میں اس مادّے کا نام "آبِ حیات" رکھا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کے کلام پاک میں غور کروگے تو حقیقت تم پر واضح ہو جائے گی۔

تشریح: جسم انسانی کی تخلیق باعتبار اسباب کے مادّہ منویہ کے ان عناصر سے ہے جن کو جرثومہ تولید (اسپرم) کہا جاتا ہے لیکن اس مادّہ میں مجامعت کے وقت انسانی دماغ سے غیر محسوس طریقہ پر حیاتیاتی عنصر نکل کر اس کیمیائی عمل میں شریک ہو جاتا ہے۔ طبِ جدید اور قدیم دونوں اس پر متفق ہیں۔ اور اگر بفرضِ محال متفق نہ بھی ہوں تب بھی قرآن پاک کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قرآنِ پاک تو صاف اعلان کرتا ہے کہ ہم نے انسان کو ایسے پانی سے پیدا کیا جو اچھلتا ہوا سینے اور پشت کے درمیان سے پیچیدہ راستوں کے ذریعہ نکلتا ہے، اور یہ تمام عمل دماغ کی نگرانی کے تحت ہوتا ہے، اسی وجہ سے اس مادّہ کی حقیقت کا تعلق دماغ سے ہے اور اسی حقیقتِ مادّہ کو جوہرِ حیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جسم ہر یک آدمی را ذات مجمل شد منی ۔۔۔۔۔ شد مفصّل وجہ ہر اعضا راز و یکدا منی

ترجمہ: ہر ایک آدمی کا جسم مجمل طور پر مادّہ منویہ کی ہی ایک شکل ہے، پھر اسی ایک نقطہ

کے پھیلاؤ سے تمام اعضاء جسمانی کا وجود ہوا۔

تشریح : اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کس قدر بے مثال ہے کہ اس مادۂ منویہ کے اندر پوشیدہ معمولی سے جرثومہ (اسپرم) میں انسانی اعضائے جسمانی کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے، مجمل طور پر تو یہ ایک ذرہ بے مقدار اور نقطۂ بے حیثیت معلوم ہوتا ہے، لیکن جب اس کی صلاحیت تفصیلی انداز میں سامنے آتی ہے تو اسی کے ذریعہ مکمل انسان کے تمام اعضاء تشکیل پاتے ہیں تو گویا مجمل طور پر اسی مادہ کا وجود انسان کی حیثیت رکھتا ہے اور تفصیلی طور پر اس کی صلاحیت تمام اعضائے جسمانی کو وجود بخشتی ہے۔

می نگر ایں آبِ حیواں را در وِش ہمقریں　　تا رسی در قربِ عالی اِلٰہ العٰلمین

ترجمہ : اس جوہرِ حیات کو ہمیشہ اپنے دماغ کے اندر بہت قریب سے دیکھ، تاکہ پروردگارِ عالم کا قرب حاصل کر کے بلند مراتب کا حصول ہو جائے۔

تشریح : جو طریقہ اس شغل کا بیان کیا گیا ہے اس پر عمل پیرا ہو کر اس بات کا تصور قائم کرے کہ میرے دماغ میں اس مرکزِ حیات کا تعلق اللہ تعالیٰ کے نور کے فیضان سے ہے، اور یہی نور تمام جسم کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس نور کے ذریعہ جو زندگی مجھے عطا کی گئی ہے اس کا استعمال صرف اسی ذاتِ پاک کے حکم کے مطابق اس کا قرب حاصل کرنے کیلئے کروں گا، اور دنیائے فانی کی فنا ہونے والی لذتوں کو عام طور پر اور خواہشِ شہوانیہ کو خاص طور پر اپنے دل و دماغ پر غالب نہ ہونے دوں گا۔ اس انداز پر غور و فکر کرنے سے یہ رجحان سالک کے ذہن میں پیدا ہو جائے گا کہ یہ زندگی اور جسمانی صحت اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت ہے جو بطور امانت میرے سپرد کی گئی ہے تو پھر اس کا استعمال لازمی طور پر صرف اسی ذاتِ پاک کا قرب حاصل کرنے کے لئے ہوگا جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی ہے اور یہی مقصودِ حیات ہے۔

در خودیٔ خود شود گم از دوامِ شغلِ ایں　　دم مسخر می شود گردد بہ دلبر ہمقریں

ترجمہ : اس شغل میں پابندی کے ساتھ مشغول ہونے سے سالک اپنی خودی سے بھی بے خبر

ہو جاتا ہے اسکا سانس بھی اسکے قابو میں ہو جاتا ہے اور مقصود دلی سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔

تشریح: جب سالک استقلال اور پابندی کے ساتھ اس شغل میں مشغولیت اختیار کرے اور اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے خیالات میں پاکیزگی پیدا کر لے شہوانی خیالات کو دل دماغ سے نکال کر باہر کرے تو گویا اس نے اپنے وجود کو ختم کر دیا، اس کا اپنا کوئی وجود ہی نہ رہا، جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، صرف اسی حکم کی اطاعت و فرمانبرداری اس کا نصب العین ہے، اسی کا نام اپنے وجود سے بے خبر ہونا ہے، اس کے بعد جب اس کی تمام آرزوئیں مالکِ حقیقی کے احکام کے تابع ہو جائیں گی تو عبادت و ریاضت میں اس کو وہ لطف محسوس ہوگا کہ اس کا کوئی سانس اُس معبود حقیقی کی یاد سے خالی نہ ہوگا، گویا سانس پر بھی اس کو قابو حاصل ہو گیا، اس کے بعد مشاہدہ کی وہ منزل جہاں محبوب کے جلوے ہر وقت ایک نئی شان کے ساتھ موجود ہوتے ہیں، اس کے سامنے ہوگی یہی وہ مقام ہے جہاں ذکر اور ذاکر کالعدم ہو جاتے ہیں اور صرف مذکور ہی موجود رہتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہو سکتی ہے۔ اللّٰھمّ اجعلنا منھم۔

ہست بس خاصیت ایں شغل برتر اے فتیٰ ۔۔۔ گر بگویم دور افتم از بیان شغلہا

ترجمہ: اے سالک! اس شغل کی خاصیتیں تو بہت ہی اعلیٰ اور ارفع ہیں، اگر میں ان سب کو بیان کرنے میں مشغول ہو جاؤں تو دوسرے اشغال کے ذکر سے رہ جاؤں گا۔

تشریح: اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ جو شئے معرفت خداوندی تک پہونچانے والی ہوگی اس کا مرتبہ بہت ہی اعلیٰ اور ارفع ہوگا۔ اس کتاب کے دیگر اشغال کی طرح یہ شغل بھی معرفت خداوندی کا بہترین ذریعہ ہے، اس لئے مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کے ثمرات و خواص کو دائرۂ تحریر میں لانا بہت مشکل ہے بس مشغولیت کے بعد ہی اس کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ اگر میں اس شغل کے فوائد کی تفصیل بیان کرنے لگوں تو سلسلۂ گفتگو بہت طویل ہو جائے گا اور دیگر اشغال کا ذکر مختصر طور پر کرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔

ایں مقام و مسکن روح است بے شک اے استدال ... از عنایات خدا گویم دِگر جا شرح آں

ترجمہ: اس بات کو یقینی طور پر صحیح مان لو کہ یہ روح کا مسکن اور قیام گاہ ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوسری جگہ میں اس کی تشریح کروں گا۔

تشریح: یہ معاملہ محققین حضرات کے یہاں مختلف فیہ ہے کہ جسم انسانی میں روح کا مسکن اور مقام کس جگہ ہے، بعض حضرات نے قلب کو اور بعض حضرات نے جگر کو اس کا مسکن قرار دیا ہے، مگر مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس خیال کی تائید کر رہے ہیں کہ روح کا مسکن اور مقام دماغ میں وہ جگہ ہے جہاں ایک نقطہ لطیف حجاب کی صورت میں ہے، چنانچہ اس کی مختصر تشریح روح کے بیان میں بھی کی گئی ہے۔

آنچہ اینجا شغل گویم ہوشداری اے پسر ... از نگاہ دل بنوشی ایں منی را سر بسر

ترجمہ: یہاں پر جو شغل میں بیان کر رہا ہوں اے سالک تو اس کی طرف توجہ کر، کہ اس جوہر حیات کو نگاہ دل کے ذریعہ نوش جان کر۔

تشریح: مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الفاظ کے ساتھ بحث کرنے سے مقصد حاصل نہیں ہوتا، اس لئے اس طرف توجہ کرنا دانش مندی کے خلاف ہے، جہاں تک ممکن ہو سکے کسی ایک شغل میں مشغولیت اختیار کرنی چاہیئے۔ سالک کیلئے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ گناہوں سے ہی نہیں بلکہ لایعنی اور فضول باتوں سے بھی اپنے کو بچائے اور جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کو توجہ کے ساتھ سُنے اور پھر اس پر عمل کرے۔ یہی معاملہ اس شغل سے بھی متعلق ہے کہ سالک پوری توجہ کے ساتھ اس جوہر حیات کی حفاظت کرے اور اپنی تمام تر صلاحیت کو مقصود اصلی کے حصول میں صرف کرے۔

گر بنوشی نور ایں را می زئی تو سال تام ... شغل برتر گفت ایں را سالک عالی مقام

ترجمہ: اگر تو اس نور کو نوش جان کریگا تو مدت دراز تک تیری صحت مندانہ حیات باقی رہے گی، اس شغل کو بلند مرتبہ سالکین نے بہت اعلیٰ اور عمدہ شغل قرار دیا ہے۔

تشریح : اس سے پہلے اس جوہرِ حیات کو نگاہِ قلب سے نوشِ جان کرنے کیلئے کہا تھا یہاں پر اس کی حکمت بیان کی جارہی ہے کہ اس جوہرِ حیات کی حفاظت کرنے سے یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ اسباب کے تحت سالک مدتِ دراز تک صحت مندانہ زندگی گذارے گا۔ ظاہر بات ہے کہ جب مزاج اعتدال پر ہوگا تو عبادت وریاضت اور فرائض کی ادائیگی کا اہتمام بھی اعلےٰ طریقہ پر ہو سکتا ہے، صحتِ جسمانی بہتر ہے تو صحتِ روحانی بھی عمدہ ہوگی اور ہمت واستقلال بھی باقی رہے گا، اور یہ سب اسباب سب سے اعلیٰ منزل کی طرف کامیابی کے ساتھ قدم اُٹھانے کے لئے بہترین ذرائع ہیں، اسلئے اعلیٰ پیمانہ پر ان اسباب کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ اس اہمیت کے پیشِ نظر بلند مرتبہ سالکین نے اس شغل کو بہت عمدہ اور اعلیٰ قرار دیا ہے۔

من نگویم ایں عمل از ہر مہم راست داں   از منی خالی نبودہ ہیچکس تا ایں زماں

ترجمہ : میں نہیں کہتا کہ یہ عمل بہت بہتر ہے بلکہ ہر ایک تجربہ کار سے اس کی اہمیت کی تصدیق کرلو، کیونکہ اب تک کوئی ایسا شخص نہیں گذرا جو اس جوہرِ حیات سے خالی ہو۔

تشریح : یعنی یہ شغل صرف صوفیا حضرات کے معمولات میں شامل ہونے سے ہی اہم نہیں ہے بلکہ اس کے فوائد تو اس طرح روشن اور ظاہر ہیں کہ ہر ایک ذی ہوش اور تجربہ کار آدمی بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتا، کیونکہ یہ جوہرِ حیات تمام انسانوں میں حسبِ استعداد پایا جاتا ہے، اس لئے ہر ایک شخص اس کی اہمیت کا اقراری ہے۔

من دریں جا ایں عمل میگویم از پیرانِ خویش   می نگر اندر حبابے نورِ خود را پیش پیش

ترجمہ : میں یہاں پر اس شغل کو اپنے مرشدوں کے واسطے سے بیان کررہا ہوں کہ حباب کی صورت میں اپنے اس نور کو اپنے سامنے تصور کرو۔

تشریح : صوفیا سالکین نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے نورِ احمدی کا جو فیضان بصورتِ حباب تیرے دماغ میں ودیعت فرمایا ہے اس نور کو تصوراتی اعتبار سے اپنی نگاہِ قلب کے سامنے رکھ، اور اس بات پر غور کرکہ اس قدر عظیم الشان اور اعلیٰ وارفع

نعمت جو تجھ کو عطا کی گئی ہے اس سے تو کس انداز سے فائدہ حاصل کرے، جب تجھ کو اپنی اس اہمیت کا احساس ہو جائے گا تو خود شناسی کی توفیق بھی میسّر ہو جائے گی اور جب خود شناسی کی توفیق میسّر ہو گی توان شاء اللہ تعالیٰ خدا شناسی کی منزل بھی مل جائے گی، جیسا کہ مصنف فرماتے ہیں کہ:

خود شناسی حق شناسی ہم ازینجا ہست راست　　　چند گویم یک سخن در یک مقامے شغلہاست

ترجمہ: یہیں پر یہ بات سچ ثابت ہو جاتی ہے کہ خود شناسی ہی خدا شناسی ہے، ایک مقام پر ایک سے زیادہ کیا بات کہوں اور بھی بہت سے اشغال کا ذکر کرنا ہے۔

تشریح: تمام تر تحقیق و جستجو کے بعد بات وہیں پر آکر اختتام پذیر ہوتی ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ، یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا، اور تمام اشغال کی روح بھی یہی ہے، یہ حقیقت بھی ہے کہ جس کو اپنا ہی احساس نہ ہو گا اور خود شناسی کی طرف توجہ ہی نہ ہو گی تو خدا شناسی تک اس کا دھیان کب جا سکتا ہے، اس طرف توجہ بالکل ناممکن ہے، اس لئے اس بات پر غور و فکر کرنا ضروری ہے کہ جو دولتِ حیات اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی گئی ہے اور اسباب و عوامل کی جو ترتیب جسم میں رکھی گئی ہے کیا ان کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا اس طرح کے استعمال میں فلاح و کامرانی ہے؟ یا اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ان تمام صلاحیتوں کو صرف کرنا باعثِ سعادتِ دارین ہے؟ جب اس طرف توجہ ہو گی تو معرفتِ نفس کا مسئلہ بالکل آسان ہو جائے گا اور جب معرفتِ نفس حاصل ہو جائے گی تو معرفتِ خداوندی کا دروازہ بھی کھل جائے گا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین

✣✣✣✣✣✣✣✣✣✣✣✣

دربیان ہوائے خالی از عدم

اس ہوا کا بیان جو عدم سے خالی ہے

شغل دیگر در حباب ہے جائے خالی راہواست ۔ روشنائی در عدم معدوم بینی ہر کجا است

ترجمہ: ایک اور شغل کا بیان سنو کہ حباب میں جو خالی جگہ ہے وہاں ہوا ہے جس جگہ بھی دیکھو وہاں روشنی کو عدم میں معدوم تصور کرو۔

تشریح: یہاں مصنف رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسا شغل بیان فرما رہے ہیں جس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ کائنات میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں کسی شئے کا وجود نہ ہو خواہ اس شئے کا وجود ہم کو نظر آتا ہو یا نظر نہ آتا ہو، یعنی عدم محض کہیں نہیں پایا جاتا۔ جس طرح کہ پانی کا بلبلہ ہے اس میں بہ ظاہر کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جس کو بغیر کسی آلہ کی مدد کے ہم اپنی آنکھ سے دیکھ سکیں حالانکہ وہاں ہوا موجود ہے۔ اسی طرح تمام کائنات میں جو مقامات مادی اشیاء کے وجود سے خالی ہم کو نظر آتے ہیں تو اس کا سبب ہماری نظر کی نارسائی ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ذاللہ بکل شیءٍ محیط، تجلیاتِ خداوندی تو کائنات کی ہر ایک شئے کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہیں، جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ خالی جگہ میں تجلیاتِ خداوندی کا وجود ہے تو وہ مقام جو زمین اور آسمان کے درمیان ہے اس میں بھی تجلیات موجود ہیں۔ اس خلار کو ہوا بھی کہتے ہیں۔ اگرچہ ہوا کے معنی خواہش کے بھی ہیں اور اس عنصر کے بھی ہیں جو عناصر اربعہ میں سے ایک ہے، لیکن یہاں مصنف کی مراد ہوا سے وہ خلا ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان ہے اور بظاہر کسی شئے کا وجود اس خلا میں نظر نہیں آتا۔ اسی بنا پر مصنف فرماتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی تم کو کوئی شئے نظر نہ آئے یعنی عدم کا احساس ہو تو اس عدم کے تصور کو اپنے ذہن سے مٹا دو اور اس عدم میں تجلیاتِ باری کے وجود کا یقین کرو۔ اسی لئے اس شغل کا نام شغل ہوا بھی ہے، کیوں کہ ہوا سے مراد لاہوتیت بےچون و بےچگونہ ہے۔ محققین نے یہ بھی تحریر فرمایا

ہے کہ اس شغل کو سلطاناً نصیراً اور سلطاناً محموداً کے بعد کرنا چاہیئے۔ ھٰکذا قال مرشدی۔

ہر چہ بینی از ہوا می شد ہویدا نقشہا
ایں تنش را در ہوا می دار بشکن شکلہا

ترجمہ: جو کچھ بھی تو دیکھ رہا ہے اس کا وجود ہوا سے ہوا ہے، اس بدن کو بھی ہوا میں رکھ دو اور اس کی شکل وصورت کو توڑ ڈالو۔

تشریح: یعنی جو کچھ کائنات میں ہے اُس کا وجود ہوا سے ہے اور ہوا نام ہے قدرت خداوندی کا اور تجلیات باری کا، لہذا ہر ایک شے کا وجود قدرت خداوندی سے ہے۔ سالک کا اپنا وجود بھی اسی خالق مطلق کی قدرتِ کاملہ کا شاہکار ہے۔ اس لیے تمام اشیاء کو یہاں تک کہ اپنے وجود کو بھی اسی کے سپرد کردو، اپنی طرف سے کسی قسم کی شکل وصورت متعین نہ کرو۔ یعنی اپنی تمام خواہشات کو ختم کر ڈالو اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے سانچے میں اپنے کو ڈھال لو۔ خواہشات بھی بظاہر نظر نہیں آتیں مگر اُن کے وجود سے کون انکار کرسکتا ہے۔ یہی اس شغل کا مقصد ہے جس کو صوفیائے کاملین نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ کسی پُرسکون مقام پر بصورت مراقبہ، باوضو قبلہ رخ نشست اختیار کرے اور لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ کا تصور اس طرح کرے کہ اس کی ہستی کے مقابلے میں تمام کائنات کی ہستی کو فانی یقین کرے۔ یہاں تک کہ اپنی ہستی کو، اپنی تمام خواہشات کو بھی مٹا کر رب کی مرضی کو ہر لمحہ مدِ نظر رکھے کیونکہ

نقش بشکن بیخ برکن از قیامِ تن درخت
تا بگرود از شکستن در بقائے بار سخت

ترجمہ: اس نقش کو توڑ ڈال اور اس درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر وجود ہی کو ختم کر دے تاکہ ٹوٹنے کی وجہ سے بہترین ثمرات کی حصولیابی ہو جائے۔

تشریح: جب سالک کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ ہر جگہ اسی کا وجود ہے، اسی کی تجلی ہے تو پھر میرا وجود کہاں، یعنی اپنی نفی بھی کرنی ضروری ہے اور تمام خواہشات کا توڑنا اور چھوڑنا ضروری ہے، خواہشات کے ٹوٹنے سے بظاہر بہت تکلیف ہوتی ہے اور بعض مرتبہ نقصان ظاہری کا معاملہ بھی سامنے آتا ہے لیکن مصنف فرماتے ہیں کہ اس قسم کے تصورات قائم کرنے

سے اور اپنی آرزوں کو سپردِ خدا کرنے کا معاملہ ایسا ہے جیسا کہ بعض پودوں کو ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگانے سے اُن کی پرورش میں نمایاں تبدیلی ہوجاتی ہے اور انگور کی بیل کی کاٹ کر چھانٹ دینے سے اور زیادہ پھل آتا ہے، اگرچہ ظاہر بیں آنکھ سے پیڑ کو جڑ سے اکھاڑنے کے عمل کو دیکھا جائے تو یہ عمل عقل کے خلاف نظر آتا ہے اور اسی طرح انگور کی بیل کی کاٹ چھانٹ بھی ایک ناواقف شخص کے لئے خلافِ عقل کام ہوگا، لیکن واقف کار اور حقیقت آگاہ نگاہیں اس فعل کے نتائج پر مرکوز ہوتی ہیں۔ اسی طرح جو حضرات بحرِ معرفت کے غواص ہیں ان کی نظریں ذاتِ پاک کی لامحدود صفات پر رہتی ہیں اور ان صفات کے سامنے وہ اپنے وجود کو، تمام کائنات کے وجود کو کالعدم یقین کرتے ہیں، ہر طرف ہی وہ ہے کا تصور ان کی نگاہوں میں سمایا رہتا ہے، تو اس کے بہترین نتائج سے بھی وہ فیضیاب ہوتے ہیں اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُم۔

بت پرستی راست آمد کفر اینجا اے پسر　　　چادرِ معدومیت پوش و دراں شو بے خبر

ترجمہ: اے سالک! اس مقام پر بُت پرستی یقینی طور پر کفر ہے، بلکہ معدومیت کی چادر اوڑھ لے اور اس میں بے خبر ہوجا۔

تشریح: اس شغل میں ضروری ہے کہ تمام موجودات کی نفی کی جائے اور صرف وجودِ مطلق کو بہمہ اوصاف متصف مان کر منزلِ مقصود بنانا ضروری ہے ورنہ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ کا تصور اپنے مفہوم کا ساتھ دینے سے عاجز ہوگا، تمام موجودات کی نفی، اپنی نفی، بلکہ اپنے اندر کی تمام خواہشات کی یکسر نفی کرنا ضروری ہے، اگر کسی خواہش کا ہلکا سا بھی تاثر ہوگا تو گویا مکمل طور پر بُت شکنی نہیں ہوئی۔ اس لئے تمام خواہشات کو رضائے مولیٰ کے تابع کرکے سوائے اس وجودِ مطلق کے کچھ اور پیشِ نظر ہونا ہی نہیں چاہیئے۔ چادرِ معدومیت کو اوڑھنے کے معنٰی یہ ہی ہیں کہ اپنے کو کُل طور پر سپردِ خدا کردیا جائے یعنی زندگی کے ہر گوشہ میں احکم الحاکمین کا حکم نافذ ہو۔

می گذر از عقل دائم در ہوائے خویش باش　　　در ہوائے دلربا آں بد ہوا از دل تراش

ترجمہ: عقل کی منزل سے گذر جا اور ہمیشہ اپنے خیال میں مگن رہ۔ اس محبوب کی

چاہت میں رہ کر دیگر تمام خواہشات کو دل سے کھرچ ڈال۔

تشریح : ایک حدیثِ پاک کا مفہوم ہے کہ اللہ کا ذکر اس قدر کرو کہ لوگ تم کو مجنوں کہنے لگیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ذکرِ خدا کرتے کرتے مجنون و پاگل ہو جائے بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ جل شانہ کی رضا کو پیش نظر رکھو، اگر کسی جگہ کوئی دنیاوی فائدہ بھی ہوتا ہو اور اللہ کے حکم کے خلاف ہو تو اس کام کو فوراً چھوڑ دینا ضروری ہے۔ خواہ عقل اس کے خلاف فیصلہ کرے یا عوام اور دوست واحباب، اپنے بیگانے یہ کہنے لگیں کہ یہ آدمی کیسا پاگل ہے کہ اس قدر عظیم فائدے کو چھوڑ رہا ہے۔ ان تمام مراحل میں مومن سالک کی نظر صرف ذاتِ وحدہٗ لاشریک کے حکم پر، اس کی خوشی پر ہونی چاہیئے۔ یہی مقصد مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ اگر عقل احکم رب کے خلاف کرنے پر اکسائے اور نفع ونقصان کی ترازو کو سامنے لاکر رکھ دے تو بغیر پس وپیش کے اس منزل سے گذر جاؤ اور صرف اسی کی خوشی کو اپنی منزل بناؤ۔ اس کی رضا جوئی کے سوا اپنی تمام خواہشوں کو دل سے نکال دو۔

کن ہوائے ظاہری و باطنی را بس یکے بے درنگی می رسی در حق تعالیٰ بے شکے

ترجمہ : اپنی تمام ظاہری وباطنی خواہشوں کو بس ایک مرکز سے ملادو گے تو بے شک بہت جلد معیتِ ذات کی منزل تک رسائی ہو جائے گی۔

تشریح : جس طرح دنیاوی خواہشات کو ظاہری اعتبار سے سالک نے دل سے علیحدہ کر دیا، اسی طرح باطنی اعتبار سے بھی خواہشات سے دل کو پاک کر لینا چاہیئے اور ظاہر وباطن میں صرف اسی کی آرزو، اسی کی تمنا، قلبِ سالک میں ہونی چاہیئے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ تو علام الغیوب ہے اس کے نزدیک ظاہر وباطن یکساں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ سالک ظاہری طور پر تو پاک صاف ہو لیکن دل میں خواہشات کا وجود ہو۔ کیونکہ ایسا ہونے سے معرفت کی منزل پالینا ناممکن ہے اور جب سالک کا ظاہر وباطن یکساں طور پہ پاک صاف ہو جائے گا اور ایک ذاتِ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی رضا جوئی کے علاوہ قلب میں کچھ باقی نہ رہے گا تو پھر ان شاء اللہ تعالیٰ بہت جلد رحمتِ خداوندی

اس کو نوازے گی اور بابِ معرفت اس کے لئے کھول دیا جائے گا۔

چند گویم اے پسر در شغل باشی ہمقریں　　رازِ دیگر شرح سازم می شنو اکنوں ہمیں

ترجمہ: اور زیادہ کیا کہوں، بس اے سالک اس شغل میں پابندی کے ساتھ مشغول ہو جا اس کے بعد ایک اور رازِ معرفت تجھ سے بیان کرتا ہوں اس کو بھی اب سُن لے۔

تشریح: مصنفؒ فرماتے ہیں کہ اس شغل کے فوائد تو بہت ارفع و اعلیٰ ہیں جن کو بیان کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہوگا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کا بیان دائرۂ تحریر سے باہر ہے اور نہ اس کی اجازت ہے بس سعادت مند اور خوش نصیب سالک کے لئے ضروری ہے کہ وہ حسبِ ہدایتِ مرشد اس شغل میں مشغول ہو کر اس کی کیفیات سے بہرہ ور ہو، اس کے بعد مصنفؒ ایک اور شغل بیان فرماتے ہیں۔

دربیانِ شنیدنِ صوت کہ عالم از نہاں آفریدہ

اس آواز کے سننے کا بیان جس کے ذریعہ کائنات عدم سے وجود پذیر ہوئی!

شغلِ دیگر می شنو زاں صوت عالم از نہاں کرد پیدا حق تعالیٰ نامِ آں دہ صد زباں

ترجمہ: ایک دوسرا شغل سنو کہ جس آواز کے ذریعہ کائنات کو عدم سے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا۔ اس شغل کا نام "ہزار زبان والا شغل" ہے۔

تشریح: یہاں پر مصنف شغل "دہ صد زبان" یعنی ہزار زبان والا شغل کے عنوان سے ایک ایسا شغل بیان فرما رہے ہیں جس کے ذریعہ بتوفیق خداوندی سالک کا رابطہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کے ظہور کی ابتدا سے قائم ہوجاتا ہے۔ اس لیے اس شغل کا بنیادی مرکز یہ ہے کہ جس طرح عاشقِ صادق اپنے محبوب کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے کتنا تڑپتا ہے اور کیا کیا جتن کرتا ہے، اس کے ساتھ باتیں کرنے کے لئے کیا کیا مصائب اٹھاتا ہے یہاں تک کہ صرف آواز سننے کے لئے کیسے کیسے مواقع تلاش کرتا ہے۔ اگر قسمت سے اس کی آواز عاشق کے کانوں میں آجائے تو یہ اس کے لئے ایسی بیش قیمت نعمت ہوتی ہے کہ اس کے سامنے دنیاوی دوسری نعمتیں ہیچ ہیں۔ محبوب کی آواز کے خمار اور سحر سے کس کافر کو انکار ہوسکتا ہے؟ یہ معاملہ تو اس محبوبِ مجازی کی آواز کا ہے جس کا سنانے والا بھی فانی، اور سننے والا بھی فانی ہے بلکہ باعتبار سماعت آواز بھی فانی ہے اگرچہ وجود کے اعتبار سے انسانی آوازیں بھی فانی نہیں بلکہ فضا میں باقی رہتی ہیں، پھر اس ذاتِ پاک کی آواز کا تو کچھ کہنا ہی نہیں کہ وہ ذاتِ پاک بھی ازلی و ابدی ہے اور اس کی تمام صفات بھی ازلی و ابدی ہیں۔ پس اس ذاتِ پاک کی طرف سے تمام مخلوقات کو وجود عطا کرنے کا اشارہ سب سے پہلے جس صوتی ہیئت اور آواز کی کیفیت کے ذریعہ ہوا تھا وہ امر "کُن" تھا، اس کی لامحدود قدرت کے ادنیٰ اشارے "کُن" سے تمام موجودات وجود پذیر ہوگئیں اور اس

امرِ کُن کا صوتی نغمہ آج بھی اُسی شان کے ساتھ گونج رہا ہے۔ صوفیارِ محققین نے اسی نغمہ کی شیرینی اور ابدیت سے اپنے کانوں کو آشنا کر کے جو لذّت و کیفیت حاصل کی ہے اس کا اظہار الفاظ کے دائرے سے یقینی طور پر باہر ہے۔

اس حکم کی کیا نوعیت تھی اور کس طرح پروردگارِ عالم نے اس حقیقت کا انکشاف فرمایا تھا اس تک رسائی تمام مخلوقات کی قوتِ امکانیہ سے مکمل طور پر باہر ہے، ہمارے لئے بس اسی قدر کافی ہے کہ اس پروردگار نے اس حقیقت کو ہمارے لئے "کن" سے تعبیر فرما کر منزل کے قریب کر دیا۔ اس لذّت کا احساس تو وہی حضرات کر سکتے ہیں جو ہمہ وقت محوِ خیالِ یار ہیں اور محبوب کی ہر ادا پر تڑپنے کے لئے بیقرار ہیں، بادۂ الست کے لذّت کش ہی اس کا مزہ جانیں تو جانیں، عام بلکہ خاص لوگوں کے بھی بس کی بات نہیں۔ ھٰذا فیضانِ المرشد۔

در شنیدن غرق شو مشرک مشو کافر مماں　　در خلائق باش مومن در خدا ناظر بماں

ترجمہ: سننے میں منہمک ہو جا مشرک مت ہو اور کافر مت رہ، مخلوقات میں ایمان کے ساتھ رہ کر خداوند تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ کر۔

تشریح: یعنی اس آواز کو سننے میں اس قدر منہمک ہو جاؤ کہ اور تمام آوازوں سے رابطہ ہی ختم ہو جائے اور یقین کی پختگی بھی اس اندازہ سے ہو کہ اگر ابتدا میں یہ آواز سُنائی بھی نہ دے تو اس کی حقیقت کا انکار مت کرو بلکہ اس بات پر ایمان رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے امرِ کُن سے یہ تمام مخلوقات وجود پذیر ہوئی ہیں اور جو کچھ بھی نظر آتا ہے وہ سب اس کی تجلّیات ہیں۔

صوفیارِ حضرات نے اس شغل کا طریق کار یہ مقرر فرمایا ہے کہ دن میں یا رات کے وقت صحرا میں یا کسی ایسے مقام پر جو لوگوں کی آمد و رفت سے دور ہو، یا کوئی تنگ و تاریک پاک صاف حجرہ ہو کہ اس میں کسی کی آواز نہ جا سکے باوضو قبلہ رخ بصورتِ مراقبہ بیٹھ کر اپنی قوتِ سماعت کی طرف متوجہ ہو کر اس انداز سے غور و فکر کرے کہ گویا کسی کی پس پردہ آواز سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہے اور یہ احساس پیدا کرتا رہے کہ اس لفظ "کُن" کی بازگشت میری سماعت

سے ٹکرا رہی ہے۔ اس توجہ میں اس قدر مشغول ہو جائے کہ اس آواز کے سوائے کوئی اور خیال اس وقت سالک کو نہ ہو اور دوسری ہر قسم کی آوازیں سننے سے مکمل طور پر گریز کرے۔ جب صبر و استقلال کے ساتھ اس شغل میں مشغول ہو جائے گا تو شروع میں "گھُوں گھُوں" کی آوازیں آتی ہیں، پھر تقریباً ایک چلہ گذر جانے کے بعد عجب طرح کی نغمگی کا احساس قوتِ سماعت کو ہونے لگتا ہے اور تیسرے چلہ میں منزلِ کُنْ کی طرف متوجہ ہونے کے لئے سالک کے سماعتی حجابات ختم ہونے شروع ہوتے ہیں، تین چلوں کے بعد پھر اس کا سُرور بفضلہ تعالیٰ محسوس ہونے لگتا ہے اور سالک یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ آواز جو آتی ہے، بحرِ وحدت کا ایک قطرہ ہے اور جتنی آوازیں ہیں سب اسی سے ہیں، جب بھی دھیان دے یہی آواز کانوں میں آئے۔

صوفیاء لکھتے ہیں کہ اپنی اپنی استعداد کے مطابق ہر ایک شئے اسی آواز سے استفادہ کرتی ہے، ہزاروں، لاکھوں، بلکہ لامحدود آوازیں صرف اسی ایک آواز سے وجود پذیر ہوتی ہیں اس ایک لفظِ کُنْ کے شغل کو اسی لئے ہزار زبان والا شغل کہا گیا ہے۔ یہ شغل اس قدر مہتم بالشان ہے کہ اس کے ذریعہ مشاہدہ صفات کے اعلیٰ مراتب کا حصول ہوتا ہے اس جیسے شغل کے لئے مرشد کی اجازت بہت زیادہ ضروری ہے۔

می شود زاں امر پیدا جملہ کان ویکوں ۔۔۔ می شنو آں صوت دائم باش قربِ بیچگوں

ترجمہ: جو کچھ تھا یا ہے یا ہوگا وہ سب اسی حکم کے سبب سے ہے، اس آواز کو سن اور ہمیشہ اس بے مثال کے قرب سے مستفید ہو۔

تشریح: اس میں کوئی شک نہیں کہ کائنات میں جو کچھ ظہور پذیر ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے، یا آئندہ ہوگا وہ سب اللہ تعالیٰ کے اس اَمرِ کُنْ کا فیضان ہے۔ سالک بھی اگر اس فیضان سے ہمیشہ فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس آواز کی طرف یک سوئی کے ساتھ متوجہ رہے، جب اس کی توجہ میں اللہ تعالیٰ کاملیت پیدا فرما دیں گے تو اس کو

ہمہ وقت قرب کی سعادت عطا ہو جائے گی۔

خارج از قرآں ہمی گفتند اکثر سالکاں　　غافل از آوازۂ اسرارِ امرِ کُن فکاں

ترجمہ: اس شغل کو اکثر سالکین نے قرآن سے خارج قرار دیا ہے، لیکن وہ امرِ تخلیق کی گونج کے راز سے بے خبر ہیں۔

تشریح: قرآن پاک میں بنیادی اعتبار سے تین قسم کے مضامین ہیں، ایک توحید سے متعلق، دوسرے امر و نہی سے متعلق۔ تیسرے قصص برائے عبرت، اس آواز کو سننے کا کہیں بھی ذکر نہیں، نہ صراحۃً نہ اشارۃً و کنایۃً۔ اس لئے بہت سے سالکین یہ فرماتے ہیں کہ یہ شغل اگرچہ صحیح ہے لیکن ہے قرآن پاک سے باہر کی بات۔ مصنف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے لیکن ذات پاک کا ذکر ذاتی اور صفاتی اعتبار سے دونوں طرح قرآن پاک میں موجود ہے، اس کی صفتِ قدرتِ وحدانیت کا بیان إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ کے الفاظ میں صراحۃً قرآن پاک میں موجود ہے۔ بس اسی مشاہدہ صفتِ قدرت سے ربط قائم کر کے صوفیا حضرات نے اس شغل کو اختیار کیا ہے۔ اسی لئے مصنف فرماتے ہیں کہ جن حضرات کی توجہ اسرارِ کُن کی طرف مبذول نہیں ہوئی انھوں نے اس کو قرآن سے الگ بتلا دیا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی توحید افعالی سے متعلق ہے۔

می شنو آں صوتِ کُن در گنبدِ سر مستدام　　جملہ عصیاں حق بیامرزد کند خیر الانام

ترجمہ: اس کُن کی صدا کو ہمیشہ اپنے سر میں گونجتا ہوا محسوس کر۔ اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرما کر نیک بندوں میں شامل فرمائے گا۔

تشریح: اس شغل میں مشغول ہونے سے سالک کا ہمہ وقتی رابطہ محبوبِ حقیقی کی اس صوتی کیفیت سے قائم ہو جائے گا تو پھر اس کے احکام کی بجا آوری اور ناپسندیدہ امور سے پرہیز فطرتِ ثانیہ بن جائے گی، گناہوں سے نفرت، نیکیوں سے محبت کا نتیجہ لازمی طور پر عند اللہ بلندیٔ درجات کا سبب ہے۔ بلکہ توبہ کی حقیقت بھی اسی وقت واضح ہوتی ہے جب

قلبِ یقین کی دولت سے سرشار ہوگا تو اگر سالک سے پہلے کسی ناپسندیدہ امر کا صدور بھی ہوگیا ہوگا تو وہ صداقت کے ساتھ پروردگار کی بارگاہ میں اپنے قصور کا اعتراف کرکے طلبگارِ معافی ہوگا اور خداوند رحمان ورحیم اس کے گناہوں کو معاف فرماکر اپنے نیک بندوں میں شامل فرمالے گا۔

می رساند حق ترا در خود کند آدم قبول — می دہد در باغِ جنت جائے صحبت بارسول

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تیری حقیقت تک تجھ کو پہونچنے کی توفیق عطا فرماکر شرفِ قبولیت سے نوازیگا اور جنت کے باغوں میں اعلیٰ مراتب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت تجھکو میسر ہوگی۔

تشریح: یعنی اس شغل کے ذریعہ جب قدرتِ خداوندی کے مشاہدات سالک کو میسر ہو جاتے ہیں تو اسکو اپنے نفس کی معرفت کا ادراک بھی ہونے لگتا ہے اور جس کو اپنے نفس کی معرفت حاصل ہوگئی اس کو معرفتِ رب حاصل ہو جاتی ہے اور جس کو یہ دولت مل گئی اس کے نصیب جاگ گئے، آخرت میں اس کا حشر اہلِ معرفت کے ساتھ ہوگا اور اہلِ معرفت کے سردار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لئے جنت میں اہلِ معرفت کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت اور صحبت کا شرف کامل ہوگا۔ اس سلسلے میں ایک حدیث پاک کا مضمون بھی ہے کہ ایک صحابی نے عرض کیا یارسول اللہ! دنیا میں تو ہم لوگ آپ کی صحبت سے فیضیاب ہیں۔ کیا آخرت میں بھی ہمیں آپ سے قربت کا شرف حاصل ہوسکتا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا بیشک جو جسکو پسند کرتا ہے آخرت میں اس کا ساتھ اس کو ملیگا۔

گر بگویم ہمچنیں بسیار گردد شرحِ ایں — شغلِ دیگر می شنو با عقل وبا حسنِ یقیں

ترجمہ: اگر میں اس انداز پر گفتگو کروں تو اس کی تشریح بہت زیادہ طویل ہو جائے گی۔ ایک اور شغل شعور اور یقین کی پختگی کے ساتھ مجھ سے سنو۔

تشریح: مصنف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس شغل کے خواص اور نتائج کا بیان کروں تو اس کیلئے ایک دفتر درکار ہوگا۔ اس لئے مختصر طور پر جو ضروری امور تھے ان کی وضاحت کردی گئی، اس شغل میں مشغول ہونے کے بعد خود بخود کیفیات کا آغاز ہونے لگے گا جن کی تشریح کے لئے الفاظ نہیں احساس کی ضرورت ہے۔ ھذا فیضان المرشد۔

در بیانِ کشادہ کردنِ پردۂ چشم خود در ہوائے ظاہری!

فضائے ظاہری میں آنکھوں کی پلکوں کو کھلا ہوا رکھنے کا بیان

شغل دیگر می شنو با تو بگویم اے پسر ہر دو چشم خویش وا کن در ہوا ظاہر نگر

ترجمہ: ایک اور شغل میں تجھ کو بتلاتا ہوں، اے سالک تو اس کو توجہ سے سن، کہ فضائے ظاہری کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی دونوں آنکھوں کو کھلا ہوا رکھ۔

تشریح: یہاں پر مصنف رحمہ اللہ ایک بہت ہی عمدہ شغل بیان فرما رہے ہیں، اس شغل کے ذریعہ توفیق خداوندی حقائق کا انکشاف ہو کر سالک کو فنار الفنار کے بعد مقام بقار حاصل ہو جاتا ہے بزرگوں نے اس شغل کے دو طریقے بیان فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی ایسے مقام پر جہاں لوگوں کی آمد و رفت نہ ہو یکسو اور پُر سکون اور با وضو ہو کر بصورتِ مراقبہ نشست اختیار کرے اور آسمان کی طرف رخ کر کے فضائے ظاہری میں آنکھیں کھول کر نظر جمائے رکھے اور پلک بند کرے، زبانِ قلب سے اَللّٰہُ حَاضِرِیْ اَللّٰہُ نَاظِرِیْ اَللّٰہُ مَعِیْ کہہ کر یہ تصور قائم کرے کہ آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کا ہے اور اسی ذاتِ مطلق کی تجلّی ہر جگہ موجود ہے یعنی لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ کے مفہوم سے ذہنی رشتہ قائم کرلے اور ذاتِ پاک کی تجلیات کو مقصود بنا کر نظر کو فضا میں جمائے رکھے، کچھ مدت آنکھوں میں تکلیف محسوس ہوگی، پانی جاری ہو جائے گا، اور آنکھوں میں جلن ہوگی، لیکن تین چِلّوں میں یہ کیفیت اعتدال پر آجاتی ہے اور پھر قلب کو وہ کیفیت حاصل ہوتی ہے جو مقربین کا خاصہ ہے۔

دوسری صورت اس شغل کی یہ ہے کہ کسی بند کمرے میں جو باہر کی آوازوں سے بھی محفوظ ہو حسبِ سابق نشست اختیار کرے، کمرہ بالکل پاک اور نقش و نگار سے خالی ہو۔ دیواروں اور چھت پر ہرا رنگ یا ہلکا نیلا رنگ ہونا چاہیئے۔ کمرے میں روشنی کرنے کے بعد روشنی کی طرف سے پشت کر کے کمرے کی فضا کی طرف آنکھ کھول کر متوجّہ ہو جائے اور یہ تصوّر کرے کہ اس کمرے میں

ذاتِ وحدہ لاشریک کی لامحدود تجلّیات کے انوار چاروں طرف ہیں اور پھر یہ تصور یہاں تک وسیع کرے کہ کمرے کی حدود کی پابندی نہ رہے، در و دیوار اور چھت کا وجود بھی ختم ہو جائے، اور تمام فضائے کائنات تجلیاتِ خداوندی سے لبریز نظر آئے۔

اِن دونوں صورتوں میں جب اِس تصور میں جماؤ پیدا ہو جائے تو مزید ترقی کرکے اِس تصوراتی سلسلے کو عرش عظیم تک لے جائے، اُس خداوند قدوس کے جلال و جمال کا ہمہ وقت تصور قائم رکھے اور کوئی بات، کوئی کام اُس کے حکم کے خلاف نہ کرے۔ بتوفیق خداوندی اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى کا مشاہدہ ہو جائے گا تو پھر فنائے کامل کا حصول اور مقامِ بقا کی یافت ہو جائے گی کہ سالک تمام کائنات کو بلکہ اپنے وجود کو بھی کالعدم محسوس کرنے لگے گا اور صرف اسی ذاتِ پاک کی تجلیات کا مشاہدہ اس کی نظریں کرتی رہیں گی۔ هٰذَا فَيْضَانُ الْمُرْشِدِ

در ہوائے ظاہری بنگر، گذر از آسماں کن زتن جاں را بروں تا جاں رسد در لامکاں

ترجمہ: فضائے ظاہری میں اپنی نظر کو جمائے رکھ اور آسمان سے گذر جا، اپنی روح کو جسم سے باہر کر دے تاکہ لامکان تک رسائی ہو جائے۔

تشریح: یعنی سالک کی نظریں بظاہر تو فضائے ظاہری میں جمی ہوئی ہیں لیکن تصوراتی اعتبار سے اس کی رسائی حدِّ نظر سے بھی پرے تک ہے جہاں سے لامکاں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ بلکہ اس تصوراتی مشاہدہ میں سالک کا انہماک اس قدر شدید ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے وجود سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے اور اس کی روحانی سیر کا سلسلہ فضائے امکانی سے گذر کر لامکاں تک جا پہنچتا ہے اس کو ہر طرف اُس ذاتِ لامحدود کی صفاتِ بے پایاں کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

در شہودِ حق تعالیٰ گشت او مشغول داں ایں تصور را تو دانی نام شد معراج آں

ترجمہ: اب تم یہ سمجھ لو کہ وہ صفاتِ خداوندی کے مشاہدہ میں مشغول ہو گیا ہے۔ اس تصور کو سالک اپنے لئے انتہائی بلندی کا مقام تصور کرے۔

تشریح: جب حق الیقین کے ساتھ سالک کے قلب و دماغ میں یہ بات نقش ہو جائے کہ ہر جگہ

اللہ تعالیٰ کی تجلّیات کا ظہور ہے اور ہر جگہ وہ ہی موجود ہے تو اس سے بڑھ کر اور بلند مقام کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے ظاہر و باطن میں اس شغل کے یہ اثرات مُرتّب ہوں گے کہ ہر وقت تصوّراتی اعتبار سے سالک کو اللہ تعالیٰ کی تجلّیات کا مشاہدہ ہوتا رہے گا اور تمام کائنات سے تعلّقات ختم ہو کر صرف اس ذاتِ پاک کی تجلّیات کا مشاہدہ ہوتا ہی سب سے بڑی بلندی ہے۔ اسی عظیم بلندی کو معراج کہتے ہیں، گویا سالک کو بھی تصوّراتی معراج حاصل ہوگئی جو یقیناً کائنات کی تمام نعمتوں سے افضل ہے۔

نیست اینجا بُت پرستی جز ہوا ہاہوت دار　　　　در ہوا دیدن ہوائے حق بگردد استوار

ترجمہ: عالم ہاہوت جیسی فضا کے سوا یہاں کسی طرح کے محبوب کا تصوّر نہیں، فضائے ظاہری پر نظر کرنے سے تجلیاتِ ذات کے مشاہدے کی تمنا اور زیادہ ہو جاتی ہے

تشریح: یعنی جس طرح عالمِ ہاہوت میں ذاتِ وحدہٗ لاشریک کے سوا کوئی شے متصوّر ہی نہیں ہوتی، اسی طرح سالک جب فضائے ظاہری میں اپنی نظر کو مرکوز کرتا ہے تو بظاہر وہاں کوئی شے موجود نظر نہیں آتی اور یہ بات مسلّم ہے کہ عدمِ محض کا وجود ہی نہیں، یعنی کوئی جگہ ایسی نہیں ہے کہ جو بالکل ہی خالی ہو اور وہاں کسی بھی شئے کا وجود نہ ہو، البتہ جہاں بظاہر کچھ بھی نظر نہیں آتا، جیسے فضائے ظاہری جو ایک سپاٹ خلاء ہے وہاں پر بھی سالک اپنی توجہ کی یکسوئی اور طلبِ حق کی خاطر جب نظر کو مرکوز کرتا ہے تو وہاں پر اس قسم کی کیفیات کا مشاہدہ ہوتا ہے جن کے لئے الفاظ نہیں ہیں عالمِ ہاہوت کے بارے میں صوفیاء نے لکھا ہے کہ یہ تو وہ عالم ہے جہاں تعیّن صفات بھی نہیں ہے بلکہ صرف ذاتِ مطلق ہی کا وجود ہے اور جب سالک اس شغل میں مشغول ہوتا ہے تو اس بے کیفی کے منظر سے طلبِ کیفیت کی جستجو اور شوقِ مزید کا ظہور ہوتا ہے، اسی لئے صوفیاء حضرات نے فرمایا ہے کہ

در ہوا بنگر دما دم در عدم شو بے خبر　　　　انتقالِ رُوح از وے نیز گردد اے پسر

ترجمہ: ہوائے ظاہری میں دیکھ اور عدمِ ظاہری میں بے خبر ہو جا۔ اے سالک! اس طرح سے انتقالِ روح کی کیفیت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

تشریح : جب سالک فضائے ظاہری میں یک سوئی کے ساتھ توجہ کرے گا تو اس کو اس قدر انہماک ہو جائے گا کہ وہ تمام کائنات سے الگ ہو جائے گا اور ذاتِ مطلق جو کہ بظاہر معدوم ہے اس کی تجلیات کا مشاہدہ ہونا شروع ہو جائے گا جس کی وجہ سے سالک کو روحانی سیر حاصل ہو جائے گی اور جب روحانی سیر کی کیفیت حاصل ہوگی تو روح سے اس کا تعلق ختم ہو کر صاحبِ روح سے رابطہ قائم ہو جائے گا اور یہی منزلِ مقصود ہے کہ پروردگار کائنات جو کہ صاحبِ روح ہے اس سے سالک کا رابطہ قائم ہو جائے اور باقی تمام کائنات اس رابطہ کے ضمن میں آجائے ، اصل مقصود صرف وہی ذاتِ پاک ہو۔

ایں خطائے محض گفتم انتقالِ روح ازیں　　　می شود حاصل زہر شغلے کرامت بالیقیں

ترجمہ : میں نے یہ بات غلط کہی کہ اس شغل سے انتقالِ روح کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے بلکہ ہر ایک بہترین شغل سے یہ کیفیت یقینی طور پر حاصل ہو جاتی ہے

تشریح : مصنّف فرماتے ہیں کہ ذاتِ وحدہٗ لاشریک کی معرفت بذریعۂ صفات حاصل ہو کر تمام کائنات سے تعلق ضمنی طور پر قائم ہونا اور صرف اسی ذات کو مقصودِ اوّلین قرار دینا اور اس کے ہر ایک حکم کے آگے سر جھکانا، تسلیم کر کے عمل پیرا ہونا ، اور اس کے حکم کے مقابلے میں تمام امور کو ہیچ سمجھنا ، یہی دراصل روحانی سیر ہے یعنی روح کا رشتہ ہر وقت مالکِ روح سے قائم ہے ، تو یہ کیفیت ہر ایک شغل سے جو اس کتاب میں درج ہے حاصل ہو جاتی ہے صرف اسی شغل پر اس کیفیت کا دار و مدار نہیں ۔ مصنّف نے صرف اس شغل کی مزید اہمیت بتلانے کیلئے یہ کہدیا ہے کہ اس شغل کے ذریعہ روحانی سیر کی کیفیت کا حصول ہوتا ہے۔

انتقالِ روح نزدش سہل باشد راست داں　　　مرد کامل باشد و گردد یکے از کاملاں

ترجمہ : یہ بات صحیح ہے کہ انتقالِ روح اس کے نزدیک بہت آسان معاملہ ہے بلکہ وہ تو انسانِ کامل ہو کر واصلین کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے

تشریح : جب سالک کو فنا کی اس منزل تک رسائی میسر ہو جاتی ہے تو پھر روح کا منتقل

ہونا اس کے لئے کوئی دشوار بات نہیں ہوتی، بلکہ یہ معاملہ تو اس منزل کے لئے ایک ادنیٰ سی بات ہے۔ اِس لئے کہ اب تو وہ انسانیت کا مکمل نمونہ بن چکا ہے یعنی عبدِ کامل بن کر مکمل طور پر مالکِ حقیقی کا اطاعت گذار بندہ بن گیا ہے، اب اس کی اپنی کوئی خواہش نہ رہی، بلکہ مالکِ حقیقی کے احکام کی بجا آوری ہی اس کی تمناؤں اور خواہشات کا مرکز ہے۔ اس طرح وہ اپنی ذات سے بے خبر ہو کر واصل بحق ہو گیا۔

روح اندر جسمِ عارف چوں پرندہ در ہوا   بگذرد ہر جا کہ خواہد بلکہ بر عرشِ خدا

ترجمہ: صاحبِ معرفت کے جسم میں روح اس طرح رہتی ہے جیسے پرندہ ہوا میں، وہ جہاں چاہے وہاں پہونچ جاتی ہے بلکہ عرش خداوندی تک اس کی رسائی ہوتی ہے

تشریح: یعنی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اپنی معرفت عطا فرمادی تو پھر اس کی روح اس معرفت کے فیضان سے صرف جسم کے پنجرے میں مقید نہیں رہتی بلکہ جس طرح پرندے ہوا میں آزاد پھرتے ہیں اِسی طرح ان کا روحانی تعلق بھی اس قدر عظیم الشان ہو جاتا ہے، کہ عرش خداوندی تک رسائی یعنی حضوری کا درجہ سالک کو حاصل ہو جاتا ہے۔

عرش و کرسی مہر و ماہ و آسماں نزدیک اوست   با ملائک آشنا و ہر یکش دارند دوست

ترجمہ: عرش و کرسی، چاند سورج اور آسمان سب کے سب اس کے قریب ہو جاتے ہیں فرشتوں کے ساتھ اس کی جان پہچان ہو جاتی ہے اور ہر ایک اس کو دوست رکھتا ہے۔

تشریح: یعنی تصوراتی اعتبار سے سالک ہمہ وقت خداوند قدوس کے حضور میں رہتا ہے، اور یہ تصور حضوری ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے الگ نہیں ہوتا، اس طرح گویا سالک کو ہمہ وقت حضوری کا درجہ حاصل ہے اور عرش و کرسی تک اس کی رسائی ہمہ وقت ہے ظاہر بات ہے کہ چاند اور سورج تو اس سے بھی کم درجہ کی چیزیں ہیں اور فرشتے تو عرش و کرسی کے خادم ہیں جب سالک اطاعت خداوندی میں اس مقام پر پہونچ گیا تو تمام اشیائے کائنات اس کی تابعِ فرمان ہو گئیں، اس کے ساتھ فرشتوں کا تعلق بھی اسی اطاعت کی وجہ سے ہے،

جیسا کہ حدیثِ پاک میں ہے کہ پروردگارِ عالم جب کسی بندے کو پسند فرماتے ہیں تو فرشتوں کو حکم ہوتا ہے کہ میں اس بندے کو محبوب رکھتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو اور تمام جگہ اس امر کا اعلان کردو۔ چنانچہ اس حکم کے بعد ملائکہ اعلان کرتے ہیں اور تمام مخلوقِ خدا اور نیک بندے اور فرشتے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور اس کے ساتھ دوستی کا رشتہ قائم کرلیتے ہیں۔

دوسری صورت فرشتوں کے ساتھ دوستی کی یہ ہے کہ سالک اخلاق بہیمانہ کو ترک کردیتا ہے اور اطاعتِ خداوندی کا مزاج اُسی طرح سالک میں پیدا ہوجاتا ہے جس طرح فرشتے اللہ تعالےٰ کے حکم کی بلاچون وچرا تعمیل کرتے ہیں، اس اطاعتی مزاج کی وجہ سے فرشتے اور تمام کائنات اس سے محبت کرنے والی ہوجاتی ہے۔

خاک را زر، آتشی را آب کردن نزدِ شاں　　سہل باشد زندہ کردن مردہ راہم راست داں

ترجمہ: مٹی کو سونا اور آگ کو پانی کرنا ان کے نزدیک آسان ہوجاتا ہے اور مُردے کو زندہ کرنا بھی ان کے نزدیک کوئی مشکل کام نہیں۔

تشریح: اس مقام تک رسائی کے بعد اشیاء کی حقیقت سالک کے سامنے آجاتی ہے کہ ہر ایک شئے میں اللہ تعالیٰ ہی کا حکم جاری وساری ہے اور جب اپنی کوئی تمنا اور آرزو نہ رہی اور ہر کام صرف پروردگار کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے تو ایسی حالت میں ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہوتے ہیں، جب اس کیفیت میں یہ حضرات بارگاہِ خداوندی میں اپنی گذارش پیش کرتے ہیں تو رحمتِ خداوندی یقینی طور پر ان کی مددگار ہوجاتی ہے، اس وقت مٹی اور سونا ان کے نزدیک برابر ہوجاتا ہے، آگ اور پانی کی خاصیت، زندگی اور موت کی حقیقت سب کا ان پر انکشاف ہوجاتا ہے، اس لئے اگر یہ حضرات اللہ کی مدد کے سہارے مٹی کو سونا اور آگ کو پانی کرنا چاہیں یا مُردے کا تعلق زندگی سے قائم کرنے کی بارگاہِ خداوندی میں دعا کریں تو خداوند قدوس ان کی دعا کو شرفِ قبولیت عطا فرمادیتے ہیں اور یہ تمام امور انجام پذیر ہوجاتے ہیں۔

صورت حیوانات از علم لدنی فهمد، آں　　　　ہر کسے نشناسد اورا ہم مثالِ عامیاں

ترجمہ: علمِ لدنی کی وجہ سے وہ جانوروں کی بول چال سمجھ لیتا ہے، ہر ایک آدمی اس کو نہیں پہچان پاتا کیونکہ وہ بھی عام لوگوں کی طرح رہتا ہے۔

تشریح: علم لدنی وہ علم ہے جو بغیر کسب کے حاصل ہو اور اس کے حاصل کرنے کے لئے کوئی واسطہ نہ ہو، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے خاص بندوں کو یہ دولت عطا فرماتے ہیں کہ وہ جانوروں کی گفتگو سن لیں، سالک جب اس منزلِ فنا سے گذر جاتا ہے تو وہ معاملات جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں اور ہماری دسترس سے باہر ہیں کہ وہ آوازیں ہماری سماعت تک نہیں پہونچ پاتیں یا وہ زبان جو جانور بولتے ہیں ہم نہیں سمجھ پاتے، بلکہ ہماری عقل وفہم کا دائرہ تو اس قدر محدود ہے کہ اپنے ہی جیسے غیر ملکی انسانوں کی مہذب زبان سمجھنے سے ہم قاصر ہیں چہ جائیکہ جانور اور چرند پرند کی بولی کو سمجھ سکیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے خاص بندے اس نعمت سے بھی سرفراز ہیں اور کائنات کے حقائق کو سمجھنا ہمارے لئے جس قدر مشکل ہے اُن کے لئے اُتنا ہی آسان ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان تمام نعمتوں سے سرفراز ہونے کے بعد وہ عام لوگوں کی طرح سے ہی رہتے ہیں، تصنع، بناوٹ اور ظاہر داری سے بالکل پرہیز کرتے ہیں، کیونکہ حقیقتِ دنیا ان کے سامنے ہے کہ یہ فانی ہے، معاملہ تو صرف اسی ذات پاک کے ساتھ ہے جو قدیم ولازوال ہے، اس کی بارگاہ میں ہمہ وقت حضوری کی وجہ سے ان تمام نمائشی امور سے وہ بیگانہ رہتے ہیں یہاں تک کہ عام لوگ ان کو پہچان بھی نہیں پاتے۔

از فنائے خود بدارد قدرتے بر جملہ کار　　　　لاجرم شد فقر بروے کامل وہم استوار

ترجمہ: یہ اپنی فنا کی وجہ سے تمام امور پر حاوی ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں لازمی طور پر اس کا فقر کامل اور مستحکم ہو گیا۔

تشریح: جب سالک کو ہر ایک شئے میں شہودِ حق کی کیفیت حاصل ہو جائے اور اس کیفیت میں دوام واستقلال پیدا ہو جائے تو سالک اپنی ہستی سے بے خبر ہو جاتا ہے، یعنی

ہر ایک معاملہ میں اس کی نظر اس ذاتِ پاک کی طرف اُٹھنے لگتی ہے جو قادرِ مطلق ہے ، اس صورت میں سالک کا وجود ہی کہاں رہا ، یہ تو آلۂ کار ہو گیا جو چاہتا ہے پروردگار چاہتا ہے اور جو کرتا ہے پروردگار کرتا ہے ، یہ مقامِ معائنہ ہے جس کے لئے اصطلاحی طور پر صوفیا رحضرات یہ فرماتے ہیں کہ اس مقام پر شاہد و مشہود ، ناظر و منظور کا تصور قائم کرنے کی حدود قائم نہیں رہتیں بلکہ صرف وہی وہ ہے اور بس ، اس کے علاوہ کچھ نہیں ۔ اسی کیفیت کو فقیری کا تام ہونا کہتے ہیں کہ ماسوا ذات کے سب سے بے پروا ہو جائے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے معاملات قال سے متعلق نہیں ہیں بلکہ حال سے ان کا رشتہ ہے ۔

خود خدا از بے خودی شد رَا سِت ادانی اے پسر ۔۔۔ چند گویم با تو فضلش در حدیثے می نگر

ترجمہ : اپنی ہستی کی فنا کی وجہ سے بے شک وہ اخلاقِ خداوندی سے متصف ہو گیا ، اس مقام کی عظمت و فضیلت میں کہاں تک بیان کروں ، حدیث میں ملاحظہ کر لو ۔

تشریح : یہ شعر بھی مقامِ معائنہ سے متعلق ہے ، سالک جب اس مقام پر پہونچ جاتا ہے تو اس کے پیشِ نظر صرف ذاتِ پاک کے جلوے ہوتے ہیں اور تمام کائنات سے بے خبر ، یہاں تک کہ اپنی ذات کا علم بھی اس کو نہیں ہوتا ، یہی وہ مقام ہے جس کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ پاک ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا بندہ نوافل و عبادت کے ذریعہ مجھ سے تقرب حاصل کرنا چاہتا ہے ، یہاں تک کہ میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے ، اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے ، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے ، غرض کہ تمام امور میں صرف ذاتِ وحدہٗ لاشریک کا تصور ہمہ گیری انداز میں جلوہ فگن ہو جاتا ہے ، اس مقام پر سالک کا وجود ہی کہاں باقی رہ گیا ، تمام کام وہی قادرِ مطلق کر رہا ہے ، اسی لئے اصطلاحی طور پر شدتِ تعلق کی بنا پر سالک کو تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ یعنی "اخلاقِ خداوندی سے اپنے کو آراستہ کرو" کا مصداق قرار دے کر مجازی طور پر کہہ دیا گیا ہے ، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ خدا ہی ہو گیا ہو ۔

کشفِ خود را ستر سازد از خلائق بالتمام　　جز خدا او ہیچ داند کشف نزدش حالِ خام

ترجمہ: وہ اپنے مکشوفات کو عام لوگوں سے مکمل طور پر پوشیدہ رکھتا ہے، ماسوائے خدا کے اسکی نظر میں سب ہیچ ہے اور کشف بھی اسکے نزدیک ناپختگی کی علامت ہے

تشریح: اس شعر سے قبل جو مفہوم بیان کیا گیا تھا اس میں یہ شبہ ہو رہا تھا کہ مصنف نے سالک کو "خدا" کہہ دیا تھا جس کی تشریح ہم مختصر طور پر بیان کر چکے ہیں، مصنف رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کی وضاحت فرما رہے ہیں کہ اس مقام پر سالک کی نظر میں صرف اسی کی ذاتِ پاک ہوتی ہے اور کسی سے بھی اس کا تعلق نہیں ہوتا، اپنی ذات سے بھی اس کا تعلق ختم ہو جاتا ہے، اس لئے وہ مکشوفات جو اس مقام سے متعلق ہیں ان کی طرف اوّل تو سالک کی توجہ ہی نہیں ہوتی، اور اگر کچھ پوشیدہ چیزوں کے بارے میں منجانب اللہ اس کو بتلا دیا جاتا ہے تو لوگوں کے سامنے وہ بیان نہیں کرتا بلکہ ان سے پوشیدہ رکھتا ہے، کیونکہ یہ تمام امور مقصدِ اصلی تک رسائی میں رکاوٹ ہیں، دوسرے اس وجہ سے کہ یہ تمام امور مقصود نہیں، مقصود تو صرف اسی کی ذات ہے اور غیر مقصود کی طرف توجہ کرنا راہِ معرفت کے خلاف ہے، تیسری وجہ یہ ہے کہ کشف کا ہونا، یہ علامت ہے عدم پختگی کی، اور ہمہ وقت حضوری کی کیفیت میسر نہ ہونے کی، کیونکہ کشف کا مطلب ہی یہ ہے کہ جو چیز پوشیدہ تھی اس کو ظاہر کر دیا جائے۔ اس میں دوام نہیں ہوتا، کبھی پردہ اٹھا دیا جاتا ہے اور کبھی حجابات سے واسطہ پڑتا ہے، ان تمام چیزوں کو سامنے رکھ کر مصنف نے بڑے مختصر اور جامع انداز میں اس مفہوم کو بیان کر دیا ہے۔

آنکہ بینی از اولیاء کشف و کرامت مشتہر　　پختہ گردد چوں شگوفہ بوئے گردد منتشر

ترجمہ: اور جس کشف و کرامت کا ظہور اولیاء اللہ سے تم دیکھتے ہو، یہ ایسا ہے کہ جیسے کلی مکمل ہو کر پھول بن جاتی ہے تو خوشبو پھیل جاتی ہے۔

تشریح: یہ بھی ایک شبہ کا جواب ہے، شبہ یہ ہوتا ہے کہ جب احوال و کیفیات کی پوشیدگی سالکانِ راہِ طریقت کا اصول ہے اور اس پوشیدگی میں بہت سی مصلحتیں پوشیدہ ہیں تو پھر

بہت سے بزرگوں سے جن کی شخصیت سب کے نزدیک مستند اور مسلّم ہے کشف وکرامت کا جو ظہور ہوتا ہے تو گویا یہ بھی ناپختگی اور مکمل طور پر رسائی نہ ہونے کی بات ہے، اسکا جواب مصنفؒ اس طرح دے رہے ہیں کہ جن بزرگوں سے کشف وکرامت کا ظہور ہوتا ہے اوّل تو یہ اختیاری معاملہ نہیں ہے اور نہ کوئی بزرگ قصد کر کے اس طرح کا معاملہ کرتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہے کہ وہ ان کی ذات سے لوگوں کو فائدہ پہونچانا چاہتا ہے تو اس قسم کے معاملات کا صدور ہو جاتا ہے جس طرح کلی جب مکمل ہو جاتی ہے تو قانونِ قدرت کے مطابق اس کی خوشبو کا فیضان پہونچانے کے لئے اس کو پھول بنا کر کھلا دیا جاتا ہے اور خوشبو سے آس پاس کے ماحول کو معطر کر دیا جاتا ہے یہی معاملہ بس اللہ تعالیٰ کی طرف سے بزرگوں کے معاملہ میں سمجھنا چاہیئے منزل تک پہونچانا بھی بحکمِ خداوندی ہے اور معرفت کی دولت عطا فرمانا بھی انعامِ خداوندی ہے اور اس کا فیضان دوسروں تک پہونچانا بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے، تو پھر بزرگ کی طرف سے کسی قسم کا معاملہ ہی نہیں تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کشف وکرامت کا ظہور بزرگ کی طرف سے ہوا ہے، یہ تمام معاملات تو منجانب اللہ ہیں۔

گر بگویم زیں زیادت دور افتم از بیاں ۔۔۔ رازِ دیگر می شنو، گویم ز شرحِ فضلِ آں

ترجمہ: اس سے زیادہ اگر بیان کروں گا تو مقصود سے دور ہو جاؤں گا، اس لئے ایک اور رازِ معرفت مجھ سے سنو جس کی مختصراً تشریح بفضلہ تعالیٰ میں بیان کرتا ہوں۔

تشریح: مصنفؒ نے مختصر اور جامع طور پر اس شغل سے متعلق تمام راز بیان کر دئے ہیں، ان رازوں کی اہمیت کا اندازہ تو صحیح معنیٰ میں جب ہی ہوگا جب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس میں مشغول ہونے کی توفیق ہوگی، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں اس کی توفیق ارزانی فرمائے، آمین

اب اسکے بعد مصنفؒ دوسرے شغل کا حسبِ سابق بیان کر رہے ہیں اور اتنا کچھ بیان کرنیکے بعد بھی انکساری کے طور پر یہ فرماتے ہیں کہ اس شغل کی تمام کیفیات کو بیان کرنا مشکل ہے اور اسمیں کوئی شک بھی نہیں کہ اس کتاب کا ہر شغل اپنی جگہ اہمیت کے اعتبار سے ایک کتاب ہے جسکو مختصر ہی بیان کیا جا سکتا ہے۔

در بیانِ شغلِ جمالی رازِ حق تعالےٰ

اللہ تعالےٰ کی معرفت کے سلسلہ میں شغلِ جمالی کا بیان

شغلِ دیگر گویم از رازِ جمالی ہوشدار　　چشم را بر بند اوّل پس سیاہی می گمار

ترجمہ : جمالِ خداوندی کے راز کے بارے میں ایک شغل میں بیان کرتا ہوں، اس طرف توجہ کرو، پہلے تم اپنی آنکھوں کو بند کرلو اس کے بعد سیاہی کی طرف دھیان دو۔

تشریح : یہ بات تو بالکل عیاں ہے کہ تمام اشغال سے مقصود معرفتِ ذات اور معیتِ ذات ہے اور معرفتِ ذات کے بے شمار طریقے ہیں، اس سلسلہ میں مصنف رحمۃ اللہ علیہ جو شغل بیان فرمارہے ہیں اس کا نام "شغلِ جمالی" ہے، یہ بات بہ صراحت گذر چکی ہے کہ نورِ ذات متّصف بہ سیاہی ہے اور ذاتِ پاک لامحدود حجاباتِ نورانی میں اِندماجی کیفیت کے ساتھ پوشیدہ ہے یعنی صفات اور ذات اس طرح آپس میں ایک دوسرے سے متعلق ہیں کہ ہم ذات اور صفات کے درمیان خطِ امتیاز قائم نہیں کر سکتے، بلکہ ہمارا تعلق شاہداتی طور پر صفات سے ہے اور صفات ہی کے ذریعہ ذات تک رسائی ہے اس لئے صفات ہی مرکزِ غور و فکر ہیں۔

اس شغل کا بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ سالک کسی پُرسکون تاریک مقام پر باوضو، قبلہ رخ بصورتِ مراقبہ نشست اختیار کرے، اس کے بعد اَللّٰہُ حَاضِرِیْ اَللّٰہُ نَاظِرِیْ اَللّٰہُ مَعِیْ کا تصور قائم کرکے اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا تصور کرکے اپنی دونوں آنکھوں کو بند کرلے اور دل کی طرف توجہ کرے، دل میں خون کا سیاہی مائل بہت چھوٹا سا ایک نقطہ ہوتا ہے جس کا تعلق براہ راست روح سے ہے، اس نقطہ پر تصوّراتی اعتبار سے یوں توجہ کرے کہ یہ نقطہ مرکزِ عالم اور وسطِ عالم ہے، اس نقطہ سے جو خطوط اور شعاعیں اوپر نیچے، دائیں بائیں جارہے ہیں ان سب کا تعلق نورِ ذات سے ہے اور نورِ ذات تو عرش پر جلوہ گر ہے بلکہ لامکان تک نورِ ذات ہی ہے، تو ان قلبی شعاعوں کو سالک، نورِ ذات سے منسلک کردے اور یہ خیال کرے

کہ میں اپنے پروردگار کے روبرو حاضر ہوں اور اس کا جمالِ بے مثال جو لامحدود حجابات میں پوشیدہ ہے اس کا فیضان میرے قلب کے مرکز تک براہِ راست پہونچ رہا ہے اور اس تصور میں اس قدر منہمک ہو جائے کہ اپنا وجود بھی کالعدم محسوس ہونے لگے لیکن تمام مراقبہ میں یہ تصور تسلسل اور یکسوئی کے ساتھ قائم رہے کہ اس ذات پاک کی نوراتی شعاعیں میرے قلب تک پہونچ کر اس نقطۂ سیاہ کو اس طرح منور کر رہی ہیں کہ تمام کائنات کی روشنی اس نور کے سامنے کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی۔ بفضلہ تعالیٰ جب یہ تصور مستحکم ہو جائے گا اور اس کی حقیقت قلب میں جاگزیں ہو جائے گی تو معیتِ ذات کی نعمتِ لازوال جو مقصود ہے حاصل ہو جائے گی۔

جملہ موجودات را بشکن زچشم دل چناں　　در سیاہی می نگر کاں بودہ باشد جاوداں

ترجمہ: تمام موجودات کو نگاہِ قلب سے اس طرح مٹا دو گویا ان کا وجود ہی نہ تھا اور صرف سیاہی میں غور و فکر کرو کیونکہ وہی ہمیشہ ہمیش رہنے والی ہے۔

تشریح: یعنی مراقبہ کی حالت میں ماسوا ذات کے تمام موجودات کے تصور کو دل دماغ سے باہر نکال دو اور صرف اُس ذات پاک کے نور کی طرف متوجہ ہو جاؤ کیونکہ وہ ازلی و ابدی ہے اور اس کے سوا تمام اشیاء صفتِ فنا سے متصف ہیں اور اس نورِ ذات کی مرکزیت قلبِ سالک میں اِسی نقطہ کو حاصل ہے جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، جب سالک اس طرف متوجہ ہوگا تو نورِ ذات کا جس کا مشاہداتی رنگ سیاہ ہے، مشاہدہ شروع ہو جائے گا۔

ہر چہ پیدا کرد بینی حق تعالیٰ اے پسر　　از سوادِ بحرِ وحدت راست دانی ایں خبر

ترجمہ: اے سالک! جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور تو اس کو دیکھ رہا ہے، ان تمام موجودات کا تعلق بحرِ وحدت کی سیاہی سے ہے، اس بات کو بالکل صحیح سمجھ۔

تشریح: یعنی ذاتِ پاک تو ازل سے صفتِ وحدت سے متصف ہے اور ابد تک متصف رہے گی، یہ تمام جلوے اور کثرت، سب کے سب اس کی صفات کی تجلیات ہیں، اور اس کی صفات کی تجلیات کا مشاہداتی مرکز سیاہی ہے، اس لئے سالک تمام کائنات کو اسکی تجلیات

تصور کرتے ہوئے بحرِ وحدت کی سیاہی یعنی نورِ ذات کی طرف متوجہ رہے کیونکہ

بازگردد کلِ اشیاء سوئے اصلِ خویش داں   مصطفٰی حُبُّ الوطن گفتہ است بہرِ ایں بیاں

ترجمہ: یہ بات تم سمجھ لو کہ ہر ایک شے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ اسی لئے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وطن کی محبت ایمان کا جزو ہے۔

تشریح: اس سے پہلے مصنف رحمۃ اللہ علیہ بیان کر چکے ہیں کہ تمام کائنات کا وجود بحرِ وحدت کی سیاہی یعنی جمالِ ذات سے ہے تو لازمی طور پر روح کو اس جمال سے تعلق ہوگا۔ اس لئے کہ روح کا وطنِ اصلی آخرت ہے اور آخرت میں جمالِ خداوندی کا دیدار روح کی سب سے بڑی معراج ہوگی، اس شغل میں مشغول ہونے سے بھی جمالِ خداوندی کا تصوراتی مشاہدہ ہوتا ہے تو روح کو سکون میسر ہوتا ہے کیوں کہ یہی نور تو مرکزِ اصلی ہے اور ہر ایک شے اپنے مرکز کی طرف لوٹنا پسند کرتی ہے۔ وطن کی محبت کے بارے میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ وطن کی محبت ایمان کا جزو ہے۔ اس لئے روح کو بھی اپنے وطن سے محبت ہے اور اس جمالِ ذات کے مشاہدے میں مشغول ہونے سے روح کو اپنا اصلی وطن یاد آجاتا ہے اس لئے کہ ہر ایک شے کی مراجعت اپنی اصل کی طرف ہوتی ہے۔ ھٰذَا مِنْ فَیْضَانِ الْمُرْشِدِ۔

اندراں عالم زیاں زندگی جاوداں   بہرِ دیدارش ہر اعضا را بود چشمے بداں

ترجمہ: اس عالم میں تو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی زندگی حاصل ہو جائے گی اور اس کے دیدار کے لئے ہر ایک عضو کو آنکھ عطا کر دی جائے گی۔

تشریح: صوفیاء حضرات نے نورِ ذات کو سیاہی سے متصف مانا ہے اور یہ ان کا مشاہدہ ہے جس کی توضیح وہ یہ فرماتے ہیں کہ نورِ ذات اس قدر لطیف اور شدید ہے کہ اس کی جھلک نظر آتے ہی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا ہے اور چاروں طرف سیاہی ہی سیاہی محسوس ہونے لگتی ہے تو جب اس جہان میں اس نور کی ایک ادنیٰ سی جھلک دیکھنے کی تاب انسان کو نہیں تو آخرت میں کس طرح اس کے جمال کے دیدار سے فیضیابی ہوگی، یہ ایک شبہ تھا

جس کا جواب مصنف رحمۃ اللہ علیہ یہ فرمار ہے ہیں کہ یہ دنیا تو فانی ہے یہاں کی زندگی بھی فانی ہے، اسی لیے یہاں پر انسانی اعضاء کو منجانب اللہ اسی قدر صلاحیت دی گئی ہے جس سے کام چل سکے لیکن جنت کا اور آخرت کا معاملہ تو الگ ہے، وہاں جو زندگی عطا کی جائے گی وہ کبھی ختم نہ ہونے والی ہوگی، اسی اَبدیت کے مطابق پروردگار عالم کی طرف سے جسمانی اعضاء کو ایسی صلاحیت عطا کردی جائے گی کہ وہ جمالِ دیدار سے فیضیاب ہوسکیں، آخرت کے معاملہ کو دنیا کے معاملہ پر قیاس نہ کرنا چاہیئے۔

غیرِ انساں کس نہ بیند مر خدا را آں زماں　　　دیدِ حق جبریل ہم یکبار یا بد راست داں

ترجمہ: انسان کے علاوہ کوئی اور اُس جہان میں اللہ تعالیٰ کو نہ دیکھ سکے گا، حضرت جبریل علیہ السلام کا دیکھنا بھی ایک ہی بار کا ہے، یہ بات صحیح مان لو۔

تشریح: قیامت میں حساب کتاب کے بعد دیدارِ خداوندی کا مرکز جنت ہے اور جنت میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جنتی لوگوں کو اپنے دیدار کی نعمتِ بے بہا سے سرفراز فرمائیں گے لیکن یہ سعادت صرف انسانوں کو نصیب ہوگی اور انسانوں میں بھی وہ لوگ جو مومن ہوں گے انسان کے علاوہ جنات یا ملائکہ کو یہ شرف نہیں عطا کیا جائے گا، یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے اس فیصلہ میں کسی کو کیا مجالِ دم زدن ہے، اگرچہ احکامِ شریعت کے مکلف انسانوں کی طرح جنات بھی ہیں اور عذاب و ثواب کا دار و مدار احکامِ شریعت کی بجا آوری اور عدول حکمی پر ہے لیکن جنت میں داخلہ کے سلسلے میں جنات کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، جن کی تفصیل "آکام المرجان فی احکام الجانّ" میں موجود ہے اس میں بھی مستند قول یہی ہے کہ جنات کا داخلہ جنت میں نہ ہوگا، اُن کے لئے جنت جیسی کوئی جگہ متعین کردی جائے گی یا اعمالِ خیر کے بدلے میں عذابِ دوزخ سے چھٹکارا ہی ان کا ثواب ہے، اس کے علاوہ عقلی اعتبار سے بھی یہ بات سمجھ سے بالاتر نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت کا استحقاق صرف انسانوں کو عطا فرمایا ہے، جنات اور ملائکہ اس سے محروم ہیں، اس استحقاقِ خلافت

کی استعداد کی بنا پر احکام شریعت کا مکلف ہونے کے باوجود جنات میں سے آج تک کسی نبی کا ورود نہیں ہوا، تیسری بات یہ ہے کہ جس طرح آج انسان اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود ان کو اصلی شکل وصورت میں نہیں دیکھ پاتا اور فرشتوں کو بھی نہیں دیکھ پاتا تو اس نہ دیکھنے سے اس کی اشرفیت میں کوئی فرق نہیں آتا، اسی طرح قیامت میں اگر جنات اور ملائکہ کو دیدارِ خداوندی کی صلاحیت عطا نہ کی جائے گی تو اس میں کسی کو کیا اعتراض؟ خداوندِ قدوس کی مصلحت ہے، جنات کے علاوہ فرشتے تو فطرۃً معصوم ہیں اور ہر وقت اطاعتِ خداوندی میں مصروف رہتے ہیں گناہ کا تصور بھی ان کے یہاں موجود نہیں لیکن دیدارِ خداوندی کا اعزاز حاصل نہ کرسکیں گے، یہاں تک کہ جبرئیل علیہ السلام جو تمام فرشتوں کے سردار ہیں ان کے بارے میں بھی یہی روایت ہے کہ آپ نے صرف ایک مرتبہ پروردگار کے جمال کا مشاہدہ کیا اور وہ بھی ستر ہزار حجاباتِ نوری کے ساتھ جیسا کہ گذر چکا ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ پروردگار کی تجلیات کو برداشت کرنے کا معاملہ ہے جب ہمارے سامنے معراج شریف کا وہ واقعہ آتا ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچ کر حضرت جبرئیل علیہ السلام ٹھہر گئے اور "فروغِ تجلی بسوزد پرم" کہہ کر آگے نہ جاسکے، اور آقائے نامدار سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تمام صفاتِ بشریت کے ساتھ بارگاہِ خداوندِ ذوالجلال میں وہاں تک پہونچے جہاں تک نہ کوئی آج تک گیا اور نہ جاسکے گا، تو ان تمام شواہد سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دیدار کا معاملہ صرف انسان تک محدود ہے، مزید تفصیل مذکورہ بالا کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔

قدرِ ایماں می شود حاصل لقائے جانجاں　　　آں زماں وکافراں اندر عذاب جاوداں

ترجمہ: اور خداوند قدوس کے دیدار سے فیضیابی ایمانی کیفیت کے اعتبار سے ہوگی اس وقت کافر دوزخ میں ہمیشہ ہمیش کے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

تشریح: آخرت میں خداوند تعالیٰ کے دیدار کی کیا کیفیت ہوگی، اس سلسلہ میں متعدد احادیث معتبرہ موجود ہیں، جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دیدارِ خداوندی ہوگا اور اہل ایمان اس

تجلی سے مستفید ہوں گے، البتہ اس نور کو دیکھنا اور فیضان حاصل کرنا یہ قوتِ ایمانی پر موقوف ہوگا جس کا ایمان جس قدر بلند درجہ کا ہوگا اُسی اعتبار سے اس کو تجلّی ہوگی، اس لیئے کہ نورِ خداوندی میں تو کسی قسم کی کمی یا زیادتی کا تو امکان ہی نہیں اور نہ ظہور میں کسی قسم کا فرق ہوگا، فرق صرف اس اعتبار سے ہوگا کہ اس کی ایمانی کیفیت کس درجہ کی ہے، اس دن ایمان والے دنیا و آخرت کی سب سے بڑی نعمت یعنی دیدارِ خداوندی سے لطف اندوز ہوں گے اور کافر و مشرک عذابِ دوزخ میں مبتلا ہوں گے، ان کو اس دن دوگنا عذاب اس طرح ہوگا کہ ایک تو وہ دیدار سے محروم، دوسرے عذابِ دوزخ میں مبتلا ہوں گے۔

آنچہ دیدم از کتابِ حق نوشتم ہم چنیں　　شک نیاری در یکے زیں گر بیاشد اہلِ دیں

ترجمہ: جو کچھ میں نے معتبر کتابوں میں دیکھا اس کو بعینہ لکھ دیا، اگر تو بھی مومن ہے، اور دین پرست ہے تو اس میں شک نہیں کرے گا۔

تشریح: مصنف فرماتے ہیں کہ دیدارِ خداوندی سے فیضیابی اور قدرِ ایمان کے مطابق تجلّیات سے استفادہ، اور کافروں کو دوزخ کا عذاب، مومنین کو ہمیشہ ہمیش کی راحت اور اور کافروں کو عذابِ ابدی، یہ تمام امور وہ ہیں جن کی وضاحت قرآن وحدیث میں بہ کثرت ہے، میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ ان کتابوں سے پڑھ کر لکھا ہے، اگر تم بھی ایمان والے ہو اور ان کتابوں کو معتبر سمجھتے ہو تو بالکل شک نہ کرو کیونکہ

ہر کہ در اقوالِ باری شک بیارد ہوشدار　　بے تامل در حقیقت گشت کافر اہلِ نار

ترجمہ: جو کوئی اللہ تعالیٰ کی باتوں میں شک کرے گا تو خیال رکھو کہ بے شک وہ حقیقت کا انکار کرنے والا اور دوزخی ہوگیا۔

تشریح: یعنی کائنات کی ہر ایک شے قدرتِ خداوندی کا شاہکار ہے، کسی بھی مخلوق کے بس کی بات نہیں کہ وہ ان تمام حکمتوں کو اور مصلحتوں کو سمجھ سکے اور حقائقِ اشیاء کا ادراک کر سکے، ہم جس زمین پر رہتے ہیں یہاں کے اُمور ہی ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں چہ جائیکہ

آخرت اور وہاں کے احوال کے سلسلے میں ہم اپنی عقل وفہم کو دخل دیں، اس سلسلے میں قرآن وحدیث میں جو صراحت آئی ہے اس پر ایمان لانا عین سعادت ہے اور جس طرح حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو سچے دل سے تسلیم کرنا عین ایمان ہے جو اس میں شک کرے گا تو یقیناً وہ حقیقت کا انکار کرنے والا ہو کر منکرِ توحید ورسالت ہوگا، یا حقیقت کو چھپانے والا ہو کر کفر کرنے والا ہوگا اور اپنے اس انکار وپوشیدگی کی وجہ سے وہ جہنم کی سزا کا مستحق ہوگا۔

بہر ایں بسیار آیتہا گفتہ ذوالجلال گر بگویم دور افتم کن خیالی در کمال

ترجمہ: ان امور کی صراحت کے لئے اللہ تعالیٰ نے بہت آیات نازل فرمائی ہیں اگر میں ان کی تفصیل بیان کرنے لگوں تو موضوع سے الگ ہو جاؤں گا تم خود اس کے کمالات کی طرف توجہ کرلو۔

تشریح: یعنی ایمان وکفر اور اعمالِ خیر وبد، دنیا وآخرت، حساب وکتاب اور دوزخ وجنت کا داخلہ، اور پھر عذابِ دوزخ کی ہولناکی اور جنت میں آرام وراحت کا منظر، اس سلسلے میں قرآن میں تمام صراحت اللہ تعالیٰ نے فرما دی ہے، مختلف مقامات پر مختلف انداز بیان کے ساتھ ترغیب وترہیب کے طور پر تمام چیزیں قرآن میں مفصل موجود ہیں، مصنف فرماتے ہیں کہ میرا مقصد اس وقت شغل جمالی کا ذکر ہے ان تمام چیزوں کی تفصیل پیش کرنا نہیں اسلئے میں اگر اس طرف توجہ کروں گا تو پھر اپنے مقصد سے الگ ہو جاؤں گا۔

ہست واجب سربسر ایں شغل اعظم را ادال می نگر اندر خبر تا باز بینی فضل آں

ترجمہ: اس بات کو صحیح سمجھ لو کہ یہ شغل مکمل طور پر بہت زیادہ ضروری ہے، حدیث میں غور وفکر کرو تاکہ پوری طرح اس کی فضیلت تم کو معلوم ہو جائے۔

تشریح: اس سے پہلے بھی مصنف کہہ چکے ہیں کہ ذکر اور فکر کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں متعدد مقامات پر مختلف انداز میں بیان فرمایا ہے، نیز حدیث پاک میں بھی ذکر اور فکر کی بہت زیادہ فضیلت بیان کی گئی ہے چونکہ یہ شغل بھی ذکر کے ذیل میں آتا ہے اس لئے کہ جس

کا تعلق زبان سے ہو یا قلب سے یا روح سے اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تصور صفاتی وذاتی اعتبار سے قائم ہو ذکر میں شامل ہے اور اس شغل میں اللہ تعالیٰ کے جمال بے مثال کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ تو اس قدر عظیم ہے کہ دنیا ہی میں نہیں بلکہ آخرت میں بھی یہ نعمت صرف انسانِ مومن کے لئے مخصوص ہے جیسا کہ تشریح کردی گئی تو پھر اس شغل کی اہمیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ یہ نورِ ذات جو متصف بہ سیاہی ہے یہ بھی درحقیقت اسی نور کا ایک جزو ہے جس کا مشاہدہ مکمل طور پر جنت میں مومنین کریں گے اور یہ نعمت دیدار دنیا وآخرت و مافیہا سب نعمتوں سے اعلیٰ وارفع ہے اسی لئے مصنف فرماتے ہیں کہ یہ شغل بہت زیادہ عظیم اور ضروری ہے۔

چوں سوادِ بحرِ وحدت نور مکشوف و عیاں　　　　شد تجلی پس بہ بینی نور الطف درمیاں

ترجمہ: جب وحدت کے سمندر کی سیاہی کا نور کھل کر اور ظاہر ہوکر روشن ہوجائے گا تو اس کے درمیان سب سے زیادہ لطیف اور پاکیزہ نور کو تو دیکھے گا۔

تشریح: سالک جب یہ شغل کرتا ہے تو رفتہ رفتہ قلب کی کثافت ختم ہوکر لطافت روح کی قوت میں اضافہ ہونے لگتا ہے اور پھر اسی قوتِ روحانی کے مطابق اس کے درجات میں بلندی عطا ہوتی ہے اور حجاباتِ ذات مرتفع ہوکر معرفت کی راہ آسان کردی جاتی ہے اور سالک کو ذاتِ پاک کی تجلیات کا بہت ہی قریب سے مشاہدہ ہونے لگتا ہے جس کی وجہ سے سالک یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ خداوند قدوس کی بارگاہ میں حاضر ہے اور اس نور کو جو بہت زیادہ لطیف وپاکیزہ ہے دیکھ رہا ہے۔

نورِ وحدت نور الطف ہست آں آبِ حیات　　　　می نگر اندر سواد نور الطف وصفِ ذات

ترجمہ: وحدت کا نور جو سب سے زیادہ لطیف نور ہے یہی تو سرچشمۂ حیات ہے، اسی لطیف ترین نور کی سیاہی میں تو صفاتِ ذات کا مشاہدہ کر۔

تشریح: کائنات کی تمام موجودات اللہ تعالیٰ کی صفتِ قدرت سے وجود پذیر ہوئی ہیں،

اور نور بھی اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے اور ہر ایک شئے اپنے موجود ہونے میں اسی صفتِ نور سے فیضان حاصل کر رہی ہے، اسی لئے مصنف اس نور کو سرچشمۂ حیات قرار دے رہے ہیں اور سالک کو اس طرف متوجہ فرما رہے ہیں کہ اس سرچشمۂ حیات یعنی نور ذات میں غور و فکر کرو تاکہ اس کی ذات کی قربت و معیت کا شرف حاصل ہو جو مقصودِ اصلی ہے۔

شد لطافت با کثافت مختلط ہم پیچ دار　　　زیں جہت ایں وصف را تو ذات گوئی ہوشدار

ترجمہ: لطافت، کثافت کے ساتھ بڑے عجیب انداز سے گھل مل گئی ہے ہوشیار رہو، اسی وجہ سے اس صفت کو ذات ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تشریح: یہ حقیقت ہے کہ جس طرح ذاتِ وحدہٗ لاشریک نور ہی نور ہے، اسی طرح اس کی تجلیات بھی مکمل طور پر نورانی اور بے انتہا لطیف ہیں، ہم ان تجلیات کو حجابات سے اس لئے تعبیر کرتے ہیں کہ ان تجلیات کی کثرت کی وجہ سے ذاتِ پاک تک رسائی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ ذاتِ پاک بھی لطیف ہے اور اسکی صفات بھی ذات کی طرح لطیف و پاکیزہ ہیں، دوسری بات بنیادی طور پر مصنف یہ فرما رہے ہیں کہ جس طرح ذات پاک ازلی و ابدی ہے اسی طرح صفات بھی ازلی و ابدی ہیں، وجود کے اعتبار سے ذات و صفات یکساں ہیں اور ذات و صفات میں اس طرح کا اندماجی تعلق ہے کہ ہم ذات اور صفات کو الگ نہیں کر سکتے، اسی لئے مشاہدہ کی بنا پر صفات کو ہی ذات سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ہماری رسائی توفیقِ خداوندی اگر ہوئی تو صفات تک ہو سکتی ہے، ادراکِ ذات محال ہے۔

در سیاہی غوطہ زن تا نورِ وحدت ہست ذات　　　زود بینی وجہ او را در نظر بے کیفیات

ترجمہ: سیاہی میں غوطہ لگاؤ تاکہ ذاتِ وحدت کا نور جس کو ذات کہتے ہیں تم بہت جلد اپنی نظروں سے اس نور بے کیف کی تجلیات کا مشاہدہ کر لو۔

تشریح: مصنف فرماتے ہیں کہ اس شغل جمالی کو اختیار کر کے قلب کی طرف توجہ

کرو، اور اس ذاتِ پاک کے نورانی حجابات سے قلب کو منسلک کر دو، جس قدر صفات سے قربت ہوتی جائے گی حجابات اٹھتے چلے جائیں گے اور جس قدر حجابات اٹھتے چلے جائیں گے اُسی قدر قربت کا حصول ہوگا یہاں تک کہ اس نورِ وحدت کی سیاہی میں غور وفکر سے وہ مراتب حاصل ہوں گے جس کو ذاتِ بے کیف کی تجلیات کا عنوان دیا جا سکتا ہے یعنی مراتب کی بلندی ہوتے ہوتے وہاں تک رسائی ہو جائے گی جہاں ذات کی صفات کی کیفیات کا تعین نہیں ہو سکتا۔ یہ مقام بہت مشکل ہے بلکہ مقامِ حیرت ہی ہے کہ جہاں پر سالک عقل و ہوش کے باوجود صُمٌّ وبُکْمٌ بن جاتا ہے اور ایک تصویرِ حیرت بن کر رہ جاتا ہے یہاں کی کیفیات کا بیان ناممکن ہے صرف مشاہدہ سے اس کا تعلق ہے۔

گفت اَلْفَقْرُ سَوَادُ الْوَجْہ زیں رو مصطفیٰ ‎ ‎ جائے دیگر باز گفتا فقر باشد فخر ما

ترجمہ: اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ذات کی سیاہی ہی اصل فقر ہے اور پھر دوسری جگہ فرمایا کہ فقر ہی میرے لئے باعث فخر ہے۔

تشریح: یہاں ایک حدیث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اَلْفَقْرُ سَوَادُ الْوَجْہِ فِی الدَّارَیْنِ، یعنی فقر اور تنگدستی دونوں جہان کی روسیاہی کا باعث ہے یعنی جو آدمی اعمالِ صالحہ سے محروم ہوگا حدیث کے مطابق وہی آخرت میں سب سے زیادہ مفلس ہوگا اور دنیاوی اعتبار سے بھی فقر مسلسل رسوائی اور شرمندگی کا باعث ہوتا ہے، لیکن صوفیا حضرات اس عبارت کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ سَوَادُ الْوُجْہ سے مراد ذاتِ پاک کا وہ نور ہے جو سیاہی سے متصف ہے کہ صحیح معنیٰ میں فقر یہی ہے کہ نورِ ذات کی طرف توجہ کر کے تمام کائنات سے بے نیاز ہو جائے اور اس مفہوم کی تائید اس حدیثِ پاک سے بھی ہوتی ہے کہ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فقر میرے لئے باعث فخر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی تجلیات نورانی کا مشاہدہ ہی صحیح معنیٰ میں فخر کے لائق ہے اور اس سے بڑا اعزاز کسی کے لئے بھی دنیا اور آخرت میں نہیں ہو سکتا، اس لئے ان تمام امور کے پیشِ نظر

یہ شغل کس قدر اہمیت رکھتا ہے اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

این سخن از بسکہ دشوار است و مشکل اے پسر   کس بجز تعلیم پیر خود نہ فہمد سر بسر

ترجمہ: اے سالک حقیقت میں یہ معاملہ بہت مشکل اور دشوار ہے اور کوئی شخص اس کی حقیقت کو مکمل طور پر مرشد کی تعلیم کے بغیر نہیں سمجھ سکتا۔

تشریح: اشغال اور ان کی کیفیات اور راہ معرفت و طریقت کے رموز، یہ سب امور حقیقت میں بہت زیادہ اہم اور مشکل ہیں، اس لئے کہ ان تمام امور سے مقصد معیتِ ذات ہے، اور ظاہر بات ہے کہ وہ ذاتِ پاک جس کی کوئی مثال نہیں، جس کی قدرت تصور سے بھی بالاتر ہے جس کی عظمت وہم و خیال سے بھی ارفع ہے جس کی تعریف الفاظ سے بیان نہیں کی جا سکتی اور کوئی اس کی تعریف بیان بھی نہیں کر سکتا، ایسی ذات کی معیت اور اس کی تجلیات تک رسائی کوئی معمولی بات نہیں، اس کے لئے کسی تجربہ کار اور کامل شخص کی رہنمائی کی ضرورت ہے جو ایسے مقامات پر رہنمائی کر سکے جہاں عقل و خرد عاجز ہو، راہبر کے بغیر اس وادی میں قدم رکھنے سے فوائد سے زیادہ نقصان کا امکان ہے، اس لئے دامنِ مرشد سے منسلک ہونے کے بعد اس راہ کے رموز سے کما حقہ واقفیت حاصل ہو سکتی ہے۔

چند گویم زیں زیادہ مر ترا اے اہلِ راز   ہوشداری تا بگویم با تو دیگر شغلِ راز

ترجمہ: اے رازِ معرفت کے طالب، اس سے زیادہ میں تجھ سے اور کیا کہوں، اپنی سمجھ کو درست رکھ تاکہ دوسرا شغل میں تجھ سے بیان کروں۔

تشریح: یعنی اس شغل کی اہمیت اور افادیت کے سلسلے میں جو باتیں ضروری تھیں، وہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے مختصر اور جامع طور پر بیان کر دیں جس کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس شغل میں یکسوئی اور استقلال کے ساتھ مشغولیت اختیار کی جائے، اس کے بعد مصنف دوسرا شغل بیان کر رہے ہیں۔

در بیان شغل جلالی راز حق تعالےٰ

اللہ تعالےٰ کی معرفت کے سلسلہ میں شغل جلالی کا بیان

شغل در رازِ جلالی بشنو از من این زماں ۔۔۔ می کشا این چشم ظاہر نور بنگر در عیاں

ترجمہ : صفت جلال کے راز کے سلسلے میں مجھ سے اس وقت ایک شغل سنو، کہ اس ظاہری آنکھ کو کھول کر نور خداوندی کا واضح طور پر مشاہدہ کرو۔

تشریح : اس عنوان سے پہلے جو شغل بیان کیا گیا ہے وہ شغل جمالی تھا، کائنات کی ہر ایک شے میں جمالِ ذات پوشیدہ ہے اور ہر ایک شے جمالِ ذات ہی سے وجود پذیر ہے، اس پوشیدگی کی وجہ سے اصطلاحی طور پر اس شغل کا تعلق باطن سے تھا اور اس میں غور و فکر کا بنیادی مرکز قلب کا وہ نقطہ تھا جو براہِ راست روح سے فیضان حاصل کرتا ہے۔ یہاں پر جو شغل بیان کیا جا رہا ہے، اس شغل کا نام "شغل جلالی" ہے اور جمال کی طرح جلال بھی صفت خداوندی ہے، فرق صرف اتنا مانا گیا ہے کہ جمال میں پوشیدگی ہے اور جلال میں احاطت یعنی محیط ہونے اور گھیر لینے کا مفہوم واضح ہے، گویا ہر ایک شے کو جلالِ ذات اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے صفتِ جمال اور صفتِ جلال آپس میں اس طرح گھلی ملی ہیں جس کو اندماج کہا جاتا ہے کہ ہم ایک دوسرے میں امتیاز نہیں کر سکتے، ان صفات کو صفتِ سلبیہ اور ایجابیہ سے اگر تعبیر کیا جائے تو مفہوم زیادہ واضح ہو جاتا ہے جیسا کہ بعض محققین صوفیاء نے استعمال کیا ہے۔

ایک مغالطہ عام طور پر صفات کے سلسلے میں یہ ہو جاتا ہے کہ صفت جلال کو غصہ کے ہم معنی اور صفتِ جمال کو حسن و خوبصورتی کے مترادف سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ جلال کا مفہوم صفتِ ذات کے سلسلے میں احاطت اور شان و شوکت کا ہے اور جمال کا مفہوم شانِ رحمت کے ظہور کا ہے، کیونکہ وہ حسنِ لازوال اور نورِ بے مثال کی صفت سے تو ہر صورت میں

متصف ہے خواہ جمالی کیفیت ہو یا جلالی ہو اور یہ دونوں صفات ہی نہیں بلکہ جو بھی صفت ذات سے منسلک کی جائے گی سب کی سب اندماجی شان اپنے اندر لئے ہوئے ہوگی۔

بہرحال باری تعالیٰ کی صفتِ جلال سے متعلق اِس شغل کا بنیادی تصور یہ ہے کہ کسی سنسان مقام پر باوضو قبلہ رُخ بصورتِ مراقبہ نشست اختیار کر کے اَللّٰہُ حَاضِرِی اَللّٰہُ نَاظِرِی اَللّٰہُ مَعِی زبانِ قلب سے کہنے کے بعد اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیط کے معنیٰ کا تصور کر کے اپنی دونوں آنکھوں کو کھول کر احاطۂ جلالِ ذات کے مفہوم پر غور کرے کہ ہر ایک شئے کو اللہ تعالیٰ کا جلال احاطہ کئے ہوئے ہے، اور اس تصور کو اس قدر وسعت دی جاتی ہے کہ آنکھ سے نظر آنے والی کسی شئے کا وجود ہی باقی نہیں رہتا، صرف اس ذاتِ پاک کا وجود اس حیثیت سے کہ وہ موجود ہے اور محیط ہے قائم رکھا جاتا ہے، جب یہ تصور قائم ہو جاتا ہے تو سالک کی فطرت میں وہ کیفیت رچ بس جاتی ہے کہ وہ ہر وقت معیتِ ذات باصفتِ احاطت سے لطف اندوز ہوتا رہے اور اس کے فکر کی تمام راہیں اسی ذات کی طرف رخ کر لیں گی اور اس کے تمام کام اس کے حکم کے مطابق ہو جائیں گے، ذاتِ وحدہٗ لاشریک کے علاوہ اس کا کوئی مقصود نہ ہوگا، اس کی معرفت کے سوا اس کی کوئی منزل نہ ہوگی۔

نورِ وحدت نورِ احمد نورِ عالم ہر یکے راست دانی نورِ وحدت بے خلاف و بے شکے

ترجمہ: ذاتِ وحدہٗ لاشریک کا نور، نورِ احمدی اور تمام عالم کا نور ایک ہی ہے اور بغیر کسی اختلاف و شک کے یہ بات صحیح مان لو کہ یہ تمام کے تمام انوارِ وحدت ہیں۔

تشریح: یعنی ہر ایک شئے میں اسی کے نور کی جلوہ گری ہے خواہ نورِ احمد ہو یا نورِ کائنات ہو، اسی لئے عالمِ ناسوت میں چشمِ ظاہر کے ذریعہ جس نور کا مشاہدہ کرنے کیلئے یہ شغل کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ مصنف یہ بیان فرما رہے ہیں کہ عالمِ ناسوت کا یہ نور، دراصل نورِ محمدی کا پرتو ہے اور نورِ محمدی کا ظہور نورِ ذات سے ہے تو گویا نورِ محمدی اور نورِ کائنات دراصل

نورِ خداوندی ہی ہوا، اور سالک جب اس عالمِ ناسوت کے نور سے اُنسیت و مناسبت پیدا کر لیتا ہے اور اس کی اہمیت کو سمجھ لیتا ہے تو گویا اس کو نورِ محمدی کی حقیقت سے واقفیت ہوگئی اور جب نورِ محمدی سے نسبت ہوگئی تو نورِ خداوندی سے اس کا رابطہ قائم ہوگیا اور یہی نورِ ذات اصل مقصود ہے، اس طرح اس شغل کے ذریعہ نورِ ذات تک رسائی ہو جاتی ہے۔

بیمثال ایں نورِ وحدت می نگر در واقعات ۔۔۔۔۔ لیک رنگش مختلف از اصل آں بے رنگ ذات

ترجمہ: اس بے مثال نورِ وحدت کا تمام حقائق میں مشاہدہ کر، لیکن ہر ایک شئے میں اس کا رنگ الگ الگ ہے اگرچہ وہ ذاتِ پاک بے رنگ بے کیف ہے۔

تشریح: کائنات کی ہر ایک شئے میں اسی کا جلوہ ہے، کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس میں نورِ وحدت جلوہ گر نہ ہو، سالک جب غور و فکر کرتا ہے تو ہر جگہ ہر شئے میں اسی کے جلوؤں کا مشاہدہ کرتا ہے لیکن یہ معاملہ بھی بڑا عجیب ہے کہ وہ ذاتِ پاک تو بے رنگ بے کیف ہے اور اس کے جلوے ہر جگہ، ہر لمحہ، ہر ایک شئے میں مختلف انداز میں ہوتے ہیں ان جلوؤں کا نہ کوئی شمار ہے اور نہ کوئی انتہا ہے، اسی لئے یہ تمام لامحدود جلوے صرف اسی ذاتِ پاک کے ہیں جو خود بے کیف و بے رنگ ہے۔ کہیں یہ شبہ نہ ہو جائے کہ کثرتِ مظاہر کی وجہ سے کثرتِ ذات کا گمان ہو، یا مختلف انداز میں جلوہ آرائی کی وجہ سے تعددِ ذات کا خیال ہو جائے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اسی شبہ کو دور کرنے کیلئے یہ وضاحت فرمائی ہے۔

مثل اُو را مثل نے ایں بے مثالی وجہِ نور ۔۔۔۔۔ حق تعالیٰ را نگر نزدیک ہست از تو دور

ترجمہ: اس نورِ ذات کی بے مثالی تو اس طور پر ہے کہ کوئی بھی اس کی مثل نہیں،

حق کے اس بے مثال نور کا بہت قریب سے مشاہدہ کر، یہ تجھ سے دور ہی کب ہے؟

تشریح: یعنی اس ذاتِ پاک کے جلوے خواہ جمالی ہوں یا جلالی، اس انداز سے ہیں، کہ کوئی مثال ہی اُن کی نہیں، لیکن اس بے مثالی کی وجہ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ پھر اس بیمثال

تک رسائی ناممکن اور اس کی تلاش محال ہے بلکہ یہ جلوے تو اپنی بے مثالی کے باوجود انسان سے بہت زیادہ قریب ہیں، اس لئے ان جلوؤں کے مشاہدہ کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں وہ تو ہر جگہ موجود ہیں، شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں، صرف غور و فکر اور توجہ کی ضرورت ہے۔

زیں جہت این قرب دیدن گفت قرآں خدا   ایں چنیں اندر احادیث آمد از خیر الوریٰ

ترجمہ: اسی وجہ سے اس نورِ ظاہر کو دیکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حکم فرمایا ہے اور احادیث پاک میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کا ارشاد فرمایا ہے۔

تشریح: عالمِ ناسوت یا ملکوت، جبروت ہو یا لاہوت یا ہاہوت، اور اس کے علاوہ بھی جو عالم مشہود ہیں یا غیر مشہود، سب میں اس ذاتِ پاک کا نور جلوہ گر ہے، اس کی افادیت اور اہمیت کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے انفس و آفاق میں اپنی آیات کے مشاہدے کیلئے قرآنِ پاک میں متعدد مقامات پر فرمایا ہے، اور حدیثِ پاک میں اس پروردگار کی صفات میں غور و فکر کرنے اور اس کی قدرتِ کاملہ کا مشاہدہ کر کے اپنے قلوب میں اس کی رفعت و عظمت قائم کرنے کے لئے متعدد مقامات پر فرمایا گیا ہے، یہ شغل جلالی بھی اسی مفہوم کے ضمن میں آتا ہے اور اس میں مشغولیت قربت اور معیت کا ذریعہ بنتی ہے۔

درحقیقت اوست نورِ آسمان و ہم زمین   ذات او نور است بنگر وجہ ربّ العالمین

ترجمہ: حقیقت میں وہی آسمان اور زمین کا نور ہے، اس کی ذاتِ پاک تو مکمل نور ہے اس لئے ربّ العالمین کے نور کا مشاہدہ کر۔

تشریح: اس نور کے لئے جو خود اللہ تعالیٰ کا نور ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس آیت پاک سے بھی یہ حقیقت واضح ہو گئی، کہ آسمانوں اور زمینوں میں سب جگہ اللہ کا ہی نور ہے، سالک اس شغل میں جس نور کا مراقبہ کرتا ہے وہ بھی دراصل اسی پروردگار کا نور ہوتا ہے، کیوں کہ اس کی ذاتِ پاک تو مکمل نور ہے

اور یہ حجاباتِ نورانی جو پردہ ہائے جلال کہلاتے ہیں اس ذاتِ پاک کے جمالِ بے مثال سے اندماجی کیفیت کے ساتھ متعلق ہیں، اسی لئے جہاں اس کی تجلیاتِ جمالی کا مشاہدہ سالک کو منزلِ مقصود تک پہونچاتا ہے اسی طرح تجلّیات جلالی بھی منزلِ مقصود تک پہونچانے والی ہیں، مصنّف رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی سبب سے فرماتے ہیں کہ اس زمین و آسمان کے نور کو اس ذاتِ پاک کا نور یقین کر کے کھلی آنکھ سے اس کا مشاہدہ کرنا چاہیئے تاکہ صفات کے ذریعہ ذات تک رسائی ہو جائے۔

اگر بہ بینی در عدم بینی وجودِ نور اوست — ور بہ بینی در وجودت بنگری ہم وجہِ دوست

ترجمہ: اگر تو عدم میں غور و فکر کرے گا تو اسی واجب الوجود کے نور کو دیکھے گا اور اگر اپنے اندر غور کرے گا تب بھی اسی کے نور کو روشن اور جلوہ گر دیکھے گا۔

تشریح: یہ حقیقت ہے کہ عدمِ محض کا وجود نہیں یعنی دنیا و مافیہا میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں پر کچھ نہ کچھ موجود نہ ہو، جہاں کوئی بھی شئے بظاہر موجود نہیں ہوتی جیسا کہ فضا ہے وہاں پر بھی بہت سی چیزوں کا وجود آج کی جدید سائنس نے ثابت کر دیا ہے لیکن صوفیا حضرات کی نظر نے جس چیز کی دریافت کی ہے ان کے لئے قلبِ مومن کی مشین کے علاوہ کوئی دوسری مشین کام نہیں دے سکتی، وہ فرماتے ہیں کہ عدمِ مطلق معدوم ہے جہاں کوئی شئے مادّی یا وجودی اعتبار سے معلوم نہ ہوتی ہو وہاں تجلّیاتِ پروردگار کا وجود ہے اور ان تجلّیاتِ ظاہری کا تعلق مظہرِ جلال سے ہے اور یہ تجلیات صرف ظاہر ہی میں نہیں بلکہ خود باطنِ سالک میں بھی ان کا وجود ہے، معاملہ صرف غور و فکر کرنے کا ہے، خواہ ظاہر میں دیکھو یا باطن میں، عدم میں دیکھو یا وجود میں، سب جگہ اسی کا جمال جلوہ فگن ہے۔

شد ازیں معنی خدا را سجدہ کردن ہر طرف — لیکن آمد قیدِ قبلہ در عبادت از شرف

ترجمہ: اسی وجہ سے اللہ تعالےٰ کو ہر سمت سے سجدہ کرنا صحیح ہے، البتہ قبلہ کی قید عبادت میں احترام کی وجہ سے ہے۔

تشریح : جب یہ بات یقین کے ساتھ معلوم ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کا جمال تمام اطراف میں یکساں طور پر جلوہ فگن ہے اس کے لئے کسی ایک سمت کی قید نہیں تو اس وسعت اور ہمہ گیری کی وجہ سے خداوند تعالیٰ کو جس سمت سے چاہیں سجدہ کرلیں تو یہ سجدہ کرنا صحیح ہوگا۔ قرآنِ پاک میں اس حقیقت کو اَیْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے کہ تم جس طرف بھی رُخ کروگے تو اللہ تعالیٰ کے رُخ کو پاؤگے لیکن عبادت میں بیت اللہ شریف کی طرف منھ کرکے سجدہ کرنے کی وجہ اللہ کے گھر کا احترام ہے ورنہ اس کا جلوہ تو ہر طرف ہے۔

بسکہ نافذ گشت امرِ حق تعالیٰ بے نیاز مصطفےٰ را روئے گردن سوئے کعبہ در نماز

ترجمہ : اور یہ بات بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز کا حکم ہوا، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں قبلہ کی طرف رُخ کرنے کا۔

تشریح : مصنف رحمۃ اللہ علیہ بیت اللہ کی طرف منھ کرکے نماز پڑھنے کی دوسری وجہ یہ بیان فرمارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نماز میں قبلہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم فرمایا، اس لئے اطاعتِ حکم کی بنا پر عبادت میں قبلہ کی طرف رُخ کرنا ضروری ہے۔ ۲ھ میں ظہر کی نماز میں دو رکعت ہونے کے بعد بیت المقدس کی طرف سے رُخ پھیر کر بیت اللہ کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم ہوا اور اس حکم کے مطابق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف نماز بیت اللہ کی طرف رُخ کرکے پوری فرمائی، لہٰذا اس حکم کی وجہ سے بھی بیت اللہ شریف کی طرف رُخ کرکے نماز ادا کی جاتی ہے، ورنہ اس کا جلوہ تو تمام اطراف میں ہے۔

پنج او امر اندریشان است قرآں می نگر سجدہ سوئے غیر کعبہ نیست جائز اے پسر

ترجمہ : اس سلسلے میں پانچ اسباب قرآن پاک میں بیان کئے گئے ہیں جن کی وجہ سے اے سالک! بیت اللہ کے سوا کسی اور طرف رُخ کرکے سجدہ کرنا جائز نہیں۔

تشریح : مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جمالِ خداوندی تو ہر سمت میں ہے لیکن قبلہ کی طرف رُخ کرکے سجدہ کرنے کے پانچ سبب یہ ہیں (۱) حکم خداوندی کا اتباع

(۲) امت محمدیہ کو منصب امامت عطا کرنے کا اعلان (۳) بنی اسرائیل کی امامت اور سرداری کے خاتمہ کا اعلان (۴) اتباع پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے جانچنے کا معیار قائم کرنا کہ دیکھیں کون پیغمبر کی اتباع کرتا ہے اور کون انحراف کرتا ہے (۵) قیامت میں دوسرے انبیاء علیہم السلام کی امت کے سلسلے میں گواہی دینے اور رسول کو ان پر گواہ بنانے کے لئے'' ان پانچ امور کی وجہ سے بیت اللہ شریف کے علاوہ کسی دوسری طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے۔

مصنف رحمہ اللہ نے یہ تمام تفصیل اس لئے بیان فرمائی ہے کہ کہیں یہ مغالطہ نہ ہو جائے کہ پروردگار نے تو عبادت کا رُخ صرف بیت اللہ کی طرف رکھا ہے اور یہی عبادت تقرب کا ذریعہ اور معیتِ ذات کا سبب ہے اور مصنف رحمہ اللہ ایسا ذریعہ تقرب بیان فرما رہے ہیں جس کی کوئی سمت نہیں، اس لئے مصنف نے یہ تفصیل بیان کر دی کہ حقیقت تو یہی ہے کہ اس کا جمال ہر طرف ہے لیکن عبادت میں رُخ قبلہ ہی کی طرف ہوگا، البتہ شغل اور تفکر میں اس کے جمال کے مشاہدے کیلئے کسی سمت کی قید نہیں۔

چند گویم شرحِ ایں بسیار باشد در شمار کارِ من در شرحِ وجہ خالق و پروردگار

ترجمہ: کہاں تک میں اس کی تشریح کروں کیونکہ یہ شمار سے باہر کی بات ہے میرا مقصد تو خالق و پروردگار کے جمال کے مشاہدے کی تشریح کرنا ہے۔

تشریح: مصنف فرماتے ہیں کہ اس شغل کی تشریح اور تفصیل بیان کرنا تو بہت مشکل بات ہے، راہ سلوک میں الفاظ و مباحث کو مقصود نہیں بنایا جاتا، بلکہ یہ تو ایک ذریعہ ہیں، مقصود تو صرف وہی ذات پاک ہے جس کو ہم صفات کے ذریعہ ہی پہچان سکتے ہیں، اسی وجہ سے میں نے اپنے مقصد کے پیش نظر اس کی صفت جمال میں غور و فکر کے لئے یہ شغل بیان کر دیا ہے، اور اس کی افادیت تو کامل طور پر مشغولیت کے بعد ہی معلوم ہو سکتی ہے۔

در بیانِ حقیقتِ نماز

نماز کی حقیقت کا بیان

در عدد بنگر یکے حق آں یکے را نام دوست　　یک مجازی یک حقیقی می نگر ایں وجہ دوست

ترجمہ: اعداد میں غور کرو کہ ان کی حقیقت ایک اکائی ہے لیکن اس اکائی کے دو نام ہیں ایک مجازی اور ایک حقیقی، ان دونوں ہی میں محبوبِ حقیقی کے جمال کا مشاہدہ کر۔

تشریح: اب مصنف رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسے طریقِ بندگی کا بیان فرما رہے ہیں جو اقرارِ بندگی یعنی کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے بعد اظہارِ بندگی کا عملی طور پر سب سے پہلا اور اہم رکن ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ خاص انعام ہے کہ جو شئے مخلوق کے لئے جس قدر اہم ہوتی ہے اسی انداز سے اس کی عمومیت بھی ہوتی ہے، مثال کے طور پر "ہوا" ہے، زندگی کے لئے اس کی اہمیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے، لیکن اس کی اہمیت کے مطابق ہی اس کی عمومیت بھی ہے، ہوا ہر جگہ، ہر وقت، ہر ایک جاندار کو بغیر کسی محنت و مشقت کے حاصل ہوجاتی ہے اسی طرح پانی، گرمی، سردی، روشنی، اندھیرا، یہ تمام اشیاء حسبِ ضرورت درجہ بدرجہ عمومیت کے دائرہ میں آتی ہیں، تمام عبادات میں نماز بھی اپنے اندر ایک خصوصی اہمیت رکھتی ہے، اسی لئے اُس کی ادائیگی میں جو وسعت اور عمومیت ہے وہ دیگر عبادات میں نہیں، اس طریقِ بندگی میں نہ کسی خاص مہینے کی تخصیص ہے جس طرح فرض روزے کی ادائیگی کے لئے ماہِ رمضان کی تخصیص ہے، نہ کسی خاص مقام پر خاص ایام میں ادائیگی سے اس کا تعلق ہے جس طرح حج کا معاملہ ہے کہ اس میں وقت اور مقام کی تعیین کردی گئی ہے، نہ اس کا تعلق کسی خاص مدت کے گذرنے اور خاص مقدار کے موجود ہونے سے ہے جس طرح ادائیگیٔ زکوٰۃ کے لئے ایک سال کی مدت کا گذرنا اور صاحبِ نصاب ہونا شرط ہے۔ حج زندگی میں ایک مرتبہ، اور روزے سال بھر میں ایک ماہ اور زکوٰۃ ایک سال کی مدت گذرنے پر فرض ہے لیکن نماز

روزانہ پانچ مرتبہ ہر ایک غریب، امیر، عالم، غیر عالم، عورت، مرد، غرض کہ ہر مسلمان عاقل بالغ پر فرض ہے نہ اس کے لئے کسی خاص جگہ کی تخصیص ہے بلکہ تمام پاک مقامات پر ادا کی جا سکتی ہے، نہ اس کے لئے صاحب نصاب ہونا ضروری ہے۔

نماز کی اہمیت کا کھلا ہوا ثبوت اللہ تعالیٰ کا کلام پاک ہے، قرآن پاک میں جتنی کثرت سے نماز کا تاکیدی بیان ہے کسی اور فرض کا نہیں، حدیث پاک میں بھی نماز کی اہمیت کو مختلف انداز میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے، مصنّف رحمہ اللہ نے بھی اسی اہمیت کے پیش نظر صرف اسی طریق بندگی کی وضاحت کی ہے کیونکہ جب اس کی حقیقت مومن کے قلب میں اتر جائے گی تو پھر اس نماز کے وہ ثمرات و نتائج ظہور پذیر ہوں گے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ. بے شک نماز فواحشات اور منکرات سے روکتی ہے۔

مصنّف رحمۃ اللہ علیہ نے نماز کی حقیقت کو جس سائنٹفک انداز میں بیان فرمایا ہے یہ اللہ تعالیٰ کا وہ خاص انعام ہے جو مخصوص بندوں کو عطا کیا گیا ہے، فرماتے ہیں کہ اعداد میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اعداد کی حقیقت ایک اکائی ہے، کیونکہ اعداد کا آغاز ایک اکائی سے ہوتا ہے اور اس اکائی کی جس قدر تکرار کرتے جائیے تعداد بڑھتی چلی جائے گی مثلاً ایک کی تکرار ایک مرتبہ کی تو دو کا ہندسہ وجود میں آگیا اور دو مرتبہ تکرار کرنے سے تین کا ہندسہ وجود پذیر ہو گیا۔ اسی طرح جہاں تک بھی اس اکائی کی تکرار کرتے جائیے اسی کے مطابق اعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور جب تمام اعداد کو سمیٹ کر لائیں گے تو صرف ایک اکائی باقی رہ جائے گی، اس سے معلوم ہوا کہ تمام اعداد میں "ایک اکائی" کی حیثیت بنیادی اور حقیقی ہے اس اکائی کے علاوہ جو کثرت اعداد میں نظر آتی ہے وہ مجازی ہے اور یہ تمام کثرت مجازی اپنے وجود میں اکائی کی محتاج ہے۔ نماز میں جب تک یہ تصور قائم نہ ہوگا اور اَللّٰہُ اَکْبَر کہہ کر ہاتھ اٹھانے کے ساتھ تمام کثرت کو ختم کر کے صرف ایک مرکز وحدت کی طرف توجہ کو

مکمل طور پر مبذول نہ کیا جائے گا اس وقت تک نماز کی حقیقت عیاں نہیں ہو سکتی۔

حدیث پاک میں اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ (نماز مومنین کی معراج ہے) فرما کر اس حقیقت کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ جس طرح معراج شریف میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو ذات وحدہٗ لاشریک کی قربت کا شرف جسمانی اور روحانی طور پر حاصل ہوا تھا اور تمام ہی متعلقات سے رشتہ منقطع ہو کر رہ گیا تھا، اگر کچھ سامنے تھا تو وہ جلوہ ذات تھا، اسی طرح جب بندہ مومن تمام تعلقات سے صرفِ نظر کر کے کثرت سے وحدت کی طرف عروج کرتا ہے تو گویا اس کو شرفِ معراج حاصل ہو گیا اور جس نے نماز سے غفلت برتی وہ اس شرف سے محروم رہا، اور جس نے بے توجہی اور بے دلی کے ساتھ نماز ادا کی وہ بھی روحِ نماز کو نہ پا سکا، اسی لئے مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس طرح اعداد میں وحدت اور کثرت دونوں پر نظر ہوتی ہے لیکن حقیقتِ اعداد کی یافت کے لئے اعداد کی کثرت سے توجہ ہٹا کر ایک اکائی کو دیکھا جاتا ہے اسی طرح نماز میں ارکانِ مجازی یعنی قیام، رکوع اور سجود و قرارت کے ساتھ ساتھ آئینہ وحدت میں اسی ذاتِ پاک کی تجلیات کا مشاہدہ کرو گے تو حقیقت نماز حاصل ہو جائے گی، اس حقیقت کے سامنے آنے کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ جسمانی اعتبار سے بھی دربارِ خداوندی میں حاضری ضروری ہے اور روحانی اعتبار سے بھی۔ ھٰذا فَیْضَانُ الْمُرْشِد۔

نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح تمام کائنات کا خلاصہ انسان ہے اسی طرح تمام کائنات کی عبادت کا خلاصہ نماز ہے، ایک مومن احکم الحاکمین کے دربار میں حاضر ہو کر کس طرح اپنے آقا و مالک کو راضی کرنے کی کوشش کر رہا ہے، کبھی وہ اس کے سامنے ادب کے ساتھ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور جسمانی، قلبی، ذہنی اعتبار سے عاجزی و انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی حمد و ثنا اسی کے الفاظ کے ساتھ بیان کر رہا ہے، کبھی اس کے سامنے جھکا ہوا اس کی عظمت کے گُن گا رہا ہے اور کبھی زمین پر اپنی پیشانی رکھ کر اس ذات پاک کی بے مثال بلندی اور پاکیزگی کا اقرار کر رہا ہے اور کبھی سکون کے ساتھ بیٹھ کر اس کی معبودیت کا اعلان

پڑھ رہا ہے، اور یہ کوشش کر رہا ہے کہ کسی بھی طرح میرا مالک، میرا آقا مجھ سے راضی ہو جائے غور کیجئے کہ کس قدر خوش نصیب ہے یہ انسان جو شب و روز میں کم از کم پانچ مرتبہ اس عمل کو دہراتا ہے اور خداوند قدوس کے دربارِ عالی سے یہ تمغہ لیکر آتا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى۔ بے شک وہ کامیاب ہو گیا جس نے تزکیۂ نفس کیا اور ذکرِ رب کیا اور نماز ادا کی، اسی لئے آقائے نامدار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ اَللّٰهُمَّ وَفِّقْ لَنَا۔

یک بکے ہر جائے یک نور است بنگر در شمار ور بود دو در شمارش چشم را بر یک گمار

ترجمہ: اگر صحیح طرح اعداد کے شمار میں غور کرو گے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اکائی تو ہر جگہ اکائی ہے اگر شمار کرنے میں وہ دو بھی ہو جائے پھر بھی تو اپنی نگاہ کو ایک ہی پر قائم رکھ۔

تشریح: یعنی جس طرح اعداد و شمار کی کوئی انتہا نہیں لیکن جب شمار کرنے میں اعداد کی طرف متوجہ ہو جاؤ گے تو تم کو یہ حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ ان سب کی حقیقت تو ایک اکائی کی تھی، اسی طرح ذاتِ مطلق ازلی و ابدی اعتبار سے وحدتِ ذات کی ذاتی صفت سے متصف ہے اگرچہ اس کی صفات کے مظاہر لامحدود ہیں لیکن ان کثرتِ صفات سے تمہاری نظر کو کثرتِ ذات کا گمان نہ ہو جائے، اس لئے مصنف فرماتے ہیں کہ صفات جس قدر بھی ہوں لیکن تمہاری نظر صرف اس ذاتِ واحد کی طرف ہی متوجہ ہونی چاہیئے کیونکہ حقیقت میں وہی ایک ذات پاک ایسی ہے جس کی صفات کے یہ سب نظارے اور مظاہر ہیں۔

دو دروغ و یک حقیقی ایں سخن را ہوشدار آنچہ یک ہر جائے یک گرچہ بینی صد ہزار

ترجمہ: اس بات کا خیال رکھ کہ وجود کا تعدد جھوٹ ہے اور حقیقت اکائی ہے، جو ایک ہے وہ تو ہر جگہ ہی ایک ہے اگرچہ ہزار ہا جلووں میں اس کو دیکھو۔

تشریح: اعداد کی مثال میں وجود کی جو تقسیم کی گئی تھی وہ مجازی اور حقیقی اعتبار سے تھی، اس سے کہیں یہ شبہ نہ ہو جائے کہ وجود بھی متعدد ہیں، اس لئے مصنف تنبیہ فرما رہے ہیں کہ مظاہر

کی کثرت سے، کثرتِ وجود کے مغالطے میں نہ آنا، وجودِ حقیقی تو ایک ہی ہے وہ جتنے چاہے مظاہر میں جلوہ نما ہو جائے لیکن اس کی ذاتِ پاک تعددِ وجود سے پھر بھی پاک رہے گی۔

یک یکے باشد از وایں ہر یکے موجود ہاست آں یکے را در ہمہ موجود بنگر راست راست

ترجمہ: ایک تو ایک ہی ہوتا ہے البتہ اس ایک سے اِن سب کا وجود ہوا ہے اس لئے اس ایک ہی کو تمام موجودات میں صحیح طور پر جلوہ فگن دیکھو۔

تشریح: وہ قادرِ مطلق ہے اور اس کی قدرت لامحدود ہے، وہ ایک ہے اور اس کی یکتائی ازلی و ابدی ہے، وجود ذاتی اگر کسی کا ہے تو اس شانِ یکتائی کے ساتھ اسی کا ہے، دوسرے تمام موجودات اس کے حکم سے وجود پذیر ہوئے ہیں، اس لئے سالک کے لئے ضروری ہے کہ تمام موجودات میں بغیر کسی واسطے کے اسی کا جلوہ دیکھے اور کائنات کی ہر شئے کو اس کی قدرت کاملہ کا مظہر تصور کرے۔

از یکے بسیار و در بسیار آں یک بے شکے ذاتِ یک در وجہ بسیار است بنگر در یکے

ترجمہ: ایک سے بہت ہوئے اور اس بہتات میں بے شک وہ ایک ہے، تمام مظاہر میں ذات پاک ایک ہی ہے اور اسی ایک کی طرف توجہ کرو۔

تشریح: یعنی مظاہر کی کثرت کی وجہ سے کہیں یہ خیال پیدا نہ ہو جائے کہ ذات میں بھی تعدّد ہے کیونکہ وہ ذاتِ پاک تو اس قدر لامحدود قدرت کے باوجود کہ کائنات کی ہر ایک شئے میں اسی کا ظہور ہے، وہ ایک ہی ہے، اسی لئے تمام تر کثرتِ ظاہری میں وحدت پر ہی نظر رکھو۔

او یکے از انواعِ کسوت گشت ہر سو آشکار تو یکے را گرچہ بینی در لباس صد ہزار

ترجمہ: وہ ایک ہی ہے اور مختلف قسم کے لباس میں ہر طرف ظاہر ہو رہا ہے اسی ایک کو اگرچہ تو ہزاروں لاکھوں رنگ کے لباس میں دیکھتا ہے۔

تشریح: یعنی وہ ذات پاک تو ایک ہے اور اس کی صفات لامحدود ہیں، اس نے اپنی صفتِ قدرت کے ادنیٰ اشارے سے یہ تمام کائنات پیدا کی ہے، اس کائنات میں جو

کچھ نظر آتا ہے وہ اسی کی ذاتِ پاک کا معمولی سا کرشمہ ہے، کثرتِ مظاہر تو تیری نظر کا فریب ہے اس لئے کہ تیری نظر پر حجابات کا پرتو ہے جب یہ حجابات ختم ہو جائیں گے تُو تُو پھر اس کی وحدت کی جلوہ گری ہر ایک شئے میں دیکھے گا۔ اس لئے سالک کے لئے ضروری ہے کہ صرف اُسی کی وحدت کا مشاہدہ کرے۔

آں یکے را ایں نشاں داں راز گویم مختصر ۔۔۔ بے نشانِ حرفِ وحدت وجہِ او را می نگر

ترجمہ: مختصر طور پر میں اس وحدہٗ لاشریک کے نشان کا راز بیان کرتا ہوں کہ وحدت کی آخری حد سے اس بے نشان کی تجلیات کا مشاہدہ کر۔

تشریح: یعنی وہ ذاتِ پاک اس قدر ارفع و اعلیٰ اور بے مثال ہے کہ کوئی بھی طریقہ تعبیر ایسا نہیں جس کے ذریعہ اس کی حقیقت بیان کی جا سکے، انسان کا خیال، قیاس، گمان، وہم، اس کے ادراک سے عاجز ہیں، اس ذاتِ پاک کی معرفت کا اگر کوئی راستہ ہے تو یہی ہے کہ ہم دل کے یقین کے ساتھ مان لیں کہ کائنات کی ہر ایک شئے میں وہ اپنی شانِ یکتائی کے ساتھ جلوہ گر ہے اور کائنات کی ہر ایک شئے اس کی قدرت کا مظہر ہے بلکہ مظاہرِ قدرت لامحدود ہونے کے باوجود بھی وہ ذاتِ پاک اپنی بے مثال وحدت کے ساتھ ہر ایک شئے میں جلوہ گر ہے۔

ہر چہ بینی در ہمہ عالم مرا و را صورتی است ۔۔۔ نیست او را قیدِ صورت او چہ زیبا صورتی ست

ترجمہ: کائنات میں جو کچھ بھی تم کو نظر آ رہا ہے اسی کی ایک خاص صورت ہے لیکن وہ خود ایسے انوکھے روپ والا ہے کہ اس کو کسی صورت میں مقیّد ہی نہیں کیا جا سکتا۔

تشریح: پاک ہے وہ ذات وحدہٗ لاشریک ہر اس خاص صورت سے جو کسی بھی ذہن میں کسی بھی اعتبار سے آ رہے، اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ کائنات کی ہر ایک شئے اس کی صورت کی یعنی اس کی قدرتِ کاملہ کی ایک خاص شکل ہے اور یہی تشخّصِ وجودِ خالق اور مخلوق کے درمیان حدِ فاصل ہے، جب تک بے نشانی اور بے مثالی کے دائرے میں انسانی تخیّل پرواز کرتا رہے گا وحدہٗ لاشریک اپنی ہزار ہا بے نشانیوں کے ساتھ جلوہ گر رہے گا اور جب کسی خاص شکل و صورت میں انسانی

تصور نے اپنے ذہن میں سمیٹ لیا تو پھر وہ خالق مطلق اور قادر مطلق ہرگز نہیں ہوسکتا، اس کو ہم ذات نہیں بلکہ مظہر ذات بصورتِ صفات سے تعبیر کریں گے۔

وین عجب بین در ہر چہ اُو نے نیست آں چیز بقین　　بلکہ او در ہر چہ باشد نیست آں ہم چیز ہیں

ترجمہ: یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جس چیز میں وہ نہیں، اس چیز کا وجود ہی نہیں بلکہ جس چیز میں وہ ہے وہ چیز بھی حقیقت میں نہیں ہے۔

تشریح: یہ بات تو معلوم ہوچکی کہ واجب الوجود صرف اُسی کی ذات پاک ہے جو اپنے وجود میں کسی غیر کی محتاج نہیں اور باقی تمام موجودات اپنے وجود میں اس کی محتاج ہیں تو معلوم ہُوا کہ سب کا وجود اُس کے وجود سے قائم ہے اور ہر ایک شئے میں اسی کا جلوہ ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کائنات وجود پذیر ہونے کے باوجود بھی وجود نہیں رکھتی کیونکہ وجود تو صحیح معنیٰ میں وہی ہے جو قائم بذاتہ ہو، ان مظاہرِ کائنات پر وجود کا اطلاق مجازی ہے اس لئے اس کا ہونا، اور نہ ہونا برابر ہے۔ اسی کو صوفیاء حضرات اس طرح کہتے ہیں کہ اس وحدہٗ لاشریک کے سامنے کوئی شئے وجود کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ اگرچہ ہر ایک شئے اسی کے وجود سے موجود ہے، کیوں کہ اس ذاتِ مطلق کے سوا کسی کا وجود، اپنا ذاتی وجود نہیں اُسی واجب الوجود کا عطا کردہ ہے وہ جب چاہے عطا کرے اور جب چاہے واپس لے لے۔

نیست مثلش ہیچ چیزے چیز ہا پیدا از وست　　لیک ایں ہر چیز ہیچوں وجہ دائی وجہ دوست

ترجمہ: کوئی شئے اس کی مثل نہیں، ہاں تمام اشیاء اسی سے ظہور پذیر ہیں، لیکن یقین کے ساتھ اس کائنات کی ہر ایک شئے کو دوست کی تجلّی سمجھ۔

تشریح: اس کی مثل کوئی بھی شئے نہیں، قرآن پاک میں اس کی وضاحت لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ سے کردی گئی ہے، اب کہیں کسی شئے کے بارے میں یہ خیال نہ ہوجائے کہ جس طرح اس کی ذات بے مثل ہے اور کائنات کی تمام اشیاء اس کی بے مثل قدرت سے ظہور میں آئی ہیں تو کسی مخلوق میں اس کی طرح بے مثلیت کا خیال آجائے، یعنی بے مثلیت میں

خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی تطابق نہیں اور ایسا بھی نہیں کہ اس حد تک مغایرت ہو کہ خالق اور مخلوق اور مظہرِ صفات کی نسبت بھی نہ ہو بس تصوّر یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ذات ایسی ہے کہ جو لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ کی صفت سے متصف ہے اور ہر ایک شے میں اسی کا جلوہ ہے۔

چیزبے او چیز نے، ایں از معمّا راز داں ۔۔۔ دار ثابت جملہ اشیار وجہ ذاتش بےنشاں

ترجمہ: کوئی بھی شے اس کے بغیر شے نہیں، اس کو راز کا ایک معمّا سمجھ، تمام اشیار کو اس بے نشان کی صفاتِ ذات کا ثبوت سمجھ۔

تشریح: تخلیق کائنات اس پروردگار کا ایسا راز ہے جو انسان کی عقل سے بالاتر ہے، کیونکہ ہر ایک شے میں اس کا جلوہ ہے لیکن کس انداز سے ہے کوئی نہیں کہہ سکتا، وہ ہر ایک شے میں ہے اور ہر ایک شے سے جدا ہے، یہ ایک ایسا راز ہے جو فہم انسانی سے بالاتر ہے، انسان کے لیئے یہ یقین کافی ہے کہ تمام اشیار اس ذاتِ واحد کے وجود کا ثبوت ہیں اور ہر ایک شے میں اس بے نشان کی جلوہ گری ہے۔

ہر چہ بینی خوبصورت، راست دانی وجہ دوست ۔۔۔ ہم بباش از شکل بد راضی گر آنہم وجہ دوست

ترجمہ: جو کوئی اچھی صورت تجھ کو نظر آئے اس کو یقیناً محبوبِ حقیقی کی تجلّی سمجھ، اور صورتِ نازیبا سے راضی رہو کیونکہ وہ بھی اسی کا جلوہ ہے۔

تشریح: اس عنوان کے تحت یہ بات مختلف انداز میں مصنّف رحمۃ اللہ علیہ بیان فرمارہے ہیں کہ کائنات کی تمام اشیار اس کی صفات کا مظہر ہیں، ہر ایک شے میں اس کی قدرت کاملہ جلوہ گر ہے، اس لیئے اگر ظاہر میں کوئی اچھی شکل ہے تو یہ بھی اسی کی قدرت کا شاہکار ہے اور اگر کسی کی صورت اچھی نہیں ہے تو اس کو بھی اسی کی قدرت کا نمونہ سمجھ کر اپنے تصوّر کو خالقیت سے منسلک کردو، اور یہ یقین سے مان لو کہ ظاہری صورتوں میں فرق کے باوجود کمی بیشی سے بغیر اس کی قدرتِ لامحدود کا ظہور ہو رہا ہے، اس کی حکمت و مصلحت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے مصنوع کے ظاہری حسن و قبح کی طرف نہ دیکھو بلکہ صانعِ مطلق

کی کاریگری کی لامحدودیت کا تصور کرو۔

ہر پلید و پاک از نزدیک رب العالمین لیک در کفر و خباثت نے رضایش بالیقیں

ترجمہ: اگرچہ ہر ایک پاک اور ناپاک شئے کی نسبتِ تخلیق رب العالمین کی طرف ہے لیکن یہ بات یقین سے جان لو کہ کفر اور گناہ کے کاموں میں اسکی رضامندی قطعاً نہیں ہے

تشریح: اس سے پہلے اشعار کے مفہوم سے یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ جب ہر شئے خالقِ مطلق کی تخلیق ہے اور ہر ایک شئے میں اسی کا جلوہ موجود ہے تو پھر برائی، گناہ اور کفر و عصیان کی نسبتِ تخلیق بھی خالقِ مطلق کی طرف ہوگی اور جب پاکی اور ناپاکی، کفر و عصیان کا خالق بھی وہی ہے اس لئے اگر کوئی اِن بُرے کاموں میں مشغول ہوتا ہے اور خدا کے پیدا کئے ہوئے کفر و عصیان میں، خدا کی عطا کی ہوئی حیات میں، خدا کے بنائے ہوئے ہاتھ پاؤں، عقل و دماغ اور دیگر صلاحیتوں کے ساتھ مصروف ہے، جب سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو پھر عذاب و ثواب کا کیا سوال؟ اور بندہ قصوروار کیوں؟

اس حقیقت کو مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس طرح بیان فرما رہے ہیں کہ حقیقت تو یہی ہے کہ تمام اشیاء کا خالق وہی ہے لیکن اس قادرِ مطلق نے انسان کو عقل و فہم عطا فرما کر اچھائی اور بُرائی میں امتیاز کرنا سکھایا اور اپنی کتب میں اِس بات کی وضاحت فرمادی کہ کفر و عصیان ہماری بارگاہ میں ناپسندیدہ اور قابلِ مواخذہ ہیں، اس کے ساتھ اختیار بھی دے دیا اور اسی اختیار کو معیارِ امتحان قرار دے کر حق و باطل کا فیصلہ کر دیا، اس لئے انسان کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح وہ ہر شئے میں جلوۂ خداوندی کا تصوّر کرے اسی طرح ہر ایک کام میں، ہر ایک تصوّر میں اس رب العالمین کی پسند اور خوشی کو بھی مدِّنظر رکھے، جن امور کو وہ پسند فرماتا ہے اور بجالانے کا حکم دیتا ہے دل کی خوشی کے ساتھ ان امور کو بجالائے، اور جن کاموں کو وہ پروردگار ناپسند کرتا ہے اور ان سے رُکنے کا حکم فرماتا ہے تو بغیر کسی جبر و اکراہ کے خوشی کے ساتھ اُن سے فوراً رک جائے تب ہی صحیح معنیٰ میں مقامِ بندگی تک رسائی ہوگی۔

ہاں بوفقِ حکم آیت وجہ اورا می نگر   گرچہ بے اونیست چیزے راز گویم مختصر

ترجمہ: البتہ یہ بات ضروری ہے کہ آیتِ قرآن کے مطابق اس کی قدرت میں غور کرو، اگرچہ مختصراً میں نے یہ راز ظاہر کر دیا کہ اس کے بغیر کوئی شے نہیں ہے۔

تشریح: قرآنِ پاک میں مختلف مقامات پر مختلف انداز میں خداوند قدوس نے کائنات کی ہر ایک شے میں اپنی قدرت کے وجود کا اعلان فرمایا ہے کہیں پر فرمایا کہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ بے شک اللہ تعالیٰ ہر ایک شے پر مکمل طور پر قادر ہے، یہ بھی ارشاد پاک ہے کہ ہر ایک شے کو اللہ تعالیٰ اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے، کہیں فرمایا کہ ہر ایک شے کا پیدا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس مفہوم کی آیات سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ ہر ایک شے میں اس کا جلوہ موجود ہے، اس کے علاوہ قرآن پاک میں یہ بھی ارشادِ خداوندی ہے کہ تم اللہ کی نشانیوں میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے، ان تمام آیاتِ قرآنی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگرچہ ہر ایک شے میں اس کی قدرت کا وجود تو ہے لیکن کس انداز میں ہے اس بارے میں غور و فکر کرنا ضروری ہے تاکہ علم الیقین کے ذریعہ عین الیقین اور حق الیقین حاصل ہو جائے اور اس کی وحدانیت کی حقیقت دل میں اتر جائے، تفکر کے بغیر اس روشنی کی حقیقت کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ ھٰکذا اقال مرشدی

ذاتِ اوراپاک دانی وجہ اوراپاک بیں   راست دانی ایں سخن را ہیچ نہ بینی اندریں

ترجمہ: اس کی ذات کو پاک یقین کر اور اس کی صفات کو بھی پاک سمجھ اور اس بات کو بالکل صحیح مان، اس میں ذرا سی غلط بیانی کا تصور بھی نہ کر۔

تشریح: ماقبل کے مضمون سے کہیں یہ تصور پیدا نہ ہو جائے کہ اچھائی اور برائی جب اس خالقِ حقیقی کی تخلیق ہیں تو ان برائیوں کے ناپسندیدہ اثرات کا تعلق اور نسبت اس کی ذات یا صفات سے ہو۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک) ایسا ہرگز نہیں کہ کفر خبائث اور غیر پسندیدہ عناصر کی تخلیق کا اثر کسی اعتبار سے بھی اس کی ذات یا صفات سے متعلق ہو، اس قسم کی

تخلیقات کے باوجود بھی اس کی ذات والاصفات مکمل طور پر پاک و منزہ ہے اور اس پاکی کا تصور صرف ذات تک ہی محدود نہیں بلکہ صفات بھی مکمل طور پر پاک ہیں۔

گر بگوئی بے فراگیری ذاتش نیست چیز　　این سخن را دو مثال آرم تو اے باتمیز

ترجمہ: اگر تو یہ کہے کہ اُس کی ذات کی شمولیت سے کوئی شئے خالی نہیں ہے تو میں اے باشعور! اس سلسلے میں دو مثالیں تیرے سامنے پیش کرتا ہوں۔

تشریح: اگر تم کو یہ شک ہو کہ جب کوئی شئے اس ذات مطلق کے جلوے سے خالی نہیں تو اس شئے کے ظاہری اثرات کا تعلق باطن سے ضرور ہوگا، اس لئے کہ مظہر صفات کی اچھائی یا برائی کا تعلق صفات کے ذریعہ ذات تک پہونچے گا لیکن یہاں ایسا نہیں کیونکہ ذات ہر حالت میں ہر طرح سے پاک و منزہ ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے مصنف رحمۃ اللہ علیہ دو مثالیں بیان فرمارہے ہیں۔

این مثال اولش می گویم اکنوں اے پسر　　نور خورشید ے کہ تابد بر پلید و پاک تر

ترجمہ: اے سالک! اب یہ پہلی مثال میں تجھ سے بیان کرتا ہوں کہ سورج کی روشنی جو ہر ایک پاک اور ناپاک چیز پر پڑتی ہے۔

تشریح: یہ پہلی مثال مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلے میں بیان فرمارہے ہیں کہ اس ذاتِ پاک کی صفات ہر شے میں جلوہ گر ہونے کے باوجود بھی مکمل طور پر منزہ اور پاک رہتی ہیں اور ہر طرح کے خارجی اور داخلی تاثر سے وہ ذات قطعی طور پر محفوظ ہے اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے سورج کی شعاعیں کائنات کی ہر شے پر پڑتی ہیں اور اس روشنی کے احاطے میں ہر طرح کی اشیاء آتی ہیں جن میں پاک اور ناپاک سب شامل ہیں لیکن:-

کے فزاید پاک نور مہر روشن ساز دار　　ہم پلیدی کم نہ سازد تاب او را ہوشدار

ترجمہ: روشنی دینے والے سورج کے نور کو کسی چیز کی پاکی کب زیادہ کرتی ہے؟ اور کسی شئے کی ناپاکی بھی اس کی روشنی میں کوئی کمی نہیں پیدا کرتی!

تشریح : ذاتِ وحدہٗ لاشریک کی جلوہ گری صفات کی صورت میں ہر شے میں موجود ہے، اور صفات وذات میں مغایرت نہیں بلکہ عینیت ہے اس لئے کسی انداز میں بھی صفت کے ظہور سے نہ صفات متاثر ہوتی ہیں اور نہ ذات، اس کی مثال مصنّف اس طرح بیان کر رہے ہیں کہ ذاتِ مطلق کو ایک مرکزِ نور یعنی سورج کی طرح سمجھو اور اس کی صفات کو شعاعوں کی مانند خیال کرو، اب بتلاؤ کہ سورج کی شعاعیں اگر کسی پاک شے پر پڑتی ہیں تو کیا اس شے کی پاکی کی وجہ سے سورج کی روشنی میں یا شعاعوں کی چمک میں کچھ زیادتی ہو جاتی ہے ؟ ظاہر ہے کہ نہیں، اسی طرح اگر کسی ناپاک شے پر سورج کی شعاعیں پڑتی ہیں تو اس ناپاکی کی وجہ سے سورج کی شعاعیں ناپاک ہو جاتی ہیں ؟ ہرگز نہیں کیونکہ :-

نے ز پاکی سود او را نے ز ناپاکی زیاں   کن نظر اندر فراگیری ذاتش بہر آں

ترجمہ : نہ پاکی سے اس روشنی کو کوئی فائدہ ہے اور نہ ناپاکی سے کوئی کمی ہے، اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اس کی ذات کی شمولیت پر غور کر۔

تشریح : یعنی سورج کی روشنی پاک اور ناپاک دونوں طرح کی اشیاء پر پڑتی ہے، لیکن کسی پاک شے پر روشنی پڑنے سے روشنی میں باعتبار پاکی کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور کسی ناپاک شے پر روشنی پڑنے کی وجہ سے اس میں کوئی ناپاک اثر نہیں پیدا ہوتا، چونکہ روشنی اس قدر لطیف ہے کہ کسی قسم کی پاکی یا ناپاکی کا تعلق اس سے نہیں کیا جا سکتا، جب سورج کی یہ صفتِ نور پاکی اور ناپاکی کے اتصال سے جُدا ہے تو پھر وہ خالقِ مطلق جس کی یہ ایک بہت ہی معمولی تخلیق ہے اس کی صفات یا ذات سے کس طرح نسبت کی جا سکتی ہے۔ فَسُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا تَصِفُوْنَ

ذاتِ باری داخل و خارج صفاتی بالیقیں   واصل و فاصل، متبدّل، نے حلولی ہمچنیں

ترجمہ : یقیناً ذاتِ خداوندی صفات کے اعتبار سے ہر شے میں داخل بھی ہے اور ہر شے سے خارج بھی ہے، اسی طرح بغیر تغیر وتبدل اور حلول کے ہر شے سے ملی ہوئی بھی ہے اور الگ بھی۔

تشریح : ہر ایک شے میں اس ذاتِ وحدہٗ لاشریک کی جلوہ گری کے باوجود کسی میں محصور نہ

ہونے کی اور کسی بھی تغیر سے دوچار نہ ہونے کی مثال مصنف نے سورج کی روشنی کے ذریعہ بیان کی تھی، ظاہر بات ہے کہ سورج کی روشنی کسی چیز پر پڑتی ہے تو نہ اس روشنی کو اس شے سے متصل کہہ سکتے ہیں اور نہ منفصل، نہ اس شے میں داخل کہہ سکتے ہیں اور نہ خارج، کیوں کہ روشنی اپنی لطافت کی وجہ سے ان تمام حدود سے الگ تھلگ ہے، جب اس ادنیٰ سی مخلوق کی یہ صفت ہے تو پھر خالقِ مطلق کی لامحدود صفات کا تو کہنا ہی کیا ہے خصوصًا اس صورت میں جبکہ سورج کی روشنی کو تجلیات باری سے کوئی نسبت ہی نہیں، پھر کس طرح اسکی تجلیات کو کسی شے میں داخل یا خارج، کسی شے سے متصل یا منفصل یا کسی شے میں حلول کا تصور کر سکتے ہیں، ؟ کیونکہ اس کی ذات پاک کی طرح اس کی صفات بھی ازلی ابدی اور ذاتی ہیں اور صفاتِ مخلوق فنائیت سے متصف ہیں، اسی لئے مصنف فرماتے ہیں کہ:۔

از ہمہ اوصاف حادث پاک ذاتش یکسر ایں مثالِ ثانی اندر روح آرم سر بسر

ترجمہ: تمام فنا ہونے والی صفات سے اس کی ذات مکمل طور پر پاک ہے، اس دوسری مثال کا بیان میں روح کے عنوان کے تحت کرتا ہوں۔

تشریح: خداوندِ قدوس کی صفات کو داخل خارج اور وصل فصل حلول سے اسلئے منسوب نہیں کر سکتے کہ یہ تمام صفات تغیر پذیر ہیں اور جو شے تغیر پذیر ہو وہ حادث ہوتی ہے اور ذاتِ واجب الوجود کی صفات بھی ذات کی طرح ازلی وابدی ہیں اسلئے اسکی ذات اور صفات ہر طرح کی فنائیت کے شبہ سے بالاتر ہیں ورنہ واجب الوجود اور ممکن الوجود کا اتحاد لازم آئے گا جو باعتبار حقیقت بالکل ہی غلط ہے، اسلئے ذاتِ خداوندی تمام اوصاف حوادث سے مکمل طور پر منزہ اور پاک ہے، اس تنزیہہ کی دوسری مثال مصنف روح کے عنوان کے تحت بیان فرما رہے ہیں۔ بہرحال حقیقتِ نماز مصنف کے نزدیک یہ ہے کہ از اول تا آخر اس ذاتِ بے مثال و بے نشان کی یکتائی اور بےمثالی کا تصور قائم کر کے ہمہ تن عاجزی اور انکساری کے ساتھ اس شہنشاہ لازوال کے حضور میں باادب کھڑا ہو اور اپنی تمامتر توجہات کا مرکز صرف اسی کو بنا کے سب سے رشتہ منقطع کر کے بس اسی سے لو لگا۔ لہٰذا قال مرشدی

دربیان آنکہ روح درتن ہر پلید و پاک بچہ صورت است

ہر ایک پاک اور ناپاک کے بدن میں روح کے موجود ہونے کی صورت کا بیان

این مثال راز دیگر نیز گویم ہمچنیں　　روح در جسم ہر پلید و پاک ہمچوں ہمقریں

ترجمہ: اس مثال کے ذریعہ وہ دوسرا راز میں تجھ سے بیان کرتا ہوں کہ روح ہر پاک اور ناپاک جسم سے ایک ہی انداز سے متعلق ہے۔

تشریح: اس سے پہلے عنوان "حقیقت نماز" کے تحت مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے نماز کی حقیقت بیان کرتے ہوئے یہ بات بتلائی تھی کہ کائنات کی ہر ایک شئے کا وجود اللہ تعالےٰ کے حکم سے ہوا ہے۔ خیر و شر، خوبصورتی و بدصورتی، پاکی اور ناپاکی، ذرہ و پہاڑ، قطرہ و سمندر، غرضیکہ کائنات کی ہر ایک شئے کا خالق وہی پروردگار ہے، اور ہر ایک شئے میں اسکی جلوہ گری ہے، اس جلوہ گری کے بغیر کوئی بھی شئے وجود پذیر نہیں ہوسکتی، اور ان تمام اشیائے کائنات میں جلوہ گری کے باوجود اس کی شانِ یکتائی میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، اور نہ مظاہرِ صفات کی کثرت سے تعددِ ذات کا سوال پیدا ہوتا ہے، وہ تمام مخلوقات میں جلوہ گر ہونے کے باوجود یکتا اور بے مثال ہے۔ محققین صوفیاء فرماتے ہیں کہ ہم نے ذات کو صفات کے ذریعہ پہچانا ہے اور ذات پاک کی جلوہ گری اشیاء میں ظاہری و باطنی طور پر دیکھی ہے، لیکن اس حقیقت تک رسائی نہ ہوسکی کہ ذات پاک کی صفات کس انداز میں اشیاء میں جلوہ گر ہیں، کیا ہم ان صفات کو داخلِ شئے کہہ سکتے ہیں؟ یا خارج شئے کہیں؟ مخلوقات سے متصل مانیں یا علیحدہ؟ پھر پاک اشیاء سے تعلق تو یک گونہ قابلِ قبول بھی ہے لیکن ناپاک اشیاء میں جلوہ گری کی کیا صورت ہے؟ اس مضمون کی وضاحت کے لئے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مثال تو سورج کی شعاعوں کے ذریعہ بیان کی تھی کہ جس طرح سورج کی شعاعیں ہر اس شئے پر پڑتی ہیں جو اس کے محاذ میں ہو اور

اپنے اثرات، قبولِ صلاحیت کے مطابق اس شئے میں پیدا کرتی ہیں لیکن اس تاثراتی عمل کے باوجود بھی کسی پاک شئے کی پاکی سے سورج کی شعاعوں میں مزید پاکی نہیں ہوتی اور اسی طرح کسی شئے کی ناپاکی کی وجہ سے ان شعاعوں میں ناپاکی کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ شعاعوں کی لطافت، کیفیت، کمیت جوں کی توں قائم رہتی ہے، جب اُس قادر مطلق کی ایک ادنیٰ سی مخلوق کی تنزیہہ اور لطافت کا یہ حال ہے تو پھر وہ ذات جو مکمل طور پر پاک ہے اور اس کی پاکی بھی عدیم المثال ہے اس کے بارے میں کیسے یہ وہم کیا جا سکتا ہے کہ ناپاک، شر انگیز اور بد صورت اور بد سیرت اشیاء میں اس کی جلوہ گری سے شانِ یکتائی میں کچھ فرق پیدا ہو جائے۔

اس بے مثال جلوہ گری کی مزید وضاحت کے لئے مصنّف دوسری مثال روح کے ذریعہ بیان کر رہے ہیں۔ شعاعوں کی مثال اور روح کی مثال میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ شعاعوں کی اثر اندازی کا مشاہدہ ظاہری طور پر تھا اور روح کی کارکردگی کا تعلق باطنی طور پر ہے۔ ان دونوں مثالوں کے بیان کرنے سے ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے بات مکمل ہو جاتی ہے۔

از تنِ پاکے نگردد روح ہرگز پاکباز　　　　وز تنِ ناپاک گیرد کے سوئے ناپاک ساز

ترجمہ: کسی پاک بدن کی وجہ سے روح ہرگز پاک نہیں ہوتی اور نہ کسی ناپاک بدن سے متعلق ہونے کی وجہ سے ناپاک ہوتی ہے۔

تشریح: مصنّف فرماتے ہیں کہ سورج کی شعاعوں کی طرح روح بھی پاک اور ناپاک اشیاء سے ایک ہی انداز سے تعلق رکھتی ہے، یعنی روح جس طرح پاک جانداروں میں موجود ہے بعینہٖ اسی انداز میں ناپاک جاندار میں بھی اس کا تصرّف اور عمل دخل ہے، نہ کسی پاک شئے میں موجودگی کی وجہ سے روح کی پاکی میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ کسی ناپاک شئے سے متعلق ہونے کی وجہ سے روح پر ناپاکی کا اثر ہوتا ہے وہ تو ہر حالت میں یکساں رہتی ہے۔ کیونکہ

چونکہ اصلش پاک بود و ماند در ناپاک پاک　　　　وز پلیدی، پاکی اُو را نے جلا و زلوث باک

ترجمہ: اس کی حقیقت چونکہ پاک تھی اسلئے ناپاک سے متعلق ہونیکے باوجود پاک ہی، نہ

اسکو ناپاک سے ملوث ہونے میں نقصان اور نہ پاکی کے تعلق سے اسکی پاکی میں اضافہ ہوتا ہے۔

تشریح: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہود کے سوال کرنے پر کہ "روح کیا ہے"؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا "قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي" آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے"، اور ظاہر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مکمل طور پر پاک ہے، اس کا حکم پاک ہے اور جو شئے اس کے حکم سے خصوصی تعلق رکھتی ہے وہ بھی باعتبار حقیقت پاک ہی ہے یہی پاکی کی صفت روح میں بنیادی اعتبار سے پائی جارہی ہے، اس لئے کسی پاک شئے سے متعلق ہونے سے اس کی پاکی میں اضافہ نہیں ہوتا اور ناپاک شئے سے متعلق ہونے کی وجہ سے ناپاکی کا اثر اس میں نہیں ہوتا، وہ ہر حالت میں پاک ہی رہتی ہے۔ روح کے سلسلے میں حکماء، صوفیاء اور متکلمین کے اقوال کی تفصیل "اقسام روح" کے عنوان میں ملاحظہ فرمائیں۔

یک سوالت را جواب دو بگفتم اندریں باش در شغل لقاء وجہ ظاہر ہمقریں

ترجمہ: اس کے اندر میں نے ایک سوال کے دو جواب دے دیے ہیں اے سالک تو ہمیشہ تجلیات ظاہری کے مشاہدے میں مصروف رہ۔

تشریح: مصنف فرماتے ہیں کہ اس موضوع کے تحت کہ مخلوقات میں ذات پاک کی شان یکتائی کس انداز میں جلوہ گر ہے؟ یہ ایک بنیادی سوال تھا (اس سوال کی تفصیل حقیقت نماز میں گذر چکی ہے) اس سوال کے میں نے دو جواب دے دیے ہیں، ایک جواب تو سورج کی شعاعوں کے ذریعہ دیا تھا اور دوسرا جواب روح کے ذریعہ دیا ہے، پہلے جواب کے ذریعہ مشاہدۂ ظاہری کا بیان مقصود تھا اور دوسرے جواب کے ذریعہ مشاہدہ باطنی کا بیان پیش نظر ہے۔ یہ جواب مقصود نہیں ہیں بلکہ مقصود کی طرف رہنما ہیں، اس لئے دوسرے مصرعہ میں مصنف اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے سالک، اگرچہ میں نے یہ وضاحت ظاہری اور باطنی اعتبار سے کردی ہے مگر مقصود اصلی نہیں ہے مقصود اصلی تو اس ذات پاک کی بے مثال صفات کا مشاہدہ ہے، اس لئے سالک کیلئے ضروری

ہے کہ وہ مقصودِ اصلی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اِن تجلیات کی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کرے اور صفاتِ ظاہری میں غور و فکر کرے تاکہ ذات کا تعارف ہو۔

حق تعالےٰ پاک ذات و وجہ اُو را پاک دانٌ پاک بیں را دوست دارد پاک نگر ہر زمانٌ

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی ذات مکمل طور پر پاک ہے اس لئے تو اس کی تجلیات ظاہری کو پاک تصوّر کر، وہ پاک نظر کو دوست رکھتا ہے اس لئے تو بھی پاک نظر بن جا۔

تشریح: اس میں تو کوئی شک و شبہ ہے ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مکمل طور پر پاک ہے اسی طرح اس کی صفاتِ ظاہری بھی مکمل طور پر پاک ہیں۔ ان صفات ظاہری کا ایک نمونہ روح کی شکل میں تمہارے سامنے ہے، اس صفتِ ظاہری کو مشاہدۂ باطن کا ذریعہ بنا لینا چاہیئے کیونکہ جس کی نظر ظاہری اور باطنی طور پر پاک ہوجاتی ہے اور وہ اپنے ظاہر اور باطن کو تجلیاتِ خداوندی کے مشاہدے میں لگا دیتا ہے ایسے افراد کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور دوست کے لقب سے نوازتا ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہوسکتی ہے۔ اس لئے مصنف رحمۃ اللہ علیہ سالک کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر تو بھی اس سعادت کا طلبگار ہے تو اپنی نظر کو ظاہر اور باطن کے اعتبار سے پاک کرلے، جب یہ کیفیت تجھے حاصل ہوجائے گی تو معیتِ ذات اور قربتِ حق اور وصال کے درجہ پر تجھ کو فائز کردیا جائے گا۔ اللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُم۔ ہٰذا من فیضان المرشد

آنچہ در دل بنگری اور اجمالی می شمر آنچہ با ایں چشم بینی از جلالی می نگر

ترجمہ: جو کچھ تو اپنے دل میں مشاہدہ کرے اس کو تجلیاتِ جلالی سمجھ، اور جو کچھ اس ظاہری آنکھ سے دیکھے اس کو تجلیات جلالی سمجھ۔

تشریح: خداوند قدوس کی تجلیاتِ ظاہری کو جلال کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور تجلیاتِ باطنی کو جمال کی طرف، اور اس مفہوم کی تعبیر اس طرح کرتے ہیں کہ ذات پاک کے پردہ ہائے جلال نے ہر ایک شئے کو اپنے احاطے میں لے رکھا ہے۔ یہاں تک کہ ذاتِ پاک جو شئے کے عنوان سے بالاتر ہے وہ بھی اپنے بے مثال ازلی و ابدی حسن کے ساتھ پردہ ہائے جلال میں

مستور ہے۔ مصنف نے سورج کی شعاعوں اور روح کے ذریعہ تجلیات کی دونوں قسم کی طرف اشارہ کر دیا تھا، اب یہاں پر یہ بتلانا مقصود ہے کہ سیرِ باطن اور سیرِ ظاہر کی طرف اپنی توجہ مبذول کرو، تاکہ ظاہر اور باطن میں یکساں طور پر ذاتِ پاک سے نسبت حاصل ہو جائے جب سالک کے ظاہر و باطن میں یکسانیت ہو جائے گی تو اس کی یہ حیثیت ہو گی کہ

ہر کرا ایں راز باری گشت حاصل بالیقیں　　صاحبِ دل شد کامل کمال وجہ ہیں

ترجمہ: جس کو ذاتِ باری کی نسبت کا یہ راز یقین کے ساتھ حاصل ہو گیا، تو پھر تجلیات میں تدبر کا کمال دیکھ کر وہ مکمل طور پر دل کی تین صفات کا حامل ہو گیا۔

تشریح: یعنی جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ توفیق حاصل ہو گئی کہ تجلیاتِ ظاہری کا مشاہدہ کر کے صفات کے ذریعہ عظمت ذات کی طرف اپنی توجہ کو مبذول کر دے اور تجلیات باطنی کا معائنہ کر کے اپنے دل دماغ کو اللہ تعالیٰ کی بے مثال صفات پر یقین کے ساتھ قائم کر لے یعنی صرف زبان سے ہی نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے اس کو یقین کامل ہو جائے کہ تمام صفات ظاہری و باطنی کا تعلق ذات پاک سے ہے اور ہر قسم کی قدرت، ہر قسم کی طاقت، ہر قسم کی تعریف کی مستحق صرف وہی ذاتِ پاک ہے تو اب سالک کے قلب میں حسبِ استعداد درجہ بدرجہ تین خاصیتیں پیدا ہو جائیں گی۔

نے برش اغیار جز عرفانِ آں وجہ الکریم　　ذات را بر وجہ دید آں صاحب قلبِ سلیم

ترجمہ: اس ذوالجلال کے عرفان کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوتی کیونکہ اس صاحب قلبِ سلیم نے تجلیات ظاہری کے آئینہ میں ذات کا مشاہدہ کر لیا۔

تشریح: یہ سب سے پہلی خاصیت ہے کہ سالک کا قلب "قلبِ سلیم" کے عنوان کی طرف منسوب ہو گیا۔ اور قلب سلیم وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی معرفت کے سوا کچھ نہ ہو یعنی سالک جب مراقبہ کی وجہ سے تجلیات باری کا ظاہری اور باطنی طور پر مشاہدہ کرنے لگے گا تو جس حقیقت پر بھی اس کو آگاہی ہو گی اس میں جلوۂ یکتائی کا نظارہ کرے گا اور اس نظارہ کا محل

صوفیار حضرات قلبِ سلیم کو قرار دیتے ہیں جس میں معرفت کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور یہ معرفت صفات کے مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے اور اس مقام کو صوفیار حضرات توحید صفاتی کے حصول کا مقام قرار دیتے ہیں۔

باز گرداند ہر اشیار سوئے درگاہِ حبیب — گشت چوں حالش چنیں شد صاحب قلبِ منیب

ترجمہ: وہ تمام اشیار کو محبوب کی بارگاہ کی طرف منسوب کرنے لگتا ہے، جب اس کی کیفیت ایسی ہوجائے تو وہ صاحب "قلبِ منیب" ہوجاتا ہے۔

تشریح: یہ قلبِ سالک کا دوسرا مقام ہے جو پہلے مقام سے بلند ہے، کیونکہ قلبِ سلیم میں تو مشاہدۂ صفات کیلئے مظاہرِ صفات کی طرف توجہ ہوتی ہے اور مظاہرِ صفات کے مشاہدہ سے معرفت کا حصول ہوتا ہے، اس مرتبہ سے جب سالک ترقی کرتا ہے تو اس کو "قلبِ منیب" کے مرتبہ پر فائز کر دیا جاتا ہے۔ قلبِ منیب اس حال کو کہتے ہیں کہ سالک کی توجہ مکمل طور پر ذاتِ پاک کی طرف ہو اور مظاہرِ صفات سے بھی اعراض کرے یعنی سالک کو اس بات پر یقین کامل ہوجائے کہ تمام اشیار کا وجود، ان کی حیات، حرکات وسکنات اور کارکردگی کا تعلق صرف اسی ذاتِ پاک سے ہے، ذرّہ ہو یا پہاڑ، قطرہ ہو یا سمندر، حقیر سے حقیر تر، اور عظیم سے عظیم تر چیز کا مکمل طور پر تعلق اگر ہے تو اس کی ذاتِ پاک سے ہے، اس صورت میں سالک کی توجہ صرف ذاتِ پاک کی طرف ہوگی اور ذات کے ماسوا سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے، جب اس کو یہ کیفیت حاصل ہوجاتی ہے تو اسکے قلب کو قلبِ منیب کا عنوان عطا کر دیا جاتا ہے اور اس وقت سالک کو توحید افعالی کا حصول ہوجاتا ہے۔

ہر چہ بیند حق بہ بیند در قریب و ہم بعید — گر بایں حال آمد او شد صاحب قلبِ شہید

ترجمہ: جو کچھ دیکھتا ہے وہ حق ہی دیکھتا ہے خواہ قریب میں ہو یا بعید میں، جب اس کو یہ کیفیت حاصل ہوجاتی ہے تو اس کو صاحب "قلبِ شہید" کہا جاتا ہے۔

تشریح: جب قلبِ سالک کو یہ کیفیت حاصل ہوجائے کہ وہ مشاہدۂ صفات پر

اور صفات کے خواص پر یہ گواہی دے کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ حق ہے (یہ تو وحدۃ الوجود کی اصطلاح میں ہے) یا جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ ذات حق کی طرف سے ہے (یہ بات وحدۃ الشہود کی اصطلاح میں ہے) دونوں اعتبار کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کی روح سے یہ آواز برآمد ہو کہ ہر طرف حق ہی حق ہے اور ہر ایک شئے میں وہی ذات پاک مستور ہے تو قلب کی اس گواہی کو اصطلاحِ صوفیاء میں معاینہ کہا جاتا ہے اور اس صفت سے متصف قلب کو قلبِ شہید کا عنوان دیا جاتا ہے، اس وقت سالک کی اس کیفیت کو توحید ذاتی کہتے ہیں، کہ ذات کا عرفان، صفات اور مظاہرِ صفات اور خواصِ صفات (حرکات و سکنات اور کارکردگی)، یہ سب ذاتِ مطلق کی طرف سے ہے اور سالک ان تمام منازل سے گذر کر مقامِ معاینہ میں بفضلِ ایزدی پہونچ جائے تو اب یہ سالک صاحبِ قلب شہید ہو گیا۔

حبذا حال کسے کو پاک آمد در لقا شد ولی اللہ و خاص از اُمتانِ مصطفٰےؐ

ترجمہ: اس سالک کا حال مبارک ہے جو مشاہدہ تجلیات کے اس مقام پر فائز کر دیا گیا، وہ اللہ تعالٰی کے دوستوں میں ہو گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتیوں میں اُس کو خاص مقام حاصل ہو گیا۔

تشریح: یعنی جب تجلیاتِ ظاہری اور باطنی میں مکاشفہ، مشاہدہ اور معاینہ کا مقام سالک کو حاصل ہو جائے اور توحید صفاتی، توحید افعالی، توحید ذاتی کی منازل تک اس کی رسائی ہو جائے تو سالک کے لئے یہ بڑی سعادت کا مقام ہے، کیونکہ اس کے قلب و دماغ کی مکمل طور پر جِلا ر ہو گئی اور عالم ناسوت، عالم ملکوت، عالم جبروت کی سیر کرنے کے بعد اس کی منزل عالم لاہوت ہو جاتی ہے۔ سالک کے لئے یہ کیفیت قابل مبارکباد ہے کہ شہنشاہ مطلق نے اس کو اپنے پسندیدہ افراد کے زمرہ میں شمولیت کا شرف بخشا اور سب سے زیادہ محبوب پیغمبر حضور اکرم صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کے اُمتیوں میں سے ایک خاص مرتبہ اس کو عنایت فرمایا اور ظاہر بات ہے کہ جسکو وہ ذات پاک دوست رکھے اسکی سعادت کا کیا ٹھکانہ۔

دار دار اعمالِ نیکی قلبِ ہر مومن سہ نام　　　کافرے راہم یکے دل قاسیہ نامش تمام

ترجمہ: عمدہ عمل کرنے کی وجہ سے مومن کے قلب کے تین نام ہو گئے، کافر کے دل کا بھی ایک نام ہے اور وہ ہے "قلبِ قاسیہ"

تشریح: جس طرح ہر ایک انسان کا ایک ہی قلب ہوتا ہے اسی طرح مومن کا بھی ایک ہی قلب ہے لیکن اعمالِ خیر کی وجہ سے اس میں تین صفات پیدا ہو گئیں، اسی مناسبت سے اس کی طرف تین صفاتی نام کا انتساب کیا جاتا ہے یعنی ان نورانی کیفیات کو "قلبِ سلیم" "قلبِ منیب" اور "قلبِ شہید" کا عنوان دیا جاتا ہے، یہ اعزاز مومن کو اطاعتِ رسول اور خدا کی عبادت کی وجہ سے بخشا جاتا ہے، اسی طرح کافر کو بھی اس کے بُرے اعمال و عقائد کی وجہ سے جس نحوست کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا دبال یہ ہے کہ اس کے دل کو "قلبِ قاسیہ" کا منحوس عنوان دیا جاتا ہے اور آخرت میں ناکامی و نامرادی اس کا مقدر بن جاتی ہے، قرآن پاک میں قلب کی ان اقسام کا ذکر موجود ہے۔

باش دائم اہلِ دل در وجہِ ہر دو لے پسر　　　زیں زیادت چند گویم راز کردم مختصر

ترجمہ: اے سالک دونوں قسم کی تجلیات کے مشاہدہ میں اپنے کو ہمیشہ مصروف رکھ، اس سے زیادہ اور کیا بیان کروں، مختصر طور پر میں نے یہ راز بیان کر دیا۔

تشریح: مصنف رحمۃ اللہ علیہ اب سالک کو ایک نصیحت فرما رہے ہیں جب فضلِ خداوندی سے تجھ کو یہ سعادت نصیب ہو جائے کہ تجلیاتِ ظاہری اور باطنی میں مقامِ معاینہ تک تیری رسائی ہو جائے تو مطمئن ہو کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں بلکہ مستقل مزاجی اور یکسوئی کے ساتھ اس میں مشغول رہ تا آنکہ مقصودِ اصلی تک رسائی ہو جائے، دونوں قسم کی تجلیات میں مشغولیت کے فوائد مصنفؒ نے مختصر طور پر بیان کر دیے اور ان تجلیات کی طرف توجہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ:

ظاہراً او باطناً او بے نشانیش نشاں　　　اولاً او آخراً او نیست غیرش در جہاں

ترجمہ: ظاہر بھی وہی ہے باطن بھی وہی، اور بے نشانی ہی اس کی نشانی ہے، اوّل

بھی وہی ہے آخر بھی وہی، اس کے علاوہ کائنات میں کچھ نہیں۔

تشریح: یعنی تجلیات ظاہری اور باطنی میں مشغولیت اس وجہ سے ضروری ہے کہ ایک لمحہ بھی اس کی یاد سے اس کے ذکر سے غافل نہ رہنا چاہیئے اور اس کے ذکر سے ہمہ وقتی رابطہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کی صفات کی طرف ہمہ وقت توجہ رہے تاکہ مشاہدۂ صفات کے ذریعہ تعارفِ ذات کی نسبت قائم رہے اور اس کی صفات کی شان یہ ہے کہ کہیں بھی ان کی کوئی نشانی نہیں لیکن اس بے نشانی کے باوجود ہر جگہ، ہر وقت، ہر انداز میں، ظاہر اور باطن میں ان ہی صفات کی جلوہ گری ہے، ابتدا بھی ان ہی صفات سے ہوتی ہے اور انتہا بھی ان ہی صفات پر ہے، اُس ذات پاک اور اُس کی صفات کے علاوہ کسی دوسری شئے کا وجود ہی نہیں، اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ اہل دل، اہل نظر بچ کر جائے بھی تو کہاں جائے اس لئے سعادت اور کامرانی کا راز اسی میں پنہاں ہے کہ صرف اُسی ذاتِ پاک سے صفات کے ذریعہ ظاہر اور باطن میں رابطہ کی مضبوطی ہو۔

اوست شاہد اوست ہم مشہود میدان بالیقین   نیست چیزے غیر او تو ہر چہ بینی حق بہ بین

ترجمہ: یہ بات یقینی طور پر جان لو کہ وہی شاہد ہے وہی مشہود ہے، اس سے الگ ہو کر کوئی شئے وجود پذیر نہیں تو جو شے بھی دیکھے اس کو حق سمجھ۔

تشریح: مصنف رحمۃ اللہ علیہ چونکہ وحدۃ الوجود کی طرف مائل ہیں اس لئے اسی رنگ میں فرما رہے ہیں کہ وہ ذاتِ پاک ظاہر اور باطن میں جلوہ گر ہی نہیں بلکہ اپنے جلوؤں کی خود ہی شاہد ہے اور خود ہی ان جلوؤں میں جلوہ گر ہے، اس کی ذات سے کسی شئے کی نسبت قائم نہ ہو تو اس کا وجود ہی محال ہے، اس لئے جو کچھ بھی تو مشاہدہ کرے اس کو ذاتِ حق ہی سمجھ۔ (کیونکہ وحدۃ الوجود میں ذات اور صفات کا ایک ہی رنگ ہوتا ہے) اور انکے مشاہدہ میں مشغول رہ۔

چشم را گر یکدم کشادی نورِ حق دیدی عیاں   گوش را ہم باز کن تا بشنوی صوتے ازاں

ترجمہ: جب تو آنکھوں کو کھولے گا تو نورِ حق کی جلوہ گری دیکھے گا، کان بھی کھول

کر رکھ تاکہ حق کی آواز سنے۔

تشریح : آنکھ کھولنے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ مصنف نے جو اشغال مثلاً شغل ۱۹ یا شغل ۲۱ یا شغل ۲۳ وغیرہ بیان فرمائے ہیں ان میں سے کسی ایک شغل میں مشغولیت اختیار کر کے تجلیات خداوندی کا مشاہدہ کرے، یا دوسرا مطلب یہ ہے کہ چشم باطن سے خداوند قدوس کی تجلیاتِ ظاہری و باطنی کا مشاہدہ کرے۔ چونکہ مقصود یہ ہے کہ ذاتِ پاک سے بذریعۂ صفات رابطہ قائم ہو جائے اور یہ مقصود دونوں صورتوں میں حاصل ہوتا ہے، اس لئے حسب فرمانِ شیخ کوئی بھی صورت اختیار کر لی جائے بہتر ہے، اگرچہ ظنِ غالب پہلی صورت کی طرف منتقل ہوتا ہے کیونکہ مصنف نے دوسرے مصرعہ میں شغل ۲۰ کا حوالہ دے کر "صوت کن" کے سننے کا ذکر کر دیا ہے۔ بہرحال اپنی تمام صلاحیتوں کو مقصودِ اصلی کی طلب میں، اس کی جستجو میں صدقِ دلی اور لگن کے ساتھ صرف کرنا ضروری ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ کے نوازنے کی بات ہے، ہم چونکہ جدوجہد کے مکلف ہیں اس لئے اپنی کوشش میں کوتاہی نہ ہونی چاہیئے، منزلِ مقصود تک پہونچانے میں تو صرف اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہی کا اختیار چلتا ہے اس لئے ہم کو اس کا مکلف نہیں کیا گیا، بس اَلسَّعْیُ مِنَّا وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ کا تقاضا یہی ہے کہ سالک اپنے ہوش گوش کے ساتھ طلبِ صادق کے جذبہ سے معمور ہو تو منزل تک رسائی کی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق عطا ہو جاتی ہے۔

برزبانِ ہر خلائق حق بہ گوید ہوش دار   نطق او ہم بیمثالی ایں صدا را گوش دار

ترجمہ : ہر مخلوق کی زبان پر وہی بولتا ہے، اس بات کا تو دھیان رکھ، اس کی گفتگو اور کلام بھی بے مثال ہے اس لئے اس آواز کی طرف متوجہ رہ۔

تشریح : یہاں پر مصنف یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ خواہ اس کی صفات کو مظاہر صفات کے ذریعہ سمجھو یا براہِ راست۔ مثلاً مخلوق کی گفتگو اور بول چال، یہ تو مثال ہے مظاہر صفات کے ذریعہ ذات تک رسائی ہونے کی، اور دوسرے لفظ "کُن" کی صدائے بازگشت، جو

بغیر مظہرِ صفت کے وجود پذیر ہوئی ، اور براہ راست امرِ خداوندی ہے ، اس آواز کا سننا ، دونوں صورتوں میں بظاہر فرق ہے مگر جس طرح اس کا کلام بے مثال ولازوال ہے ، اسی طرح اس نے اپنی اس صفتِ کلام کا جس شئے کو مظہر بنایا ہے یعنی مخلوقات کی زبان کو ، وہ بھی درحقیقت کلامِ حق ہی ہے ۔ فرق صرف بالواسطہ اور بلاواسطہ کا ہے اور دونوں طرف توجہ کرنا اور تفکر کرنا ضروری ہے ، کیونکہ سالک کا مقصود تو وہی ذاتِ پاک ہے ، اس کو تو ہر ایک شئے میں اسی کا رنگ دیکھنا ضروری ہے ، اس لئے کہ یہ حقیقت ہے کہ :

چیست قدرت خاک را کو نطق راند بر زباں   حق بگوید بشنود بے اختلاف ہر زماں

ترجمہ : خاک کو کیا مجال ہے کہ وہ زبان پر کلام کو جاری کر سکے ، وقت کے اختلاف سے ماورا رہو کر حق ہی کہتا ہے اور حق ہی سنتا ہے ۔

تشریح : یعنی سالک اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے کہ انسان کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے ، مٹی میں کلام کرنے کی صفت ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ جو خالق مطلق ہے اور قادر مطلق بھی ہے اسی کی طرف سے یہ صفت بھی ملی ہے ، اس لئے حقیقت میں وہ متکلّم ہے وہی سامع ہے اور یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ زمان ومکان سے ماورا ہے اس لئے کہنے اور سننے کا عمل اس کی بارگاہ میں وقت کی حدود میں نہیں ہے جیسا کہ مخلوق کا دستور ہے بلکہ وہ ایک ہی وقت میں ایک ہی شان کے ساتھ کلام کرنے والا بھی ہے اور اسی طرح اسی وقت اسی شان کے ساتھ کلام کو سننے والا بھی ہے اور یہ صفت کسی بھی مخلوق میں نہیں ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں متضاد صفات کی جامع ہو ۔

خاک از وے آب از وے نار از وے حق بداں   ریح از وے روح از وے خود بگوید در نہاں

ترجمہ : مٹی ، پانی ، اور آگ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے حکم سے وجود پذیر ہوئے ہیں ، ہوا اور روح بھی اسی کے حکم سے ہے اور پردے میں وہی گفتگو کرتا ہے ۔

تشریح : انسان کی تخلیق عناصر اربعہ آگ ، پانی ، مٹی اور ہوا سے ہے ، اس کے بعد ان

چاروں عناصر میں حرکت و عمل کا تعلق روح سے ہے اور ظاہر بات ہے کہ یہ سب اشیاء اللہ تعالیٰ کے حکم سے وجود پذیر ہوئی ہیں، عناصر اربعہ میں کہاں یہ صلاحیت کہ قوتِ گویائی عطا کریں، یہاں تک کہ عناصر اربعہ کی موزوں ترکیب کے ساتھ اگر روح بھی موجود ہو تب انسان کی زبان میں رُوح کے ہونے سے قوت گویائی پیدا ہو جائے یہ بھی ضروری نہیں جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ اچھا خاصا چلتا پھرتا تندرست انسان ہے لیکن قوت گویائی مفقود ہے، اب بتائیے کہ اس کے گونگے ہونے کا کیا سبب ہے معلوم ہوا کہ اصل چیز قدرتِ خداوندی کی جلوہ گری ہے اور یہ سب چیزیں اسی کی قدرت کا نمونہ ہیں۔ اسی کی صفات ہیں، ان صفات کے پردے میں ذات جلوہ گر ہے اسی لئے یہ بھی حقیقت ہے کہ:

ذکر خود را خود بگوید، بشنود خود سر بسر   راست دانی اوست ذاکر اوست مذکور اے پسر

ترجمہ: وہ خود اپنا ذکر کرتا ہے اور مکمل طور پر وہی سنتا ہے، اے سالک یہ بات سچ مان لو کہ وہی ذاکر ہے اور وہی مذکور ہے۔

تشریح: یہ بات بھی وحدۃ الوجود کے رنگ میں کہی گئی ہے کہ جب تمام صفات اسی ذات پاک کی طرف منسوب ہیں، یہاں تک کہ وجودِ اشیاء بھی اسی کی طرف منسوب ہے تو پھر اس وجود کے پردے میں وہ خود ہی ذکر کرنے والا ہے اور ذکر بھی اسی کا ہے، خود ہی متکلم ہے خود ہی مخاطب ہے تو اس وقت سالک کا وجود کالعدم ہے اور جب وجود سالک ہی کالعدم ہے تو پھر صفات بھی نہ ہونے کے برابر ہیں، اس بنیاد پر تمام صفات اور موجودات کو وحدہٗ لاشریک کی طرف منسوب کرنے سے گفتگو کی نسبت اور گفتگو سننے کی نسبت، ذکر کرنے کی نسبت اور ذکر سننے کی نسبت، غرضیکہ تمام نسبتیں اسی ذاتِ پاک کی طرف ہو جاتی ہیں۔

کن خیالے بر ہمیں تا بشنوی کان ذاکر اوست   نیست چیزے آفریدہ در جہاں بے ذکر دوست

ترجمہ: اسی کی طرف توجہ کر تاکہ اس کا ذکر سننے کے لائق ہو جائے، کیونکہ کوئی شئے ایسی نہیں جو اس کے ذکر سے خالی ہو۔

تشریح: یعنی سالک کو جب یہ یقین ہو جائے گا کہ ہر ایک شئے میں صرف اسی ذات پاک کی جلوہ گری ہے اور اس کے یقین پر مکاشفہ اور مشاہدے کا دروازہ کھل جائے گا تو پھر ہر ایک شئے اس ذات پاک کی تسبیح خواں معلوم ہوگی، قرآن پاک میں اس حقیقت کو پروردگار عالم نے صاف صاف بیان فرمادیا کہ کوئی شئے ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح نہ کرتی ہو، البتہ یہ بات ہے کہ تم اس کو سمجھ نہیں پاتے۔ اس تسبیح کو سمجھنے کے لئے اور اس ذکر کو جاننے کے لئے، اور پروردگار کی وحدانیت اور بیمثالی کی گواہی کے لئے صوفیاء حضرات نے یہ عمارت تیار کی ہے تاکہ صرف یقین ہی نہیں بلکہ عین الیقین اور اس سے آگے بڑھ کر حق الیقین کی دولت مل جائے اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب صفات باری میں تدبّر اور غور و فکر کی سعادت میسّر ہو، انھی صفات کے تعارف کے بعد معرفت ذات کا حصول ہے، اسی لئے:-

دیدنِ انوارِ باری ہست واجب بصر ہم شنیدن ذکرِ حق بر گوش واجب می شمر

ترجمہ: اہل بصیرت پر اللہ تعالیٰ کی تجلّیات کا مشاہدہ ضروری ہے اور اسی طرح اہلِ گوش کے لئے اس کا ذکر سننا بھی ضروری ہے

تشریح: یعنی صفات کے ذریعہ معرفتِ ذات ہوتی ہے، اس لئے صفات کے مشاہدہ کے لئے جد و جہد کرنا ضروری ہے۔ جن حضرات کو خداوند قدوس کی طرف سے یہ صلاحیت عطا ہو جائے وہ کس قدر خوش نصیب ہیں۔ اور اسی طرح وہ حضرات جن کے کان حق کی آواز کو سننے کے لئے بیتاب رہتے ہیں ان کی سعادت کا کیا ٹھکانہ۔

ان تمام چیزوں کا حصول مرضیات آقا پر مکمل طور پر عمل کر کے ہی ہو سکتا ہے، صرف تمنّا سے کام نہیں چلتا۔ اسی لئے مصنف رحمۃ اللہ علیہ ہر جگہ عمل، جد و جہد اور توجہ کرنے کے الفاظ کا تکرار کرتے ہیں۔ اور عمل کا راستہ وہی پسندیدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ محبوب بندے کے لئے پسند فرمایا، اخلاص کے ساتھ عمل کرنے کے بعد عاجزی و انکساری بارگاہ خداوندی میں قابل قبول ہے اور قدرت کے باوجود بے عملی کی عاجزی کی

کوئی قیمت نہیں، جس کا عملی نمونہ تمام کائنات کے سردار، خدا کے دلارے، ہم سب کے پیارے آقائے نامدار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قیامت تک کے لئے دنیا کے سامنے پیش فرمایا۔ (فداہ روحی)

بارگاہِ روح چشم و گوش دانی اے پسر　　　　این تمامی کے بگنجد در کتاب مختصر

ترجمہ: اے سالک کان اور آنکھ روح کی دہلیز ہیں، ان تمام باتوں کی تفصیلات اس مختصر کتاب میں کیسے سما سکتی ہیں۔

تشریح: مصنف رحمۃ اللہ علیہ یہاں ایک نکتہ کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ آنکھ اور کان کو کھلا رکھنے کی کیا وجہ ہے اور ان اعضاء کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و قدرت سے جو صلاحیت عطا فرمائی ہے اس کو کام میں لانے کا سبب کیا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں کان اور آنکھ روح کی دہلیز ہیں، جس طرح مکان کے اندر داخل ہونے کے لئے دہلیز سے گذرنا پڑتا ہے، اسی طرح حواس خمسہ میں سب سے زیادہ قریب اور کارآمد اور عملی اعتبار سے وسیع دائرہ رکھنے والی چیزیں یہ دو ہیں، یعنی ایک آنکھ اور دوسرے کان۔ اور ان کے ذریعہ صفاتِ خداوندی کا رابطہ جس وسعت سے قائم ہوتا ہے وہ دوسری قوتوں کے مقابلہ پر کہیں زیادہ ہے۔ قوتِ ذائقہ، لامسہ، اور شامہ، یعنی چکھنے کی قوت چھونے کی قوت اور سونگھنے کی قوت کا دائرہ اس قدر وسیع نہیں، اس لئے روح کا سب سے زیادہ اہم اور قریبی تعلق دیکھنے اور سننے کی قوت سے ہے، ذرا سی آنکھ ہے لیکن اس کی کارکردگی کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور اسی طرح کان کہاں کہاں کی اور کیسی کیسی باتیں سنتا ہے، جس قدر عمدہ ان دونوں کی کارکردگی ہوگی اسی قدر روح کو کسب فیضان ہوگا، جس کو سمجھنے کے لئے یوں کہہ لیجئے کہ اسی قدر قوتِ روحانی میں اضافہ ہوگا اور اس کی مخالف قوت اسی قدر مغلوب ہوگی، یہاں تک کہ اس مشاہدہ کے ذریعہ رفتہ رفتہ تجلیۂ روح کا کام آگے بڑھتا رہے گا، اور منزل مقصود قریب آتی رہے گی۔

مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تمام حقائق ایسے ہیں جن کو دائرۂ تحریر میں لانا مشکل ہے اور یہ کتاب بہت ہی اختصار کے ساتھ ترتیب دی گئی ہے، اس میں پوری تفصیل بیان کرنا تو ناممکن ہے۔ شیخِ کامل کی صحبت، پرخلوص جدوجہد اور توفیق خداوندی کے ذریعہ ان حقائق کا حصول ہوتا ہے۔ ھٰذا مِنْ فَیْضَانِ الْمُرْشِد۔

باز می گردم ز تحریر حکایت بہر این تا بگویم شغل دیگر ہوش داری ہمچنین

ترجمہ: اس تفصیل کو بیان کرکے میں اپنی بات ختم کرتا ہوں، میں تجھ سے دوسرا شغل بیان کرتا ہوں، اسی طرح توجہ سے سنو۔

تشریح: مختصر طور پر مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے یہ شغل بیان کردیا، اب اس کے بعد دوسرا شغل بیان کرنے کی طرف توجہ فرمارہے ہیں اور سالک کو یہ نصیحت کررہے ہیں کہ اس آنے والے شغل کو بھی غور اور توجہ سے سُن، تاکہ تیرے لئے مفید ہو۔

✣✣✣✣✣✣✣✣✣✣✣✣

در بیان نقش کردنِ لفظ اللہ بر دِل

لفظ اللہ کو دل پر نقش کرنے کا بیان

شغلِ دیگر می شنو کایں بہترین شغلہاست
می نگر منقوش و در دل لفظ اللہ را راست

ترجمہ: ایک دوسرا شغل سنو کہ یہ بہترین شغل ہے، بالکل سیدھے سادے طریقہ پر لفظ اللہ کو اپنے دل میں نقش کیا ہوا تصوّر کرو۔

تشریح: اذکار کے ذریعہ قلب کے تصفیہ کے بعد ذاتِ وحدت سے ہمہ وقت رابطہ قائم رکھنے کے لئے یہ ایک بہترین شغل ہے کہ اپنے دل میں لفظ اللہ کو راست انداز میں یعنی منقلب نہیں، تصوراتی اعتبار سے لکھ لیا جائے، چونکہ یہ لفظِ مبارک اسم ذات ہے اور ہمارے لئے ذات کی ترجمانی کے واسطے اس سے زیادہ جامع لفظ کوئی اور نہیں ہے، اس لئے یہ لفظ مسمّٰی تک رسائی کا سب سے اعلیٰ اور عمدہ ذریعہ ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ قلب تجلّیاتِ باری کا آئینہ ہے جب اس آئینہ میں اس اسم پاک کو آپ نے لکھ لیا تو گویا آئینۂ دل کو مستقل طور پر سالک نے ذاتِ پاک کی جلوہ گاہ بنا دیا اور اسم کے ذریعہ مسمّٰی سے تعلق قائم کر لیا۔

صوفیائے کرام نے اس شغل کے متعدد طریقے بیان فرمائے ہیں لیکن مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے جو طریقہ لکھا ہے وہ بہت ہی عمدہ اور قرین قیاس ہے۔ وہ یہ کہ باوضو، تنہائی میں قبلہ رخ بصورتِ مراقبہ بیٹھے اور یہ تصور کرے کہ میرے دل پر اسم پاک اللہ سنہرے یا نقرئی رنگ میں اس طرح لکھا ہوا ہے کہ اللہ کا الف بائیں ہاتھ کی طرف ہے اور لام مشدّد درمیان میں اور ہ دائیں طرف، اور اس لفظِ مبارک کا رُخ قلب سے اس طرح ہوگا کہ گویا سامنے کھڑا ہو کر اگر کوئی اس کو پڑھے تو سیدھا سیدھا پڑھ سکے۔ یہ اس لئے واضح کر دیا گیا کہ بعض حضرات نے ایسا بھی لکھا ہے کہ لفظ اللہ کا الف دائیں طرف ہو اور لام مشدّد درمیان میں اور ہ بائیں طرف، نیز اس لفظ کا رخ معکوس ہو، حضرت قبلہ مرشدی کے فرمان کے مطابق اوّل الذکر طریقہ

زیادہ مستند ہے، کیونکہ ذکر میں بھی بائیں طرف سے ابتدا کی جاتی ہے جہاں اللہ کا الف لکھا ہوا ہے تو گویا آغاز الف سے ہوا اور ضرب کا رُخ بھی بائیں طرف ختم ہوتا ہے، گویا انجام بھی الف پر ہے، اس لیئے ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ کی کیفیت کا مشاہدہ ہوجاتا ہے۔

در نود نہ نام باری حق تعالیٰ اندراں   بنگری با نقش زر، یا نقش نقرہ ہر زماں

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں میں سے اس اسم پاک کو اپنے دل کے اندر سنہرے رنگ میں یا رُوپہلے رنگ میں لکھا ہوا ہر وقت ملاحظہ کرو۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں لیکن وہ صفاتی ہیں اور لفظ اللہ اسمِ ذاتی ہے یعنی ذاتِ پاک کی تعبیر کے لیئے اس سے زیادہ جامع لفظ کوئی اور نہیں ہے، اس لیئے اسی ذاتی نام کو اپنے دل میں لکھنا چاہیئے خواہ سنہرے رنگ میں لکھو یا رُوپہلے رنگ میں، چشتیہ حضرات سنہرے رنگ میں اس کو قلب پر لکھتے ہیں اور قادریہ حضرات روپہلے رنگ میں، یہ اپنا اپنا رجحان ہے، مقصود رنگ نہیں بلکہ اسم ذات کے ذریعہ تعلق مع الذات مقصود ہے۔

می نماید زر جلالی طالباں را ہوشدار   نقش نقرہ در جمالی راز دار و استوار

ترجمہ: اس بات کا خیال رکھو کہ طالبانِ معرفت کیلیے زرد رنگ تجلّی جلال کو ظاہر کرتا ہے اور نقرئی رنگ ہمیشہ تجلّی جمال کا رازدار ہوتا ہے۔

تشریح: ذات وحدہ لاشریک لہٗ صفتِ جلال اور جمال دونوں سے متّصف ہے اسی لیئے سالک پر بھی ان صفات کے اثرات مُرتّب ہوتے ہیں، ان اثرات کا ظہور سالک کی پسند سے ہوجاتا ہے کہ اگر سنہرے رنگ سے قلب پر لفظ اللہ لکھنا اس کو محبوب ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سالک پر تجلیاتِ جلالی کا ظہور ہو رہا ہے اور نسبتِ جلالی سے اس کے مزاج کا تعلّق ہے اس نسبت کا مشاہدہ چشتیہ سلسلہ کے حضرات میں ہوتا ہے، ان حضرات میں جوش عشق اور شوق کی شدت ہوتی ہے، اسی لیئے یہ حضرات ذاتِ بے چوں سے والہانہ تعلق رکھتے ہیں، سماع اور وجد سے سکون پاتے ہیں، سلوک اور جذب کا امتزاج بھی شدّت کے ساتھ ان

کا خاصہ ہے۔ اسی لئے یہ حضرات سنہرے رنگ کو پسند فرماتے ہیں۔ نقرئی رنگ میں سکون اور ضبط ہوتا ہے اور یہ رنگ تجلیات جمالی کا آئینہ دار ہوتا ہے، قادریہ حضرات اور نقشبندیہ حضرات کے یہاں یہ اوصاف خاص طور پر پائے جاتے ہیں۔

ذکر کے طریقے میں رجحان کی نشاندہی ہوتی ہے کہ نسبتِ جلالی کی وجہ سے چشتیہ حضرات میں ذکر جہری بہت جلد فائدہ کرتا ہے اور نسبتِ جمالی کی وجہ سے قادریہ، نقشبندیہ حضرات میں ذکر خفی معتبر اور مفید ہے، بہرحال دونوں ہی طریقے محبوب ہیں اور مقصود تک رسائی کے لئے بالکل صحیح ہیں۔

ہر کہ بر دل نقشِ اللہ را بود ناظر مدام   از دلش منسوخ گردد نقشِ دنیا لاکلام

ترجمہ: جو کوئی لفظ اللہ کے نقش کو ہمیشہ دل میں ملاحظہ کرے گا، بے شک اس کے قلب سے دنیاوی نقوش مٹ جائیں گے۔

تشریح: یہاں پر مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس شغل کا مقصد بتلا رہے ہیں کہ جب سالک اپنے دل میں ہر وقت اسم ذات کو لکھا ہوا تصور کرے گا تو گویا وہ اس اسم کے ذریعہ مسمّیٰ کی ذاتِ پاک کی تجلیات کا مشاہدہ ہر وقت اپنے دل میں کر رہا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ خداوندِ قدوس کی تجلیات کے مقابلے میں کوئی بھی شئے ایسی نہیں ہے جو اپنی طرف متوجہ کر سکے، نہ ان کی کوئی مثال اور نہ کوئی ان کا مقابل، اس لئے اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ سالک کے دل سے ذاتِ مطلق کی تجلیات کے ماسوا تمام نقوش مٹ جائیں گے۔

مشاہدۂ تجلیات کی وجہ سے کائنات اور جو کچھ کائنات میں ہے اس کی حقیقت و فنائیت اس کے سامنے بالکل عیاں ہو جائے گی کہ نہ اس کائنات کا اپنا کوئی ذاتی وجود ہے اور نہ ان چیزوں کا جو اس میں ہیں۔ جب اس شغل کے ذریعہ یہ تصور سالک کے دل و دماغ میں راسخ ہو جائے گا تو پھر تجلیات کے سامنے کسی اور شے کا وجود بھی کالعدم ہو جائے گا، اور یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ کی کیفیت سے وہ سرشار ہو جائے گا

گم شود زیں شغل برتر از خودی خود بداں   دل تجلی زود می گیرد رسد با یارِ جہاں

ترجمہ: اس بلند پایہ شغل کے ذریعہ شاغل اپنی خبر سے بے خبری حاصل کرلیتا ہے،
اور قلب بہت جلد تجلّیات کے قابل ہوکر محبوب حقیقی تک رسائی حاصل کرلیتا ہے،

تشریح: یعنی سالک جب اس شغل میں پابندی اور یکسوئی کے ساتھ مشغولیت اختیار کرے گا تو قلب میں کثافت کم ہوکر لطافت کی کثرت ہوجائے گی، اس بنا پر روح سے فیضان حاصل کرنے کی استعداد بھی بڑھے گی اور اسی روحانی فیضان کے کسب کی استعداد کے مطابق سالک کا قلب تجلّیات خداوندی کا مرکز بن جائے گا اور جب ان تجلّیات کے ظہور کے وقت اپنے وجود کی نیستی کی حقیقت عیاں ہوگی تو فنائیت کی وادی سے رفتہ رفتہ عبور کرنے لگے گا اور "مقامِ بقاء" جو رسائی کا سب سے اعلیٰ مقام ہے، اس تک سالک کی رسائی ہوجائے گی، اسی کو معیت ذاتی کہتے ہیں، اور یہی مقصود کلی ہے

دربیانِ گماشتنِ نقشِ اَللّٰہ برتنِ خود

اپنے تن پر لفظ اللّٰہ کو نگران بنانے کا بیان

شغل دیگر ہم دریں جا نیز گویم ہوشدار — نقش اللّٰہ بس دمادم برتنِ خود می گمار

ترجمہ: اسی جگہ ایک دوسرا شغل بھی بیان کرتا ہوں جس کو غور سے سنو، کہ ہر سانس کے ساتھ لفظ اللّٰہ کے نقش کو اپنے بدن پر نگراں سمجھو۔

تشریح: اس سے قبل مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے قلب پر لفظ اللّٰہ تحریر کرنے کا شغل بیان کیا تھا، اب یہ دوسرا شغل، اپنے ظاہری بدن پر لفظ اللّٰہ کو نگراں بنانے کا بیان کر رہے ہیں۔ ان دونوں اشغال کو ایک دوسرے سے متصل بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مقصد کے اعتبار سے دونوں میں بہت قربت ہے، وہ یہ کہ پہلے شغل میں باطن سے ظاہر کی طرف رجوع ہوتا ہے کہ قلب پر لفظ اللّٰہ تصوراتی اعتبار سے لکھ لو اور پھر اس اسم کے اثرات باطن سے گذرتے ہوئے ظاہر پر بھی ہو رہے ہیں، اسم سے مراد مسمّٰی ہے اور مسمّٰی کی صفات ظاہر و باطن ہیں اس لئے یہ اسم جو قلب سالک پر لکھا ہوا ہے اور اس لکھنے سے مسمّٰی کی تجلیاتِ صفات باطن پر ہو رہی ہیں، اسی طرح ظاہر پر بھی ان تجلیات کا ظہور ہے۔

اس شغل میں ظاہر سے باطن کی طرف مراجعت ہے اور سالک نے جب اس اسم پاک کو جس سے مراد مسمّٰی ہے اپنے ظاہری وجود پر نگراں بنا دیا تو جس طرح ظاہر پر تجلیات کا ظہور ہو رہا ہے باطن بھی اسی انداز سے فیضیاب ہو رہا ہے۔ گویا سالک کو ظاہری اور باطنی پاکیزگی حاصل ہو رہی ہے۔ ھٰکَذَا قَالَ مُرشِدِیؒ۔

می نگر ایں نقش اعظم برتنِ خود ہر زماں — چند گویم زیں فزوں بر ہر تنے ایں نقش داں

ترجمہ: اس نقش اعظم یعنی لفظ اللّٰہ کو اپنے بدن پر ہر وقت نگراں سمجھو، اس سے زیادہ اور کیا کہوں، بس یہ سمجھو کہ ہر بدن پر یہی نقش احاطہ کئے ہوئے ہے۔

تشریح : اس شغل کا طریقہ یہ ہے کہ باوضو قبلہ رُخ گوشۂ تنہائی میں بصورتِ مراقبہ بیٹھ کر لفظِ اللہؔ کا تصوّر کرنے کے بعد آنکھوں کو بند کرلے اور پھر یہ خیال کرے کہ اس اسم مبارک (جس سے مراد مسمّیٰ ہے)، کی تجلیات مجھے چاروں طرف سے محصور کئے ہوئے ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد اس اسم کا واسطہ درمیان سے اُٹھ جائے گا اور مسمّیٰ کی صفاتِ مطلقہ کا تصوّراتی ظہور شروع ہوجائے گا۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ سالک اپنے وجود کو بھی درمیان سے الگ کردیتا ہے یعنی جب صفات کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے تو اپنے وجود سے بھی بے خبر ہوجاتا ہے اور اسی ذاتِ پاک کی تجلّیات باقی رہ جاتی ہیں، یعنی سالک کی تمام آرزوئیں، تمام تخیلات، صرف اسی ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ سے متعلق ہوجاتے ہیں، اس کو وہ کیفیتِ ایمانی حاصل ہوجاتی ہے جس کو مشاہدے سے تعبیر کرتے ہیں اور ہمہ وقتی رابطہ اس ذاتِ مطلق سے قائم ہوجاتا ہے۔ ـــــــ یہ شغل اگرچہ بہت مختصر ہے مگر فوائد کے اعتبار سے بہت زیادہ جامع مانع ہے کیونکہ اس شغل میں اسم ذات یعنی اللہؔ کے نگراں بنانے سے ہر وقت سالک کو یہ دھیان رہتا ہے کہ وہ ذاتِ مطلق ہر وقت میرے ساتھ ہے، میرے ظاہر و باطن سے بخوبی واقف ہے، اس لئے اب سالک کو کسی بھی گناہ کی طرف توجہ کرنے کی جرأت نہیں ہوسکتی وہ اگر گفتگو کرے گا تو اس کے دھیان میں یہ موجود ہوگا کہ اللہ میرا نگراں ہے، لہٰذا جھوٹ بولنے سے، دھوکہ دہی سے اور ہر قسم کے گفتاری گناہ سے بچے گا۔ نہ دل میں کسی کے متعلق کدورت، بغض و عناد، حسد، جلن رکھ سکتا ہے اور نہ ذہنی اعتبار سے منفی رویہ اختیار کرے گا، اور نہ عملی اعتبار سے کسی گناہ کی جرأت اس کو ہوسکتی ہے۔ جس وقت اس دنیا سے آخرت کا سفر اختیار کرے گا تب بھی یہی ذاتِ پاک اس کے ساتھ ہوگی، اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہوسکتی ہے، اس شغل کی ابتدائی مشق کے لئے محققین صوفیاء نے صبح کی نماز کے بعد، اور عشاء کی نماز کے بعد کا وقت مقرر فرمایا ہے، کم از کم تین چِلّوں کے بعد ہمہ وقتی تصوّر کی دولت حاصل ہوتی ہے

دربیان مسخر کردن سوراخ بینی بہر دم

ہر ایک سانس کیلئے ناک کے سوراخ کو مسخر کرنیکا بیان

بایقینِ دل شنو گویم بتو شغلِ دگر   دم مسخر گردد از سوراخ بینیت نگر

ترجمہ: میں تم سے ایک اور شغل بیان کرتا ہوں جس کو یقینِ قلب کے ساتھ سنو، اگر تم ناک کے سوراخ کی طرف توجہ کروگے تو سانس تمہارے تابع ہو جائے گا

تشریح: جسم انسانی میں سانس لینے کا ذریعہ ناک کے دو سوراخ ہیں، سانس کی آمد و رفت زندگی کی علامت اور طبیعتِ انسانی کی بالیدگی و فرحت کا یہ سب سے بڑا ذریعہ ہے، قدرتِ خداوندی کی بے مثال کاریگری اور حکمت پر عقلِ انسانی انگشت بدنداں ہے کہ ہوا جیسی عام شے کو حیاتِ انسانی کے قیام کا کس قدر اہم ذریعہ بنادیا، باہر کی صاف شفاف ہوا اندر داخل ہوتی ہے تو اندرونی طور پر فرحت ہوتی ہے اور جب اندر کی کثیف ہوا باہر آتی ہے تو سکون کا احساس ہوتا ہے۔ اللہ والے حضرات کی نظر نعمت کے ساتھ ساتھ منعم پر بھی ہوتی ہے اور منعمِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے جس نے اپنی رحمت کاملہ سے سانس کی آمد و رفت کی دو نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور ہر نعمت پر منعم کا شکر ادا کرنا واجب، پس سانس کے آنے اور جانے پر دو مرتبہ شکر ادا کرنا ضروری ہے، محققینِ صوفیا نے اظہارِ تشکر کا طریقہ یہ مقرر کیا ہے کہ اندر داخل ہونے والا اور باہر نکلنے والا سانس ذاتِ پاک کے ذکرِ پاک سے خالی نہ ہو۔

اس شغل کی صورت یہ ہے کہ خلوت میں یکسوئی کے ساتھ بصورتِ مراقبہ یا چہار زانو بیٹھ کر سانس کی آمد و رفت کا جو ذریعہ ہے یعنی ناک کے سوراخ پر اپنی توجہ صرف کرے اور جس طرف سے سانس چل رہا ہو، ناک کے اس سوراخ پر انگشتِ شہادت رکھ کر بند کردے اس جاری سُر کے مخالف سُر سے سانس لے، اس طرح عمل کرنے میں ابتدائی طور پر تو کچھ گھبراہٹ محسوس ہوگی اور سانس کی آمد و رفت کی ترتیب قائم کرنے میں بھی کچھ الجھن سی محسوس

ہوگی لیکن پھر رفتہ رفتہ کم از کم تین چلے گذر جانے کے بعد یہ کیفیت حاصل ہو جائے گی کہ انگشت ناک پر رکھے بغیر جس سُر سے بھی چاہے سانس لے اور جس سُر کو چاہے بند رکھے، ذکر و فکر میں خطرات و وساوس کے دفعیہ کیلئے ایک مجرب عمل ہے جو مقصود تک رسائی کا بہت بڑا ذریعہ ہے

جائے دم ہر دم بماند بر بنا یدر استداں　　رنگ ہر دم نیز بر تو کشف گردد آں زماں

ترجمہ: یہ بات یقین کے ساتھ جان لو کہ ہر سانس اپنی جگہ موجود رہے گا، باہر نہیں آئیگا اور اس وقت ہر سانس کی کیفیت بھی تجھ پر ظاہر ہوتی رہے گی۔

تشریح: یعنی سانس کی آمد و رفت بند نہیں ہوگی، سانس اپنی جگہ موجود رہے گا، البتہ حبس دم کئے بغیر اس شغل کے ذریعہ سالک کو ایسی کیفیت حاصل ہو جائے گی کہ بغیر ذکر کے سانس باہر نہ آئے گا اور نہ اندر جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ سالک کو ہر سانس پر قدرتِ خداوندی کی تجلیات کا مشاہدہ ہوتا رہے گا اور ذکر کی مداومت کی وجہ سے معبودِ حقیقی سے ہمہ وقت رابطہ قائم رہیگا۔ اس رابطہ کے قیام سے جن برکات کا ظہور ہوگا وہ احاطہ تحریر سے باہر ہے

غیب عالم کشف گردد آتش عشقت قریں　　ہر باری دل بسوز دیار یابی گر دریں

ترجمہ: عالم غیب کے حجابات اُٹھ جاتے ہیں اور عشق کی آگ کی قربت محسوس ہونے لگتی ہے اگر تو اس میں محبوب کے جلوے دیکھ لیگا تو اسکی محبت تیرے دل کو جلا ڈالے گی،

تشریح: جب سالک کا قلب اللہ تعالیٰ کی محبت سے لبریز ہو جاتا ہے تو پھر غیریت کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں اور قلبِ سالک میں صرف اسی ذاتِ پاک کے جلوے فروزاں رہتے ہیں، اس مقام پر قلبِ سالک سے تمام کثافتیں ختم ہو جاتی ہیں اور نورِ وحدت سے ایسی لطافت قلبِ سالک میں پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے عالمِ غیب کے حجابات نگاہِ قلب سے اٹھا دئے جاتے ہیں اور وہ ان تمام حالات کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے جو ہمارے لئے پردۂ غیب میں ہیں کائنات کی ہر شے میں سالک کو صرف اسی کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے، مشاہدۂ جلال میں عشق کی گرمی برابر اس کے دل کو گرماتی رہتی ہے اور مشاہدۂ جمال میں حسنِ حقیقی کے جلوؤں میں سالک

اپنی ذات کو بھی فراموش کر دیتا ہے کیوں کہ محبت کا سب سے اعلیٰ مقام ہی یہ ہے کہ عاشق کے دل سے محبوب کے سوا تمام نقوش مٹ جائیں یہاں تک کہ اپنا وجود بھی کالعدم ہو جائے۔

خاصیات این مقام افزون ست از شرح وبیاں ۔۔۔ گر بگویم می شوم از شغل دیگر باز ماں

ترجمہ: اس مقام کے خواص کی تفصیل بیان سے باہر ہے، اگر میں ان کو بیان کرنے لگوں تو دوسرے شغل کے ذکر سے رہ جاؤں گا۔

تشریح: یعنی جب بفضلہ تعالیٰ سالک کی اس مقام تک رسائی ہو جاتی ہے اور جو عجائب وغرائب اور خوشگوار ثمرات مشاہدہ میں آتے ہیں ان کی تفصیل بیان سے باہر ہے، کسی بھی انسان کے بس کی بات نہیں کہ انکی قدرتِ کاملہ کا بیان کر سکے۔ عالم غیب میں اس قدر تحیّر افزا واقعات کا ہر ہر قدم پر مشاہدہ ہوتا ہے جن کا تعلق حال سے ہے قال سے نہیں۔ یہ تو اس شغل کے باطنی اور حقیقی فوائد تھے، یوگا کے طور پر مشق کرنے سے اس کا ایک دنیاوی فائدہ یہ ہے کہ سرد مزاج رکھنے والے افراد اگر ناک کے بائیں سوراخ کو بند کر کے داہنے سوراخ سے سانس لیں گے تو ان کے مزاج میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اگر کوئی چیز ایسی کھائی جائے جس کی تاثیر ٹھنڈی ہے اور بایاں سوراخ بند کر کے دائیں سوراخ سے سانس لیکر اس چیز کو کھائیں گے تو اس چیز کے سرد اثرات طبیعت پر اثر نہ کر سکیں گے، اسی طرح اس کے برعکس، گرم مزاج والے دایاں سوراخ بند کر کے بائیں سے سانس لیں اور گرم تاثیر والی کوئی چیز کھائیں گے تو اس کے گرم اثرات اثر نہ کریں گے، کیونکہ دائیں سوراخ کا تعلق سورج سے بتایا جاتا ہے اور بائیں کا چاند سے، لیکن صوفیاء حضرات شمس وقمر سے اس کا تعلق قائم نہیں کرتے بلکہ دائیں طرف کو مسکن روح سے قربت کی وجہ سے کیفیت جلالی حاصل ہے اور ناک کی بائیں جانب کو قلب سے قریب ہونے کی وجہ سے جمال سے تعلق زیادہ ہے جلال میں گرمی کا ہونا اور جمال میں سکون واطمینان کا ہونا فطری امر ہے، اس وجہ سے گرمی اور سردی کے اثرات کا ظاہر ہونا بھی تجلیاتِ خداوندی کا ظہور ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

دربیان دم پوشیدن معمر

عمر درازی کیلئے سانس روکنے کا بیان

شغل دیگر ہم دریجا نیز بشنو اے پسر   حبس دم کاریست برتر راہ پیراں سربسر

ترجمہ: اسی جگہ ایک دوسرے شغل کے بارے میں اے سالک تم سنو، سانس روکنا بھی سالکانِ راہ طریقت کے لئے ایک اہم کام ہے۔

تشریح: یہاں مصنف رحمۃ اللہ علیہ حبس دم یعنی سانس روکنے کا شغل بیان فرما رہے ہیں اس لئے کہ یہ شغل خطرات اور وساوس سے حفاظت کرنے میں بہت معاون ہے اور اسی معاونت کی وجہ سے ذکر کرنے میں یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے جو مقصود کے حصول کا ذریعہ ہے، سالکانِ راہِ طریقت نے بھی اس کو حصولِ مقصد میں معاون و مددگار ہونے کی حیثیت سے اختیار کیا ہے مقصود نہیں بنایا ہے۔

زندگانی بیش میگردد ز شغل ایں عمل   ایں بود بہر معمر نسخہائے بے بدل

ترجمہ: اس عمل میں مشغول ہونے سے زندگی کا وقفہ طویل ہو جاتا ہے، درازئ عمر کے خواہش مندوں کے لئے یہ لاجواب نسخہ ہے۔

تشریح: یہ بات تو مسلّم ہے کہ انسان کی جس قدر زندگی اللہ تعالیٰ نے مقرر کردی ہے اس کو پورا کر کے ہی وہ اس دنیائے فانی سے دارالبقاء کا سفر کرے گا لیکن چوں کہ اس مدت کا علم سوائے خداوندِ قدوس کے کسی اور کو نہیں ہے، اس لئے اسباب کے تحت صحت کی حفاظت اور طویل عمری کے لئے جو تدابیر اختیار کی جاتی ہیں ان اسباب ظاہری میں سے طویل عمری کا ایک سبب "حبس دم" بھی ہے۔ حبس دم میں عمرِ درازی کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انسان کے جس قدر سانس اس دنیا میں لکھ دیئے گئے ہیں اگر ان سانسوں کی آمد و رفت کا وقفہ لمبا کر دیا جائے تو جب تک یہ سانس پورے نہ ہوں گے وہ اس دنیا میں رہے گا مثلاً ایک منٹ میں

عام طور پر ۱۸ مرتبہ انسان سانس لیتا ہے اگر مشق کے ذریعہ ۱۸ منٹ میں ایک سانس لیا جائے تو ۱۸ سانس پورے کرنے میں ایک منٹ کے بجائے ۳۲۴ منٹ لگ جائیں گے، اندازہ لگایئے کہ ایک منٹ کا وقفہ ۳۲۴ منٹ تک طویل ہو گیا تو ۲۴ گھنٹے کے سانس اور اسی حساب سے اوسط عمر کے سانس، کس قدر طوالت اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ صرف ایک عقلی قیاس ہے، یہ نہ ہمارا موضوع ہے اور نہ مقصود، صرف ضمن میں بر سبیل تذکرہ یہ بات عرض کر دی گئی۔

اس شغل کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ ابتداً رات کے آخری حصہ میں بیدار ہو کر تہجد کی نماز کے بعد کسی پرسکون جگہ پر چار زانو بیٹھ کر ایک لمبا سانس لیں اور اس سانس لینے میں جتنا وقفہ لگا ہے اس سے دو گنے وقفہ تک سانس کو اندر روکے رکھیں اور جب اندازاً یہ وقفہ پورا ہو جائے تو آہستہ آہستہ سانس باہر نکالیں۔ سانس باہر نکالتے وقت یہ خاص دھیان رکھیں کہ آہستہ آہستہ سانس باہر چھوڑیں، ایک دم تیزی سے باہر سانس چھوڑنے میں دماغ پر برا اثر پڑتا ہے، مثلاً سانس لیتے ہوئے اگر ۱۵ سکنڈ کا وقفہ لگا ہو تو ۳۰ سکنڈ تک سانس اندر روکے رکھیں اور پھر آہستہ آہستہ سانس باہر چھوڑیں، پھر رفتہ رفتہ اس کے روکنے کی مدت کو بڑھاتے جائیں۔ سانس روکنے کی کوئی حد نہیں ہے، جہاں تک بھی مشق ہو جائے، طبی اعتبار سے یہ بھی دھیان رکھیں کہ کھانے میں گرم اشیاء سے پرہیز اور مقوی غذاؤں کا استعمال رکھیں ورنہ خشکی کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے مرشد کی اجازت کے بغیر یہ شغل نہ کریں، اگر مرشد مناسب خیال فرمائے تب ہی یہ شغل کریں۔

لیک ایں را می گمارد مرد صوفی ناروا ۔۔۔ بے خدا او ہیچ داند زندگی قرنہا

ترجمہ: لیکن سالکِ راہِ طریقت اس طریقہ کو مناسب نہیں سمجھتا، کیونکہ خدا کے بغیر صدیوں کی زندگی بھی اس کے نزدیک بیکار ہے۔

تشریح: دنیاوی اعتبار سے حبس دم کے اور فوائد بھی تجربہ کے بعد سامنے آئے ہیں، صرف عمر کی درازی ہی میں اس شغل کا فائدہ منحصر نہیں ہے لیکن سالکِ راہِ طریقت ان تمام فوائد کو بیکار سمجھتا ہے اور اس شغل کی مشق کرنے میں جو وقت گذرتا ہے اگر اس میں خدا کے تصور سے علیحدگی ہو

تو ایسی زندگی اگر سینکڑوں برس پر بھی مشتمل ہو تو نتیجہ کے اعتبار سے بیکار ہے اور سالک کی نظر نتیجہ پر ہوتی ہے اور زندگی کا ماحصل و نتیجہ اس کا ذکر، اس کی تمنا، اس کی یاد ہے، اس لئے وہ مقصود اصلی کے غیر کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا۔

می کند صوفی فدا جاں بہرِ آں آرام جاں　　　حق تعالیٰ باشد اورا دوست در ہر دو جہاں

ترجمہ: صوفی تو بس اسی مقصود زندگی پر اپنی جان نچھاور کر دیتا ہے اور حق تعالیٰ ہی کو دونوں جہان میں دوست رکھتا ہے۔

تشریح: یعنی سالک کا مقصود اصلی تو ذات پاک کی معیت اور صفات کے ذریعہ اس کی یافت ہے، از اوّل تا آخر اس کا مقصود اصلی یہی ہے، اسی کے حصول کیلئے وہ اپنا تن من دھن نچھاور کرتا ہے۔ اس کے غیر کی طرف متوجہ ہونے کا تصور بھی اس کے ذہن میں نہیں آتا، یہی وجہ ہے کہ خداوند قدوس کو وہ دونوں جہان میں اپنا دوست پاتا ہے۔

عاشقاں را حق تعالیٰ بس بود در دو سرا　　　از نفس اورا چہ حاجت زندگی سالہا

ترجمہ: عاشقوں کے لئے دونوں جہان میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے، سانس کے ذریعہ لمبی عمر حاصل کرنے کی ان کو کیا ضرورت ہے۔

تشریح: یعنی مقصودِ عاشق تو محبوب کی ذات ہوتی ہے اور سالک راہِ طریقت کی منزلِ مقصود صرف اسی کی ذاتِ پاک ہے اس لئے ان کا ہر ایک سانس اس کی یافت کے لئے، اس کی یاد کے لئے وقف ہوتا ہے۔ اگر اس سانس کے ذریعہ لمبی زندگی مل جائے تو اصل مقصود تو حاصل نہ ہوا، اس لئے غیر مقصود کے حصول میں اپنے وقت کو صرف کرنا وہ بیفائدہ تصور کرتے ہیں۔

عاشقاں را گر بہ دم حاجت بودے در استدال　　　در دمے بودے محمدؐ سر گروہ دم کشاں

ترجمہ: عاشقوں کو اگر حبس دم کی ضرورت ہوتی تو یقین جانو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حبس دم کرنے والوں کے سردار ہوتے۔

تشریح: یعنی حبس دم کرنا اگر مقصودِ اصلی ہوتا تو مرکزِ معرفت سید الانبیاء حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کی مشغولیت اس شغل میں سب سے زیادہ ہوتی اور سب سے زیادہ آپ کی عمر مبارک بھی ہوتی ۔ جبکہ

کرد رحلت مصطفیٰؐ در عمرِ شصت و چار سال   گشت در دم واصلِ قربِ جنابِ ذو الجلال

ترجمہ : حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۴ برس کی عمر میں اس دنیا سے رحلت فرمائی اور اتنے ہی سانسوں کے ذریعہ وہ خدائے ذوالجلال والاکرام کی حضوری میں مشرف یاب ہو گئے ۔

تشریح : یعنی صرف لمبی عمر ہونا کوئی محمود بات نہیں بلکہ اصل معاملہ تو تعلق مع اللہ ہے ۔ سید الانبیاء حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک صرف ۶۴ برس کی ہوئی لیکن جس قدر عالی مرتبہ قربت خداوندی کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا وہ ۶۴ ہزار برس کی عبادت سے بھی کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا اس لئے صوفیاء حضرات بھی کثرتِ عمر یا کثرتِ اعمال کی طرف دھیان نہیں دیتے بلکہ وہ تو کیفیت اور روحِ اخلاص کو مدِ نظر رکھتے ہیں اور یہی چیز بارگاہ خداوندی میں قرب کا سبب بھی ہے ۔

زیں جہت من در بیانِ دم نہ گشتم شغل ساز   آمدم بس بر سرِ تبیینِ رازِ بے نیاز

ترجمہ : اسی وجہ سے میں حبس دم کے شغل کی تفصیل میں مشغول نہ ہوا ، اس پاک بے نیاز کی معرفت کے راز بیان کرنے کی طرف متوجہ ہو گیا ۔

تشریح : چونکہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کے تمام اشغال میں مقصودِ اصلی معرفتِ ذات کی تحصیل کو قرار دیا ہے اور یہ شغل فی نفسہ اس مقصد سے الگ ہے اگرچہ معاونِ مقصد ہے ۔ اسی لئے مصنف نے بھی اس شغل کی مختصر سی کیفیت بیان کر دی ۔ صوفیاء حضرات نے بھی اس شغل کو اسی حد تک استعمال کیا ہے ۔ یہی فرق ہے اسلامی اور غیر اسلامی نظریۂ تصوف میں ، کہ اسلام میں مقصودِ اصلی کو ہی ہر جگہ پیش نظر رکھا گیا ہے ۔

دربیانِ مسخر کردن دم دمادم وسُلطانًا نصیرا وسُلطانًا محمودًا

سانس کی آمدورفت مسخر کرنا اور شغل سلطانًا نصیرا وسُلطانًا محمودًا کا بیان

گر بہ بینی نائے وحدت در دمادم اے پسر　　یافتی حق را چو کردی دم مسخر زین نظر

ترجمہ: اے سالک اگر سانس کی آمدورفت میں ناک کے نتھنوں کو تو دیکھے گا جب اس سانس کے ذریعہ تو نے سانس کو مسخر کرلیا تو گویا حق کو پالیا۔

تشریح: اس عنوان کے تحت مصنف رحمۃ اللہ علیہ تین شغل بیان کر رہے ہیں، ابتدائی دو اشعار میں شغل ناب، اس کے بعد تین اشعار میں شغل سلطانًا نصیرا، اور پھر پانچ اشعار میں شغل سلطانًا محمودًا کا بیان ہے۔ ان تینوں اشغال کو ایک ساتھ بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دراصل تینوں اشغال میں تدریجی ترتیب ہے اور اس ترتیب سے ہی یہ شغل ایک مکمل اور جامع شغل بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ مقصود سلوک معیتِ ذات ہے۔ معیتِ ذات کا مطلب یہ ہے کہ سالک اپنے آپ کو مالک حقیقی کے روبرو اس طرح سمجھے گویا وہ ذاتِ پاک کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اس تصور کا ذہن میں مشاہداتی انداز میں قائم ہوجانا اس قدر عظیم نعمت ہے جو انسان کو بندگی کی منزل پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے اور منزلِ بندگی پر پہونچ کر ہی مقصدِ زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔

زیرِ نظر عنوان میں یہ پہلا شغل "شغل نابِ وحدت" ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ بعد نمازِ فجر، یا نمازِ عصر کے بعد باوضو، قبلہ رو، دوزانو یا چہار زانو بیٹھے اور سانس کی آمدورفت میں ناک کے نتھنے پر اس طرح نظر جمائے رکھے کہ حتی الامکان پلک جھپکنے نہ پائے، تصور یہ کرے کہ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا لامحدود نور جو تمام کائنات کو گھیرے ہوئے ہے سالک کے قلب پر اس کا مسلسل فیضان ہو رہا ہے اور زبانِ قلب سے حرکتِ زبان کے بغیر سانس جب اندر آئے تو اللہ کہے اور جب سانس باہر جائے تو اس وقت بھی اللہ کہے، اس طرح ہر سانس

کی آمد و رفت پر سالک کا تعلق اسم کے ذریعہ مسمّیٰ سے ہو جاتا ہے اور یہی تعلق مقصودِ سالک ہے۔

اس شغل کے شروع میں آنکھ سے پانی بہنا شروع ہو جاتا ہے بلکہ آنکھ میں درد کی سی کیفیت کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن یہ کیفیت ایک چلّے تک رہتی ہے، دوسرے چلّے میں طبیعت پُرسکون ہو جاتی ہے اور تیسرے چلّے میں اِستقامت کی توفیق عطا ہو جاتی ہے۔ پاسِ اَنفاس میں بھی ہر سانس کی آمد و رفت میں ذکرِ اسمِ ذات ہوتا ہے لیکن ناک کے نتھنے پر نظر نہیں جمائی جاتی، اس لیے شغلِ نابِ وحدت پاسِ اَنفاس کے بعد شروع کرنا چاہیئے۔ شغلِ نابِ وحدت میں ناک کے نتھنے پر نظر جمانے اور زبانِ قلب سے اَللّٰہ، اَللّٰہ کرنے سے ظاہری و باطنی طور پر سالک کو نظری و قلبی یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے اور یہی یافتِ حق کی علامت ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہونے کی علامت ہے۔

ایں مقامِ نائے یعنی نابِ توحید است نام   تا ز روحانی شود حاصل ازیں بنگر مدام

ترجمہ: ناک کے نتھنے کا یہ مقام مرکزِ توحیدِ خالص کہا جاتا ہے، اِستقلال کے ساتھ اس پر توجہ کرنے سے روحانی سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔

تشریح: انسان کے جسمانی نظام میں حواسِ خمسۂ ظاہرہ مختلف قسم کی معلومات ہر وقت مہیا کرتے رہتے ہیں۔ ان نت نئی معلومات کی وجہ سے ذہنِ انسانی کی توجہ ایک مرکز پر نہیں ہو پاتی حواسِ خمسہ میں آنکھ کی کارکردگی کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ یہ ذرا سی شئے زمین و آسمان کی وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے اور ہر وقت تحرک و جستجو اس کی فطرت ہے اس کے علاوہ اس میں پوشیدہ قوت بھی موجود ہے، لہٰذا اس کے کنٹرول کرنے کی طرف خاص طور پر توجہ دینی ضروری ہے۔ اگر اللہ رب العزت کی معیّت کے تصوّر کے ساتھ نگاہ کی حفاظت کی جائے گی تو بیشمار گناہوں سے بفضلہٖ تعالیٰ بچا جا سکتا ہے۔ گناہوں سے بچنے کی وجہ سے روح میں لطافت پیدا ہوگی اور لطافتِ روح کی وجہ سے عالمِ ملکوت سے رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔ صوفیاء حضرات نے مختلف انداز میں اس نگاہ کو وحدتِ مرکزیت سے مربوط کرنے کے طریقے اختیار کیے ہیں

ناک کے نتھنے پر طریقۂ مذکورہ کے ساتھ نگاہ کو مرکوز کرنے سے صرف ایک تصور پر ٹھہراؤ ہو جاتا ہے اور وہ ہے تمام کائنات پر خداوند وحدہٗ لاشریک کی قدرت ۔ اسی مرکزِ وحدت کا تصور حاصل ہو جانے کی بنا پر اصطلاحِ تصوف میں اس مقام کو نابِ توحید کا مقام اور اس شغل کو شغلِ نابِ وحدت کہا جاتا ہے اس میں سالک کو اپنا چہرہ سامنے نظر آنے لگتا ہے جس طرح کہ آئینہ میں نظر آتا ہے، حالانکہ یہاں سامنے آئینہ نہیں ہوتا۔

می نگر بالائے بینی در ہوائے خود بماں　　پختہ گردد خام تن غافل نباشی گر ازاں

ترجمہ : ناک کے اوپری حصہ کی طرف دیکھ اور فضا میں یکسوئی کے ساتھ متوجہ رہ، اگر تو اس شغل سے غفلت اختیار نہ کرے گا تو تیرا خام تن پختہ ہو جائے گا۔

تشریح : یہاں سے مصنف رحمۃ اللہ علیہ شغل سلطانا نصیرا بیان فرما رہے ہیں، اس کا مناسب وقت بھی صبح کی نماز کے بعد یا عصر کی نماز کے بعد ہے، اس میں ناک کے بانسے پر نظر کو متوجہ کر کے فضائے بسیط کی طرف ذاتِ مطلق کے نورِ لامحدود کا تصور کیا جاتا ہے یعنی بغیر پلک جھپکائے جس طرح چراغ یا ستارہ کی روشنی کو دیکھتا ہے، خداوند تعالیٰ کے غیر معین نور کا تصور کرے اور قلب کی زبان سے حرکتِ لسان کے بغیر سانس کی آمد و رفت کے وقت اسمِ ذات کا وِرد کیا جاتا ہے، جب سالک اس نورِ لامحدود کی تجلیات کو چاروں طرف دیکھتا ہے تو حیرت و استعجاب میں اس قدر مستغرق ہو جاتا ہے کہ اپنی بھی خبر نہیں رہتی ۔ مشاہدۂ صفات ہونے کی وجہ سے گناہوں سے طبعی طور پر اس کو نفرت ہو جاتی ہے اور راہِ معرفت میں استقامت کی توفیق عطا ہو جاتی ہے

میرسی در ہیچ روحانی ازیں در یک نظر　　ہست بس خاصیت ایں در ہواشی می نگر

ترجمہ : اس شغل سے ایک ہی نظر میں تو روحانی فضا میں پہونچ جائے گا، اس شغل کے بے شمار خواص ہیں جن کو محققین کی تشریح میں دیکھ۔

تشریح : یکسوئی کے ساتھ جب سالک اس شغل میں مشغول ہو جاتا ہے تو اس کی نگاہ کو روحانی فضا میں پرواز کی طاقت حاصل ہو جاتی ہے اور جسم ناسوتی گناہوں کی کثافت سے

پاک ہوکر عالم ملکوت تک رسائی حاصل کرلیتا ہے۔

غیبِ عالم کشف گردد چوں کنی ایں شغلہا ہر کہ بیند نائے بینی اوست مردِ باصفا

ترجمہ: جب تو یہ شغل اختیار کرے گا تو عالم ملکوت کے راز تجھ پر کھل جائیں گے، اور جو کوئی اپنی ناک کے نتھنے کو دیکھتا ہے وہ مردِ باصفا ہے۔

تشریح: محققین صوفیاء نے لکھا ہے کہ تین چلے گذرنے کے بعد اس شغل کے نتائج کا ظہور ہونے لگتا ہے اور معیتِ ذات کا تصور پھر کسی وقتِ متعین تک محدود نہیں رہتا بلکہ ہمہ وقتی تصور حاصل ہوجاتا ہے، گناہوں سے طبعی طور پر نفرت کی بناء پر روح میں قوت اور فیضان حاصل کرنے استعداد بہت زیادہ ہوجاتی ہے۔ اور عالم ملکوت کے وہ اسرار جو عام لوگوں کی نظری رسائی سے باہر ہوتے ہیں اس پر منکشف ہونے لگتے ہیں۔ فضائے بسیط اس کے لئے ایک آئینہ کی طرح ہوجاتی ہے جس میں اس کو اپنی صورتِ مثالی نظر آنے لگتی ہے اور نورِ الٰہی اس کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے محسوس ہونے لگتا ہے، اس نور میں جو مشاہداتی کیفیات سالک کو ہوتی ہیں ان کا تعلق قال سے نہیں بلکہ حال سے ہے۔ خطرات کو دور کرنے کے سلسلہ میں بھی یہ شغل بہت مفید ہے۔

می نگر بر چشم و ابرو در شبِ تاریک جا تا بہ بینی در سیاہی جلوۂ نورِ خدا

ترجمہ: اندھیری رات میں آنکھ اور بھنوؤں کی طرف توجہ کرو۔ تاکہ سیاہی میں اللہ تعالیٰ کے جلوہ کا مشاہدہ کرسکو۔

تشریح: یہاں سے مصنف رحمۃ اللہ علیہ شغل سلطانا محمودا کا آغاز کررہے ہیں، زیرِ نظر عنوان کا یہ تیسرا شغل ہے، ان تینوں اشغال میں ترتیب وار کم از کم تین تین چلوں تک مشغول ہونا چاہیئے اور مقصود صرف اسی کی ذاتِ پاک کی معیت ہو۔

اس شغل کا طریقہ یہ ہے کہ رات یا دن میں کسی وقت تنہا اور پُرسکون مقام پر تاریک جگہ میں باوضو قبلہ رو بیٹھے اور نگاہ کو فضائے بسیط کی طرف اُوپر اُٹھا کر دونوں بھنوؤں کے درمیان مرکوز کرے اور اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے فیضانِ نور کے ساتھ ہر ایک سانس کی آمد و رفت پر

اَللّٰہُ اَللّٰہُ زبانِ قلب سے ادا کرتے رہنا ضروری ہے ۔

اس شغل کا تعلق عالمِ جبروت سے ہے ، اس لئے یہاں پر نورِ ذات کے ظلماتی حجابات کا مشاہدہ ہوتا ہے اور نورِ ذات بھی مشاہداتی اعتبار سے سیاہی سے متّصف ہے ، اسلئے مصنفؒ نے سیاہی میں نورِ خدا کے جلوہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے ، نیز بعض حضرات نے اس شغل کیلئے رات کا وقت مناسب خیال فرمایا ہے اور اسی مناسبت سے وہ شبِ تاریک میں جلوۂ ذات کا مشاہدہ کرتے ہیں

ایں مقامِ برترش را قابِ قوسین است نام　　منزلِ نورِ تجلّی خداوندِ انام

ترجمہ : اس بلند و برتر مقام کا نام قابَ قوسین ہے اور یہ تمام مخلوق کے پروردگار کے نور کی جلوہ گاہ ہے ۔

تشریح : یعنی بھنوؤں کے درمیانی مقام کو اصطلاحِ صوفیا رمیں قابَ قوسین کہا جاتا ہے دونوں بھنویں دو کمان کی طرح ایک دوسرے سے بہت قریب سے مل رہی ہیں اسی مناسبت سے قابَ قوسین سے تشبیہ دے کر اس مقام کی عظمت باطنی کا بھی اظہار ہے کہ جس طرح معراج شریف میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ہی قریب سے تجلّیاتِ ذات سے نوازا گیا تھا اسی طرح بندۂ مومن جب نماز میں اس مقام کو عاجزی اور انکساری کے ساتھ اپنے مالکِ حقیقی کے سامنے زمین پر رکھ دیتا ہے تو اس کو بھی بہت ہی قربت حاصل ہو جاتی ہے ، اسی قربت کی مناسبت کی وجہ سے اس مقام کو خداوند تعالیٰ کی تجلّیات کی منزل قرار دیا ہے ۔

درمیانِ چشم و ابرویت نظر را می گمار　　کاں محلِّ نیک محرابِ جمالِ کردگار

ترجمہ : آنکھ اور بھنوؤں کے درمیان اپنی نظر کو مرکوز کرو ، کیوں کہ یہ مقام پروردگار کے جمال کا بہترین مرکز ہے ۔

تشریح : یہاں پر مزید وضاحت کے ساتھ حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اپنی نظر کو آنکھ اور بھنوؤں کے درمیان اس لئے مرکوز کرتے ہیں کہ عظمتِ باطنی کے اعتبار سے یہ مقام پروردگار کے جمال کا سب سے بہترین مرکز ہے ۔

جلوہ باری تعالیٰ نیز یابی بر جبیں در شبِ تاریک یا در روز روشن پیش بیں

ترجمہ: اس پیشانی پر اللہ تعالیٰ کے جلوے کا مشاہدہ بھی کرے گا، اندھیری رات میں یا روشن دن میں اپنے سامنے کی طرف توجہ کر۔

تشریح: یعنی یہ پیشانی عظمتِ باطنی کے اعتبار سے بلند مقام رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے اس پیشانی کو جھکانا قطعاً حرام ہے کیونکہ اس میں نور خداوندی ہے اور لطائفِ ستہ کی ترتیب میں بھی اس مقام کو خفی سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اس مقام پر نورِ ذات پوشیدہ ہے۔ اس لئے رات میں یا دن میں کسی وقت بھی اس شغل میں مشغول ہو کر مشاہدہ تجلیات کیا جا سکتا ہے۔ رات اور دن کا فرق تو ہمارے لئے ہے ورنہ وہ ذات پاک تو مکان و زمان، ماضی حال، استقبال کی قیود سے آزاد ہے۔ البتہ جن حضرات نے رات کا وقت اس شغل کیلئے مُعیّن کیا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شغلِ ناب اور شغل سلطاناً نصیرا کے اعتبار سے یہ شغل زیادہ اہم ہے، اس لئے اس کیلئے اسی قدر اہتمام اور سکون کی ضرورت ہے اور رات میں یہ تمام باتیں موجود ہیں، اس لئے رات میں اس شغل میں مشغول ہونے سے بہت جلد منزل مقصود تک رسائی ہو جاتی ہے۔

حق تعالےٰ ہست موجود عیاں درایں مقام زیں جہت داں ایں مقام برتر است اے نیکنام

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی تجلیات یہاں پر موجود اور ظاہر ہیں اس لئے اے سالک اس مقام کو بہت اعلےٰ مرتبہ سمجھو۔

تشریح: یہ بات تو معلوم ہو گئی کہ اس مقام پر تجلیات خداوندی موجود ہیں لیکن ان تجلیات کا ظہور، شغل مذکور میں انہماک کے بعد ہی ہوتا ہے، صوفیا حضرات نے لکھا ہے کہ اس شغل کی تکمیل کے بعد عالَم ناسوت اور عالَم ملکوت اور عالَم جبروت کی کیفیات کی تصویر مثالی سالک کے سامنے اس طرح آجاتی ہے گویا وہ آئینہ میں دیکھ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تصوراتی اعتبار سے جب سالک اپنے آپ کو اپنے مالک و خالق کے روبرو سمجھنے لگتا ہے تو فطری

طور پر تمام صغائر و کبائر اور دُنیاداری کے علائق سے توجہ ہٹ جاتی ہے، انتہا یہ ہے کہ اس کا ہر سانس اسی کی معیت میں گذرتا ہے، ان اَحوال پر جب استقامت نصیب ہوجاتی ہے تو حجاباتِ کثافت اس کے سامنے سے علیحدہ ہونے شروع ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ ان تجلّیات کا ظہور شروع ہوجاتا ہے جو منزلِ مقصود تک رسائی کیلئے نیک شگون ہے خود مقصود نہیں۔

اس مقام کی عظمت کا اعتراف ہندو جوگیوں میں بھی کیا جاتا ہے، اپنی اصطلاح میں اس مقام کو وہ ترکٹی کہتے ہیں اور اِس جگہ یعنی بھنوؤں کے درمیان سیندور، چندن وغیرہ لگاتے ہیں، اگرچہ مرورِ ایام سے اس کی ہیئت کذائی باقی ہے مگر روح نظر نہیں آتی۔

لیک بندہ عبدرحماں کہتر از ہر خاص و عام　　　داد عمر از دست در غفلت بشغل ہر مقام

ترجمہ: لیکن ہر خاص و عام سے کم مرتبہ بندۂ عاجز عبدالرحمٰن نے، تمام مقام کا شغل اختیار نہ کر کے عمر کو غفلت میں گنوادیا۔

تشریح: یہاں مصنفؒ روایاتِ صوفیاء کے مطابق اپنی عاجزی اور انکساری کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ تمام اشغال اگرچہ بہت ہی مفید ہیں لیکن میں اپنی غفلت کی وجہ سے تمام مقامات کا شغل اختیار نہ کرسکا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ تمام اشغال کو اختیار کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ بلکہ مرشد کی اجازت سے اور اس کی صواب دید کے مطابق کوئی ایک شغل ہی بہتر ہے۔ مصنفؒ کی اس عاجزی سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ انھوں نے کوئی بھی شغل نہیں کیا بلکہ یہ حضرات کتنے ہی اعلیٰ مقام تک پہونچ جائیں لیکن اس کی لامحدود تجلیات کے حضور اپنے کو کالعدم اور سب سے کم سمجھتے ہیں۔ یعنی اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی اپنی طرف غفلت اور کوتاہی کو منسوب کرتے ہیں۔

از برائے طالبِ حق ساز دادم ایں کتاب　　　زیں مشقت من نجویم از خدا یکجو ثواب

ترجمہ: طالبانِ حق کے لئے میں نے اس کتاب کو ترتیب دیا ہے، میں اپنی اس محنت کا بدلہ ایک جو کے برابر بھی خدا سے طلب نہیں کرتا۔

تشریح : یعنی جو حضرات اپنے قلب و دماغ میں طلب حق کی تڑپ رکھتے ہیں انکی رہنمائی کے لئے میں نے یہ کتاب ترتیب دی ہے، مادی ثواب کی صورت میں پروردگار سے اپنی اس محنت کا بدلہ لینا اس لئے مناسب نہیں سمجھتا کہ میری یہ محنت کوئی خاص کارنامہ نہیں ہے جس کو انجام دینے کے بعد میں اپنے کو ثواب کا مستحق گردانوں، بلکہ میری اس کاوش اور جدّوجہد کا مقصد صرف یہ ہے کہ :

از رضائے حق تعالےٰ راز گوئیم راستد ال   شو مراقب زیکے از شغل باقی بازماں

ترجمہ : سچی بات تو یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے میں نے یہ تمام راز بیان کئے، ان اشغال میں سے کسی ایک میں مشغول ہوکر باقی سے کنارہ کشی کرو۔

تشریح : مصنف نے اس کتاب کی ترتیب کا مقصد طالبانِ حق کی رہنمائی اور خداوند قدوس کی رضا جوئی قائم کیا ہے، اس لئے اس کی رضا کے سوا کچھ اور نہیں چاہیئے اور یہ سب سے زیادہ دانائی اور بصیرت کی بات ہے کیوں کہ جس کو رضائے مولیٰ مل گئی اس کو سب کچھ مل گیا اور جس کو سب کچھ ملا لیکن رضائے مولیٰ نہ ملی اس کو کچھ بھی نہ ملا۔

دوسرے مصرعے میں مصنفؒ اس حقیقت کی طرف اشارہ کررہے ہیں کہ ان تمام اشغال کے لکھنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ تمام اشغال کی طرف توجہ کرو۔ ایسا نہیں۔ بلکہ مرشد کی اجازت سے کسی بھی ایک شغل میں لگ جاؤ، ان شاء اللہ تعالیٰ منزلِ مقصود تک رسائی ہوجائے گی، کیونکہ مقصود یہ اشغال نہیں ہیں بلکہ مقصود ذاتِ پاک اور اس کی رضا ہے۔

راہِ خالق گر شماری در خلائق بیشمار   لیک یک مقصود از انہا حق تعالےٰ ہو شدار

ترجمہ : مخلوق کے لئے حق تعالیٰ تک پہونچنے کے بے شمار راستے ہیں لیکن ان تمام راستوں سے مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک ہے۔

تشریح : یعنی معرفتِ حق حاصل کرنے کیلئے تمام کائنات اور کائنات کی ہر ایک شئے گواہی دے رہی ہے، کائنات کی کوئی شئے ایسی نہیں جس میں اس کا جلوہ نہ ہو، جو اس کی قدرتِ کاملہ

کا شاہکار نہ ہو، لیکن اس اور اک حقیقت کے لئے بصیرت بھی درکار ہے، اللہ تعالیٰ جس کو اپنی رحمت سے ایسی بصیرت عطا فرمادے وہی ان اشیائے کائنات میں تجلیات کا مشاہدہ کرسکتا ہے، اور ان تمام مشاہدات میں مرکزِ وحدت یعنی ذات وحدہٗ لاشریک کی قدرتِ کاملہ کا جلوہ دیکھ سکتا ہے کیونکہ نہ یہ کائنات مقصود ہے اور نہ اس کائنات کی اشیاء، بلکہ مقصود تو وہی ذاتِ وحدہٗ لاشریک ہے، اس کے سوا کوئی اور چیز مقصود نہیں، اس لئے:

از یکے گر کار آید باز باشی از فزوں ۔۔۔ لیک باشد می شنو ہر راز باری رہنموں

ترجمہ: اگر کسی ایک کے ذریعہ مقصد برآری ہوجائے تو آگے قدم بڑھانے کی ضرورت نہیں اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر ایک شے رازِ باری تعالیٰ کی طرف رہنمائی کرتی ہے

تشریح: یعنی اگر کسی ایک شغل کے ذریعہ مقصود سالک حاصل ہوجائے تو پھر دوسرے اشغال میں مشغول ہونے کی ضرورت نہیں اور جب پروردگار اپنی رحمت سے کسی بھی شغل کے ذریعہ اپنی معرفت عطا کردے تو مقصود حاصل ہوگیا اور مقصود حاصل ہوجانے کے بعد کسی دوسری طرف توجہ کرنا، اور غیر مقصود میں مشغول ہونا کسی طرح مناسب نہیں، اگرچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کائنات کی ہر شے اس کی قدرتِ کاملہ کا کھلا ہوا ثبوت ہے اور اس تک رسائی کا ایک بہترین ذریعہ ہے، اسی مقصد کو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ۔۔۔ ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

یعنی سبز درختوں کے چھوٹے چھوٹے پتے عقلمند اور سالک کی نظر میں خدا کے جاننے کے لئے ایک ایک دفتر ہیں، وہ ان ہی پتوں میں خدا کو دیکھتا ہے یہاں مصنف رحمۃ اللہ علیہ اپنے مسلک وحدۃ الوجود کی طرف بھی اشارہ کررہے ہیں۔

در بیان اقسام اربعہ ارواح

روح کی چار قسموں کا بیان

رازِ باری می شنو ارواح راشد نوع چند　　　　در کلامِ اصطلاحی چار نوع اے ہوشمند

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی معرفت کا راز سنو کہ روح کی چند قسمیں ہیں، اے سالک اصطلاحِ تصوف میں وہ چار قسموں پر منقسم ہے۔

تشریح: سلوک و معرفت میں تزکیۂ نفس کے بعد تجلیۂ روح کا نمبر آتا ہے اور جس چیز کا تجلیہ کیا جائے اس کا مختصر تعارف ہونا ضروری ہے تاکہ مقصود سے مناسبت ہو جائے۔

روح اگرچہ بذاتِ خود پاک صاف اور لطیف ترین شے ہے، بلکہ اپنے اندر ایسی شانِ لطافت و نظافت رکھتی ہے کہ کسی پاک شئے سے متعلق ہونے کے بعد مزید پاک نہیں ہوتی اور نہ کسی ناپاک شئے کی ناپاکی سے ذرہ برابر اثر نجاست قبول کرتی ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ خود اس قدر پاک و صاف ہے تو تجلیۂ روح کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ صوفیاء حضرات تجلیۂ روح سے وہ کیفیت مراد لیتے ہیں جو روح کے ذریعہ صفاتِ ذات سے فیضان حاصل کرتی ہے، اور اس فیضان کی کیفیت سے سالک کے قلب و دماغ میں پاکیزگی کا غلبہ لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ یعنی سالک کے باطن سے غیر شعوری طور پر پاکیزگی کے جذبات کا عملی اظہار ہونے لگے اور نفس کی وہ منفی طاقت جو برائیوں میں ملوث کرنے کی کوشش کرتی ہے کمزور اور مغلوب ہو جائے۔ روح کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی بڑی عجیب ہے کہ تمام اشیاء کائنات خالقِ مطلق کی تخلیقات میں شامل ہیں، روح بھی خالقِ مطلق کی پیدا کی ہوئی ہے، لیکن اس کے دونوں کنارے یعنی ایک کنارہ تو وہ جو ذاتِ مطلق کی طرف منسوب ہے اور دوسرا کنارہ وہ جو مخلوقات کی طرف متعلق ہے، دونوں ہی بڑے پیچیدہ

ہیں، اسی پیچیدگی کی وجہ سے آج تک کوئی اس کی حقیقت کو نہ پاسکا اور اپنے اپنے فہم اور علم و قیاس سے مختلف قسم کے خیالات اس سلسلہ میں ہو گئے۔ حکمائے متقدمین کہتے ہیں کہ رُوح جوہرِ مجرد قدیم ہے، حکمائے متاخرین کہتے ہیں کہ روح جوہر مجرد حادث بعد البدن ہے یعنی جسم پہلے پیدا ہوا اور روح بعد کو پیدا ہوئی۔ صوفیائے کرام یہ فرماتے ہیں کہ روح جوہر مجرد حادث قبل البدن ہے، یعنی بدن کے پیدا ہونے سے پہلے روح کی تخلیق کی گئی، علمائے متکلمین کہتے ہیں کہ روح جسم غیر عنصری ہے، یعنی روح ایک جسم تو ہے لیکن عناصر اربعہ میں سے کوئی عنصر اس میں نہیں، اطبائے کرام کہتے ہیں کہ روح جسم عنصری ہے۔ یہ کل پانچ قسم کے خیالات ہیں جس کو یوں تعبیر کیا جاتا ہے کہ روح کے بارے میں پانچ مذہب ہیں، ان پانچ قسم کے خیالات میں سے صحیح کیا ہے اور غلط کونسا ہے، تو اس کو مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ دو اوّل کے غلط اور تین آخر کے صحیح ہیں، یعنی حکمائے متقدمین و متاخرین کا مسلک غلط اور صوفیائے کرام، علمائے متکلمین، اور اطبائے کرام کا مسلک صحیح ہے، اوّل کے دو نظریات اس لئے غلط ہیں کہ حکمائے متقدمین روح کو قدیم مانتے ہیں جبکہ روح مخلوق ہے اور جو مخلوق ہے وہ قدیم نہیں ہو سکتی، حکمائے متاخرین کا مسلک اس لئے غلط ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ بدن کی تیاری کے بعد روح پیدا کی جاتی ہے اور بدن میں ڈالی جاتی ہے یہ اسلئے غلط ہیکہ بخاری شریف میں حدیث پاک کا یہ جزو کہ۔ اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَۃٌ۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ ارواح ابدان سے پہلے مجتمع تھیں، لہٰذا یہ قول بھی ٹھیک نہیں۔ اب باقی رہ جاتے ہیں آخر کے تین قول، تو وہ صحیح ہیں اور ان کے صحیح ہونے کی وجہ یہ ہے کہ صوفیا حضرات کا یہ مذہب مکاشفہ پر مبنی ہے اور کشف جب دلیل شرعی کا مخالف نہ ہو تو اس کے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں، یہاں روح کے بدن سے پہلے حادث ہونے پر بخاری شریف کی یہ حدیث اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَۃٌ سے روح کی موجودگی کا قبل بدن ثبوت ملتا ہے، چوتھے مذہب یعنی روح کے جسم غیر عنصری ہونے پر قرآن پاک کی یہ آیت دلیل ہے کہ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ، اس آیت سے معلوم ہوا کہ رُوح جسم میں پھونکی گئی اور جو چیز پھونکی جائے

گی اس کے لئے جسم کا ہونا ضروری ہے اگرچہ جسمِ لطیف ہو۔ پانچواں مذہب اطبّار کا اس لئے صحیح ہے کہ اس کی دلیل مشاہدہ ہے اور مشاہدہ شرعًا حجت ہے اور ان تینوں کا تعلق بدن انسانی سے ہے۔ ان تینوں مذاہب میں اگرچہ آپس میں بہ ظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقتًا ایسا نہیں کیونکہ روح جوہر مجرّد ہونے کے اعتبار سے جسمِ غیر عنصری کے واسطے سے جسمِ انسانی سے متعلق ہے اور جسمِ غیر عنصری کا تعلق جسم انسانی کے ساتھ جسم عنصری کے ذریعہ ہے یعنی اوّل کا تعلق بواسطۂ ثانی اور ثانی کا تعلق بواسطۂ ثالث ہے اور دلیل یہ ہے کہ انسان کی موت کے وقت جب روحِ طبّی جو جسمِ عنصری رکھتی ہے وہ جسم سے الگ ہو جاتی ہے تو جسمِ غیر عنصری بھی اس سے جدا ہو جاتا ہے اور جب جسمِ غیر عنصری الگ ہو جاتا ہے تو جوہر مجرد کا تعلق بھی جسم انسانی سے ختم ہو جاتا ہے روحِ طبّی جو جزوِ عناصر ہے وہ موت کے بعد عناصر میں مل جاتی ہے اور روح غیر عنصری عالم برزخ میں باقی رہتی ہے اور اوّل چونکہ جوہر مجرّد ہے اس لئے وہ کسی مکان میں نہیں رہتی اس لئے کہ مکان تو مادّہ کے خواص میں سے ہے اور روح مادہ نہیں بلکہ جوہرِ مجرّد ہے۔ اسی وجہ سے صوفیار حضرات روح کو فوق العرش سے تعبیر کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ روح عرش کے اوپر رہتی ہے بلکہ عرش آخری حد ہے امکان و مکانات کی اور روح جوہر مجرّد ہونے کی وجہ سے مکان سے الگ ہے، اس لئے روح کو لامکانی کہہ دیتے ہیں۔

روح کے سلسلے میں ابھی متعدد امور باقی رہ جاتے ہیں جن کی تفصیلات کتابوں میں موجود ہیں ہمارا مقصد تو صرف یہ بیان کرنا ہے کہ روح کا تعلق ذاتِ باری کی صفتِ تخلیق (جو ارادہ کے ضمن میں ہے) سے ہے اور ہر مخلوق میں اس کی جلوہ گری ہے لیکن موجودات میں ذاتِ مطلق کا فیضان روح کے ذریعہ کس طرح ہے اس کو محققین صوفیار چار طریقہ پر بتلاتے ہیں، ان چار قسموں میں سے بھی مقصود کونسی ہے اور غیر مقصود کونسی ہے اسکی تشریح مصنفؒ اس طرح فرماتے ہیں

نوعِ اوّل ناطق واں روحِ انسانی بداں   نوعِ ثانی صامت و آں روحِ حیوانی بداں

ترجمہ: پہلی قسم روحِ ناطق ہے اس کو روحِ انسانی سمجھو، دوسری قسم روحِ صامت

ہے اس کو روحِ حیوانی سمجھو۔

تشریح: یعنی موجودات میں ذاتِ مطلق کا فیضان کس انداز سے ہے اور کونسی شے کس طرح روح کے ذریعہ اس ذاتِ پاک کے جلووں سے حیات پذیر ہے اس کی تفصیل بتاتے ہوئے مصنف فرماتے ہیں کہ کائنات میں اشیاء موجودات کی حیات کا نظم چار انداز میں ہے پہلی قسم کے فیضان کا سلسلہ بذریعہ روحِ انسانی ہے اور اس موجود کو ناطق کہتے ہیں اور دوسری قسم کے فیضان کا سلسلہ بذریعہ روحِ حیوانی ہے، اس موجود کو صامت کہتے ہیں، یعنی ایک مخلوق تو فہم و فراست، عقل و شعور کے ساتھ زندگی سے فیضیاب ہے اور دوسری قسم کی مخلوق نعمتِ حیات سے تو بہرہ ور ہے لیکن عقل و شعور اور معقولات کی یافت سے محروم ہے، اس کو روحِ حیوانی کہا جاتا ہے جو صامت (خاموش رہنے والی) ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ جانور خاموش رہتے ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ افہام و تفہیم اور عقل و شعور اور معقولات کی دریافت جانوروں کے پاس نہیں۔

نوعِ ثالث روحِ نامی در ہمہ اشجار ہا نوعِ رابع روحِ جسمی در ہمہ احجار ہا

ترجمہ: روح کی تیسری قسم روحِ نامی ہے جو تمام درختوں میں ہے، چوتھی قسم روح کی روحِ جسمی ہے جو پتھروں میں موجود ہے۔

تشریح: بذریعہ روح فیضان حاصل کرنے والی تیسری قسم مخلوق کی وہ ہے جو روحِ نامی کے نام سے موسوم ہے اور اس روحِ نامی کا تعلق تمام درختوں سے اور زمین سے اُگنے والی نباتات سے ہے، اور روح کی چوتھی قسم روحِ جسمی ہے جس کا تعلق پتھروں سے اور دیگر جمادات سے ہے۔

روحِ انسانی اسست اصل و روحِ عالی را سداں غیرِ ایں انفاس دانی تا بدانی رازِ جاں

ترجمہ: یہ بات بالکل صحیح مان لو کہ روحِ انسانی اصل اور روحِ عالی ہے، اس کے علاوہ کو سانس سمجھو تاکہ تم کو روح کا راز معلوم ہو جائے۔

تشریح: مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تمام کائنات میں روح کے ذریعہ حرکت و عمل کا جو سلسلہ جاری ہے اس کی چار قسمیں ہیں، ان چار قسموں میں سے اصل اور اعلیٰ

مرتبہ والی روحِ انسانی ہے، کیوں کہ اس کو عقل و شعور اور معقولات کے ادراک کی جو صلاحیت عطا کی گئی ہے روح کی باقی تین اقسام اس صلاحیت سے محروم ہیں، ان تین قسموں کی حیثیت صرف سانس کی آمد و رفت کی سی ہے جس سے سلسلۂ حیات قائم ہے، ان سے کسی قسم کی بازپرس اور عذاب و ثواب کا معاملہ بھی نہیں، یہ تمام خصوصیات صرف روحِ انسانی ہی سے متعلق ہیں۔

روحِ انساں را دو نوع آمد بدانی اے پسر　　روحِ عالی روحِ سافل می نگر اندر بشر

ترجمہ: اے سالک! تو یہ بات جان لے کہ روحِ انسانی کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک اعلیٰ درجہ کی روح، دوسرا ادنیٰ درجہ کی ہے، اس کا مشاہدہ انسان میں کرو۔

تشریح: یعنی روحِ انسانی جو تمام اقسامِ روح میں اصل ہے اور اس کا مرتبہ بھی سب سے اعلیٰ ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک روحِ عالی یعنی بلند مرتبہ والی روح، دوسرے روحِ سافل یعنی گھٹیا درجہ کی روح۔ اور روح کی یہ تقسیم اصطلاحی طور پر اچھے اور برے اعمال کی وجہ سے ہے فی نفسہ رُوح کی تقسیم نہیں ہے بلکہ رُوح کے سامنے اعمال کا آئینہ جس رنگ میں پیش کیا جائے گا اسی رنگ میں رنگی ہوئی روح نظر آئے گی اور نفع نقصان کے شعور کے ساتھ کام کرنا یہ صلاحیت صرف انسان کو ملی ہے، اس لئے روح کی چار اقسام میں سے رُوحِ انسانی کی تقسیم کی گئی، دیگر اقسام کے مظاہر اس صلاحیت سے محروم ہیں یعنی حیوانات، نباتات، جمادات میں یہ صلاحیت نہیں۔

رُوحِ عالی را سہ مسکن دیگرش در ہر مکاں　　یاد داری ایں سخنہا را دنگر ایں زماں

ترجمہ: رُوحِ عالی کے وقوع کے اعتبار سے تین ٹھکانے ہر ایک جسم میں الگ الگ ہیں۔ اس وقت ان امور کی طرف توجہ کرنے کے بعد ان باتوں کو یاد رکھ۔

تشریح: یہاں پر مصنف رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ہم روح کی تعریف میں اطبار کا قول بھی نقل کر چکے ہیں کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ روح جسم لطیف عنصری ہے، اور مُدبّر بدن ہے، انسانی جسم میں اس کے عمل کا دائرہ بھی الگ ہے اور اسی اعتبار سے اس کا

محلِ وقوع بھی تین مقام پر ہے، وہ تین مقام یہ ہیں، قلب، جگر اور دماغ، اطباء حضرات اس روح کو جو قلب میں مقیم ہوتی ہے روحِ حیوانی کہتے ہیں اور اس کا کام تمام جسم کو مادّی خوراک فراہم کرنا ہے، دوسری قسم روحِ طبعی ہے اس کا مقام جگر ہے اور یہ فراہمئ غذا کیلئے اسباب مہیا کرتا ہے، اور تیسری قسم روحِ نفسانی ہے جس کا مرکز دماغ ہے اور اس کا کام تمام جسم میں شعور آگہی پیدا کرنا ہے، روح کی یہ تقسیم طب کے اعتبار سے ہے، اس کی تفصیلات بھی طب کی کتابوں میں دستیاب ہیں، یہاں مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے ضمنی طور پر اس کا ذکر کر دیا ہے اصل موضوع نہیں ہے۔

نزدِ بعضے روح بے تخلیقِ خالق ہست داں   امرے از امرِ خدا ہست او بگوید ہمچناں

ترجمہ: بعض حضرات کے نزدیک روح خالق کی تخلیق کے بغیر وجود پذیر ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اوامر میں سے ایک امر ہے۔

تشریح: روح کے سلسلے میں بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ یہ مخلوق نہیں ہے، اس لئے کہ یہ امرِ خداوندی ہے اور "امر اللہ" تعالیٰ کی صفت ہے اور صفتِ خداوندی مخلوق نہیں، کیونکہ اگر صفاتِ خداوندی کو مخلوق مانتے ہیں تو حادث یعنی فنا ہونے والی ماننا پڑے گا، اسلئے کہ مخلوق تو وہ ہے جو پہلے نہیں تھی، پھر بحکمِ خداوندی عدم سے وجود میں آئی اور پھر ختم ہو جائے گی، روح تو ختم ہونے والی نہیں ہے اسلئے یہ صفتِ خداوندی ہونی چاہیئے اور غیر مخلوق ہونی چاہیئے۔

روح نزدش امرِ رب ست واں باشد کلام   ہر کلامش غیر مخلوق است گفتا بالتمام

ترجمہ: اُس کے نزدیک روح امرِ رب ہے اور وہ صفت کلام ہے اور یہ بات متفقہ طور پر تسلیم شدہ ہے کہ اس کا ہر ایک کلام غیر مخلوق ہے۔

تشریح: یعنی جو روح کو غیر مخلوق تسلیم کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ امرِ رب ہے، اور امرِ رب صفتِ کلام باری تعالیٰ ہے اور یہ بات سب کے نزدیک تسلیم شدہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی تمام صفات غیر مخلوق اور قدیم ہیں، اس لئے روح بھی غیر مخلوق اور قدیم ہے لیکن مصنفؒ

کا مسلک روح کے سلسلہ میں اس کے برعکس ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

مذہب ما روح از امر است زامر کردگار ہرچہ از امر است شد مخلوقِ خالق ہوشدار

ترجمہ: ہمارا مسلک یہ ہے کہ روح امر خداوندی کے ایک امر کے ذریعہ وجود پذیر ہوئی ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے امر کے ذریعہ وجود پذیر ہے وہ خالق مطلق کی مخلوق ہے۔

تشریح: مصنف رحمۃ اللہ علیہ روح کو صفتِ خداوندی ماننے کے نظریے سے متفق نہیں ہیں، اس لئے فرماتے ہیں کہ روح امر خداوندی نہیں بلکہ امرِ خداوندی کے ذریعہ سے موجود ہوئی ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ جو کچھ امر خداوندی کے ذریعہ موجود ہوا ہے وہ خالق کی مخلوق ہے اور جب مخلوق ہے تو وہ حادث ہے اور جو حادث ہے وہ صفتِ خداوندی نہیں بن سکتی، اس لئے روح بھی صفتِ خداوندی نہیں بن سکتی۔

روح از امر است و کے بے امرش امر دو جہاں زیر امرش ہرچہ آید ہست آں مخلوق داں

ترجمہ: روح امر خداوندی کے ذریعہ موجود ہوئی ہے اور دونوں جہان کا کونسا معاملہ اسکے حکم سے خالی ہے اور یہ بات طے شدہ ہے کہ جو کچھ اسکے حکم کے ضمن میں آتا ہے وہ مخلوق ہے

تشریح: مصنف فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تو اس قدر وسیع ہے کہ دونوں عالم یعنی عالم امر اور عالم خلق اسی کے حکم سے وجود پذیر ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ جب کسی شے کے موجود ہونے کا ارادہ فرماتے ہیں تو لفظ "کُن" فرماتے ہیں، پھر وہ شے وجود میں آجاتی ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ جو شے بھی امرِ خداوندی کے ضمن میں آتی ہے وہ لفظ کُن کے تاثر کا مصداق ہے جو پہلے وجود پذیر نہیں تھی، لفظِ کُن فرمانے کے بعد وجود میں آگئی، اسی طرح روح کا معاملہ ہے جیساکہ حدیثِ پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روح کو اجسام سے ہزاروں سال قبل پیدا فرمایا اور ابدان کے وجود سے قبل روحیں ایک جگہ جمع تھیں۔

روح ہرگز نے کلامش لیک زامرش بالیقیں می نگر من آخر از ربی گفت خالق ہمراہیں

ترجمہ: روح ہرگز اس کا کلام نہیں ہے لیکن یقینی طور پر اس کے حکم سے موجود ہوئی ہے

دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے اسی وجہ سے مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کہا ہے۔

تشریح: یہود نے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کے بارے میں سوال کیا تھا کہ روح کیا ہے؟ تو بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب عنایت کیا گیا تھا قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ۔ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے) اس آیت پاک سے یہ بات صاف ہوگئی کہ "روح امر رب ہے" یعنی صفت کلام نہیں ہے کہ غیر مخلوق اور قدیم مانا جائے، بلکہ امر رب کے ذریعہ موجود ہوئی ہے جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جو شئے لفظ کُنْ کے تحت امر کے ذریعہ وجود پذیر ہو وہ شئے یقیناً خالق مطلق کی مخلوق شمار ہوگی جو حادث ہوگی۔

جملہ چیز از امر حق پیدا ز عرش و تا ثری   روح ہم زینساں بدانی اے پسر گفتم ترا

ترجمہ: عرش سے فرش تک تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیدا ہوئی ہیں اے سالک میں تجھ سے کہتا ہوں کہ روح کو بھی ان ہی مخلوقات سے سمجھ۔

تشریح: کائنات میں جس قدر بھی موجودات ہیں ان سب کے موجود ہونے کیلئے اللہ تعالیٰ جب بھی لفظ کُنْ فرماتے ہیں تو وہ تمام اشیاء وجود پذیر ہو جاتی ہیں، روح کیلئے بھی لفظ کُنْ کے تأثر کا مصداق ماننا چاہیئے۔

حق خبر داد است ما را روح از امرش بداں   در کتاب خویش کے ماہیتش کردہ بیاں

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے خود ہمیں مطلع فرمایا کہ روح کو اس کے حکم سے موجود سمجھو، اس نے اپنی کتاب قرآن مجید میں روح کی حقیقت کب بیان کی ہے۔

تشریح: یہ بات کہ "روح مخلوق ہے" ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ خداوند قدوس نے اپنے کلام پاک قرآن مجید میں فرمایا "اَلرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" (روح میرے رب کے حکم سے وجود پذیر ہوئی ہے) اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ اَمرِ رب کا صدور لفظ کُنْ سے ہے اور لفظ کُن کا مامور دیگر اشیاء اور مخلوقات کی طرح روح بھی ہے، بس روح کے

متعلق اسی قدر فرماکر یہود کے سوال کا جواب دیدیا گیا تھا۔ اس کی ماہیت نہیں بیان کی گئی تھی کہ مزید تحقیق کا سراغ مل سکے، کیوں کہ ہماری عقل اس راز کو سمجھنے سے قاصر ہے اسی لئے اس کی حقیقت کو نہیں بتلایا گیا۔

جسم زندہ از وصالِ جاں مگر از ما نہاں ۔۔۔ جملہ از جاں جز خموشی نیست ما را ہیچداں

ترجمہ: روح کے ملاپ کی وجہ سے جسم زندہ ہے مگر اس کی حقیقت ہم سے پوشیدہ ہے سب کچھ روح کی وجہ سے ہے لیکن خاموشی کے سوائے ہمارے لئے کوئی چارۂ کار نہیں۔

تشریح: یہ بات تو ظاہر ہے کہ حیاتِ جسمانی کا دارومدار روح پر ہے جب تک روح کا اتصال جسم سے ہے جسم میں زندگی اور تابندگی باقی ہے اور جب روح جسم سے الگ ہو جاتی ہے تو جسم کو مردہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ اتنا سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہ جسم کا تمام کاروبار روح کے سہارے چل رہا ہے، یہ عجیب بات ہے کہ روح کے بارے میں ہم کو کچھ بھی معلومات نہیں کہ روح کیا ہے اور کس طرح جسم کے اندر اس کا تصرّف ہے، کس طرح جسم میں اس کا دخول ہوتا ہے اور کس طرح خروج ہے، یہ تمام باتیں آج تک راز ہیں، ان کی حقیقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے سائنس جدید اس قدر ترقیات کے بعد بھی روح کے بارے میں ہنوز روزِ اوّل کی طرح ہے، اور جو کچھ کہا گیا ہے وہ صرف قیاسی حد تک ہے یقینی طور پر کوئی بھی فرد روح کی حقیقت کو دریافت نہ کر سکا، جیسا کہ مصنّف فرماتے ہیں۔

کس تواند روح را در شرح آرد اے پسر ۔۔۔ جز خموشی نیست ما را بحث کردم مختصر

ترجمہ: اے سالک! کون ہے جو روح کی تشریح کر سکے، ہمارے لئے خموشی کے سوائے کوئی چارۂ کار نہیں ہے، اسلئے ہم نے بحث کو مختصر کر دیا۔

تشریح: مصنّف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ روح کی تشریح کرنا کسی کے بس کی بات نہیں اسی لئے ہم نے بھی بحث کو مختصر کر کے صرف اسی حد تک قدم بڑھایا ہے جہاں تک قرآن پاک نے ہماری رہبری کی ہے، اور اسی کے مطابق اسی بات پر اکتفا کیا ہے کہ روح

امر رب سے وجود پذیر ہے ۔

شرح کردن روح را از ماہیت آمد حرام   حق نہ گفتہ در کتاب خود کنوں گوید کدام

ترجمہ : روح کی ماہیت بیان کرنا شرعی طور پر بھی حرام ہے ، جب اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان نہیں فرمائی تو پھر کون بیان کرسکتا ہے ۔

تشریح : کسی بھی شئے کی حقیقت بیان کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس کے وہ اجزاء معلوم ہوں جن سے یہ شئے مرکب ہے ، روح کے سلسلے میں قرآن وحدیث میں اس بات کی وضاحت نہیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے اور نہ قیاس وفہم ہی اس بارے میں کوئی رہبری کرتے ہیں ، نہ سائنس کی تحقیقات کے ذریعہ اس راز کا انکشاف ہوسکا ۔ یہ بات تو سب تسلیم کرتے ہیں کہ جسم میں کوئی ایسی قوت موجود ہے جو جسم کو فعال اور متحرک بنائے ہوئے ہے لیکن اس وجود کی حقیقت اور اس کی کارکردگی کی نوعیت کیا ہے اس سے مکمل طور پر لاعلمی ہے ، اس لئے جس معاملہ میں عقل ونقل رہبری نہ کرسکے اس پر گفتگو کرنا ہی غلط ہے ۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جب خالق روح نے اس کی ماہیت نہیں بیان فرمائی تو پھر کسی کی کیا مجال جو اس سلسلہ میں تحقیق کا حق ادا کرسکے ۔

امر از وے ، نفخ از وے ، روح از وے ہگوشدار   ایں تمامی عین وے ، نے غیر وے شد ہوشدار

ترجمہ : یہ بات یاد رکھو کہ امر ، نفخ اور روح سب کے سب اسی کی طرف سے ہیں اور یہ تمام اس کے عین ہیں ، غیر نہیں ہیں ، اس بات کا دھیان رکھو ۔

تشریح : اب مصنف رحمۃ اللہ علیہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حقیقت تو یہ ہے کہ امر کی شان ، نفخ کی نوعیت ، اور روح کی کیفیت ، یہ سب ذات مطلق کی طرف منسوب ہیں ، جیسا کہ قرآن پاک میں امر کی نسبت رب کی طرف ہے اور اسی طرح نفخ کی نسبت بھی نَفَخْتُ (میں نے پھونکی) میں پروردگار عالم نے اپنی طرف کی ہے ، اور رُوحِی میں روح کی نسبت بھی خداوند قدوس نے اپنی طرف کی ہے یعنی ان تینوں کی نسبت پروردگار کی طرف ہے

اور جو کیفیتِ افعال ذاتِ پاک کی طرف منسوب ہوتی ہے اس کو صفاتِ ذات سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ظہورِ فعل سے پہلے یہ کیفیت وحدۃ الوجود کے اعتبار سے عینِ ذات ہوتی ہے، اس لیئے ان تینوں کی نسبت عینِ ذات کے دائرہ میں ہے لیکن مصنّف کا مذہب روح کے سلسلہ میں مخلوق ہونے کا ہے، اس لیئے روح کو اس نسبت ذاتی سے اس طرح علیحدہ کرتے ہیں کہ:-

لیک بعد از نفخ روحے بود فرماں عین وار　　　می نگر در وَاسْجُدُوْا ایں راز پاکِ کردگار

ترجمہ: لیکن نفخ کے بعد روح کے بارے میں جو فرمان صادر ہوا وہ مثل ذات قرار دے کر تھا، پروردگار کے اس پاک راز کو وَاسْجُدُوْا میں دیکھ لو۔

تشریح: اس سے پہلے مصنّف نے روح کو مخلوق مانا تھا، لیکن جب امر اور نفخ کی نسبت ذاتِ مطلق کی طرف کی اور اسی کے ساتھ ساتھ روح کو بھی ذات کی طرف منسوب کرکے تینوں چیزوں کے لیئے عینِ ذات کا حکم دیدیا تو روح کے سلسلے میں یہ دو باتیں متضاد ہوگئیں کہ وہ مخلوق بھی ہے اور غیر مخلوق بھی، یہ ایک اعتراض اس سے پہلے شعر سے پیدا ہوتا تھا جس میں امر، نفخ اور روح تینوں کو ایک ہی درجہ میں رکھدیا گیا ہے، اس کی توجیہ مصنّف اس طرح فرما رہے ہیں کہ دراصل ذات پاک کی طرف روح کا انتساب عینِ ذات پر دلالت کرتا ہے لیکن نفخ کے بعد روح کا درجہ غیر مخلوق اور قدیم کا نہ رہا، بلکہ ذاتِ مطلق کے فرمان کے مانند ہوگیا، اس مثل فرمان ہونے کی وجہ سے روح کو سمجھنے میں پیچیدگی اور بھی زیادہ ہوگئی، کیونکہ اس میں دونوں شان کا وجود اور ظہور رہے، نیز عینِ ذات کی شان روح میں موجود ہونے کی وجہ سے آدم علیہ السّلام کے لیئے ملائکہ کو سجدہ کا حکم ہوا اور مسجودِ ملائک ہونے کے شرف میں یہی راز پوشیدہ ہے۔

گفت ما ظاہر نگشتیم اندرون ہیچ چیز　　　چوں ظہورم در نسیمم بشنو حکایت اے عزیز

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہم کسی بھی شئے میں ظاہر نہیں ہیں جس طرح کہ ہماری شان کا ظہور روح میں ہے، اس حقیقت کو غور سے سنو۔

تشریح: یعنی کائنات کی تمام اشیاء اس کی قدرتِ کاملہ کا مظہر ہیں لیکن کسی بھی شئے میں

اس کے جلوؤں کا ظہور نہیں ہے مگر روح کا معاملہ ایسا پیچیدہ ہے کہ باوجودیکہ ہم کو روح
احساس ہوتا ہے اور جسم کی تمام کارکردگی بھی اسی کی موجودگی پر منحصر ہے مگر اس کا
کا ادراک بالکل نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ پروردگار کی شان کا ظہور جس انداز میں
ہے کسی اور شئے کے ذریعہ نہیں، اس ظہور کی وجہ سے ہم احساس روح تو کرتے ہیں
موجود ہونے سے زندگی کا حکم لگاتے ہیں اور روح کے الگ ہو جانے سے موت کا
ہیں اور یہ رات دن کا مشاہدہ ہے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے لیکن اس کے
معلوم نہیں ہے کہ روح کس انداز سے جسم میں آتی ہے اور کس طرح جسم سے نکلتی
پر یہ مفرد ہے یا مرکب ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی تمام باتیں محققین نے اپنے
کے مطابق کہی ہیں، یقینی طور پر کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔

نفخ روحی را اضافی روحِ نامے ہست داں   سجدہ می کردند آدم را ملائک

ترجمہ: یہ بات تم اچھی طرح سمجھ لو کہ نفخ روح کا نام روحِ اضافی ہے، اسی وجہ
فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا ہے۔

تشریح: یعنی روح پھونکنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے اور اسی
وجہ سے آدم میں روح پھونکنے کے باوجود بھی اس میں عین ذات کا رنگ باقی ر
رنگ جھلکنے کے سبب فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا۔

از ہماں روئے جمالی حق بیاید عین دار   وز جلالی گشت ابلیسِ لعین

ترجمہ: اسی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی تجلیاتِ جمالی مثل ذات کے ظاہر ہوئی
تجلیاتِ جلالی کی وجہ سے ابلیس لعین مردود بارگاہ ہو کر ذلیل و خوار ہو گیا۔

تشریح: یعنی نفخ روح کے بعد جب روحِ اضافی کا ظہور ہوا اور باری تعالیٰ کی تج
ذاتِ آدم بنی تو اس وقت تجلیاتِ جمالی و جلالی کا مظاہرہ بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے
کے حسن ظاہر سے سنوار کر اپنے خلیفہ ہونے کا اعزاز عطا فرمایا اور نفخ روح کے بعد

عطا فرما کر فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ تمام فرشتوں نے تعمیل حکم کی، یہ سب تجلیاتِ جمالی سے فیضیاب ہوئے لیکن شیطان نے نافرمانی کی اور حکم نہ مانا تو تجلیاتِ جلالی کا ظہور ہوا، اور شیطان مردودِ بارگاہ ہو کر ہمیشہ کے لئے ذلیل و خوار ہو گیا۔

چشم خفاشی مراورا بود کو شد غیر بیں　　از تکبر گفت خود را بہترم زو با یقیں

ترجمہ: اس کی آنکھ چمگادڑ کی سی تھی کہ وہ غیر کا دیکھنے والا ہوا اور تکبر کے ساتھ اس نے یہ بات کہی کہ میں یقیناً اس سے بہتر ہوں۔

تشریح: یعنی اللہ تعالیٰ نے جب فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں تو ابلیس بھی وہاں موجود تھا اور اپنی عبادت و ریاضت کی وجہ سے اس کو بھی بلند درجہ ملا ہوا تھا چنانچہ وہ بھی اس حکم کے تحت آ گیا، اس حکم کے بعد تمام فرشتوں نے تو فرماں برداری کے تحت آدم کو سجدہ کر لیا، لیکن ابلیس نے اس سے انکار کر دیا اور وہ اس روشن دلیل کو بھول گیا کہ قادرِ مطلق کے حکم کی تعمیل سب سے بڑی عبادت و اطاعت ہے، جس طرح چمگادڑ روزِ روشن میں دیکھنے سے محروم ہے، اسی طرح اس کی آنکھوں پر بھی پردہ پڑ گیا اور وہ حقیقت کے خلاف دیکھنے لگا، اس مَردُود نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا جو حکم کی فرماں برداری میں پوشیدہ تھی یا اس حقیقتِ روح کو نہیں سمجھا جو اس مٹی کے پتلے میں پوشیدہ تھی، اپنے اس اندھے پن کی وجہ سے وہ تکبر کر بیٹھا اور طوقِ لعنت اپنی گردن میں ڈال لیا۔

آفریدی تو مرا از نار و او را از گلے　　زیں تکبر داغ لعنت گشت او را حاصلے

ترجمہ: تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے، اس تکبر کی وجہ سے لعنت کا داغ اس کا مقدر بن گیا۔

تشریح: یعنی اس نے حقیقت کو نہیں سمجھا کہ اطاعتِ حکم میں کیا راز پوشیدہ ہے یا اس مٹی کے پتلے میں کیا حقیقت پنہاں ہے، وہ ظاہر کا دیکھنے والا ہو کر تکبر کر بیٹھا اور کہنے لگا کہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے جس کی فطرت بلندی کی طرف مائل ہے اور اس کو مٹی سے بنایا ہے

جس کی فطرت میں خاکساری انکساری ہے ،حاکم مطلق کے سامنے اس مناظرہ کی وجہ سے اسکی قسمت میں لعنت کا طوق پڑگیا اور وہ ہمیشہ ہمیش کے لئے مردودِ بارگاہ ہوگیا۔

شد عدوِّ آدم و اولادِ آدم آں لعین   ایں حکایت بر ہمہ روشن چہ گویم بیش ازیں

ترجمہ: وہ مردود آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کا دشمن ہوگیا، یہ واقعہ سب پر روشن ہے میں اس سے زیادہ کیا کہوں۔

تشریح: یعنی وہ مردود تو ہوا نافرمانی کی وجہ سے لیکن اپنی بد عقلی اور بدنصیبی کی وجہ سے دشمن ہوگیا حضرت آدم علیہ السلام کا، اس نے یہ سمجھا کہ آدم کی وجہ سے میری رسوائی ہوئی اور مردود بارگاہ ہوا، اس کے بعد اولادِ آدم سے بھی اس کی کھلم کھلا دشمنی ہے، قرآن کریم میں یہ تمام واقعات بالکل صاف صاف بیان کردیئے گئے اور متعدد مقامات پر اس کی وضاحت کردی گئی ہے۔ اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، فافہم۔

ذاتِ آدم مظہرِ حق ایں سخن را راست داں   گر بگویم بیش ازیں از شغل گردم باز ماں

ترجمہ: یہ بات سچ مان لو کہ ذاتِ آدم تجلیاتِ خداوندی کا مظہر ہے، اگر اس سے زیادہ میں بیان کروں گا تو دوسرا شغل بیان کرنے سے رہ جاؤں گا۔

تشریح: خلاصۂ کلام کے طور پر مصنفؒ فرماتے ہیں کہ بس مختصراً یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ نفخِ روح کے بعد ذاتِ آدم پروردگار کی تجلیات کا مظہر ہوگئی۔ اس لئے روح کے ذریعہ جس قدر فیضان حاصل کرلیا جائے وہ کم ہے، تصوف میں روح کے بیان کا مقصد تجلیۂ روح ہے جس کے ذریعہ نفس مغلوب ہوجائے اور صفاتِ ذات کی طرف متوجہ ہوکر سالک کو تصورِ ذات کا ہمہ وقتی استحضار ہوجائے۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ۔

*****

دربیان شغل ظاہری

شغل ظاہری کا بیان

شغل دیگر می شنو در شمس ظاہر می نگر   تا رسی در شمس وحدت لازوالی اے پسر

ترجمہ: ایک اور شغل کا طریقہ سنو کہ سورج کے ظاہری حصہ پر غور کرو۔ تاکہ اس کے ذریعہ اے سالک! ہمیشہ باقی رہنے والے وحدت کے سورج تک رسائی ہوجائے۔

تشریح: جس طرح کسی چیز کی بناوٹ سے اس کے بنانے والے کی استعداد و قدرت کا اندازہ ہوتا ہے اور جس طرح عشق مجازی کو عشق حقیقی کیلئے زینہ بنایا جاتا ہے اسی طرح یہ شغل شمسی بھی ہے کہ یہ دنیاوی سورج جو فنا ہونے والا ہے اس میں کس قدر اعلیٰ درجہ کی روشنی ہے کہ تمام عالم اس سے منور ہے تو پھر اس کا خالق کس بیمثال قدرت کاملہ سے متصف ہے بس اسی تصور کے ساتھ اس شغل کی ابتدا ہوتی ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ سالک صبح کے وقت اشراق کی نماز کے بعد ایسی جگہ پر جہاں یکسوئی حاصل ہو خواہ آبادی کی جگہ ہو یا ویرانے کی، کمرہ ہو یا مسجد، زمین ہو یا مکان کی چھت، غرض جہاں پر بھی یکسوئی حاصل ہو باوضو سورج کی طرف منہ کرکے بیٹھے اور سورج پر نظر کرے اور یہ تصور کرے کہ یہ سورج جو قدرت خداوندی کا ایک بہت ہی معمولی قسم کا مظہر ہے لیکن اس قدر روشنی والا ہے کہ تمام دنیا کو اپنی روشنی پہونچاتا ہے، تو پھر اس کا خالق کس قدر عظیم الشان اور بیمثال قدرت سے متصف ہوگا اور یہ تصور قائم کرنے کے بعد اپنی دونوں آنکھوں کو بند کرلے اور اپنے دماغ میں اس نقطہ سورج کو اس قدر وسعت دے کہ گویا تمام کائنات کو اور سالک کے تمام جسم کو اس سورج کے نور نے محیط کرلیا، اور یہ تمام نور اس ذات پاک کے جلال کا نور ہے۔

اس طرح پابندی اور یکسوئی کے ساتھ یہ شغل کرتے رہنے سے ذات پاک کی صفات جلالی سے سالک کی وابستگی ہوجاتی ہے۔

ایں جلالِ نورِ ذاتی از جلالِ کبریاست تابِ او لئے تابِ کبریں کہ فرقے بر تراست

ترجمہ: اس جلالی نور کے بارے میں یہ یقین کر کہ بزرگ و برتر اللہ کی طرف سے ہے جب اسکے دیکھنے کی طاقت نہیں تو اللہ بزرگ و برتر کے نور کی تاب کہاں کیونکہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے

تشریح: اس سورج کے نور کے بارے میں سالک کا یہ تصوّر ہونا چاہیئے کہ یہ نور اللہ تعالیٰ کے نور سے اکتسابِ فیض کر رہا ہے اور جب اس سورج کے نور کو دیکھنے کی طاقت انسان کی آنکھ میں نہیں ہے یعنی جب سورج بلند ہو جاتا ہے اور خوب چمکنے لگتا ہے تو پھر اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا طاقتِ بشری سے باہر ہے تو اس نور کی نوعیت کیا ہوگی جو ذاتِ پروردگار کا ہے، یہ سورج خود فانی اور محدود اور اس کا نور بھی فانی اور محدود ہے۔ جب اس کے نور میں یہ آب و تاب ہے تو پھر ذاتِ پاک کے نور کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا، کیونکہ سورج کے اور اس کے نور میں کوئی نسبت ہی نہیں۔

سازایں را نیک برزخ از جلالِ کبریا تا بہ بینی شمس وحدت زاں کمالِ کبریا

ترجمہ: اس نور کو جلالِ خداوندی کے نور کا بہترین برزخ تصوّر کرو۔ تاکہ تم وحدت کے اس سورج کا مشاہدہ کر لو جو قدرتِ کاملہ کا مظہر ہے۔

تشریح: یعنی اس سورج کے نور کے تصوّر تک ہی اپنے کو محدود مت رکھو، بلکہ اس نور کو تصوّراتی اعتبار سے یہ سمجھو کہ یہ تو ایک پردہ ہے اور اپنے ذہن کو یکسوئی کے ساتھ اس لامحدود نور کی طرف متوجہ کرو جو نورِ ذات ہے۔ اس طرح استقلال اور یکسوئی سے اس شغل میں مشغول ہونے سے تجلیاتِ خداوندی کا مشاہدہ شروع ہو جائے گا۔ تجلیات اور صفاتِ خداوندی کے بارے میں بتلایا جا چکا ہے کہ ذاتِ پاک کی طرح یہ بھی لامحدود اور بے مثال ہیں، یہاں تک رسائی ہو جائے اور حق الیقین کا درجہ حاصل ہو جائے تو اس کے ثمرات کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا

+++++++++++++++

در بیان شغل قمر پُر نور

نور سے لبریز چاند کے شغل کا بیان

شغل اکبر بر مہِ پُر نور بنگر ہمچنیں تا بہ بینی آں مہِ وحدت جمالی را قریں

ترجمہ: ایک بہترین شغل یہ ہے کہ اسی طرح نور سے لبریز چاند کی طرف متوجہ ہو جاؤ تاکہ اس کے ذریعہ وحدت کے چاند کے جمال کا مشاہدہ قریب سے کرو۔

تشریح: یہ شغل بھی شغل ظاہری کی طرح ہے بس فرق یہ ہے کہ اس میں مغرب ہی کے بعد مشغولیت کی جاتی ہے اور مطلع صاف ہونے پر کسی بھی دن سے شروع کر سکتے ہیں نیز شغل قمر میں اس وقت مشغولیت کرنی چاہیئے جب چاند پر شباب ہو یعنی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخ کا چاند اس کے لئے بہترین قرار دیا گیا ہے۔ سالک بعد نماز مغرب اوابین سے فارغ ہو کر باوضو کسی یکسو مقام پر چاند کی طرف بصورت مراقبہ رخ کر کے بیٹھے اور تھوڑی دیر تک چاند کو دیکھے، پھر آنکھیں بند کر لے اور یہ تصور کرے کہ چاند کا نور میرے باطن میں سرایت کر رہا ہے اور اس کے نور سے ایک قسم کی طمانینت سالک کو محسوس ہو رہی ہے، کیوں کہ یہ نور بھی اس ذات پاک کی تجلّیات کا نور ہے اور پھر اس نور کو برزخ بنا کر ذاتِ پاک کے نور تک رسائی حاصل کرے، تین دن کے بعد عشاء کی نماز پڑھ کر اس شغل میں مشغول ہونا چاہیئے۔ پھر چاند کے سامنے بیٹھنے کی کوئی شرط نہیں ہے بلکہ تصوّر ہی کافی ہے، کیوں کہ مقصود نہ چاند ہے اور نہ اس کی چاندنی۔ بلکہ یہ مجاز سے حقیقت تک رسائی کا ایک ذریعہ ہے، جب تک مجاز موجود تھا ٹھیک تھا اور جب مجاز معدوم ہو گیا تو حقیقت کی یافت ہو گئی اور اس مجاز کی ضرورت باقی نہ رہی۔

ان لوگوں میں جو چاند اور سورج کو ہی مرکزِ نور سمجھتے ہیں اور ان کی پوجا کرنے لگتے ہیں تصوّفاتی اعتبار سے یہی غلطی ہوئی ہے کہ وہ عالمِ ناسوت تک ہی محدود ہو گئے۔ لامحدودیت ذات و

صفات سے انھوں نے وابستگی نہیں کی۔

راز برتر شغل بہتر ہست ایں دو شغلہا　　　دل مجلیٰ می شود بے زحمت از ہر دیوہا

ترجمہ: یہ دونوں شغل بہت اعلیٰ بھید والے بہترین شغل ہیں، کہ ان کے ذریعہ بغیر زیادہ پریشانی کے تمام خرابیوں سے دل پاک صاف ہو جاتا ہے۔

تشریح: یعنی یہ دونوں اشغال اگرچہ بظاہر بہت مختصر ہیں لیکن حقیقت میں ان کے فوائد بے مثال ہیں، کیوں کہ سالک جب ہمہ وقت اس پروردگار کے جلال یا جمال کی طرف متوجہ رہے گا تو اس عالمِ فانی کی حقیقت اس کے سامنے آجائے گی اور اس کی وابستگی صحیح طریقہ پر ذات پاک کے جلال وجمال سے ہو جائے گی۔ دنیا کے تمام معاملات میں خلوص للّٰہیت آجائے گی، اکل حلال، صدقِ مقال، حسن اخلاق اور جس قدر بھی اللہ کے پسندیدہ بندوں کی صفات ہیں وہ اس میں پیدا ہو جائیں گی اور تمام غلط تصورات اس کے دل سے نکل جائیں گے۔ اس طرح اس کے قلب کی صفائی ہو جائے گی اور جب قلب تمام فانی اشیاء کی چاہت سے الگ ہو جاتا ہے تو پھر اس کو مقامِ فنا سے مقامِ بقا میں پہونچا دیا جاتا ہے اس طرح اس سالک کا تصفیہ قلب ہونیکے بعد اسکے مراتب بھی بلند ہو جاتے ہیں یہی ان اشغال کے ثمرات ہیں

✤✤✤✤✤✤✤✤✤✤✤✤

در بیانِ شغل مقام چہار گانہ

چار مقامات کے شغل کا بیان

شغل دیگر راز باری از مقام ہر چہار ہر یکے را شرح سازم بر حریر زر نگار

ترجمہ: معرفتِ باری تعالیٰ کے راز میں ایک شغل مقام چہار گانہ ہے، ہر ایک مقام کی شرح میں اس انداز میں کر رہا ہوں جو ریشم پر سنہرے حروف سے لکھنے کے لائق ہے۔

تشریح: یہ بات تو آپ کو معلوم ہو چکی ہے کہ تمام اذکار و اشغال اور عبادات سے مقصود رضائے خداوندی ہے جس کا لازمی نتیجہ قربتِ ذات اور معیّتِ ذات ہے، اسی کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی مسلّم ہے کہ اذکار و اشغال و عبادات میں روح اور کیفیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب معرفتِ ذات کی نسبت قائم ہو جائے، اِس معرفت کے حصول کے لئے محققین صوفیا نے جہاں بہت سے طریقے بیان فرمائے ہیں ایک طریقہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کا ہے (جس نے خود کو پہچان لیا اس نے رب کو پہچان لیا) اور اس خود شناسی کے ذریعہ خدا شناسی کے حصول کو لازم قرار دینے کا سبب قرآن پاک کی یہ آیات ہیں جن میں اپنے اندر غور و فکر کرنے کی باقاعدہ صراحت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْ اَنْفُسِہِمْ (اپنے اندر غور کیوں نہیں کرتے) دوسری جگہ ارشاد فرمایا وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (اور اس کی نشانیاں تمہارے اندر بھی ہیں پھر غور کیوں نہیں کرتے)، وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ (تم جہاں کہیں بھی ہو گے وہ تمہارے ساتھ ہے) ایک جگہ ارشاد خداوندی ہے فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ (جدھر بھی تم رُخ کرو گے اُدھر اللہ تعالیٰ کی تجلّی موجود ہو گی) اور پھر سب سے آخر میں بہت زیادہ واضح طور پر قربت کی انتہا بھی بیان فرما دی کہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ہم ان کی شہ رگ سے بھی زیادہ ان سے قریب ہیں)، اس قربت کی جستجو کے لئے اور صفت ہمہ گیری کی یافت کے لئے

محققین صوفیاء نے اپنے ذوق کے مطابق مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کی مختلف انداز میں تشریحات فرمائی ہیں، جن میں بظاہر تفاوتِ الفاظ اور طریقہ کار کا فرق ہے۔ لیکن نقطۂ نظر کی مرکزیت میں تمام تشریحات اتحادِ معنویت رکھتی ہیں، ہم نے یہ جملہ معترضہ اس لئے بیان کر دیا کہ مصنّف رحمۃ اللہ علیہ نے اس شغل کو بھی حسبِ سابق بہت ہی جامعیت کے ساتھ والہانہ انداز میں بیان کیا ہے، جس کی تشریح کیلئے مستقل ایک کتاب کی ضرورت علیحدہ سے ہے، اور ہم حسبِ عادت اختصار و تسہیل کے ساتھ اس شغل کی ہیئت کو بیان کریں گے، یہ سب سیدی و مرشدی کا فیضانِ نظر ہے۔ ہماری اس کوشش میں بعض باتیں مصنّف کی بیان کردہ باتوں سے الگ محسوس ہوں گی لیکن یہ فرق صرف اندازِ بیان کی ترتیب کا ہوگا، مقصد سے انحراف تو جسارتِ بیجا کے مرادف ہے، اس لئے اس کی جرأت بھی نہیں کی گئی جس کا اندازہ خود آپ حضرات کو مطالعہ سے ہو جائے گا۔ رہا معاملہ اختلافِ طریقہ کا، تو چونکہ تمام اشغال کا تعلق مشاہدہ سے ہے اس لئے سالکینِ راہ طریقت نے اپنے اپنے مشاہدہ اور حصولِ فوائد کے مطابق ان اشغال کی ترتیب لکھی ہے، یہ امور قطعی اور منصوص نہیں ہیں جن کی تعبیر اور ادائیگی میں سرِ مو انحراف نہیں کیا جا سکتا، البتہ ان چیزوں کی اجازت صرف مجتہدین فی الطریقہ کو ہے۔

زیرِ نظر کتاب کا یہ شغل سب سے زیادہ طویل، جامع، مکمل اور دیر طلب شغل ہے، فوائد کے اعتبار سے بھی اس کا درجہ بہت ارفع و اعلیٰ ہے، اسی لئے مصنّف رحمۃ اللہ علیہ تحدیثِ نعمت کے طور پر فرماتے ہیں کہ معرفتِ باری کے راز کے سلسلے میں یہ شغل اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاص کا انعام ہے اور فوائد کے بکثرت حصول کی وجہ سے یہ شغل ریشم پر سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس شغل سے فیضیابی کی سعادت عطا فرمائے۔ آمین

اس شغل میں مصنّف نے جسمِ انسانی کو چار حصّوں میں تقسیم کیا ہے، بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ چار لطائف پر منقسم کیا ہے، پہلا مقام لطیفۂ نفس ہے جس کا مرکزی مقام مقعدہ یعنی ناف اور ناف کے نیچے کا حصّہ ہے، دوسرا مقام لطیفۂ روح کا ہے جس کا مرکز معدہ یعنے جگر ہے،

تیسرا مقام لطیفہ سِر ہے جس کا مرکز دماغ انسانی ہے ، اور چوتھا مقام لطیفہ قلب کا ہے جس کا مرکز مضغۂ قلب ہے ۔ ان چار مقامات کی تخصیص کا سبب تو یہ ہے کہ ان مقامات کو تخلیقِ انسانی کے اعتبار سے بنیادی اہمیت حاصل ہے ، علم طب کے اعتبار سے انسانی پیدائش کی حقیقت یہ ہے کہ جب شکم مادر میں استقرار کی صورت پیش آتی ہے تو مادّہ کا ذرّہ بے مقدار تین دن کے بعد حباب کی صورت اختیار کرتا ہے اور یہ نقطہ دل کا مقام بن جاتا ہے ، چار دن کے بعد ایک اور نقطہ نمودار ہوتا ہے جو دماغ کا مقام ہوتا ہے ، چھٹے روز تیسرا نقطہ نمایاں ہوتا ہے وہ جگر کا مقام بنتا ہے ، ساتویں روز چوتھا نقطہ ناف کی جگہ پر بنتا ہے ، اس طرح گویا چار نقطے بنتے ہیں ۔ نوّے ۹۰ دن کے بعد روحِ حیوانی پیدا ہوتی ہے جس کا مقام قلب ہے اور چھیانوے ۹۶ دن کے بعد دل سے بخارات کی صورت میں جگر کی طرف روح کی رجعت ہوتی ہے ، جگر میں اس روح کا نام روحِ طبعی ہے اور سَو دن کے بعد دماغ کی جانب سرایت کر جاتی ہے جس کو روحِ نفسانی کہا جاتا ہے جب روح کا گذر دماغ میں ہوتا ہے تو حرارت پہونچنے کے بعد شکم مادر میں پرورش پانے والا بچہ حرکت کرنے لگتا ہے ۔

اس مختصر تمہید سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ ان مقامات کی تخصیص جسم انسانی میں اس لئے کی گئی کہ ظاہری اعتبار سے بھی انسان کے جسم میں یہ مقامات اہم ہیں ، اس لئے ان میں سے ہر ایک مقام پر ذکر و فکر کے ذریعہ روح کو تقویت پہونچا کر صفاتِ باری سے فیضان کے ذریعہ کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا ہے اور نفس و شیطان کے اثرات سے بچانا ہے ۔ نیز لطائف ستّہ میں سے چار لطائف ان مقامات کے ساتھ بھی متعلق ہیں ۔ اور عناصر اربعہ سے بھی انکو متعلق رکھا گیا ہے ۔

ان لطائف کی اصلاح بھی راہِ طریقت میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے ، نیز بندے کو اپنی حقیقت سمجھنے میں بھی اس سے مدد ملتی ہے کہ وہ ابتدا میں کس قدر ذرّہ بے مقدار تھا اور خلّاقِ عالم نے اپنی رحمت سے ظاہری اور باطنی اعتبار سے اس کو کس قدر رفعت عطا فرمائی اپنی خلافت عطا فرمانے کے بعد اشرف المخلوقات کا شرف بھی صرف اسی کو بخشا ، اب اس بندہ کے لئے یہ امر کس قدر ضروری ہے کہ وہ اپنے رب کی بارگاہِ عالی میں اپنی عبدیت کا قولی ،

عملی ثبوت پیش کر کے اس کی خوشنودی حاصل کرے۔

می شنو اوّل مقامِ مقعدہ ناسوت نام مسکن نار است عزرائیل بیند ایں مقام

ترجمہ: غور سے سنو کہ پہلا مقام، مقامِ مقعدہ ہے جس کا نام ناسوت بھی ہے، یہ آگ کا مسکن ہے اور عزرائیل علیہ السلام اس مقام کے نگراں ہیں۔

تشریح: یہاں سے مصنف اس شغل کی تشریح کرتے ہوئے اس کا طریقہ بیان کر رہے ہیں، اس سلسلہ میں جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ مرشدی وسیدی صوفی الحاج احمد حسن شاہ صاحب دامت فیوضہم نے اس شغل کی ترکیب بہت ہی جامعیت اور اختصار کے ساتھ آسان انداز میں فرمادی جس سے سالکِ راہِ طریقت کو ان شاء اللہ تعالیٰ شرح صدر ہوگا اور منزل کی جانب پیش رفت میں بھی کوئی خلجان نہ رہے گا۔ اس لئے ضروری خیال کرتے ہوئے شعر کی تشریح سے پہلے وہ نقشہ بیان کردیں تاکہ بیک نظر سالک کے لئے اس پر عمل کرنا آسان ہوجائے۔

اس شغل میں چار مقامات ہیں اور ان چار مقامات کا تعلق چار عالم سے کیا گیا ہے، مثلاً مقامِ مقعدہ کا تعلق عالمِ ناسوت سے ہے، مقامِ معدہ کا تعلق عالمِ ملکوت سے ہے، مقامِ سِر کا تعلق عالمِ جبروت سے ہے اور مقامِ قلب کا تعلق عالمِ لاہوت سے ہے۔ تعلق کا مطلب یہ ہے کہ جب سالک اس شغل کو اختیار کرے گا تو سب سے پہلے عالمِ ناسوت کی حقیقت اس پر آشکارا ہونی چاہیئے کہ وہ فانی ہے اور دارالعمل ہے، اس لئے شریعتِ مطہرہ پر عمل کرنے سے اور مراقبہ کی صورت میں تنہائی میں ذکرِ لسانی کرنے سے توحیدِ اقوالی اس کے مضغۂ قلب میں راسخ ہوجائے گی اور آگ کی طرح ہر اچھے عمل کو جلا کر خاک کردینے والا نفس امّارہ مغلوب ہوجائے گا اور اس کو قلبی لگاؤ عبادت سے ہوجائے گا، صفاتِ خداوندی میں غور و فکر کی طرف توجہ ہوگی اور روح کی دہلیز یعنی سالک کے ظاہری و باطنی آلاتِ سماعت (کان اور دوسروں کی زبان سے بھی ذکرِ خداوندی سن کر لذت اندوز ہونے لگیں گے، لطائف کے انوار بھی اس کو محسوس ہونے لگیں گے، مقامِ اوّل کا یہ شغل ایک سال تک کرنا ہوگا، اس کے بعد دوسرے

مقام کا شغل بھی ایک سال کا ہے ۔ اسی طرح تیسرے اور چوتھے مقام کے شغل بھی ایک ایک برس کے ہیں، گویا چار برس میں یہ شغل مکمل ہوتا ہے، یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہر سال کے شغل میں بارہ مہینوں کے اعتبار سے بارہ چیزوں کا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ گویا یہ شغل کی بنیاد ہیں جن کو درج ذیل نقشہ میں ملاحظہ فرمائیں ۔

(۱)	حصۂ جسم	مقام مقعدہ
(۲)	متعلق بہ	عالم ناسوت
(۳)	عمل	شریعت
(۴)	ذکر	ذکرِ لسانی
(۵)	حصول	توحیدِ قولی
(۶)	شغل	مراقبہ
(۷)	مرکز	لطیفۂ نفس
(۸)	خواص	نار
(۹)	طریق	عزرائیل
(۱۰)	مغلوبیت	نفس امّارہ
(۱۱)	رنگ لطیفہ	زرد
(۱۲)	دہلیز روح	دونوں کان

اب اس نقشہ کے مطابق شغل کی ترتیب اس طرح ہو گی کہ سالک کسی پر سکون اور تنہائی کے مقام پر با وضو قبلہ رخ بیٹھ کر اللّٰہُ حاضِری اللّٰہُ ناظِری اللّٰہُ مَعِیْ کا زبان سے اظہار اور قلب سے اقرار کرے ۔ اس کے بعد یہ خیال کرے کہ یہ عالمِ ناسوت فانی ہے اور میری زندگانی بھی چند روزہ ہے اس لئے شریعت مطہرہ کے اعمال سے اپنی حیات دنیوی کو مکمل طور پر آراستہ کرے ، کوئی کام خلافِ شریعت نہ کرے ، پھر اس تنہائی میں مضغۂ قلب کو مرکز

بناکر ذکرِ لسانی کرے ۔ یہ ذکر خواہ جہری ہو یا سری ہو، لیکن ابتدا میں محققین صوفیار نے ذکرِ لسانی کے لئے فرمایا ہے، اور جب ذکر کرنے لگے تو لَا اِلٰہَ کو ناف سے اٹھائے، جو لطیفۂ نفس کا مقام ہے اور اس کے ذریعہ تمام دنیاوی علائق اور رشتوں کی نفی کرے، نفی کا مطلب یہ نہیں کہ ان رشتوں سے قطع تعلق کرلے، کیونکہ یہ تو رہبانیت ہوجائے گی جس کی اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں، بلکہ نفی کا مقصد یہ ہے کہ ان تمام چیزوں سے تعلق عارضی ہے۔ اس تعلق کے ختم ہوجانے کو صوفیار خواص نار سے تعبیر کرتے ہیں جس طرح آگ میل کچیل کو جلاکر ختم کردیتی ہے، اسی طرح ذکرِ نفی بھی ان علائق کو ختم کردیتا ہے اور اِلَّا اللّٰہُ کو مضغۂ قلب پر ضرب کرے اور حضرت عزرائیل علیہ السلام کے طریق کو اختیار کرے کہ جو کچھ ہے اللہ ہے اور اس کا حکم ہے، خدا کے سامنے کتنی بھی بڑی اور پیاری شئے ہو لائق التفات نہیں۔ جس طرح عزرائیل علیہ السلام کو کسی نوجوان اکلوتے صاحبِ جمال و کمال و مال کی روح قبض کرنے کا حکم دربارِ خداوندی سے ہوتا ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں اسی طرح سالک کے لئے ضروری ہے کہ حکمِ خداوندی کے سامنے کسی بھی صورت میں تاویل یا تاخیر کا معاملہ بالکل نہ کرے، جب یہ صورت سالک اختیار کرے گا تو پھر اس کا نفس امّارہ مغلوب ہوجائے گا اور اس کو لطائف کی کیفیات کا حصول ہونا شروع ہوجائے گا، جس کی ابتدا ہر لطیفہ کے رنگ کے مشاہدہ سے ہوتی ہے، ان تمام قواعد کو پابندی اور یکسوئی کے ساتھ مرشدِ کامل کی اجازت سے جب سالک ترتیب وار ادا کرتا رہے گا تو پھر اس کو عجائب و غرائب کا مشاہدہ ہونے لگے گا، اس کی روح کا رابطہ اشیائے کائنات میں کانوں کے ذریعہ ایسی آوازوں سے ہوجائے گا جو ذکرِ الٰہی کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوں گی یعنی تمام اشیار کی خواہ جاندار ہوں یا بے جان ہوں، تسبیحات اور ذکر کی آوازیں اس کے کانوں میں آکر تقویت روح کا باعث بنتی رہیں گی۔ اسی لئے صوفیار محققین فرماتے ہیں کہ عالمِ ناسوت میں روح کی دہلیز کانوں کو قرار دیا گیا ہے، کیونکہ مراقبہ میں آنکھیں تو بند رہتی ہیں اور زبان ذکرِ نفی و اثبات میں مشغول رہتی ہے، صرف کان باقی

پہنچتے ہیں، بس یہی اس عالمِ ناسوت میں رابطۂ روح کا کام انجام دیتے ہیں، اس تفصیل کے بعد اس شغل کی ترکیب بہت آسان اور ترتیب وار ہوگئی۔ ھٰذَا فَیضَانُ المُرشِد

اب شعر کے مفہوم کی طرف توجہ فرمائیے کہ مقامِ چہارگانہ میں سب سے پہلا مقام، مقام مقعدہ ہے جس کو لطیفۂ نفس سے بھی تعبیر کرتے ہیں، اس کے ذریعہ جسمِ انسانی میں ناف اور اس سے نیچے کے حصے کی طرف اشارہ ہوتا ہے، اس کا تعلق عالمِ ناسوت سے ہے، یعنی نفس امارہ اس دنیا کی عارضی آرائش و دل کشی کی طرف متوجہ کر کے سالک کے نیک اعمال کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جس طرح آگ جلا ڈالتی ہے، اور عزرائیل اس مقام کا نگراں ہے، اس مقام کو حضرت عزرائیل کے ساتھ منسوب کرتے ہیں، یعنی اس مقام پر عبور حاصل کرنے کیلئے طریق عزرائیل کو اختیار کر کے سالک معرفت کی راہ میں مضبوطی کے ساتھ قدم جما سکتا ہے

آفتابِ اندرونش نیز ناظر ہر زماں نارِ سوزاں گشت از وشد پختگی تن از آں

ترجمہ: اس کے اندر ایک آفتاب ہے جو ہر وقت اس کا نگراں ہے، جلانے والی آگ بھی اسی سے ہے جس کے ذریعہ اجسام میں پختگی آتی ہے۔

تشریح: جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اس مقام کا تعلق عالمِ ناسوت سے ہے، جو فانی ہونے کے ساتھ ساتھ دار العمل اور دار الاسباب بھی ہے، اس لئے اسباب کے درجہ میں مقام مقعدہ یعنی لطیفۂ نفس کی یہ متضاد خاصیت بھی ہے کہ اس میں تجلیاتِ جلالی کا پرتو آفتاب کی صورت میں موجود ہے جس سے ایک جانب جلانے والی آگ کا انتساب ہے تو دوسری طرف ناپختہ اجسام کی پختگی کا سامان بھی فراہم ہوتا ہے، یعنی سالک شریعت کے احکام پر عمل کر کے اور گناہوں کی عارضی لذتوں سے اپنے دامن کو بچاتے ہوئے اس امتحان کی بھٹی میں صحیح سالم گذر گیا تو پھر اس کے ایمان کی پختگی کا بھی اسی سے آغاز ہوتا ہے۔

زندگی مُلکِ کبریٰ ملکِ صغریٰ راسدااں از طفیلِ مہر و مہ گفتند اکثر سالکاں

ترجمہ: یہ بات بالکل درست ہے کہ عالمِ کبیر اور عالمِ صغیر کی زندگی کیلئے سورج اور چاند

ایک سبب ہیں، اکثر سالکین حضرات نے ایسا ہی فرمایا ہے۔

تشریح: یعنی اس دارالاسباب میں جس طرح نظامِ کائنات چاند اور سورج کی گردش، اور سورج کی گرمی، چاند کی ٹھنڈک سے تواتر اور ترتیب کے ساتھ چل رہا ہے اور شمس و قمر اصطلاح تصوّف میں تجلّیاتِ جلالی اور تجلّیاتِ جمالی کی علامت ہیں، اسی طرح عالمِ صغیر یعنی جسمِ انسانی میں بھی ان دونوں طرح کی تجلّیات کارفرما ہیں، اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفات سے انسان متصف ہے، اس میں جلال بھی ہے اور جمال بھی ہے۔

از یکے آتش زدیگر آب ہر دو سودمند　　بے یکے زیں ہر دو کے ممکن حیاتے ہوشمند

ترجمہ: ایک کے ذریعہ آگ کا حصول ہے دوسرے سے پانی کا، اور دونوں ہی مفید ہیں، اور اے سالک ان دونوں کے بغیر حیات کس طرح باقی رہ سکتی ہے۔

تشریح: جس طرح حیاتِ ظاہری کے لئے گرمی اور سردی دونوں ضروری ہیں، اسی طرح حیاتِ باطنی کیلئے جلالی و جمالی تجلّیات کا وجود ضروری ہے۔ بلکہ جلال اور جمال کا توازن باقی رہتا ہے تو حیاتِ ظاہری اور باطنی کا نظام قاعدہ کے مطابق چلتا ہے، ورنہ عام مشاہدہ ہے کہ اگر حیات ظاہری میں یا حیاتِ معنوی میں صرف جلال ہی جلال اور گرمی ہی گرمی ہوجائے تو تمام توازن درہم برہم ہو جاتا ہے، اسلئے ان دونوں کا وجود ہر صورت میں مفید ہے اور حیات بخش ہے۔

تا بود آں نار در وے زندگانی را بقا　　می نگر آں آتشی را چوں چراغِ پُر ضیاء

ترجمہ: جب تک وہ آگ اس میں موجود ہے تو زندگانی کی بقا بھی ہے، اس آگ کو تو ایک روشن چراغ کی طرح اپنے اندر تصوّر کر۔

تشریح: جس طرح کائنات کا نظام اس وقت تک برقرار ہے جب تک سورج کی گرمی توازن کے ساتھ موجود ہے، اسی طرح جسمِ انسانی میں اسباب کے تحت جب تک حرارت موجود ہے اس کا نظامِ جسمانی بھی برقرار ہے، محققین صوفیاء یہ فرماتے ہیں کہ یہ حرارت تو جسمِ ظاہری کے بقاء کا سبب ہے، باطنی نظام کا تعلق بھی اس حرارت سے اس انداز سے ہے کہ جب تک

سالک کے اندر یہ احساس بیدار رہے گا کہ ایمان کا چراغ اس کے باطن میں نور پھیلا رہا ہے تو گویا قلب سالک زندہ اور بیدار ہے اور جب یہ احساس ختم ہو جائے گا تو پھر یہ چلتا پھرتا ایک ایسا ڈھانچہ ہے جو مُردوں سے بھی بدتر ہے۔

ہر کہ بیند آں چراغِ پُر ضیا ہر دم قریں ۔۔۔ زندگانی دیر یابد، غیب داند بالیقیں

ترجمہ: جو کوئی اس روشن چراغ کو ہر وقت اپنے قریب محسوس کریگا، ہمیشہ قائم رہنے والی زندگی اسکو حاصل ہوگی اور پوشیدہ رازوں سے بھی اس کو آگاہی ہوگی۔

تشریح: یعنی جب سالک کے قلب و دماغ میں یہ بات پوری طرح اتر جائے گی کہ اصل زندگی ایمان و یقین کی روشنی کا نام ہے تو وہ اپنے قلب و روح میں ایمان و یقین کی شمع روشن کرنے کی فکر میں لگ جائے گا، اور جب کسی کو یہ دولت نصیب ہو جائے تو پھر اس کی حیات دراز ہی نہیں بلکہ ابدیت سے سرشار ہو جاتی ہے اور صفاتِ باری تعالیٰ کے وہ راز جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں اس کی نظروں کے سامنے عیاں ہو جاتے ہیں۔ یعنی جب سالک کو اس بات کا یقین کامل ہو جائے کہ اطاعتِ خداوندی کے یہ فوائد ہیں تو عملی طور پر وہ اپنے کو اس سانچے میں ڈھال لے گا تو پھر دنیا میں اس کا ذکرِ خیر باقی رہے گا اور آخرت میں بھی لامحدود حیات سے ہمکنار ہو کر عیش و آرام سے رہے گا، یہی وہ راز ہے جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہے، اگر وہ اس بات پر مکمل طور پر یقین کرلیں کہ احکام خداوندی کی بجا آوری میں کیا کیا فوائد ہیں، تو ان کی آنکھوں سے بھی حجاب دور ہو جائے اور رازہائے معرفت کا حصول ہو جائے۔

آشنائی با ملائک می شود زیں شغل داں ۔۔۔ خلقِ عالم نیز گردد پیرو انش ہر زماں

ترجمہ: اس شغل میں مشغول ہونے سے فرشتوں کے ساتھ جان پہچان ہو جاتی ہے اور کائنات کی مخلوق بھی ہمہ وقت اس کی تابعدار رہتی ہے۔

تشریح: یعنی جب کوئی سالک اس شغل مقام چہارگانہ میں مشغول ہو جاتا ہے اور پہلی منزل یعنی عالَم ناسوت پر اس کو عبور ہو جاتا ہے تو اس درجہ سے ترقی دے کر عالَم ملکوت کے

مشاہدے کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ عالمِ ناسوت پر عبور حاصل ہونے یا اس عالمِ ناسوت سے گذر جانے کی پہچان یہ ہے کہ وہ اخلاقِ غیر محمودہ سے بالکل تائب ہو جاتا ہے، گناہوں سے اس کو قلبی نفرت ہو جاتی ہے، ہمہ وقت رضائے الٰہی کی جستجو اور تمنا کی وجہ سے اور اعمالِ صالحہ کو بطریقِ سنّت ادا کرنے کے سبب اس کی روح میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے عالمِ لطیف کا پہلا دروازہ یعنی عالمِ ملکوت اس کے لئے کھول دیا جاتا ہے۔ اب سالک کے عادات واطوار میں فرشتوں جیسی پاکیزگی نمایاں ہونے لگتی ہے اور رجال الغیب سے اس کی ملاقاتیں بھی ہونے لگتی ہیں اور جب سالک رضائے الٰہی کے اس مقام پر فائز ہو جاتا ہے تو بحکم خداوندِ قدوس تمام مخلوقاتِ عالم بھی اس کے حکم کے تابع بن جاتے ہیں، اس قسم کے شواہد بزرگانِ دین کے حالات میں بکثرت موجود ہیں۔

فرشتوں سے آشنائی کا مطلب یہ نہیں کہ فرشتے اس کے پاس آنے لگیں یا وہ فرشتوں کے ساتھ بات چیت کرنے لگے، کیونکہ راہِ معرفت میں نہ تو یہ مقصود ہے اور نہ انسان کے لئے یہ فخر کی بات ہے اس لئے کہ انسان تو اشرف المخلوقات ہے اور خلافتِ الٰہی کا تاج اس کے سر پر رکھا ہوا ہے، بلکہ جب یہ انسان اپنے آپ کو پہچان لے، اور پہچان کر رضائے الٰہی کے سانچے میں خود کو ڈھال لے تب اس کا مقام اس قدر بلند ہو جاتا ہے کہ ملائک بھی اس پر رشک کریں

گوش در ناسوت آمد بارگاہِ روح داں   وقت بازش بشنود آوازِ باری اندراں

ترجمہ: یہ بھی جان لو کہ کان عالمِ ناسوت میں روح کی بارگاہ ہیں، ان کو کھلا رکھنے کے وقت وہ پروردگار کی صفاتی آواز سنتا ہے۔

تشریح: یعنی عالمِ ناسوت میں سالک چونکہ مراقبہ کرتا ہے اور مراقبہ میں آنکھیں بند رکھی جاتی ہیں، زبان کے ذریعہ ذکر کیا جاتا ہے، خواہ یہ ذکر جہری ہو یا سرّی، اب قلب تک پیغام پہنچانے کے لئے صرف کان باقی رہ جاتے ہیں، اس لئے عالمِ ناسوت میں کانوں کو روح کی بارگاہ قرار دیا گیا ہے، دورانِ مراقبہ سالک جس وقت اپنی تمام تر توجہ کو سمیٹ کر ذاتِ وحدہٗ لاشریک کی

طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کے کانوں میں ایسی آوازیں آتی ہیں جو ملأ اعلیٰ سے متعلق ہیں یعنی عالم ملکوت سے کانوں کے ذریعہ اس کا تعلق قائم ہو جاتا ہے اور وہ ایسے احکام جو خداوند قدوس کی طرف سے عالم ناسوت یعنی اہل دنیا کے لئے صادر ہوتے ہیں، نزول عالم سے پہلے ہی سن لیتا ہے، ظاہر بات ہے کہ یہ بھی کشف کا ایک جزو ہے اور صفت کشف بزرگان صوفیاء میں پائی جاتی ہے۔

ذکر باری بشنود بر ہر زبان اہل جاں　　　ایں تفکر فرض آمد برا کابر راست داں

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا ذکر وہ ہر ذی روح کی زبان سے سنتا ہے اور اس انداز سے غور فکر کرنا تمام سالکین کے لئے ضروری ہے۔

تشریح: یعنی دنیا کی تمام مخلوق، اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید (یا) کی وحمد وثنا) بیان کرتی ہے، یہ بات الگ ہے کہ ہم اس تسبیح کو نہ سن پاتے ہیں اور نہ سمجھ پاتے ہیں، لیکن جن حضرات کی بارگاہ خداوندی میں رسائی ہو جاتی ہے وہ تمام تسبیحات کو بحکم خداوندی سنتے ہیں اور سمجھتے بھی ہیں، اس لئے مصنف فرماتے ہیں کہ سالک کو اس قدر قلب کی صفائی کرنی چاہیئے کہ آئینہ کی طرح اسکا قلب صاف شفاف ہو کر اس قسم کی صلاحیت کا حامل ہو جائے۔

روح را دہلیز دو گوش است دانی اے پسر　　　استماع ذکر بروے فرض آمد سر بسر

ترجمہ: اے سالک! جسم انسانی میں روح کی دہلیز دونوں کان ہیں، اس لئے ذکر کا سننا اس کے لئے نہایت ضروری ہے۔

تشریح: یہ بات تو ظاہر ہے کہ سب سے عمدہ عمل پروردگار کا ذکر کرنا ہے، اسی طرح اس کا ذکر سننا بھی سب سے عمدہ اور پاکیزہ عمل ہے۔ محققین صوفیاء نے سالک کی توجہ تمام طرف سے ہٹا کر ذکر کی طرف اس انداز میں مبذول کرانی چاہی ہے کہ گویا سالک کا اوڑھنا بچھونا ذکر ہو جائے، اسی لئے اس اوّل مرحلہ میں کانوں کو روح کی دہلیز کا درجہ عطا کر کے اس سمت توجہ دلائی ہے کہ کائنات کی تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید بیان کرتی ہیں۔ تم بھی زبان سے اس کی تسبیح بیان کرو اور کانوں سے صرف اسی کی تسبیح وتحمید کی آوازوں کو سنو، کیونکہ:

نیست چیزی در خلائق کان بود بے ذکرِ دوست   می شنو ایں ذکرِ باری بر زبانِ خلق اوست

ترجمہ: مخلوقات میں کوئی بھی شئے ایسی نہیں جو اس کے ذکر سے خالی ہو، اللہ تعالیٰ کے اس ذکر کو اس کی مخلوق کی زبان سے سنو۔

تشریح: قرآنِ پاک میں اس بات کی صراحت فرمادی گئی ہے کہ کائنات کی ہر ایک شئے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور پاکی بیان کرتی ہے۔ اس لیے سالک کو چاہیئے کہ اپنی زبان کو تو ذکر میں ہمیشہ مصروف رکھے، اس کے ساتھ ساتھ اپنے کانوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر کو سننے کے لیے وقف کر دے، گویا اپنی تمام امکانی صلاحیت کو محبوبِ حقیقی کے ذکر کیلئے لگا دینا ضروری ہے۔

ایں مقامے را دو در کرد است پیدا حق ازاں   تا تسامع بیش گردد از مقالت ہر زماں

ترجمہ: اس مقام کے دو دروازے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں تاکہ سننے کا سلسلہ کہنے کے مقابلہ میں زیادہ ہو جائے۔

تشریح: یہ تو ضروری ہے کہ سالک اپنی زبان کو ذکر میں مصروف رکھے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ دیگر مخلوقات کے ذکر کی طرف بھی اپنی قوتِ سماعت کو لگائے رکھے تاکہ اس سننے کی وجہ سے اس کو مزید ذوق شوق ہو، اور یہ احساس بیدار ہو کہ جب یہ تمام موجودات ذات وحدہٗ لاشریک کی تسبیح و تحمید میں ہمہ تن و ہمہ وقت مصروف ہیں تو پھر مجھے ان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ عبادت خداوندی میں مصروف ہونا چاہیئے، اسی ذوق و شوق کی زیادتی کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے سننے کا انتظام دوہرا فرمایا ہے کہ دو کان دیئے ہیں جبکہ ایک ہی کان سے سننے کی ضرورت پوری ہو سکتی تھی۔

ثانیاً بشنو مقامِ معدہ را ملکوت نام   مسکنِ ریح است اسرافیل بنید انیمقام

ترجمہ: دوسرے مقام کے بارے میں سنو وہ مقام معدہ ہے اس کا نام ملکوت ہے، یہ ہوا کا مسکن ہے اور اسرافیل اس مقام کے نگراں ہیں۔

تشریح: شغل مقام چہارگانہ میں مقام اوّل کی تشریح کے بعد دوسرے مقام کی تشریح فرماتے

ہوئے مصنف فرماتے ہیں کہ اس شغل کا دوسرا مقام، مقام معدہ ہے، جو دراصل جگر ہے۔ اس کا تعلق عالمِ ملکوت سے ہے اور یہ مسکن ہے بخارات کا۔ اس مقام کے لطیفہ کا رنگ سبز ہے۔ اس شغل کا یہ دوسرا مقام جگر ہے جس میں روحِ طبعی رہتی ہے اور یہ مقام جسمِ انسانی میں خون کا مبدا ہے، اسی مقام کے ذریعہ جسم کے ہر عضو کو سامانِ زندگی فراہم ہوتا ہے جس طرح حضرت اسرافیل ع قیامت کے دن صور پھونک کر تمام مُردوں کو بحکم خداوندی قبروں سے اٹھائیں گے، اسی طرح خون کے ذریعہ روحِ طبعی ہر ایک عضو میں سرایت کرتی ہے۔ یہاں پر ریح سے مراد ہوائے مطلق نہیں ہے بلکہ وہ بخارات ہیں جو اعضائے جسمانی کو فعّال اور متحرک رکھتے ہیں۔ اس مقام کے شغل میں بھی اگر بارہ امور کو پیشِ نظر رکھا جا سکے تو اس پر عمل کرنا بہت آسان ہو جائے۔ پہلے مقام سے اس مقام میں تدریجی ترقی بھی ہے جس کو آپ نقشۂ ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

(۱)	حصۂ جسم	مقام معدہ (جگر)
(۲)	متعلق	بہ عالمِ ملکوت
(۳)	عمل	برطریقت
(۴)	ذکر	ذکرِ قلبی
(۵)	حصول	توحیدِ افعالی
(۶)	شغل	مکاشفہ
(۷)	مرکز	لطیفۂ روح
(۸)	خواص	ہوا
(۹)	طریق	اسرافیل
(۱۰)	معیت	نفسِ لوّامہ
(۱۱)	لطیفہ کا رنگ	سبز رنگ
(۱۲)	دہلیز روح	ناک کے دونوں سوراخ

ان تمام چیزوں پر عمل کرنے کا طریقہ وہی ہے جو مقام اوّل میں گذر چکا ہے، البتہ یہاں پر اس روح کو تربیت دی جائے گی جو روحِ طبعی ہے اور حبسِ دم کے ساتھ ذکرِ قلبی کیا جائے گا۔ کسی تنہا مقام پر آنکھیں کھول کر ذکرِ قلبی شروع کیا جائے گا، اس ذکرِ قلبی کے اثرات سے توحیدِ افعالی کا حصول ہوگا یعنی ہر کام کی نسبت کا تعلق یقین کامل کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مربوط ہوگا، اور قلب کی صفت قلبِ منیب ہو جائے گی جو ہر ایک شے میں اِنابت الی اللہ کو مدِنظر رکھتا ہے، اس طرح عمل پیرا ہونے سے مکاشفہ کا سلسلہ شروع ہو جائے گا، لیکن سالک کو اس طرف توجہ نہیں کرنی چاہیئے، بلکہ وہ طریق اختیار کرے جو حضرت اسرافیل علیہ السلام کا ہے کہ وہ اپنے صُور کے ذریعہ بحکمِ خداوندی تمام مخلوقات کو دوبارہ زندگی عطا کریں گے، اس طرح سالک ذکرِ قلبی کی روحانیت سے تمام جسم میں روح کا غلبہ کردے، جب روح کا غلبہ ہوگا تو نفسِ امّارہ خود بخود ختم ہو جائے گا، بلکہ نفس کی خاصیت نفسِ لوّامہ کی سی ہو جائے گی جو انسان کو غلط کام کرنے پر لعنت ملامت کرتا ہے اور اس کے بعد جب اس مقام پر سالک کو عبور حاصل ہو جائے گا تو اس مقام سے متعلق لطیفہ کے سبز رنگ کا مشاہدہ ہونا شروع ہو جائے گا، اس مقام کی دہلیز محققین صوفیاء نے ناک کے دونوں سوراخ کو مقرر کیا ہے۔

تا دراں آں ریح باشد روح باشد لے پسر　　　　می نگر آں ریح راچوں رنگِ سبزے سر بسر

ترجمہ: جب تک وہ حرارت اس میں رہتی ہے تو اے سالک روح بھی رہتی ہے، اس ہَوا (حرارت) کو سبز رنگ کے ساتھ متصف دیکھو۔

تشریح: چوں کہ یہ مقام مسکن ہے ہَوا کا، اور ہَوا سے مراد وہ حرارت اور بخارات ہیں جو خون کو قلب کی طرف سپلائی کرتے ہیں، اس لئے جسمِ انسانی میں جب تک یہ حرارت موجود ہے روحِ طبعی بھی موجود رہے گی اور جب یہ حرارت ختم ہو جائے گی تو روحِ طبعی بھی ختم ہو جائے گی، نیز حضرت مصنّف رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ اس شغل کے درمیان کیفیات کے حصول میں اس لطیفہ کا رنگ سبز دکھائی دیتا ہے۔

ہر کہ بیند آں دمے در دیدہ و دل مستدام　　　طول گردد زندگی با وصل گردد شاد کام

ترجمہ: جو بھی اس سانس کو دل کی گہرائی میں مستقل محفوظ رکھے گا، تو اس کی زندگی طویل ہوگی اور مقصد میں کامیابی سے سرفراز ہوگا۔

تشریح: اب یہاں پر روحِ طبعی کا نتیجہ بتلا رہے ہیں کہ اس روحِ طبعی کے نتیجہ میں جو حرارت پیدا ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ مبدأ خون میں حیات و تحریک قائم رہتی ہے اور اس تحریک کے ذریعہ تمام جسم کو دل کی وساطت سے خون سپلائی ہوتا ہے، تو اس تمام عمل میں اس ہوا کو جو ناک کے ذریعہ پھیپھڑوں تک پہونچتی ہے اپنے اندر روک لیا جائے، یعنی حبس دم کر کے اس مقام کے شغل میں مشغول ہونے سے سالک کی عمرِ طبعی طویل ہو جاتی ہے اور اسباب کے اعتبار سے اس کی صحت بھی عمدہ رہتی ہے جس کے سبب وہ اپنے مقاصد میں کامیاب رہتا ہے۔

غیب عالم کشف گردد از لدنی علمہا　　　نفسِ بد بر عکس باشد روح ماند در بہا

ترجمہ: علمِ لدنی کے ذریعہ عالَمِ ملکوت کے پوشیدہ راز اس کو معلوم ہو جاتے ہیں اور نفسِ امارہ مغلوب ہو جاتا ہے اور روح کے اثرات قوی ہو جاتے ہیں۔

تشریح: یعنی جب سالک حبس دم کے ساتھ اس شغل میں مشغول ہو جاتا ہے تو پھر رفتہ رفتہ عالَمِ ملکوت کے راز اس پر عیاں ہونے لگتے ہیں، اور یہ انعام صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور اس علم کے ذریعہ ہوتا ہے جس کو کسب سے کوئی تعلق نہیں، یعنی اس کو اللہ تعالیٰ علم لدُنّی عطا فرمادیتے ہیں، اِس مقام پر نفسِ امارہ بالکل مغلوب ہو جاتا ہے اور روح کا فیضان قوی درجہ میں میسّر ہوتا ہے۔

مسکنِ اصلی ست دم را ناف باشد بایقیں　　　خلوتِ روح است لیکن ہر وصلش ہمقریں

ترجمہ: سانس کا مسکن اصلی تو یقینی طور پر ناف ہے، لیکن روح کی خلوت گاہ بھی اس سے بالکل متّصل ہے۔

تشریح: سانس سے مراد یہاں پر وہی حرارت ہے، کیونکہ معدہ، جگر اور ناف کا بالائی حصّہ یہ

سب الگ الگ ہیں، جگر دراصل روحِ طبعی کے زیرِ اثر ہے، گویا روحِ طبعی کا خلوت کدہ جگر ہے مگر معدہ اور ناف سے اِتّصال کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں ایک ہیں، اس لئے سالک کا دھیان اس روحِ طبعی کے مسکن کی طرف ہونا چاہیئے اور اس لطیفۂ روح کا اِنجلاء بذریعہ ذکرِ قلبی حبسِ دم کے ساتھ کرنا ضروری ہے، تاکہ روح کو عالَمِ ملکوت سے فیضان حاصل کرنے میں تقویت پیدا ہو۔

دم مدارِ زندگانی روح بروے اُستوار　　زندگیٔ جسم کے بے دم بماند برقرار

ترجمہ: زندگی کا دارومدار سانس پر ہے اور روح اس پر قائم ہے، جسم کی زندگی بغیر سانس کے کیسے باقی رہ سکتی ہے۔

تشریح: یعنی جب سانس باقی ہے تو زندگی بھی باقی ہے اور روح بھی باقی ہے اور جب روح باقی ہے تو جسم بھی باقی ہے، اور جب سانس ختم ہوجائے گا تو روح بھی نہ رہے گی اور جب روح نہ رہے گی تو جسم بھی نہ رہیگا، اسلئے سانس کی حفاظت سالک کو حبسِ دم کے ذریعہ کرنی چاہیئے۔

دم بہرِ اعضاء بگردد گر نہ گردد یک زماں　　علتے باشد مقرر بلکہ مُردہ گشت آں

ترجمہ: سانس تو تمام اعضاء کو گردش دیتا ہے، اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے گردش نہ دے، تو کوئی نہ کوئی بیماری ضرور ہوگی بلکہ وہ جسم پھر مر ہی جائے گا۔

تشریح: یعنی یہ سانس جس کو حرارت اور روح بھی کہتے ہیں یہ جسم کے ہر عضو میں ہمہ وقت گردش کرتی ہے، اگر اس روح کی گردش تھوڑی دیر کے لئے کسی عضو میں رک جائے تو پھر وہ عضو معطل ہوجاتا ہے، جسم کے تمام اعضاء میں سے روح سمٹ کر ایک مرکز پر آجاتی ہے تو اس وقت بھی سکتہ کی بیماری کی وجہ سے جسم کا تعطل ہوجاتا ہے۔ اور اگر بالفرض یہ تعطل مستقل طور پر قائم ہوجائے تو گویا اب اس جسم کی موت واقع ہوگئی۔

اس لئے اس سانس کو جو مدارِ زندگانی ہے بہت قیمتی سمجھنا چاہیئے اور ذکر سے ایک لمحہ بھی غفلت نہ برتنی چاہیئے۔

هست بینی بابِ ملکوتیت دانی اے پسر　　دم ازاں دو بار آید، باز گردد سر بسر

ترجمہ: اے سالک! ناک کو عالمِ ملکوت کا دروازہ سمجھو، کیوں کہ اس کے ذریعہ سانس بار بار آتا جاتا رہتا ہے۔

تشریح: یعنی لطیفۂ روح جس کا تعلق عالمِ ملکوت سے ہے، اس کا دروازہ ناک ہے، گویا ناک کے ذریعہ روح کو فیضانِ صفات کا موقع مل رہا ہے، اس لئے کہ سانس ناک کے ذریعہ آتا جاتا ہے اور سانس مدارِ زندگی ہے، اسی پر روح کا وجود بھی ہے، کیونکہ اگر سانس نہ ہوگا تو پھر روح بھی نہ ہوگی۔ اس لئے اصطلاحاً روح کے لئے عالمِ ملکوت کا دروازہ ناک کو قرار دیا گیا ہے جس طرح عالمِ ناسوت میں روح کا دروازہ کان تھے۔

ایں مقامے را دو در گشتہ ہویدا ہمچنیں　　لیک نوبت شد یکے را بعد یک از بہر ایں

ترجمہ: اس طرح اس مقام کے دو دروازے ظاہر میں مقرر کئے گئے ہیں، لیکن کام کرنے کی نوبت ایک کے بعد ایک سے آتی ہے۔

تشریح: یعنی جس طرح عالمِ ناسوت میں دونوں کان روح کی دہلیز تھے اور عالمِ جبروت میں دونوں آنکھیں روح کی دہلیز ہیں، اسی طرح عالمِ ملکوت میں روح کی دہلیز ناک کے دونوں سوراخ ہیں، اس میں اور مذکورہ ماقبل دونوں میں فرق یہ ہے کہ دونوں کان اور دونوں آنکھیں ایک ساتھ بیک وقت کام کرتی ہیں اور ناک کے دونوں سوراخ سانس لینے کا کام بیک وقت ایک ساتھ نہیں کرتے۔ ہنگامی صورت حال نہ ہو تو ناک کا صرف ایک سوراخ کام کرتا ہے یعنی ایک سوراخ سے سانس آتا جاتا رہتا ہے اور دوسرا سوراخ بند رہتا ہے، پھر جب دوسرا سوراخ کھل جاتا ہے تو پہلا سوراخ کام کرنا بند کر دیتا ہے یعنی ایک ہی سوراخ سے سانس کی آمد و رفت باقی رہتی ہے اور یہی صحت کی علامت بھی ہے۔

تا نگردد بُردن از دو، ریحِ آں بس بر فزوں　　گاہ راس و گاہ چپ دم است میگردد بروں

ترجمہ: تاکہ ان دونوں سوراخوں سے سانس لینے کی وجہ سے ہوا کا دباؤ زیادہ نہ ہو جائے

اسلئے کہ سانس کبھی داہنی طرف سے آتا ہے اور کبھی بائیں طرف سے آتا ہے۔

تشریح: یعنی قدرت نے دونوں کانوں اور دونوں آنکھوں کی طرح سانس کا نظام نہیں رکھا ہے کہ ایک کان سے سنو گے تو کم سنائی دیگا اور دونوں سے سنو گے تو بڑھ نہیں جائے گا۔ اسی طرح آنکھ کا معاملہ ہے کہ آدمی جتنا دونوں آنکھوں سے دیکھتا ہے ایک آنکھ سے بھی اسی قدر دیکھتا ہے، بخلاف ناک کے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے ایسا توازن رکھا ہے جو ایک سوراخ سے سانس لینے میں قائم رہتا ہے، اور دونوں سوراخوں سے مستقل و متواتر سانس لینے میں ہوا کا دباؤ زیادہ محسوس ہوتا ہے، صرف ہنگامی صورتِ حال میں دونوں سوراخ کام کرتے ہیں، بحالت سکون ایک ہی سوراخ ایک وقت میں کام کرتا ہے، جب ایک بند ہوجاتا ہے تو دوسرا چالو ہوجاتا ہے۔

شمس را باشد مناسب بادِ یمنیٰ اے پسر ماہ را باشد مناسب بادِ یسریٰ سر بسر

ترجمہ: اے سالک! داہنی طرف کے سُر کو سورج کے ساتھ مناسبت ہے اور بائیں طرف کے سُر کو چاند کے ساتھ مناسبت ہے۔

تشریح: علم النفس میں تجربات کے بعد یہ بات واضح طور پر بتلائی جاتی ہے کہ ناک کے دونوں سوراخوں سے الگ الگ سانس لینے کی ایک وجہ تو وہ ہے جو مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پہلے بیان فرمائی کہ دونوں سوراخ سے بیک وقت سانس متواتر لینے میں ہوا کا دباؤ زیادہ ہوگا اور لازمی طور پر تکلف کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا، اس لئے قدرت نے ہنگامی صورت حال کے علاوہ ایک ساتھ دونوں کو جاری نہیں فرمایا، اب یہاں پر مصنف ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں کہ دونوں طرف کے سانس کی خاصیت بھی الگ الگ ہے، داہنی طرف کا سانس مزاج کے اعتبار سے گرم ہے، اس لئے اس کو سورج کی طرف نسبت دیدی گئی ہے اور بائیں طرف کا سانس مزاج کے اعتبار سے ٹھنڈا ہے اس لئے اس کو چاند کی طرف منسوب کردیا گیا ہے یعنی جس طرح سورج میں گرمی اور چاند میں ٹھنڈک ہے اسی طرح ان گرم اور ٹھنڈے سانسوں کو بھی دونوں کی طرف منسوب کردیا گیا، یہ وجہ بھی دونوں سانس کے ایک ساتھ نہ

چلنے کی ہے کہ ایک گرم ہے اور ایک ٹھنڈا ہے۔

سیدی و مرشدی نے ایک عجیب بات بیان فرمائی کہ ہم سورج اور چاند کی طرف کیوں منسوب کریں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ داہنے سُر کی تاثیر اس لئے گرم ہے کہ اس طرف لطیفۂ روح کا مقام ہے اور روح اپنی لطافت و رفعت کے اعتبار سے ذات مطلق کے اَمرِ کُن سے بہت قریبی رابطہ رکھتی ہے اس لئے جلال کا پرتَو اس طرف کے سُر میں نمایاں ہے اور بائیں طرف لطیفۂ قلب ہے اور قلب انوارِ الٰہی کا مرکز ہے اور انوارِ الٰہی میں سکون و ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے، اسلئے بائیں سُر کو ٹھنڈا کہنا مناسب ہے۔

این دُو دم را ہر کہ می آرد فراہم ہر زماں   کہ نیاید در تنش آثارِ پیری راست داں

ترجمہ: ان دونوں سانس کی جو شخص ہر وقت حفاظت کرتا ہے تو یہ بات صحیح ہے کہ اس کے بدن میں کبھی بڑھاپے کے آثار نہیں پیدا ہوتے۔

تشریح: ظاہری اسباب کے اعتبار سے سانس کی آمد و رفت کی نگرانی کہ کس وقت کونسا سُر چل رہا ہے اور کونسا بند ہے ان تمام باتوں کا خیال رکھنے سے، نیز کھانے پینے، سونے جاگنے کے وقت اس کا لحاظ رکھنے سے صحتِ جسمانی برقرار رہتی ہے بلکہ تجربات اس کے شاہد ہیں کہ اس توازن کے ساتھ زندگی گذارنے سے ضعیفی اور بڑھاپا قریب بھی نہیں آتا۔

می نگر در بابِ مَلکوتی دمادم ہوشدار   دَم ازاں در باز آید باز گردد در شمار

ترجمہ: بابِ مَلکوتی کے ذریعہ سانس کی آمد و رفت پر توجہ کے ساتھ دھیان دو، کہ گنتی کے اعتبار سے سانس جس سُر سے آیا تھا اسی سُر سے واپس ہُوا یا نہیں۔

تشریح: بابِ مَلکوتی یعنی ناک کے سُروں پر سانس کی آمد و رفت میں یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ جب ایک سُر سے سانس اندر آرہا ہے تو باہر جانے کی مقدار بھی تعداد کے اعتبار سے متوازی اور برابر ہونی چاہیئے کہ جتنی مرتبہ ایک سُر سے سانس اندر لو، اتنی ہی مرتبہ اُسی سُر سے سانس باہر پھینکو۔ اس توازن کا لحاظ رکھنے سے صحت کیلئے فوائد کا حصول ہوتا ہے۔

منتظرِ دم را شود وصل خدا امیدوار　　می بود مُردا ردم بے یادِ حق اے ہوشیار

ترجمہ: جو سانس کی آمدورفت کا انتظار کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی معیت کا طالب ہے،

کیونکہ اے سالک! اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر گویا وہ سانس مَرا ہوا ہے۔

تشریح: یہاں مصنف رحمۃ اللہ علیہ اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہر ایک سانس پر اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اہتمام کرنا چاہیئے، جو شخص اپنے ہر ایک سانس پر ہوشیار رہتا ہے اور ذکر سے غافل نہیں ہوتا، وہ دراصل قربتِ ذات کا شیدائی اور وصلِ ذات کا تمنائی ہے اور وہ شخص جس کے سانس بغیر اس کی یاد کے گذر گئے یا گذر رہے ہیں اس کا شمار زندوں میں نہیں ہوتا۔ گویا ذکر باری زندگی ہے اور ذکر سے غفلت موت ہے۔

اِتصالِ ذکر بادم پاسِ انفاس است نام　　ہیچ ذکرے نیست زیں بہتر بکن بادم مدام

ترجمہ: ہر ایک سانس کے ساتھ ذکر کو قائم رکھنے کا نام پاسِ انفاس ہے، کوئی ذکر اس سے بہتر نہیں ہے، تم بھی اے سالک ہر ایک سانس کے ساتھ ذکر کرتے رہو۔

تشریح: اس مقام معدہ کے شغل کا خلاصہ یہ ہے کہ سالک اپنے ہر ایک سانس پر نظر رکھے اور کوئی سانس ذکر کے بغیر نہ گذرنے دے۔ سانس کی آمدورفت کے ساتھ ذکرِ ذات کرنیکو تصوف کی اصطلاح میں پاسِ انفاس کہا جاتا ہے، مصنف فرماتے ہیں کہ سالک کے لئے سب سے عمدہ شغل یہی ہے کہ اس کا ہر سانس اللہ تعالیٰ کی یاد میں ڈوبا ہُوا ہو۔

حق تعالیٰ می کند از ہر دم تو دو سوال　　می نگر اندر خبر، کن ذکر بادم جملہ حال

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تیرے ہر ایک سانس کے سلسلے میں دو سوال کرے گا، اس حقیقت کو حدیث پاک میں ملاحظہ کرو اور ہر حال میں ہمیشہ ذکر کرتے رہو۔

تشریح: یعنی قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کے سلسلہ میں لوگوں سے دریافت فرمائیں گے کہ ہم نے تم کو فلاں فلاں نعمتیں عطا کیں، تم نے ان پر کیا شکر ادا کیا؟ تو ان نعمتوں میں سے ایک سانس بھی بڑی نعمت ہے اور یہی ایک سانس اپنے اندر دو رُخ رکھتا ہے، ایک

رُخ تو یہ ہے کہ جب یہ سانس باہر سے اندر جاتا ہے، تب صحت کے لئے مفید ہے تو یہ ایک نعمت ہوئی، دوسری نعمت یہ کہ جب یہ سانس باہر واپس آتا ہے تب بھی صحت کے لئے فائدہ مند ہے، بہرحال ایک سانس کی آمد و رفت میں دو نعمتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر ایک نعمت کے بارے میں سوال کیا جائے گا تو جب ایک سانس میں دو نعمتیں ہیں، یعنی باہر سے اندر جاکر زندگی عطا کرنا اور اندر جاکر باہر آنے سے کثافتِ جسمانی کو دور کرنا، یہ دو نعمتیں ہیں تو گویا ایک سانس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو سوال ہوں گے کہ ہم نے تم کو سانس اندر لے جانے دیا، بتلاؤ تم نے کیا شکر ادا کیا، اور پھر جب سانس اندر چلا گیا تو ہمارے حکم سے واپس آیا بتلاؤ ان دونوں نعمتوں کا کیا جواب دوگے، اس لئے ضروری ہے کہ سانس کی آمد و رفت پر گہری نظر رکھے اور کوئی سانس اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر اندر نہ لے اور نہ باہر نکالے، بلکہ ہر ایک سانس میں ذکر کی مداومت کرے، اس طرح ان شاء اللہ تعالیٰ قربتِ ذات حاصل ہو جائے گی۔

ثالثاً باشد مقام سر کہ جبروت اشت نام   مسکنِ آب است میکائیل بیند ایں مقام

ترجمہ: تیسرا مقام، مقام سِر ہے جس کا نام جبروت ہے، یہ پانی کا مسکن ہے، اور میکائیل اس مقام کی نگرانی کرتا ہے۔

تشریح: شغلِ مقام چہارگانہ کا تیسرا مقام، مقام سِر ہے، جسم انسانی میں سِر کا مقام گلے کے نیچے سینے کی جو چوڑی ہڈی ہے اس ہڈی کے اوپری حصے سے دو انگل نیچے ہے، جہاں پر اندر کی طرف شہ رگ دل سے نکلنے کے بعد پشت کی طرف مڑتی ہے، بس یہ مقام سِر ہے، یہ پانی کا مسکن ہے، یعنی جس طرح آبپاشی وغیرہ کے لئے پانی کی سب سے بڑی نہر یا ندی ہوتی ہے، اس کو ذخیرۂ آب یا مسکنِ آب کہتے ہیں، اسی طرح جسم انسانی میں شہ رگ ہے جو تمام اعضاء جسمانی کو خون سپلائی کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور سب سے زیادہ خون کا ذخیرہ یہیں سے ہو کر گذرتا ہے، اسی لئے عناصر اربعہ میں سے پانی کی طرف نسبت کرتے ہوئے صوفیاء حضرات نے اس مقام کو مقام سِر سے تعبیر کیا ہے اور اس کی نگرانی حضرت میکائیل علیہ السلام کرتے

ہیں، یعنی اس مقام کا خاصہ حضرت میکائیل علیہ السلام کی طرح پانی سے سیرابی کرنا ہے، اس لئے اس مقام کی نگرانی یعنی خواص کو حضرت میکائیل کی طرف منسوب کیا ہے۔

اس مقام کے شغل کا معاملہ بھی ایک برس کا ہے اور بارہ چیزوں کا حسبِ سابق یہاں پر بھی سالک کو لحاظ کرنا ہوگا جو درجِ ذیل ہیں۔

(۱)	حصۂ جسم	مقامِ ستر، سینہ کی ہڈی سے ۲ دو انگل نیچے
(۲)	متعلق بہ	عالمِ جبروت
(۳)	عمل	حقیقت
(۴)	ذکر	ذکرِ روح
(۵)	حصول	توحیدِ افعالی
(۶)	شغل	مشاہدہ
(۷)	مرکز	لطیفۂ ستر
(۸)	خواص	آب
(۹)	طریق	میکائیل
(۱۰)	معیت	نفسِ مطمئنہ
(۱۱)	رنگ لطیفہ	نیلگوں
(۱۲)	دہلیزِ روح	دونوں آنکھیں

اس مقام کی عملی کیفیت گذشتہ دونوں مقام کی طرح ہے، البتہ بارہ چیزیں جو نقشے میں موجود ہیں سالک کی کیفیات سے متعلق ہیں، اور چونکہ سالک نے ترقی کی ہے اس لئے کیفیات میں بھی ترقی کا معاملہ ہے۔

ماہ در وے نیز ناظر اے پسر تحقیق داں   آب از وے گشت جاری زندگی تن ازاں

ترجمہ: اے سالک! یہ بات بالکل تحقیقی ہے کہ چاند اس مقام کی نگرانی کرتا ہے،

اس کے ذریعہ پانی کا اجرا ہو کر جسم کے لئے سامانِ زندگی مہیا ہوتا ہے۔

تشریح: جس طرح عالمِ کبیر میں پانی کے مدّوجزر کو چاند سے نسبت ہے اور یہ پانی لوگوں کی زندگی کے اسباب فراہم کرتا ہے، اسی طرح عالمِ صغیر میں اس مقام پر ذاتِ پاک کی تجلیات نورانی کا ظہور ہوتا ہے اور اس نور کی وجہ سے روحانی طور پر جسمِ انسانی کو سیرابی کے اسباب مہیا ہوتے ہیں سالک کو مراقبہ کی نشست گاہ میں ذکر روحی کے ساتھ یہ تصور کرنا چاہیئے کہ اس مقام پر نور خداوندی میرے باطن میں جلوہ گر ہے، جس سے تمام جسم منوّر ہو رہا ہے۔

تا بود آں آب در وے روح باشد بر قرار　　　می نگر آں آب را چوں رنگ نطفہ آبدار

ترجمہ: جب تک وہ پانی اس میں موجود ہے روح بھی برقرار رہے گی، تم اس پانی کو برنگ نطفہ (ہلکا نیلگوں) چمکدار تصور کرو۔

تشریح: جب تک جسم انسانی (عالم صغیر) میں وہ پانی موجود ہے تو روح بھی موجود رہے گی، چونکہ اس پانی میں تجلیاتِ انوار کا وجود ہے تو روح بھی اس نور سے فیض حاصل کرنے کے لئے موجود رہے گی، اس لئے اس پانی کے وجود کو تصور میں اس طرح قائم رکھو گویا ہلکا نیلگوں برنگِ نطفہ چمکدار پانی کا وجود سالک کے باطن میں ہے، یہ پانی چونکہ اسی ماہتاب کے نور کا تاثر ہے، جو ماہتاب جلوۂ باری سے عبارت ہے، اسلئے جبتک وہ جسم سالک میں رہیگا روح بھی باقی رہے گی۔

در دماغت آبِ نطفہ را بدانی آں منی　　　نور در وے بلکہ خود نور است در یکجا منی

ترجمہ: اپنے دماغ کے اندر اس نطفۂ آب کو منی تصوّر کرو اور یہ تصوّر کرو کہ اس میں نور موجود ہے، بلکہ ایک طرح سے وہ خود نور ہے۔

تشریح: جس طرح کہ شغل دماغی میں اس بات کی وضاحت کردی گئی تھی کہ مادہ منویہ کا وہ جزو جس کا دماغ سے تعلق ہے وہ نور خداوندی کا پرتو ہے، کیونکہ مادہ منویہ تمام جسم سے نچوڑی ہوئی روح ہے، البتہ اس میں دماغ کی طرف جو جزو شامل کیا جاتا ہے وہ سب سے اعلیٰ اور قیمتی شے ہے اور یہی شے دماغ کے اندر جلوۂ نور خداوندی کا مرکز ہے اور مرکزِ روحِ نفسانی

ہے، اس لئے اس مادہ کو جب دماغ سے متعلق کریں گے تو اس کا تصور ایک نور کی صورت میں کرنا ہوگا۔ کیونکہ

خلوتِ روح است آنرا راست دانی اے پسر	روح در آب ست و نیز آب اندرونش می نگر

ترجمہ: اے سالک! اس کو صحیح طور پر یہ سمجھو کہ یہ روح کی خلوت گاہ ہے۔ یہ روح اس پانی میں موجود ہے اور اِس روح میں بھی پانی موجود ہے۔

تشریح: یعنی دماغ میں مادۂ منویہ کا مرکزِ ترسیل مرکزِ نور ہے جس کو قلبِ مدوّر بھی کہتے ہیں جو ایک گول نقطہ کی طرح ہے، دماغ میں یہ نقطہ روحِ نفسانی کا مرکز ہے اور روح اس نقطۂ آب میں قیام پذیر ہے، بلکہ پانی اس روح کے اندر ہے۔ "روح پانی میں ہے یا پانی روح میں ہے" یہ کہہ کر مصنف اس طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ روح اور پانی آپس میں اس طرح گھلے ملے ہوئے ہیں کہ جن میں تفریق نہیں کی جا سکتی، بس یوں سمجھئے کہ ایک ادغامی کیفیت ہے یعنی روح پانی میں ہے اور پانی روح میں۔

زندگی جملہ اشیا را می بود از آب راست	زندگی بے آب نا ممکن بدانی ہر کجا است

ترجمہ: تمام اشیاء کی زندگی پانی کے وجود سے وابستہ ہے اور جہاں کہیں بھی زندگی ہے بغیر پانی کے ناممکن ہے۔

تشریح: عالمِ کبیر (کائنات) میں تمام اشیاء کو کسی نہ کسی طور سے پانی کے ذریعہ فیضانِ حیات حاصل ہو رہا ہے، جس کا مشاہدہ ہم شب و روز کرتے ہیں۔ اور عالمِ صغیر یعنی جسم انسانی عکس ہے عالم کبیر کا، لہٰذا پانی کی اہمیت اس کے لئے بھی اسی درجہ کی ہے، لیکن یہاں مطلق پانی کی نوعیت سے بحث نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ جو حیات بخشی کا جوہر موجود ہے وہ مراد ہے یہ بات ضرور ہے کہ مصنف نے مقامِ چہارگانہ کے لئے جس طرح جسم انسانی کے حصے مخصوص کئے ہیں، اسی طرح عناصر اربعہ میں سے ایک ایک مقام کے لئے ایک ایک عنصر بھی متعین کیا، اس مقام کا عنصر پانی ہے، جو اگرچہ علی الاطلاق پانی ہی ہے، مگر اس کے ساتھ جو

کیفیتِ حیات بخشی ہے وہ مقصود ہے۔

ایں مقامے ہست برتر غیب دیدن بیگماں   چند خاصیت بدارد با تو گفتم اے جواں

ترجمہ: یہ مقام بھی بہت بلند ہے یہاں رازہائے پوشیدہ کا مشاہدہ ہوتا ہے، اے سالک! اس مقام کی کچھ خصوصیات میں تجھ سے بیان کرتا ہوں۔

تشریح: یعنی شغل مقام چہارگانہ کا یہ تیسرا جزو حقیقت کے اعتبار سے بہت اہم ہے، یہاں پر بھی رازہائے پوشیدہ کا مشاہدہ سالک کو ہوتا ہے، اسکی کچھ خصوصیات مصنفؒ بیان فرمارہے ہیں۔

چشم درجبروت آمد بارگاہ مرروح را   وقت بازش نور باری بنگرد در ہر کجا

ترجمہ: عالم جبروت میں روح کی قیام گاہ آنکھوں کو قرار دیا گیا ہے، ان کو کھولنے کے وقت ہرطرف انوار باری کی تجلیات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

تشریح: یہ مقام سرِ عالم جبروت سے تعلق رکھتا ہے، اور عالم جبروت میں تجلیاتِ جمالی کا تفصیلی نقشہ موجود رہتا ہے، سالک جب اس مقام پر پہونچتا ہے تو چاروں طرف انوارِ باری کی تجلیات کا اس کو مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔

روح را دہلیز دو چشم است می داں اے پسر   اشتہاد نور بروے فرض آمد سر بسر

ترجمہ: اے سالک! تم یہ سمجھ لو کہ روح کی دہلیز بھی دونوں آنکھیں ہیں، اس لئے نور کا مشاہدہ کرنا اس پر فرض اور ضروری ہے۔

تشریح: جس طرح مقام اوّل میں روح کی دہلیز دونوں کان تھے، اور مقام ثانی میں ناک کے دونوں سُر تھے، اسی طرح اس مقام پر رُوح کے فیضان کا ذریعہ آنکھ ہے، کیونکہ یہ مقام، مقام مشاہدہ ہے اسلئے ظاہری اور باطنی آنکھوں کو کھول کر انوارِ باری کی تجلیات کے مشاہدہ میں مشغول ہونا اس مقام کی خاصیت ہے، اور یہی معاملہ اس مقام کی رفعت وبلندی کا ثبوت ہے۔

باز بروے فرض آمد دیدنِ شانِ خدا   ہرچہ بیند از خدا، مخلوق بیند در قفا

ترجمہ: پھر اس پر خداوند تعالیٰ کی شان کا مشاہدہ بھی فرض ہے، وہ جو کچھ دیکھتا ہے

خدا کی طرف سے دیکھتا ہے، اور مخلوق پردے کے ساتھ دیکھتی ہے۔

تشریح: جیسا کہ نقشے میں بیان کیا گیا ہے کہ اس مقام پر سالک کو توحیدِ احوالی کا حصول ہوتا ہے یعنی جس قدر احوال اس کو پیش آتے ہیں اور جو حالت بھی اس پر طاری ہوتی ہے وہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہوتی ہے، اور سالک کے قلب کی صفت بھی اس مقام پر قلب منیب کی ہوتی ہے، اس لئے توحیدِ احوالی کے ذریعہ خداوند تعالیٰ کی ہر لمحہ نئی شان کا مشاہدہ اس کو ہوتا رہتا ہے اور قلبِ منیب کے ذریعہ وہ ہر ایک کام کو براہ راست خدا کی طرف منسوب کر کے دیکھتا ہے، جبکہ عام لوگ ان امور کو اس قدر کھلے ہوئے یقین کے ساتھ نہیں دیکھ پاتے، گویا اس وقت سالک کو درجۂ احسان حاصل ہوتا ہے۔ ھٰذَا اَفِیْضَانُ الْمُرْشِدْ۔

نیک و بد از حق بداں از روئے خلقت اے پسر بد ز بندہ نیک از حق راست در قرآں نگر

ترجمہ: تخلیق کے اعتبار سے اچھائی اور برائی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھو لیکن برائی کے ظہور کو بندہ کی طرف منسوب کرو اور اچھائی کو اللہ تعالیٰ کی طرف، قرآن میں اسکی صراحت دیکھو۔

تشریح: یہاں پر مصنف ایک شبہ کا ازالہ کر رہے ہیں کہ کہیں سالک کے ان احوال سے کہ وہ جو کچھ دیکھتا ہے خدا کی طرف اس کی نسبت کرتا ہے، یہ گمان نہ ہو جائے کہ وہ برائی کے ظہور کا بھی۔ معاذ اللہ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف انتساب کرے گا، ایسا نہیں بلکہ اس کی حقیقت یوں سمجھو کہ اچھائی اور برائی اگرچہ دونوں خداوند تعالیٰ کی تخلیق ہیں، لیکن ان تخلیقات سے عالَم اسباب میں انتساب انسان کے عمل پر موقوف ہے۔ پروردگار چونکہ پاک ہے اس لئے پاکی کو پسند فرماتا ہے، اس پاکی کی نسبت سے اعمالِ خیر کے ظہور کو بھی اسی کی رحمت سمجھا جائے گا اور اس کا انتساب بھی اسی کی طرف کیا جائے گا، اعمالِ بد اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں، خداوند قدوس بندوں سے بھی ان اعمالِ بد کے ظہور کو ناپسند فرماتا ہے، اسی لئے اگر کوئی انسان اعمالِ بد کا ارتکاب کرے گا تو اس کے ظہور کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں ہوگی بلکہ ارتکاب کرنے والے کی طرف ہوگی، مگر اللہ نے دنیا کو دارالامتحان بنا کر انسان کو یہ اختیار عطا کر دیا کہ وہ اعمالِ خیر کا

ارتکاب کرے یا اعمالِ بد کا، سالک اس مقام پر قرآن کی ہدایت کے مطابق صرف اعمالِ خیر کا انتساب ذات پروردگار کی طرف کرتا ہے اور برائی کا انتساب مرتکب کی طرف کرتا ہے۔

بندہ مخلوق است ہم اعمالِ شاں مخلوق داں   لیک حق از نیک راضی نیست از بد شادماں

ترجمہ: بندہ مخلوق ہے اور اس کے اعمال کو بھی مخلوق سمجھو، لیکن اللہ تعالیٰ اعمالِ خیر سے راضی ہے، اعمالِ شر سے راضی نہیں ہے۔

تشریح: یہ امر تو مسلّم ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق عباد بھی ہے اور خالق اعمال بھی ہے، قرآن پاک میں صاف صاف فرمانِ باری تعالیٰ ہے کہ تم کو اور جو کچھ تم کرتے ہو سب کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے لیکن اعمال کی تخلیق کا انتساب ذات وحدہٗ لاشریک کی طرف کرنے سے یہ بات بالکل لازم نہیں آتی کہ وہ اعمال خیر کی طرح اعمالِ شر کے ارتکاب سے بھی راضی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ

راضی از خیر است از شر در غضب حق را ببیں   ہر کہ گوید در بدی راضی است شد از منکرین

ترجمہ: سچ تو یہ ہے کہ اعمال خیر سے راضی ہے اور اعمال شر سے ناراض ہے، جو کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ اعمال شر سے بھی راضی ہے تو وہ حق کا انکار کرنے والا ہے۔

تشریح: یعنی یہ بات تو بالاتفاق صحیح ہے کہ خیر اور شر کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، لیکن اس نے اپنی پسند اور ناپسندیدگی کا اعلان بھی واضح طور پر کر دیا ہے کہ وہ اعمال خیر سے راضی ہے اور اعمال شر کے ارتکاب سے سخت ناراض ہے۔ انسان کو عقل سلیم عطا فرما کر خیر اور شر کی تخلیق کر کے اس دار الامتحان میں بھیجنے کا مطلب ہی یہی ہے کہ وہ جانچے کہ کون ہماری پسند پر عمل کر کے ہماری خوشنودی حاصل کرتا ہے اور کون اعمال شر کا ارتکاب کر کے اپنے اوپر ہمارے غضب کو مسلط کرتا ہے۔ اب اس اعلان کے بعد بھی کوئی یہ کہے کہ وہ اعمال خیر کی طرح اعمال شر سے بھی راضی ہے تو وہ صراحتاً حق کا منکر ہے تخلیق شر سے اس کی پسندیدگی لازم نہیں آتی۔

کفر کافر گرچہ آمد از قضائے کردگار   لیک زیں تقدیر اول کرد بہر کفر نار

ترجمہ: کافر کا کفر بھی اگرچہ پروردگار کے فیصلے سے ہے لیکن اس نے یہ بھی لکھ

دیا کہ کفر کی سزا جہنم ہے۔

تشریح: یعنی ایمان کی طرح کفر کی تخلیق کی نسبت بھی اللہ کی طرف ہوتی ہے لیکن اس تخلیق سے یہ لازم نہیں آتا کہ کفر اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، کیونکہ اس نے یہ بھی لکھ دیا ہے اور صاف اعلان کر دیا ہے کہ کفر کو اختیار کرنے والے کی سزا جہنم ہے۔ اس لئے اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اگر کفر ناپسند ہوتا تو اس کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اسلئے کفر ناپسند نہیں ہے، تو اس شخص کا یہ کہنا غلط ہے، کیونکہ تخلیق تو صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، اور وہ صفت جامع ہے کفر و ایمان کو، یعنی دونوں کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے، معاملہ انسان کے اختیار کرنے نہ کرنے پر ہے، جو بھی کفر اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق جہنم میں جائے گا۔

جملہ چیز از نزد باری تعالےٰ کردگار　　نیک را از بہر جنت کرد بد را بہر نار

ترجمہ: تمام چیزیں خالقِ مطلق اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں، نیک افراد کو جنت کے لئے اور بُروں کو دوزخ کے لئے بھی اسی نے پیدا کیا۔

تشریح: یعنی جو کچھ کائنات میں ہے سب خدائے وحدہٗ لاشریک کی تخلیق ہے، خیر ہو یا شر ہو، ایمان ہو یا کفر ہو لیکن ان متضاد اشیاء کو پیدا فرما کر کسب کا اختیار اللہ تعالیٰ نے بندوں کو عطا کر دیا۔ بندہ خالق افعال نہیں بلکہ کاسب افعال ہے، اسی کسب کے اعتبار سے ثواب و عذاب کا معاملہ ہوگا، اگر اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی کے مطابق عمل کر کے نیک لوگوں کے گروہ میں شمولیت اختیار کرلی تو اس کے وعدہ کے مطابق جنت ملے گی اور اگر اعمال بد اور کفر اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو پھر ایسے افراد کے لئے جہنم کا فیصلہ ہے۔

ایں مقامے را دو در گشت است پیدا بہر آں　　تا بصارت تیز گردد از مقالت ہر زماں

ترجمہ: اس مقام کے دو دروازے اس لئے ظاہر ہوئے ہیں تاکہ دیکھنے کا تناسب ہر مرحلہ پر بولنے کے مقابلہ میں زیادہ ہو۔

تشریح: یہ مقام ستر عالمِ جبروت سے متعلق ہے، یہاں مشاہدہ کا معاملہ ہے اس لئے دونوں

آنکھوں کو عالمِ جبروت کا دروازہ مقرر کیا گیا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ پروردگار کی تجلّیات کا مشاہدہ ہو سکے اور مشاہدہ بھی عجائب وغرائب کا ہوتا ہے، اس لئے بولنے کا موقع ہی میسر نہیں ہوتا بلکہ حیرت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

کرد بعضے اہلِ وصلت اختلافے اندریں　　　گفت لاہوت است در سر تختِ ربّ العالمین

ترجمہ: بعض مقامِ وصل پر فائز حضرات نے اس میں اختلاف کیا ہے، وہ کہتے ہیں مقامِ سِرّ میں عالمِ لاہوت ہے جو ربّ العالمین کا تخت ہے۔

تشریح: مصنف فرماتے ہیں کہ بعض ان حضرات کو جو مقامِ مشاہدہ پر فائز ہونے کی وجہ سے معیّتِ ذات کے وصل سے شادکام ہیں، اس مقامِ سِرّ کے بارے میں اختلاف ہے اور وہ اختلاف یہ ہے کہ وہ لطیفہ سِرّ کا تعلق عالمِ جبروت کے بجائے عالمِ لاہوت سے قائم کرتے ہیں اور عالمِ لاہوت چونکہ خلوت گاہِ ذاتِ پاک ہے اس لئے وہ ربّ العالمین کا تخت مانا جائے گا۔ اگرچہ مصنف خود بھی اس سے متفق نہیں ہیں، اس لئے مختصر طور پر اشارۃً بتلا دیا لیکن جب تک اس کی تشریح نہ کی جائے گی بات واضح نہ ہوگی، اس لئے حسبِ فیضانِ مرشد عرض یہ ہے کہ یہ اختلاف اس وجہ سے ہوا کہ چونکہ یہ مقامِ سِرّ، مقامِ مشاہدہ ہے اور اس کا تعلق عالمِ جبروت سے ہے جس کا دروازہ دونوں آنکھیں ہیں، ظاہری اور باطنی آنکھوں کے ذریعہ ہی مشاہدہ ہوتا ہے تو یہاں پر بھی عالمِ لاہوت کی طرح تجلّیاتِ باری تعالیٰ ہوتی ہیں، لیکن اس مرحلہ پر تجلّیات کا معاملہ اس قدر کثرت سے ہوتا ہے کہ سالک کو یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ خلوت گاہِ ذات میں صفات کا مشاہدہ کر رہا ہے، عالمِ لاہوت تو خاص حریمِ قدس ہے لیکن عالمِ جبروت بھی اس کے قریب قریب ہے، اس قربتِ اتصال کی وجہ سے مشاہداتی خلط ملط ہو جاتا ہے، ورنہ کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے۔

کس بگوید نام محموداً نصیراً ہم کسے　　　اختلاف اندر مسمّٰی در دماغ و دل بسے

ترجمہ: کوئی اس شغل کو شغل سلطاناً محموداً کہتا ہے اور کوئی سلطاناً نصیراً کہتا ہے، نام رکھنے کے معاملہ میں دل و دماغ میں لوگوں کے بہت اختلاف ہے۔

تشریح : یہاں پر نام کے سلسلے میں جو اختلاف ہوا اُس کی وجہ یہ ہے کہ عالمِ جبروت کو بہت سے حضرات لطیفۂ خفی کے ساتھ منسوب کرتے ہیں اور لطیفۂ خفی کا مرکز ابرؤوں کی قوسین کے درمیان ہے اور اس مقام پر آنکھوں کے ذریعہ اس مرکز پر نظر جمائی جاتی ہے، اس لئے بعض حضرات اس کو شغل سلطاناً محموداً کہتے ہیں اور بعض حضرات بالائے بینی پر نظر مرکوز کرتے ہیں، وہ اس شغل کو سلطاناً نصیراً سے تعبیر کرتے ہیں. جبکہ مصنف کی بیان کردہ ترتیب زیادہ صحیح ہے اور یہ تمام فرق اعتباری ہے جو مشاہدہ سے تعلق رکھتا ہے، اصل مقصود تو اپنی تمامتر توجہات کو ذات کی صفات کی طرف مرکوز کرنا ہے، اس کا عنوان خواہ کچھ بھی رکھ لیا جائے، تصوّف میں الفاظ و تعبیر سے بحث نہیں ہوتی بلکہ مقصود ہی ہر حال میں پیش نظر ہوتا ہے، اسی لئے مصنف فرماتے ہیں۔

دل درانجا تختِ باری تعالیٰ نزدشاں ۔۔۔ بسکہ گویم از خدا در پیشوائے سالکاں

ترجمہ : اہلِ تصوّف کے نزدیک دل اللہ تعالیٰ کی تجلّیات کا تخت ہے، اسلئے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے میں اس کا ذکر سالکان کی رہبری کے واسطے کرتا ہوں۔

تشریح : یعنی الفاظ کی بحث میں اُلجھنے سے کوئی فائدہ نہیں، عنوانِ شغل کچھ بھی رکھ لیجئے، بس نظر اسی مقصود اصلی پر رہے، اسی لئے مصنف ان تمام باتوں کو چھوڑ کر قلب کے مقام کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور قلب کی اہمیت بھی بتلا رہے ہیں کہ قلبِ مومن تجلّیات انوارِ باری کا تخت ہے، اس لئے اس کی تشریح کی طرف توجہ کرنی چاہیئے، میرے بس کی بات تو نہیں تھی کہ اس کی تشریح کرتا لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ سالکانِ راہ سلوک کی رہبری کے لئے مجھے یہ خدمت سپرد کی گئی۔

رابعاً دل کو مقامِ تختِ حق لاہوت نام ۔۔۔ مسکنِ گل جبرئیلؑ از ناظرانِ ایں مقام

ترجمہ : چوتھا مقام دل کا ہے جو تختِ حق کا مقام ہے اور لاہوت اس کا نام ہے، یہ مٹی کا مسکن ہے اور جبرئیل علیہ السلام اس مقام کے نگراں ہیں۔

تشریح : شغل مقام چہارگانہ میں چوتھا مقام لطیفۂ قلب کا ہے جس کا تعلق عالمِ لاہوت

سے ہے ، عناصر اربعہ میں سے اس کو عنصر خاک کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اس مقام کی خاصیت حضرت جبرئیل علیہ السلام کی سی ہے ۔

اس شغل میں یہ مقام سب سے اہم ہے چونکہ لطیفۂ قلب اس کا مرکز ہے اور قلب کی اصلاح پر سعادتِ دارین کا انحصار ہے حیاتِ ظاہری بھی قلب کی درستگی پر موقوف ہے اور حیاتِ باطنی بھی ۔ قلب کا تعلق عالمِ لاہوت سے ہونے کی وجہ سے یہ مقام تجلیاتِ انوارِ باری کا مرکز قرار پایا ہے ، خاک کو وجودِ انسانی کی صورت عطا فرماکر خداوندِ قدوس نے اس قدر رفعت ظاہری و باطنی بخشی کہ اپنی خلافت کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا ، اسی طرح جسمِ انسانی میں گوشت کے ایک ٹکڑے یعنی قلب کو حکومت جسم عطا فرمادی ، اور جس طرح جسمِ انسانی (عالمِ صغیر) کا نظام حیاتِ قلب سے ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مرضیات کی روشنی میں عالمِ کبیر کا نظام جبرئیل علیہ السلام سے متعلق ہے کہ وہ تمام انبیاء پر پیغامِ الٰہی پہونچانے کا کام انجام دیتے ہیں ۔ اسی پیغام کے سبب اہلِ جہاں کو حیاتِ حقیقی سے سرفراز کیا گیا ، ذاتِ خداوندی کی صفات کا تعارف ، توحید کی اشاعت اور دنیا و آخرت کی کامرانی کا نظام اسی پیغام سے وابستہ رہا ہے ، اس لئے مقامِ قلب کی نگرانی کو حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ۔ نیز کشف والہام کا اِلقاء بھی قلب سے متعلق ہے اِس اِلقائی کیفیت کی نسبت بصورتِ وحی جبرئیل علیہ السلام سے متعلق تھی ، اس علاقہ قربت کی وجہ سے بھی جبرئیل کو اس مقامِ قلب کا نگراں قرار دیا جاتا ہے ۔

صورتِ گِل نیست ہر گز بلکہ معنی خاکداں　　　نورِ پُر نور است در وے رویتِ جانِ جہاں

ترجمہ : اس کی صورت مٹی کی سی نہیں بلکہ یہ تو خاک سے بنا ہوا ایک ایسا مرکز ہے جو خود نور ہے اور نور سے لبریز ہے اور اسی میں انوارِ خداوندی کا جلوہ نظر آتا ہے ۔

تشریح : مسکن گِل ہونے سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اس قلب کی شکل وصورت مٹی جیسی ہوگی ، اس شبہ کو دور کرنے کیلئے مصنف فرماتے ہیں کہ اس کی صورت مٹی کی سی نہیں ہے بلکہ جسمِ انسانی میں یہ تو وہ مرکزِ نور ہے جس میں انوارِ خداوندی کا جلوہ نظر آتا ہے ۔

خلوتِ روح است وعرشِ حق تعالےٰ ہوشدار　　　می نگر دل را درونش سرخ رنگ و زرد وار

ترجمہ: خبردار! یہ روح کی خلوت گاہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا عرش ہے۔ لطیفۂ قلب کا نورِ باطنی سرخ اور زردی مائل رنگ میں ملاحظہ کرو۔

تشریح: جس طرح جگر روحِ طبعی کی خلوت گاہ ہے اور دماغ روحِ نفسانی کی خلوت گاہ ہے، اسی طرح قلب روحِ حیوانی جو مُدبّرِ بدن ہے کی خلوت گاہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے عرشِ پاک کی طرح اس میں تجلیاتِ باری کا ظہور ہوتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا ظہور عرش پر ہے اسی طرح قلب بھی انوارِ باری کی تجلیات کا مرکز ہے۔ جب سالک اس کی طرف توجہ کرے گا تو لطیفۂ قلب کا رنگ سرخ اور زردی مائل نظر آئے گا۔

چوں بود در خانۂ تاریک روشن یک چراغ　　　روشنیش می نگر ہر جائے می گردد بلاغ

ترجمہ: جس طرح اندھیرے گھر میں ایک چراغ روشن ہوتا ہے تو جہاں تک پہونچ ہے وہاں تک اس کی روشنی کو تم دیکھ سکتے ہو۔

تشریح: یہاں قلب کو روشن چراغ سے تشبیہ دے کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ جس طرح اندھیرے گھر میں ایک چراغ روشن کرنے سے تمام گھر میں اجالا ہو جاتا ہے اسی طرح ذکر کے ذریعہ قلب کے چراغ کو روشن کر کے جسم کے تمام نظامِ باطن کو سالک روشن کر لیتا ہے۔

یا کہ باشد آفتاب طالع واز تابِ او　　　ہر مکاں روشن ہمیں ساں روح اندر جسمِ تو

ترجمہ: یا ایک روشن سورج ہو اور اس کی روشنی سے ہر مکان روشن ہو، اسی طرح روح کے ذریعہ جسم کے نظام میں روشنی قائم ہے۔

تشریح: یعنی جس طرح سورج ہر ایک مکان کو اور ہر ایک مقام کو جو اس کے محاذ میں ہو روشن کر دیتا ہے، اسی طرح جسمِ انسانی میں قلب کے اندر جو روحِ حیوانی موجود ہے وہ مدبّرِ بدن ہے اور تمام جسم کے نظامِ ظاہری و باطنی کو قائم رکھے ہوئے ہے، اور صنعتِ خداوندی کا یہ شاہکار چراغِ باطن، زندگی کو روشن کئے ہوئے ہے۔

شاہ دریک جائے باشد آمر او در ہر مکاں   ہست جاری بے تفاوت ایں مثال از روح داں

ترجمہ: بادشاہ تو ایک ہی جگہ پر رہتا ہے لیکن اس کا حکم ہر مقام پر جاری رہتا ہے، بغیر کسی کمی زیادتی کے روح کی مثال اسی طرح سمجھ لو۔

تشریح: یعنی روح کی خلوت گاہ اگرچہ قلب ہے مگر جس طرح بادشاہ اپنی جگہ تخت پر بیٹھے ہوئے احکام صادر کرتا ہے، اسی طرح روح حیوانی قلب میں اپنے مرکز سے تمام جسم کو احکام صادر کرتی ہے۔ یہاں پر قلب کو سلطنتِ جسم کا شہنشاہ قرار دیا گیا ہے۔

دل کہ باشد جائے خاصِ رویتِ حق بیگماں   معدنِ عقل است وفوجِ روح میداں اندراں

ترجمہ: بیشک دل اللہ تعالیٰ کی تجلیات کے دیدار کا خاص مرکز ہے، یہ عقل کا گہوارہ بھی ہے اور روح کی فوج بھی اسی میں موجود ہے۔

تشریح: یعنی اس میں تو کوئی شک نہیں کہ قلب انوارِ باری کا مرکز ہے، اسی کے ساتھ ساتھ یہ عقل کا گہوارہ ہے، یعنی عقل بھی اسی کی گود میں پرورش پاتی ہے جس طرح بچہ ماں کی گود میں پرورش پاتا ہے اور اس کا دودھ پیتا ہے اسی طرح قلب بھی دماغ کو خون کی سپلائی کر کے عقل کی پرورش کرتا ہے، اور روح کی فوج بھی اسی میں ہے، یعنی جس طرح انتظامی امور کے سلسلے میں فوج کام کرتی ہے، قلب میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت عطا فرمائی ہے کہ وہ جسم کے ہر ایک حصہ کا اس کی ضرورت کے مطابق غذائی اور تربیتی انتظام کرتا ہے۔

از صفاتِ دل ہمی گویم چہ با تو بیش ازیں   می نگر دل را درونش باریابی بالیقیں

ترجمہ: دل کی صفات کے سلسلے میں اس سے زیادہ میں تجھ سے اور کیا کہوں، تو قلب کے باطن میں توجہ کریگا تو صفاتِ باری تک تیری رسائی ہو جائے گی۔

تشریح: اگرچہ قلب مومنین کے عنوان کے تحت قلب کے بارے میں مصنف سب کچھ بیان کر چکے ہیں، یہاں پر چونکہ اس مقام شغل کا تعلق بھی قلب سے تھا اس لئے قلب کی خصوصیات بہت اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قلب کی تعریف اور اس کی

خصوصیات کا احاطہ کرنا بہت دشوار ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ قلب پر توجہ کرنے سے تجلّیات باری کا مشاہدہ شروع ہو جاتا ہے، اس سے بڑھکر اور کیا تعریف ہو سکتی ہے۔

دل حرم گاہِ شہنشاہِ دو عالم اے پسر　　چوں تو خواہی باریابی اندرونش می نگر

ترجمہ: اے سالک! دل تو دونوں جہان کے بادشاہ کا حریم خاص ہے جب تو اس بادشاہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا چاہے تو اس کے باطن میں توجہ کر۔

تشریح: یہ بھی خصوصیاتِ قلب سے ہے کہ وہ دونوں عالم یعنی عالَمِ اَمر اور عالَمِ خَلق کے شہنشاہ کا مخصوص حریم ناز ہے، جہاں ہمیشہ اس کی تجلّیات موجود رہتی ہیں، ان تجلّیات کا مشاہدہ کرنے کیلئے قلب کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے، سالک جب ذکر روحی کے ساتھ اس مقام کا معاینہ کرے گا تو تجلّیاتِ خداوندی کا نظارہ کرے گا۔

دل حرم حق را ست تختش نام لاہوتی مقام　　راست بنگر در مراد را ایں زباں بہر کلام

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے حریم خاص کے تخت کا نام دل ہے اور اس کا مقام لاہوتی ہے، اس زبان سے عرض مدّعا کرنے کیلئے صحیح طریقے پر اس میں غور و فکر کر۔

تشریح: جس طرح دنیاوی بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہو کر تخت شاہی کے سامنے باادب طریقہ پر عرض مدّعا کیا جاتا ہے، اسی طرح اس قلب میں بھی اسی تصوّر کے ساتھ غور و فکر کیا جاتا ہے کہ گویا اس قلب میں تخت شاہی بچھا ہوا ہے اور جس طرح عالم لاہوت میں صرف اسی کی تجلّیات ہیں، اسی طرح اس مقام پر بھی صرف اسی ذاتِ پاک کی تجلّیات ہیں اور سالک نہایت ادب کے ساتھ شہنشاہِ مطلق کے دربار عالی میں کھڑا ہوا عرضِ مدّعا کر رہا ہے۔

نطق در دل بے حروف و صوت لیکن بر زباں　　وقتِ گفتن با حروف و صوت باشد بے گماں

ترجمہ: قلبی گفتگو تو بغیر حروف اور آواز کے ہوتی ہے لیکن زبان سے گفتگو کرنے کے وقت حروف اور آواز کا ساتھ ہوتا ہے۔

تشریح: یعنی دل کی زبان تو ہوتی نہیں، دل سے جو کچھ کہا سنا جاتا ہے وہ بغیر حروف و آواز کے

ہوتا ہے ۔لیکن انسان جب اپنی بات کرتا ہے تو اس کو حروف اور زبان سے کام لینا پڑے گا ، اس لئے قلب کی توجہ کرتے وقت حروف اور آواز سے بھی کام لیا جائے گا تو کوئی مضایقہ نہیں ۔ اور بغیر آواز و حروف کے اپنی فریاد پیش کی جائے تب بھی صحیح ہے کیونکہ ۔

خود بگوید در نہان و نطقِ خود خود بشنود　　بہر اخفارِ رازِ خود را در خودی پنہاں کند

ترجمہ : حقیقت میں تو وہ خود ہی کہتا ہے اور اپنی بات خود ہی سنتا ہے لیکن اپنے راز کو چھپانے کیلئے اس نے اپنی صفات میں خود کو چھپا رکھا ہے ۔

تشریح : معاملہ یہ ہے کہ قلب سے کس طرح بات کی جائے جبکہ نہ اس کے زبان ہے ، نہ حروف و آواز سے اس کو واسطہ ہے اور قلب حریم خاص بھی ہے جہاں فریاد کی جاتی ہے اور شہنشاہ اسکو سنتا ہے اور فریاد رسی کرتا ہے ۔ اس سلسلہ میں مصنّف فرماتے ہیں کہ قلب سے گفتگو کیلئے ، اس حریم خاص میں فریاد پہونچانے کیلئے حروف و زبان کی ضرورت ہی نہیں ، اس لئے کہ انسان جو بھی گفتگو کرتا ہے وہ اسی کے حکم سے کرتا ہے ، اور دوسرا انسان جو کچھ سنتا ہے وہ بھی اسی کے حکم سے سنتا ہے ، تو دونوں جگہ اسی کی صفات کی جلوہ گری ہے گویا وہ خود ہی کہہ رہا ہے اور خود ہی سن رہا ہے ، لیکن یہ کہنا سننا عالمِ خلق میں مظاہر صفات کے ساتھ ہے ، اس لئے کہ وہ ایسی ذاتِ لطیف ہے جو اِدراک سے ماوراء ہے جس انداز میں مصنّف نے تشریح کی ہے ، اس کو وحدۃ الوجود کہتے ہیں ، ہم نے اُس انداز میں اس کی تشریح کی ہے جو فیضان مرشد کے طفیل معلوم ہوا کہ درحقیقت وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے نزاع کو ختم کرنے کیلئے وحدۃ الذّات اور وحدۃ الصّفات کی اصطلاح زیادہ مناسب ہے کہ ذات میں تو اتحاد کسی درجہ میں بھی ممکن نہیں ، البتہ صفات میں حسبِ استعداد و عطائے خداوندی پر تو صفات موجود ہے ، اس صورت میں دونوں طرف سے نزاع لفظی بھی ختم ہو جاتا ہے جب کہ نزاع حقیقی و معنوی تو پہلے بھی نہ تھا ۔

ایں مقامے را یکے در بہر ایں شد لے پسر　　تا مقالت کم بگردد از تسامع و زبصر

ترجمہ : اے سالک ! اس مقام کا صرف ایک دروازہ اس لئے مقرر ہوا تاکہ تیری گفتگو

کا تناسب سننے اور دیکھنے سے کم ہو سکے۔

تشریح: جس طرح تینوں مقامات میں روح کی دہلیز کان، آنکھ اور ناک کو مقرر کیا گیا ہے، اسی طرح اس مقام کا دروازہ زبان ہے، قلب کو حریم خاص کا تخت مقرر کر کے اس کے سامنے فریاد کے لئے یہ دروازہ مقرر کیا گیا ہے اور چونکہ یہ عالم لاہوت ہے اسلئے یہاں سننے اور دیکھنے کا معاملہ بکثرت ہے کیونکہ اس عالم لاہوت میں تجلیات کی اس قدر کثرت ہے کہ سالک عالمِ حیرت میں غرق ہو جاتا ہے اور زبان تو بڑی مشکل سے کھلتی ہے۔ اور کچھ کہا بھی جاتا ہے تو زبانِ قلب سے کام لیا جاتا ہے جس کو وہ بے مثال سمیعِ مطلق سنتا ہے۔

نیست بہتر ہیچ چیزے در خلائق از زباں   کاں بخواہد برد در فردوس و دوزخ بیگماں

ترجمہ: مخلوقات میں زبان سے بہتر کوئی شے نہیں ہے، اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ جنت میں بھی لے جائے گی اور دوزخ میں بھی۔

تشریح: زبان ظاہری ہو یا باطنی، اس سے بہتر جسم انسانی میں کوئی شے نہیں، کہ اس کے ذریعہ ظاہر اور باطن کی آبادی اور بربادی کا فیصلہ ہوتا ہے۔ لسانِ ظاہری کے اقرار سے انسان دائرۂ اسلام میں آجاتا ہے اور اسی کے ذریعہ اسلام سے نکل بھی جاتا ہے اور لسانِ باطن کے اقرار سے ایمان کی وابستگی ہے۔ اس لئے یہی شے اِقرارِ توحید و رسالت کے بعد جنّت میں لے جائے گی، اور انکار کرنے پر دوزخ میں لے جانے والی بھی یہی ہے۔

ہر کہ ساکت شد سلامت باشدش از دو جہاں   مردِ صامت گشت بہتر درمیان مردماں

ترجمہ: جو کوئی خاموش رہا وہ دونوں جہان میں سلامتی کے ساتھ رہا، خاموش رہنے والا آدمی لوگوں میں پسندیدہ بھی ہوتا ہے۔

لیکن اینجا بعد ایماں دو سخن برتر بداں   ذکر کردن، صدق گفتن فرض آمد ہر زماں

ترجمہ: لیکن اس موقع پر ایمان کے بعد دو باتوں کو بہت اعلیٰ سمجھو، ایک تو ذکر کرنا اور دوسرے ہمیشہ سچ بولنا نہایت ضروری ہے۔

تشریح : اس سے پہلے شعر میں مصنف نے خاموش رہنے کو بہت عمدہ قرار دیا تھا، اسی سلسلہ میں یہ تشریح کر رہے ہیں کہ خاموش رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی ہر وقت چپ ہی رہے، بلکہ ایمان کی دولت کے بعد یہ دونوں امر بہت ضروری ہیں کہ آدمی ہر وقت ذکر سے اپنی زبان کو تر اور تازہ رکھے اور ہمیشہ سچ بولنے کو اپنا شعار بنالے۔ دیکھنے میں تو یہ باتیں ایک سادہ سی حقیقت ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس شغل کے آخر میں حضرت مصنّف نے شریعت و طریقت کا خلاصہ بیان کر دیا ہے کہ صوفیاء کرام جس خاموشی کی تاکید کرتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ زبان کو بے فائدہ اور آخرت کے نفع سے خالی باتوں میں مشغول نہ کیا جائے، ورنہ جو چیزیں آخرت کے لئے مفید اور کار آمد ہیں ان میں تو زبان کو مشغول ہی رکھا جائے گا، اور اس سلسلے میں مصنّف تین باتیں بیان کر رہے ہیں، ایک ایمان جس کے بغیر کوئی عمل صالح قابل قبول نہیں، دوسرے ذکر، کہ ایمان کے قلب میں حاصل ہو جانے کے بعد یہ سب سے بڑی عبادت ہے اور حقیقت کے پیش نظر نماز، تسبیحات اور تمام اوراد و اشغال اسی کی عملی تفسیر ہیں۔ اور تیسرے سچ بولنا، یہ لفظ بھی اپنی حقیقت کے اعتبار سے اتنا عام ہے کہ پوری شریعت و طریقت اسی کی تفصیلات ہیں کیونکہ ایمان بھی دنیا و آخرت کی ایک بڑی سچائی کا نام ہے اور عرفان و عبادت بھی اسی سچائی کا ایک اہم حصہ ہیں اور صوفیاء کرام کے اوراد و اشغال بھی اسی کا جز ہیں۔

صمت بہتر داں ز کفر حق تعالیٰ اے پسر　　چند گویم زیں فزوں در شغل دیگر می نگر

ترجمہ : اے سالک! اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے سے بہتر خاموش رہنا ہے، اس سے زیادہ اس مقام کی تشریح اور کیا کروں، اب دوسرے شغل کی طرف توجہ کرو۔

تشریح : یعنی ایسے کلمات کی ادائیگی سے زبان کا خاموش رہنا بہتر ہے جن سے کفر لازم آتا ہے، البتہ ذکر اور اظہار حق سے زبان کو کبھی نہ روکنا چاہیئے۔

نوٹ۔ اس شغل مقام چہارگانہ میں ہم نے تین مقامات کے نقشے بنا کر ایک اجمالی خاکہ شغل کا بیان کر دیا تھا، اس چوتھے مقام کا نقشہ بھی اب پیش کیا جا رہا ہے، اس کو مؤخر اس لئے

کر دیا گیا تھا کہ اس کے ساتھ تینوں پہلے نقشے بھی درج کر دیے جائیں تاکہ بیک نظر اس شغل کا تدریجی اور مرحلہ وار ارتقاء سمجھ میں آجائے، یعنی سالک جب ایک مقام سے ترقی کر کے دوسرے مقام پر پہونچتا ہے تو اسکے طریق کار میں، اسکی کیفیات میں، ارتقائی نصب العین کس انداز میں موجود ہے

		نمبر ۱	نمبر ۲	نمبر ۳	نمبر ۴
(۱)	مقام	مقام مقعدہ	مقام معدہ	مقام سرّ	مقام قلب
(۲)	متعلق بہ	عالم ناسوت	عالم ملکوت	عالم جبروت	عالم لاہوت
(۳)	عمل بر	شریعت	طریقت	حقیقت	معرفت
(۴)	ذکر	لسانی	قلبی	روحی	سرّی
(۵)	خواص عناصر	آگ	ہوا	پانی	خاک
(۶)	اثرات	مغلوبیت نفس امّارہ	معیّت نفس لوامہ	نفس مطمئنہ	نفس ملہمہ
(۷)	حصول	توحید قولی	توحید فعلی	توحید احوالی	توحید ذاتی
(۸)	مرکز شغل	لطیفۂ نفس	لطیفۂ روح	لطیفۂ سرّ	لطیفۂ قلب
(۹)	شغل	مراقبہ	مکاشفہ	مشاہدہ	معاینہ
(۱۰)	طریق	عزرائیل	اسرافیل	میکائیل	جبرائیل
(۱۱)	لطیفہ کا رنگ	زرد	سبز	نیلگوں	سرخ زردی مائل
(۱۲)	دہلیز	گوش	بینی	چشم	زبان

زمانے بھر میں پھرنے سے بھی حاصل ہو نہیں پاتا
ملا جو تجربہ خود اپنے اندر گھوم کر مجھکو

دربیانِ آنکہ دردلِ مردماں چہار خواطر اند

انسانوں کے دل میں چار قسم کے خطرات پائے جانیکا بیان

شغلِ دیگر در مقامِ دل بگویم ہوشدار دمبدم لیکن گماری دل بہر خطرات چار

ترجمہ: مقامِ قلب کے بارے میں ایک اور قابلِ توجہ شغل کا بیان کر رہا ہوں، وقتاً فوقتاً دل چار خطرات میں سے کسی ایک خطرہ میں پھنسا رہتا ہے۔

تشریح: یہ انسان کی فطرت ہے کہ اس کے دل میں کسی نہ کسی خیال اور وسوسہ کا گذر ہوتا رہتا ہے اور کوئی نہ کوئی آرزو جنم لیتی رہتی ہے، جب تک قلب متحرک ہے ایسے خیالات میں ہمیشہ گھرا ہوا رہتا ہے، اچھے اور بُرے دونوں قسم کے خیالات آتے رہتے ہیں اور آتے رہیں گے اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ بُرے خیالات کے اثرات بھی عام طور سے بُرے ہوتے ہیں، کیونکہ خیالات کسی نہ کسی صورت میں کبھی نہ کبھی عملی شکل ضرور اختیار کرتے ہیں اور عمدہ و پاکیزہ خیالات اپنے بہترین نتائج کے اعتبار سے بہت خوب ہیں اور لائق ستائش بھی مگر راہِ سلوک میں محبوبِ حقیقی کے تصوّر کے علاوہ ہر ایک شے غیر مقصود ہے بلکہ مقصود تک رسائی میں حجاب ہے، اِسی لئے محققین صوفیاء نے پاکیزہ خیالات کو قلب کیلئے خطرات کا عنوان دیا ہے۔ گذر چکا ہے کہ قلبِ مومن عرشِ الٰہی ہے اور عرشِ بریں پر جلوۂ محبوب کے سوا کسی کا وجود ہی نہیں، پھر قلبِ سالک پر کسی دوسرے کا کسی بھی اعتبار سے وجود ہی نہیں ہونا چاہیئے ورنہ پھر اس قلب میں شانِ عرشیت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آئینۂ قلب سے ذات وحدہٗ لاشریک کے صفاتی نقوش کے علاوہ ہر طرح کے نقش کو مٹانا ضروری ہے تاکہ مقصودِ حقیقی تک رسائی میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ ترتیب وار ان چاروں خطرات کا بیان فرما رہے ہیں۔

اولینش خطرۂ رحمانی کاردِ علمِ غیب بعض را در دلِ زاہد لئے خدا بیشد و درِ غیب

ترجمہ: ان خطرات میں پہلا خطرۂ رحمانی ہے کہ اس کے ذریعہ علمِ غیب کا حصول

ہوتا ہے بغیر کسی شک و شبہ کے بعض حضرات کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔

تشریح: سب سے اعلیٰ درجہ کا خطرہ یعنی خیال جو سالک کے دل میں آتا ہے اس کو خطرہ رحمانی کہتے ہیں کہ سالک کے قلبِ مصفّٰی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے خیالات کا ورود ہوتا ہے جو عالمِ غیب سے متعلق ہوتے ہیں جس کے ذریعہ نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں اور وہ اشیاء اور حالات و معاملات جو عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں سالک کے لیے ظاہر ہوتے ہیں، یہ ایسے امور ہیں جن کے حصول کا تعلق حواسِ خمسۂ ظاہرہ کی دسترس سے باہر ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی نوازش خاص سے یہ نعمت میسّر ہوتی ہے۔

عشقِ مولیٰ در دلش غالب بگردد مستوار   دل بود روشن وہم در یادِ باری بے قرار

ترجمہ: والہانہ انداز میں اللہ تعالیٰ کا عشق سالک کے دل پر غلبہ حاصل کرلیتا ہے اور اس کی برکات سے اس کا دل روشن اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں تڑپتا رہتا ہے

تشریح: یعنی خطرہ رحمانی سے عالمِ غیب کے مشاہدہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سالک کے قلب پر عشقِ الٰہی کا غلبہ ہوجاتا ہے اور اس غلبہ کی وجہ سے تمام کثافت ختم ہوکر لطافت کا تسلّط ہوجاتا ہے اور قلب نورِ خداوندی سے منوّر ہوجاتا ہے اور صرف اسی کی یاد میں سالک کا قلب ہمیشہ بے قرار رہتا ہے۔ یہاں ایک قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ قلب کی صفت از روئے حدیث پاک یہ بھی ہے کہ اس میں جلوۂ خداوندی اس شان کے ساتھ سما جاتا ہے کہ اس کی وسعت کے مقابل آسمان و زمین کی وسعت بھی ہیچ ہے۔ اس لیے اس میں تمام دیگر اشیاء کا وجود بھی ہوگا مگر مغلوبیت کا انداز لیے ہوئے۔ قلبِ سالک پر خطرہ رحمانی کے سبب غلبہ اگر کسی چیز کا ہوگا تو وہ عشق وحدہٗ لاشریک کا ہوگا یہی اس خطرہ کی پہچان ہے۔ ھکذا قال مرشدی

از ملائک ثانیش کو در غلا نند مستدام   مومناں را سوئے نیکو بندگی حق مدام

ترجمہ: خطرہ کی دوسری قسم یہ ہے کہ فرشتوں کی طرف سے ہو جو برابر ترغیب دیتے رہتے ہیں ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت کی بہترین طریقہ پر۔

تشریح : خطرات کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ قلب سالک میں آنے والے خیالات اگر ایسے ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی بندگی کا ذوق وشوق پیدا ہو اور اس ذوق وشوق میں استقلال اور پابندی کا مزاج بن جائے تو یہ خطرہ فرشتوں کی طرف سے ہے یعنی جس طرح فرشتے پابندی اور یکسوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں اسی طرح سالک کے دل میں پاک وصاف خیالات کی آمد اس انداز میں ہو کہ مکمل بندگی کا جذبہ اس میں پیدا ہو جائے تو گویا فرشتوں سے یک گونہ روحانی رابطہ قائم ہو گیا ۔ اسی لئے اس قسم کے خیالات کو فرشتوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے ۔

می نماید ترس عصیاں باز دارد از گناہ   دائما گوید بترس از خالق وشو عذر خواہ

ترجمہ : وہ سالک کو نافرمانی سے خوف دلاتا ہے اور گناہ سے روکتا رہتا ہے اور ہمیشہ سالک سے کہتا ہے کہ خالق سے ڈر اور اپنے گناہوں کی معافی مانگ ۔

تشریح : اس قسم کا پاک خیال قلبِ سالک میں آنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ سالک کے دل میں اطاعت وعبادتِ خداوندی کا جذبہ اس طرح بیدار ہو جاتا ہے کہ گناہ کا ارتکاب کرنے اور نافرمانی سے اس کو خوف معلوم ہوتا ہے اور طبعی طور پر اس کو گناہوں سے نفرت ہو جاتی ہے بلکہ وہ استقلال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے باوجود اس کی بارگاہ عالیہ میں اپنی کوتاہی کی معافی مانگتا رہتا ہے اور مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ کی حقیقت اسکے پیش نظر رہتی ہے ۔

سوم زاں خطرۂ نفسانی است از ہوشِ خویش   نیک بیند یا نہ بیند او ندارد شرم پیش

ترجمہ : تیسرا خطرہ ، خطرۂ نفسانی ہے کہ اپنی سمجھ کے مطابق کسی چیز کو اچھا سمجھتا ہو یا بُرا سمجھتا ہو اور شرم ولحاظ بھی ختم ہو جائے ۔

تشریح : خطرۂ نفسانی کے عنوان سے مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس عنوان کے بعد ہی تفصیل سے گفتگو کر رہے ہیں ، کیوں کہ اس کی تشریح میں مختلف اقوال ہیں اور مصنف نے جسکو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ سالک اپنے ہوش وحواس میں رہ کر منہیات شرعی سے پرہیز کرتا ہو لیکن

غلبۂ طبیعت سے مجبور ہو کر کسی وقت کسل مندی کا شکار ہو جائے اور کسی وقت حدِّ اعتدال سے گذر جائے، یا اس انداز میں عبادت و ریاضت کا اہتمام کرے جس میں خلوص وللّٰہیت نہ ہو بلکہ نفس کا تقاضا ہو اور شہرت وحصولِ عزّت کی وجہ سے ہو اور ایسے امور کے ارتکاب میں اس کو اللہ تعالیٰ سے شرم وغیرت بھی محسوس نہ ہو کہ وہ پروردگارِ عالم مکمل طور پر غیب کا جاننے والا ہے، وہ میرے اس عمل کی حقیقت سے بخوبی واقف ہے. حقیقت یہ ہے کہ ریا کار آدمی کو اللہ تعالیٰ سے شرم وغیرت نہیں آتی. وہ بندوں سے شرماتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات سب سے زیادہ اس کی مستحق ہے، اگر سالک میں اس قسم کی تصنّع اور بناوٹ ہے تو یہ خطرۂ نفسانی سے متعلق ہے.

چارمی زاں خطرۂ شیطانی داں کو مستدام نفس را بالوثِ عصیاں می کنا ند زشت نام

ترجمہ: چوتھا درجہ خطرۂ شیطانی کا ہے کہ وہ خطرہ ہمیشہ نفس کو گناہوں میں ملوّث کر کے بدنام کرنے کی کوشش کرتا ہے.

تشریح: اس قسم کے خیالات جن سے گناہوں کی طرف توجہ ہو وہ خطرۂ شیطانی کہلاتے ہیں، نفس کو تو گناہوں میں لذّت محسوس ہوتی ہے اور شیطان مردود تو سالک کے پیچھے اس طرح لگ جاتا ہے کہ رحمتِ خداوندی ہی اس سے حفاظت کرے تو ہو سکتی ہے، ہر طرح سے سالک کو منزل کی طرف قدم بڑھانے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے اور صرف گناہوں کی طرف ترغیب دلاتا ہے تاکہ دنیا اور آخرت میں بدنام ہو.

در بیانِ خطرۂ نفسانی

خطرۂ نفسانی کا بیان

بازگویم بر طریقِ دیگرش ہم گوش دار ہر بیانش یک نہ بینی در دل خود ہوش دار

ترجمہ: ایک اور طریقے سے پھر بیان کرتا ہوں جو قابلِ توجہ ہے، اور اس بات کا بھی دھیان رکھ کہ ہر ایک بیان کو اپنے دل میں ایک نہ سمجھو۔

تشریح: اس سے پہلے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے سالک کے لیے جن چار قسم کے خطرات کا مختصر طور پر ذکر کیا تھا ان میں سے خطرۂ نفسانی کا ذکر تفصیل سے اس لیے کر رہے ہیں کہ اس خطرۂ نفسانی کی تشریح محققین صوفیاء نے الگ الگ انداز میں کی ہے، مصنف نے اپنے رجحان کا اظہار تو اجمالی طور پر کر دیا تھا لیکن دیگر حضرات نے جو اس کی تشریح کی ہے وہ بھی بیان کر دی جائے تاکہ بات مکمل طور پر سامنے آجائے، اس کی طرف مصنف اشارہ بھی کر رہے ہیں کہ یہاں پر جس بات کو دہرایا جا رہا ہے اس کا مقصد صرف تکرارِ کلام ہی نہیں ہے بلکہ دونوں تشریح کا فرق ظاہر کرنا بھی مقصود ہے۔

ہر چہ دل را می برد سوئے خلافِ شرع و دیں آں مقرر خطرۂ نفسانی باشد بالیقیں

ترجمہ: جو خیال بھی دل کو شریعت اور دین کے خلاف کام کرنے پر اکسائے، اس کے بارے میں یہ بات طے شدہ اور یقینی ہے کہ وہ خطرۂ نفسانی ہے۔

تشریح: اس سے پہلے اجمالی طور پر مصنف نے خطرۂ نفسانی کی جو تشریح کی تھی اس میں منہیاتِ شرعی سے پرہیز کا نقطہ پیشِ نظر تھا اور غلبۂ طبیعت اور عدمِ خلوص بنیاد تھی، لیکن بعض حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ خلافِ شرع امور کو کرنے پر دل میں جو خیال آئے اسکا تعلق خطرۂ نفسانی سے ہے کیونکہ

خطرۂ نفسانی از تعلیمِ شیطان است داں نفس را بردن خلافِ شرع خواہد لا اماں

ترجمہ: یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ خطرۂ نفسانی شیطان کے سکھانے پڑھانے سے ہوتا ہے

اور وہ نفس کو شریعت کے خلاف کام کرنے پر ابھارتا ہے، اللہ ہم سب کو محفوظ رکھے،

تشریح: اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا طریقہ، طریقِ محمدی ہے جس کو شریعت کہا جاتا ہے اور شیطان چونکہ انسان کا اور خصوصاً مومنین کا ازلی دشمن ہے، اس لئے وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح سے جادۂ مستقیم سے سالک کو ہٹادے اور اس کی یہ کوشش نفس کے ذریعہ پوری ہوتی ہے کہ وہ قلب میں ایسے خیالات پیدا کرتا ہے جو خلافِ شرع ہوں، اعلانِ خداوندی ہے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کہ آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کردیا، اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت تک کے لئے وہ دستور العمل دیدیا جس پر عمل کرکے احکم الحاکمین کی بارگاہ تک رسائی ہوگی۔ شیطان چونکہ مردودِ بارگاہ ہے اس لئے اُس کی تمام کوششیں اس انداز پر ہوتی ہیں کہ سالک کو اس صحیح سمت میں چلنے سے روکے اور غلط راستہ کی طرف لے جائے، اس لئے بعض حضرات نے اس قسم کے خیالات کو بھی شیطان کی طرف منسوب کیا ہے۔

گفت بعضے اہلِ وصلت خطرۂ نفسانی ایں ۔۔۔ کسوتِ خوش لقمہ لذت طمع شہوت ہمیں

ترجمہ: بعض واصل بحق حضرات نے فرمایا کہ خطرۂ نفسانی یہ ہے، عمدہ لباس پہننا، ذائقہ دار کھانا کھانا، لالچ اور شہوت کا موجود ہونا۔

تشریح: اس سے قبل شعر میں خطرۂ نفسانی کی تشریح میں بتایا گیا تھا کہ خلافِ شرع امور کے انتخاب پر برانگیختہ کرنا خطرۂ نفسانی ہے، لیکن بعض حضرات صوفیاء یہ بھی فرماتے ہیں کہ منہیاتِ شرعیہ سے پرہیز کرنے کے باوجود سالک کے دل میں اس قسم کے خیالات آئیں کہ اس کی طبیعت لباس فاخرہ پہننے کی خواہش کرے یا مزیدار اور طرح طرح کے کھانے کی طرف میلانِ طبع ہو، یا فانی چیزوں میں سالک کی توجہ لگی رہے، نیز دائرۂ شریعت میں رہ کر کثرتِ شہوت کا شکار ہو، اس قسم کے خطرات کو بھی بعض حضرات خطرۂ نفسانی کی طرف منسوب کرتے ہیں کیوں کہ یہ تمام اسباب بھی فی الحقیقت مقصودِ اصلی کی طرف

توجہ مبذول کرنے میں ایک قسم کی رکاوٹ ہیں، اس لئے کہ ان تمام چیزوں کا تعلق نفس سے ہے اور نفس کی تمناؤں کی کوئی انتہا نہیں، ہر لمحہ ہر آن ایک نئی آرزو جنم لیتی رہے گی اور سالک اس طرف اگر اپنی توجہ کرے گا تو پھر منزل سے بہت دور چلا جائے گا۔

اوبخواہد خویشتن را زیب و زینت ہر زماں　　چند گویم معدنِ خبث است نفسِ مردماں

ترجمہ: وہ ہر وقت اپنے لئے زیب و زینت کا مطالبہ کرتا رہے گا، اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ نفس انسانی برائیوں کا مرکز ہے۔

تشریح: مصنف فرماتے ہیں کہ نفس انسانی کی آرزوؤں اور خواہشات کی تو کوئی انتہا نہیں، یہ تو ہر وقت یہی چاہتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اسی لئے سالکانِ راہِ معرفت کیلئے ضروری ہے کہ ہر لمحہ نفس کی روباہ بازی سے چوکنا اور ہوشیار رہے کیونکہ یہ نفس برائیوں کا مرکز ہے، اس سے زیادہ الفاظ میں اس کی حقیقت اور کیا بیان کی جاسکتی ہے۔

نفس کافر نام او را شد بت اکبر بتر　　جنگ با او جنگ اکبر در حدیث آمد نگر

ترجمہ: اس کا نام نفس کافر بھی ہے اور یہ سب سے بڑے بت سے بھی زیادہ برا ہے، حدیث پاک میں دیکھو کہ اس کے ساتھ جنگ کرنا جہاد اکبر ہے۔

تشریح: نفس کی خباثت اور شرارت کی وجہ سے اس کا نام نفس کافر بھی ہے، کیونکہ فکری اور عملی اعتبار سے یہی نفس انسان کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ حقائقِ فطرت سے انکار کرے یعنی قوانینِ خداوندی میں جن کاموں کو بہترین قرار دیا گیا ہے ان کی عظمت اور عمدگی کی حقیقت کو دل سے ماننے کیلئے انسان اسی کی وجہ سے آمادہ نہیں ہوتا اور برے کاموں کے ارتکاب سے باوجود سخت عذاب کی وعید کے نہیں رکتا، کیوں کہ اس نفس کافر نے انسان کو اپنے جال میں پھانس لیا ہے اور وہ اچھی چیزوں کو برا اور بری چیزوں کو اچھا کرکے دکھلاتا ہے، اب بتلائیے کہ یہ انکارِ حقیقت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ اور حقیقت سے انکار کرنا یا اس کو چھپانا ہی تو کفر ہے۔ اور یہی نہیں کہ نفس کا معاملہ کفر تک ہو، بلکہ

یہ نفس تو اپنی ناپاکی اور خباثت میں بڑے بڑے بتوں سے بھی زیادہ برا ہے، کیوں کہ بتوں کے وجود سے ہر ذی شعور اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ انسان کو شرک اور خباثت و ناپاکی کا احساس ہو جاتا ہے لیکن اِس نفس کی برائیاں اور چالیں بڑی عجیب ہوتی ہیں جن کا سمجھنا بڑا مشکل کام ہے۔ اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نفس کے ساتھ جنگ کرنے کو جہادِ اکبر فرمایا ہے۔ کیوں کہ میدانِ جنگ میں تو دشمن سامنے ہوتا ہے اور اس کی تمام حرکات و سکنات سے واقفیت ہو جاتی ہے لیکن یہ نفس تو پوشیدگی کے ساتھ غیر محسوس طریقے پر اس طرح حملہ کرتا ہے کہ بڑے بڑے ہوشمند بھی اس کے مکر و فریب کا شکار ہو کر منزل سے دور جا پڑتے ہیں۔

مومناں را دشمنِ سخت است نفسِ زشت خصال جز بہ تیغِ ترکِ شہوت قتلِ او باشد محال

ترجمہ : یہ نفس خانہ خراب ایمان والوں کا تو بہت ہی بڑا دشمن ہے ترکِ خواہشات کی تلوار کے بغیر اس کا قتل کرنا ناممکن ہے۔

تشریح : اس نفس کے بہکاوے میں آکر جو لوگ ہدایت کے نور سے محروم ہیں، یا وہ لوگ جو اس نفس کی پیروی میں لگے ہوئے ہیں۔ ان سب کی طرف سے تو اس نفس کو بے فکری ہے لیکن جن حضرات کو توفیقِ خداوندی ایمان کی دولت عطا ہوئی ہے اور انھوں نے اپنی تمام خواہشات کو خالقِ کائنات کی مرضی کے تابع کر دیا ہے ایسے حضرات کا خاص طور پر یہ نفس دشمن ہے، اس دشمن کو فنا کے گھاٹ اسی وقت اتارا جا سکتا ہے کہ تمام کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق کئے جائیں اور اس نفس کی مرضیات و پسند کے خلاف ہر محاذ پر مورچہ بندی کر دی جائے، تاکہ کسی طرف سے بھی اس کو قلب و دماغ میں آنے کا موقع نہ ملے، اللہ تعالیٰ کی مرضی پر چلنا اور نفس کی مرضی کے خلاف چلنا ہی ایسی دو دھاری تلوار ہے جس کے ذریعہ اس دشمن کو ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں، یہی وجہ ہے کہ جن کا عمل ایسا ہو کہ رحمان بھی راضی رہے اور شیطان بھی ناراض

نہ ہو وہ نفس کے بڑے دھوکے میں مبتلا ہیں، حق و صداقت روز روشن کی طرح ظاہر ہے اور باطل و ضلالت اندھیری رات کی طرح سیاہ ہے، دونوں کے درمیان کوئی رابطہ نہیں، دونوں کو الگ الگ کرنا ہی ہوگا۔

بادشہ نفس است و سر لشکر ہوا بس ہوشدار   پیرویش ہر کہ ورزید او سراسر گشت خوار

ترجمہ: بس یہ دھیان رکھو کہ نفس ایک بادشاہ کی طرح ہے اور اس کے لشکر کا سردار خواہش ہے جس نے بھی اس کی پیروی کی وہ مکمل طور پر ذلیل و خوار ہوگیا۔

تشریح: یہاں مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے نفس انسانی کی حقیقت کو بہت ہی عمدہ طریقہ پر سمجھایا ہے کہ جسم انسانی میں اس کی حیثیت ایک بادشاہ کی سی فرض کرلو اور ظاہر بات ہے کہ شہنشاہیت کی پائیداری اور شان و شوکت کا راز عسکری قوت اور نئی نئی پالیسیوں میں پنہاں ہوتا ہے، جس بادشاہ کے سیاسی مشیر اور میدانِ جنگ کے بہادر جسقدر چالاک ہوں گے اس کی سلطنت بھی اسی انداز سے مضبوط ہوگی۔

جسم انسانی میں اس بادشاہ یعنی نفس کا لشکر خواہشات ہیں اور یہ لشکر انسان کی متاعِ ایمان کو تباہ کرنے کیلئے ہمہ وقت مستعد رہتا ہے، اب جس قدر بھی خواہشات نفسانی کی کثرت ہوگی اسی قدر اس نفس کی گرفت مضبوط ہوگی اور جس قدر بھی ان خواہشات نفسانی کی پرورش اور پیروی ہوتی رہے گی یہ لشکر بڑھتا ہی چلا جائے گا اور متاعِ ایمان کی حفاظت دشوار سے دشوار تر ہوتی چلی جائے گی۔

اور ظاہر بات ہے کہ خواہشات کی کثرت کا انجام ذلت اور خواری کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ یہ نفس تو ایسے ہی کام کرنے کی ترغیب دے گا جو اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے خلاف ہوں اور اللہ کی مرضیات کے خلاف جو بھی کام کرے گا اس کا انجام یقینی طور پر ہلاکت اور بربادی ہے، ذلت اور خواری ہے۔

اس چند روزہ زندگی میں بھی ایسے واقعات دیکھنے میں آتے ہیں اور آخرت میں تو

نفس کی پیروی کرنے والوں کے لئے مکمل طور پر ذلت وخواری ہے۔ اللھم احفظنا منہ۔

در پئے ایں نفسِ مذمومہ بسے از انس وجاں ‏ ‏ ‏ می شوند از اہلِ دوزخ در عذابِ جاوداں

ترجمہ: اس بُرے نفس کی پیروی کر کے بہت سے جنّات اور انسان، دوزخی ہو جائیں گے اور وہاں ہمیشہ ہمیش کے عذاب میں مبتلا رہیں گے۔

تشریح: یعنی یہ نفس معمولی دشمن نہیں ہے کہ تھوڑا بہت نقصان پہونچا کر پیچھا چھوڑ دے بلکہ اس کی خباثت کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو دنیا میں ذلیل وخوار کرتا ہے اور آخرت میں بھی اُن کو اس طرح کی ذلت وخواری سے واسطہ پڑے گا جس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ تمام مخلوقات میں انسان اور جنّات احکامِ شریعت کے مکلّف قرار دیے گئے ہیں۔ یہ نفسِ مردود ایسا ہے کہ انسان اور جنّات میں سے جس نے بھی اس کی پیروی کی تو لازمی طور پر وہ حقائق کو سمجھنے سے اس کو محروم کر دے گا اور اس کی عقل وخرد پر اس طرح پردہ ڈال دے گا کہ وہ قدرتِ خداوندی کی واضح نشانیاں دیکھ کر بھی نہ توحید کا ایجاب کرے گا اور نہ رسالت کا اقرار کرے گا بلکہ کفر وشرک میں ملوّث ہو کر اپنے برے اعمال و عقائد کی وجہ سے دوزخی ہوگا اور وہاں اسکو ہمیشہ ہمیش کے عذاب میں گرفتار ہونا پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نفس کی شرارتوں سے محفوظ رکھے

۔ آمین۔

دربیانِ خواصِ نفس ونامہائے آں

نفس کے خواص اور اس کے ناموں کا بیان

باز بشنو اے پسر ایں نفس را آمد سہ نام　　نفسِ امارہ یکے کاں بر بدی باشد مدام

ترجمہ: اے سالک پھر سنو کہ اس نفس کے تین نام بیان کئے جاتے ہیں، ان میں ایک نفسِ امارہ ہے جو ہمیشہ برائی پر اکساتا رہتا ہے۔

تشریح: قلبِ سالک میں چار قسم کے خیالات کی آمد کے سلسلے میں مصنف رحمہ اللہ نے خطرۂ نفسانی کا جب تفصیل سے ذکر کیا تو اب یہ بھی مناسب سمجھا کہ نفس کے خواص اور علامات کے اعتبار سے نفس کی اقسام بھی مفصل بیان کر دی جائیں۔

انسان کے جسم میں قوت مؤثرہ اور متاثرہ کے اعتبار سے بظاہر قلب ودماغ کی جو اہمیت ہے اس کی تفصیل "قلبِ مومنین" کے عنوان کے تحت بیان کی جاچکی ہے یہاں پر یہ معاملہ غور طلب ہے کہ آخر انسان کے جسم میں وہ کونسی طاقت ہے جو اس کو برائی یا اچھائی کی طرف مائل کرتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ برائی کی طرف لے جانے والی طاقت اچھائی کی طرف لیجانے والی طاقت کے برعکس ہوگی، ان دونوں طاقتوں کے وجود سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا لیکن یہ بھی عجیب بات ہے کہ جسمِ انسانی میں ان دونوں طاقتوں کے وجود کے باوجود کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کس مقدار میں ان طاقتوں کے اثرات ہیں اور کس حیثیت سے ان کا وجود ہے، نہ کوئی شخص چشم ظاہر سے ان طاقتوں کو دیکھ پایا ہے، صرف احساس تک اس کا تعلق ہے، صوفیائے محققین نے ان دونوں طاقتوں کا مرکز قلب کو قرار دیا ہے کہ جسمِ انسانی میں ان دونوں کا تعلق قلب سے ہے اور تمامتر توجہ اسی پر صرف کی ہے کہ قلب سے برائی کا تعلق کمزور سے کمزور تر ہوجائے یہاں تک کہ قلب کو برائی سے اس طرح نفرت ہوجائے جس میں سماج کا یا انسان کا خوف شامل نہ ہو بلکہ اس حاکمِ مطلق کا حکم چونکہ اس طرح ہے اس لئے

اس کام سے بغیر کسی پس وپیش کے رک جانا ہے، مثلاً پروردگارِ عالم نے غیبت سے منع فرمایا مومن نے اپنی زبان کو غیبت کرنے سے اور کان کو غیبت سننے سے روک دیا، مالکِ مطلق نے چوری سے منع کیا، مومن نے اپنے ہاتھ کو وہ شئے چرانے سے اور اپنے پاؤں کو اس طرف جانے سے روک لیا، حالانکہ بظاہر کوئی ایسی رکاوٹ ان امور کی انجام دہی میں نہ تھی، مگر قلب کا تعلق چونکہ برائی سے کمزور تر ہے، اس لئے اچھائی کے غلبہ نے اس کے رخ کو موڑ دیا ہے اسی اچھائی اور برائی کی طرف لیجانے والی طاقت کو "نفس" کا نام دیا گیا ہے۔ اور اس کے وجود کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ انسان کی تخلیق خداوندِ قدوس نے مختلف المزاج عناصر سے کی ہے، مثلاً آگ، پانی، مٹی، ہوا۔ اور یہ چاروں عناصر اپنے خواص میں ایک دوسرے کے برعکس ہیں آگ کی خاصیت پانی کے برعکس، مٹی کی کثافت ہوا کی لطافت کے برخلاف ہے؛ اسلئے جب مختلف المزاج عناصر سے تخلیقِ انسان ہوئی ہے تو اس تضاد کے اثرات اس کی طبیعت پر ہونے ضروری ہیں۔ ان متضاد اثرات اور کارکردگی کے لحاظ سے نفس کی تین اقسام قرار دی گئی ہیں نفس امّارہ، نفس لوّامہ، نفس مطمئنّہ، یہ بھی خیال رہے کہ ان طاقتوں کو کنٹرول کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے نظامِ جسمانی میں قلب ودماغ کی حاکمیّت بھی قائم کردی ہے۔ اور شعورِ فطرت کے علاوہ ایسے پاک انسانوں کو بھی اچھائی اور برائی کے درمیان حدِّ فاصل قائم کرنے والا بنا کر بھیجا ہے جن کو رسول اور پیغمبر کا لقب دیا گیا ہے۔ ان تمام چیزوں کے باوجود بھی انسان کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ کسی بھی نفس کی پیروی کرے لیکن اچھائی اور برائی کے نتائج سامنے آنے کے بعد اور حاکمِ مطلق کا فیصلہ سننے کے بعد بھی جس نے برائی کا راستہ اختیار کیا تو گویا اس نے نفس امّارہ کی اطاعت کی، وہ منزل سے دور ہوگیا اور جس نے بھلائی کا راستہ اختیار کیا تو اس نے نفس لوّامہ اور نفسِ مطمئنّہ کو اپنا ساتھی بنالیا، اور کامیاب ہوگیا، ان تینوں اقسام میں ایک نفس امّارہ ہے جو ہمیشہ برائی کی طرف لیجاتا ہے اور نفس لوّامہ ومطمئنّہ اس کے برعکس ہیں۔ اس عنوان کے تحت مصنّف رحمۃ اللہ علیہ اس

نفس کے صفاتی نام اور اس کے خواص بیان کر رہے ہیں۔

نفسِ مذموم است امّاری از برائے کافراں   بُت پرستی، شرک ورزی گشت لازم کارِ شاں

ترجمہ: یہی نفسِ امّارہ بہت بُرا نفس ہے جو کافروں کا دوست ہے، بُت پرستی اور مشرکانہ امور اسی لیے اُن کے ساتھ لازم ہو گئے ہیں۔

تشریح: یعنی نفسِ انسانی کی وہ قسم جس کا نام نفسِ امّارہ ہے یہ ہمیشہ برائیوں کی طرف ہی لوگوں کو ترغیب دیتا ہے، یہی وہ نفس ہے جو کافروں کا دوست و مددگار ہے، اس کی پیروی کی وجہ سے وہ حقیقت سے انکار کر بیٹھے، انھوں نے اپنا تعلق رحمٰن سے منقطع کر دیا اور شیطان سے جوڑ لیا۔ جس طرح شیطان اپنی حقیقتِ عبدیت کو بھول گیا اور اس احکم الحاکمین کے حکم کی خلاف ورزی کی اور اپنے نفسِ امّارہ کی پیروی کی، لہذا منزل سے دور ہو گیا، اسی طرح جو لوگ خداوندِ قدوس وحدہٗ لاشریک کی توحید اور اس کے سچے پیغمبر کی رسالت سے انکار کرتے ہیں یہ بھی اپنی حقیقتِ عبدیت کو فراموش کئے ہوئے ہیں اور شیطانِ لعین کی پیروی کر رہے ہیں، شیطان و نفس کی پیروی کی وجہ سے ہی بت پرستی اور شرک میں مبتلا ہو کر منزل سے دور ہو گئے۔

لیکن ایں بد نفس دانی گہہ بقلبِ مومناں   سر کشد تا در گنہ شاں را بدارد ہر زماں

ترجمہ: لیکن تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ کبھی یہ نفسِ امّارہ مومنوں کے دلوں میں بھی، سر اُبھارتا ہے تاکہ ان کو بھی ہر وقت گناہ میں مصروف رکھے۔

تشریح: یہاں مصنف ایک شبہ کو ختم کرنا چاہتے ہیں کہ کہیں تم کو یہ گمان نہ ہو جائے کہ نفسِ امّارہ تو صرف کافروں سے متعلق ہے، پھر مومن سے گناہ اور نافرمانی کا صدور کیوں ہوتا ہے؟ اس شبہ کا جواب دیتے ہوئے مصنف فرماتے ہیں کہ نفسِ امّارہ اگرچہ کافروں کے لئے مخصوص ہے مگر یقین کی ناپختگی، یا غلط معلومات کی وجہ سے یا بے عملی اور بدعملی کی وجہ سے مومن کو بھی یہ گناہ کے کاموں میں پھنسا دیتا ہے۔ البتہ اگر مومن ایقان ویقین اور علمِ صحیح

سے آراستہ ہو کر پروردگار کی بارگاہ میں سر نیاز جھکائے گا تو اللہ تعالیٰ اسکو نفس اور شیطان کی روباہ بازیوں سے محفوظ رکھے گا اور نفس امارہ اور شیطان کا جادو اس پر نہیں چلے گا۔

نفس لوامہ دوم باشد بدانی اے پسر   مومناں را می کند ہر دم ملامت سر بسر

ترجمہ:- اے سالک! تو یہ بات جان لے کہ دوسری قسم نفس لوامہ ہے، جو ایمان والوں کو غلط کام کرنے پر ہر وقت ملامت کرتا رہتا ہے۔

تشریح: اب مصنف نفس کی دوسری قسم یعنی نفس لوامہ کا بیان کر رہے ہیں۔ نفس کی خاصیت تو غفلت اور شہوت ہے اور ایمان کی خاصیت عفت و باخبری ہے، ریاضت اور مجاہدہ سے نفس سے غفلت کو دور کر دیا جاتا ہے لیکن ایقان و عمل میں کوتاہی کی وجہ سے اگر مومن سے کسی امر ممنوعہ کا صدور ہو جاتا ہے تو جو قوت اندر سے اس کو ملامت کرتی ہے اس کا نام نفس لوامہ ہے۔

بہر عصیاں از خدا ترساند و زجرش کند   خویشتن را دائماً در ناامیدی می نہد

ترجمہ: گناہ کے ارتکاب پر اللہ تعالیٰ کی گرفت سے ڈراتا ہے اور اپنے آپ کو ہمیشہ ناامیدی کی کیفیت میں مبتلا رکھتا ہے۔

تشریح: یعنی مومن کو گناہ کے ارتکاب کے بعد ملامت تو کرتا ہی ہے اسکے ساتھ آئندہ گناہ کا ارادہ کرنے پر بھی مومن کو تنبیہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی گرفت کا خوف دلاتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ گناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد حساب کتاب سے بے فکر ہو جانا اور بغیر کسی محاسبہ کے داخلہ بہشت کی امید رکھنا عقل کے خلاف بات ہوگی، بلکہ سالک کو تو یہ خوف دامنگیر ہو جاتا ہے کہ میری فلاں لغزش پر معلوم نہیں میری بخشش ہو یا نہ ہو یعنی سالک عدم یقین کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے اور اپنے گناہوں کا معافی نامہ بار بار بارگاہ خداوندی میں پیش کرتا رہتا ہے۔

کار او جز بندگی حق نہ باشد یک زماں   ہر چہ آید کار نیک از بندہ زو باشد بداں

ترجمہ: اس کا کام ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی بندگی و اطاعت کی طرف لگائے رکھنا ہے

آدمی سے نیک کاموں کا صدور اسی کی ترغیب کی وجہ سے ہوتا ہے۔

تشریح: یہ نفس انسان کو گناہوں کے ارتکاب پر برابر لعنت ملامت کرتا ہے اور نیک کاموں پر اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا تصور پیدا کرتا ہے، اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا کام صرف لعنت ملامت کرنا ہی نہیں بلکہ انسان اپنی زندگی میں جتنے نیک کام کرتا ہے وہ اسی نفس کی رغبت دلانے کی وجہ سے ہے۔

دارد ایں نفس حمیدہ ہر یکے از مومناں　　بلکہ ہر یک اولیاء و انبیاء و مرسلاں

ترجمہ: اس قابلِ تعریف نفس کا تعلق ہر ایک مومن سے ہے، بلکہ تمام اولیاء، انبیاء اور رسولوں سے بھی اس کا تعلق ہے۔

تشریح: جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ اس نفس لوامہ کی ایک صفت تو یہ ہے کہ وہ ہر وقت مومن کو لغزشوں اور گناہوں پر خداوند قدوس کی گرفت سے، آخرت کے حساب کتاب سے خوف دلاتا ہے، دوسری صفت یہ ہے کہ نیک کاموں کے لئے اُکساتا رہتا ہے، اور ظاہر بات ہے کہ کوئی انسان نیک کام جب ہی کرے گا جب اس کو عمدہ بدلے کا یقین ہو، اور گناہوں سے بھی اسی وقت اپنے کو بچائے گا جب احکم الحاکمین کے دربار میں محاسبہ کا خوف ہو، تو گویا اس نفس کے سبب خوف اور امید کی کیفیت پیدا ہو جاتی اور اسی خوف و امید کے درمیان جو چیز قلب انسان میں پرورش پاتی ہے اسی کا نام "ایمان" ہے، اور کوئی اللہ کا ولی یعنی دوست، اور کوئی نبی یا رسول اس کیفیت سے کبھی خالی نہیں ہو سکتا، بلکہ اولیاء و انبیاء اور رسولوں میں تو یہ کیفیت بہت ہی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے مصنف فرماتے ہیں کہ ہر ایک مومن کو، اولیاء و انبیاء اور رسولوں کو یہ صفت نفس عطا کی گئی ہے حالانکہ انبیاء و رسل تو معصوم ہوتے ہیں اور اولیاء محفوظ ہوتے ہیں لیکن بایں ہمہ تقاضائے بشریت سے بھی متصف ہیں

از ملامت ہیچکس خالی نہ بودہ در جہاں　　می نگر یا لیت گفتا اصفیاء از بہرِ آں

ترجمہ: اپنے کو ملامت کرنے سے کوئی بھی اس دنیا میں خالی نہیں، تم غور کرو کہ اسی

لیئے خاصانِ خدا نے بھی یَا لَیْتَ فرمایا۔

تشریح: تقاضائے عبدیت تو یہی ہے کہ انسان مالکِ حقیقی کے روبرو عاجزی وانکساری کا اظہار کرتا رہے، اس ذاتِ پاک کی بے نیازی سے ڈرتا رہے اور اس کی بارگاہِ قدس میں قلب ونظر جھکا کر استغفار کرتا رہے، کوئی باشعور مومن اس جہان میں ایسا نہ ہوگا جس کے دل میں کسی نہ کسی درجہ میں یہ صفت موجود نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے وہ بندے جن کو رضائے الٰہی کا تمغہ مل چکا ہے وہ بھی اپنے عمل کی کوتاہی کا اعتراف بارگاہِ بے نیاز میں کرتے تھے، حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور کاملین واصلین نے بھی اپنے بارے میں یالیتَ کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی شہادت کتابوں میں موجود ہے۔

ہست نفسِ مطمئنہ انبیاء را ثالثا　　　می بود بالخاصہ اطمینان از وے دائما

ترجمہ: تیسری صفت نفس کی مطمئنہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے لئے ہے، اس نفس کی خصوصیت یہ ہے کہ ہمیشہ اطمینان کی کیفیت سے متصف رہتا ہے۔

تشریح: یہ تیسری قسم نفس کی "نفسِ مطمئنہ" ہے، یہ سب سے اعلیٰ درجہ کا نفس ہے اور صرف انبیاء ورسل کو عطا کیا گیا ہے، کیونکہ یہ حضرات معصوم من اللہ ہونے کے ساتھ درجۂ یقین میں معائنہ کی منزل تک پہونچے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے جو اطمینان اور سکینہ ان حضراتِ انبیاء کو منجانب اللہ عطا کیا گیا ہے وہ درجۂ ایمان ویقین دوسروں کو میسر نہیں۔

مستدامی در رضا و در لقائے کردگار　　　ہست شاہد بے خدا ہرگز نہ ماند در قرار

ترجمہ: یہ ہمیشہ رضائے الٰہی اور دیدار خداوندی میں محو ہوکر مشاہدہ صفات کرتا رہتا ہے اور اس کے بغیر اس کو قرار ہی نہیں ملتا۔

تشریح: یہ نفسِ مطمئنہ جن حضرات کو عطا کیا گیا ہے ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی رضا میں راضی رہتے ہیں کیوں کہ ان کے سامنے صفاتِ ذات کے تمام نقشے موجود ہوتے ہیں۔ ان کا تصور ایک لمحہ کے لئے بھی اس ذاتِ پاک کے ذکر

اور اس کی صفات میں فکر سے جدا نہیں ہوتا۔ اور بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کی صحیح تصویر یہی حضرات ہوتے ہیں کہ اللہ کے ذکر کی وجہ سے ان کے قلوب مطمئن رہتے ہیں اور تفکراتی مشاہدہ میں ہمیشہ مگن رہتے ہیں، اس کے بغیر اُن کو سکون و قرار ہی نہیں مل سکتا۔

از زباں خاصیتِ ایں نفس کے سازم ادا　　درکلام اللہ بنگر نام ہر یک نفس را

ترجمہ: زبان سے اس نفس کے خواص کا بیان کس طرح مکمل ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کے کلام میں نفس کی تینوں قسموں کا بیان دیکھ لو۔

تشریح: تمام انسانوں کے اعمالِ خیر و شر کا اکتسابی تعلق اسی نفس سے ہے، اسی نفس کی پیروی سے برائی میں مبتلا ہوتا ہے اور اعمالِ خیر بھی اسی نفس کی اتباع سے ہوتے ہیں، اسی لئے اس نفس کی تمام خاصیتوں کا بیان کرنا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن پاک میں اس نفس کی تین قسموں کا بیان فرمایا ہے، قرآن پاک میں تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرکے ہی مصنف نے نفس کے یہ تین صفاتی نام قرار دیے ہیں اور اجمالی طور پر مختصراً ان کے خواص کا بیان کردیا ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ صرف بیان نفس کیلئے ہی ایک عظیم دفتر کی ضرورت ہوگی۔

نفسِ یک را از صفاتِ غیر آمد چند نام　　باش دشمن نفسِ بد را نیک را تابع مدام

ترجمہ: ایک ہی نفس کے صفاتِ مختلفہ کی وجہ سے چند نام پڑ گئے ہیں، تم ہمیشہ برے نفس کے دشمن رہو اور نیک نفس کی اطاعت کرو۔

تشریح: حقیقت تو یہی ہے کہ وجود کے اعتبار سے نفس تو ایک ہی ہے مگر اس نفس کی بری اور اچھی صفات کی وجہ سے اس کے تین نام پڑ گئے ہیں، ان ناموں کو اگرچہ قرآنِ کریم میں بھی ذکر کیا گیا ہے لیکن سالک کو الفاظ کی بحث میں نہیں الجھنا چاہیے بلکہ مقصود پر نظر رکھنی چاہیے، اس لئے سالک کیلئے بس اتنا کافی ہے کہ وہ نفس امارہ کے کہنے میں ہرگز نہ آئے نفسِ لوامہ کی نصیحت و ملامت کو غور سے سنے اور اس پر توجہ دے اور اعمالِ خیر میں زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔

ہر چہ دل را در ضلال و کفر آرد اے پسر   خطرۂ شیطاں مر او را راست دانی اے پسر

ترجمہ: اے سالک جو خیال بھی دل کو کفر اور گمراہی میں مبتلا کرے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ خیال یقیناً خطرۂ شیطانی ہے۔

تشریح: نفس کی اقسام کا ذکر تفصیلی طور پر کرنے سے مصنف کا مقصد یہ تھا کہ اس نفس کے خواص سے کس قسم کے خطرات اور وساوس سالک کے قلب میں پیدا ہوتے ہیں اس لئے صفاتی تقسیم کے بعد پھر اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ قلب سالک میں اگر ایسے وساوس پیدا ہوں جن کا نتیجہ گمراہی اور کفر ہو تو یقینی طور پر یہ وساوس شیطان کی طرف سے ہیں جو نفس امارہ کے ذریعہ اس طرح کے خیالات و وساوس کو انسان پر مسلط کرنا چاہتا ہے، چنانچہ حدیث پاک میں ہے کہ شیطان مومن کے دل میں یہ وسوسہ پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنے دل میں یہ سوچے کہ اس کو کس نے پیدا کیا، مومن کا قلب جواب دیتا ہے کہ اس کی پیدائش کا سبب ظاہری والدین ہیں، پھر والدین کے بارے میں سوال کرتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ ان کی پیدائش کا سبب ان کے والدین ہیں، یہاں تک کہ سب سے آخر میں بات یہاں تک پہونچتی ہے کہ سب سے پہلے انسان کو کس نے پیدا کیا، تو قلب مومن جواب دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی اسباب ظاہری کے پیدا کیا، اسکے بعد شیطان وساوس کے ذریعہ سوال کرتا ہے کہ اللہ کو کس نے پیدا کیا الخ (نعوذ باللہ من ذلک) یہ ایسی منزل ہے جو بہت کٹھن ہے۔ اسی لئے اس قسم کے خیالات سے جو شیطانی وساوس سے تعلق رکھتے ہوں ہمیشہ اللہ سے پناہ مانگتے رہنا چاہیئے، شیطان تو انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے وہ کب گوارا کرے گا کہ انسان اللہ تعالیٰ کے قرب کی لذت حاصل کرے، اسی لئے:

در عبادت سست سازد وسوسہ دل را دہد   از تقرب دور دارد در ضلالت می نہد

ترجمہ: عبادت میں سستی پیدا کراتا ہے اور دل میں شبہات پیدا کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی قربت سے دور کرکے گمراہی کے جال میں پھنسا دیتا ہے۔

تشریح: یعنی شیطان نفس امارہ کے ذریعہ مومن کے قلب میں ایسے برے اثرات پہونچانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے جن کے ذریعہ عبادت میں سستی آنے لگے اور جب عبادت میں سستی آئے گی تو لازمی طور پر قربتِ خداوندی سے دوری ہوگی اور جب قربتِ ذات میسر نہ ہوگی تو پھر گمراہی کے راستہ کی طرف انسان بڑھتا چلا جاتا ہے۔ شیطانِ لعین بہت چالاک ہے، وہ ہم رنگِ زمین جال بچھا کر پھانستا ہے کسی عابد اور زاہد کو ایک دم عبادت کی طرف سے بے رغبت نہیں کریگا بلکہ شروع میں عبادت کیطرف سے لاشعوری طور پر سستی کے وساوس دل میں پیدا کریگا اور پھر آہستہ آہستہ یہ سستی اسکی عادتِ ثانیہ بن جائے گی یہاں تک کہ تقرب خداوندی سے دور ہو کر ضلالت میں بھٹکتا پھرے گا۔ اللھم احفظنا منہ

خونِ مومن میکند از دستِ مومن در نہاں   آشکارا ہم نسازد در میانِ مردماں

ترجمہ: پوشیدہ طریقے سے مومن کے ہاتھ سے مومن کا خون کرا دیتا ہے اور کبھی کبھی ظاہرا بھی لوگوں کے درمیان فساد برپا کراتا ہے۔

تشریح: غلط عقائد اور لاشعوری طور پر غلط اعمال کرنے سے جو گمراہی پھیلتی ہے ان کے اثرات صرف ایک ہی شخص پر نہیں ہوتے بلکہ دوسرے افراد بھی ایک دوسرے کے عمل سے متاثر ہوتے ہیں اسلئے یہ شیطان لعین ایسے خفیہ راستوں سے گمراہ کر کے لوگوں کو بے موت مار ڈالتا ہے جس کا احساس بھی نہیں ہو پاتا۔ صوفیاء حضرات اس کو روحانی قتل کا نام دیتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب روح مرگئی تو پھر زندہ انسان ایک چلتی پھرتی لاش ہے اس نے اپنے مقصدِ حیات کو گم کر دیا۔ جس نے مقصد کو گم کر دیا وہ گویا موت کی آغوش میں چلا گیا، یہ تو شیطانی وساوس کے ذریعہ روحانی قتل کی مثال تھی اور بعض مرتبہ کھلم کھلا ذرا سی بات کا بہانہ بنا کر لوگوں کے درمیان بھیانک جنگ و جدال کا راستہ ہموار کر دیتا ہے مگر چونکہ یہ برائی سامنے کی ہے اس لئے یہ امکان ہے کہ مرتکب کو اسکا احساس جلد ہو جائے گا اس لئے ایسے امور کی طرف شیطان کی توجہ کم ہوتی ہے۔

ورغلاند مومناں را سوئے مکروہ و حرام   پس دمامہ می زند در خلق وارد زشت نام

ترجمہ: مومنوں کو ناپسندیدہ اور حرام کاموں کے ارتکاب پر اکساتا رہتا ہے، اس کے

بعد اس کی شہرت کر کے لوگوں کے درمیان اس کو بدنام بھی کرتا ہے۔

تشریح : یہ بات تو بالکل عیاں ہے کہ برائی کی ظاہری شکل و صورت بہت اچھی ہوتی ہے اور اس کا عارضی اور ناپائیدار ذائقہ بھی بہت لذیذ ہوتا ہے، شیطان مردود نفس امارہ کے ذریعہ برائیوں کے برے نتائج سے بے خبر رکھ کر ان کی ظاہری شکل و صورت کو ایسا دکھاتا ہے کہ انسان گناہوں میں ملوث ہو جاتا ہے، اور جب یہ دیکھ لیتا ہے کہ اب یہ پوری طرح میرے جال میں پھنس گیا ہے تو اس سے ایسے اعمال کراتا ہے جن کی وجہ سے اس کی بری شہرت لوگوں میں ہو جاتی ہے اور آخر وہ اپنے اعمال بد پر تسلسل کی وجہ سے ایک نہ ایک دن بدنام ہو جاتا ہے، اور رسوائی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ یہ تو دنیا کا معاملہ ہے، آخرت میں تو ایسے لوگوں کو جو بظاہر نیک ہوں اور حقیقت میں ان کے اعمال برے ہوں کس قدر رسوائی ہوگی، اس کی تفصیلات قرآن اور احادیث میں موجود ہیں۔

بد کناند در بدی دل را بدارد شادماں   شرح این بدبخت دشمن کے بباید در بیاں

ترجمہ : برائی میں ملوث کرتا ہے اور اعمال بد کے ارتکاب میں مگن رکھتا ہے۔ اس بدنصیب دشمن کے تمام خصائل کا بیان کون دائرۂ تقریر و تحریر میں لا سکتا ہے۔

تشریح : یہ خطرناک دشمن ایسا ہے کہ صرف برائیوں ہی میں ملوث نہیں کرتا، بلکہ برائی کا احساس دل سے اس طرح مٹا دیتا ہے کہ برائیاں اس کو بھلائیاں معلوم ہوتی ہیں اور وہ ان اعمال بد کے ارتکاب پر شرمندہ ہونے کے بجائے خوش ہوتا ہے، مصنف فرماتے ہیں کہ اس بدنصیب دشمن کی بری عادتوں کا بیان کہاں تک کیا جائے اسلئے کہ اسکے داؤ پیچ تو ہر روز ایک نئے رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں۔

ہر کرا محفوظ دارد حق ازیں خصم قدیم   او عزیز و پاک دل ہم بر صراط مستقیم

ترجمہ : اس پرانے دشمن سے اللہ تعالیٰ جس کو محفوظ رکھے، بس وہی پاک دل اور عزت والا اور ہدایت کے راستے پر چلنے والا ہے۔

تشریح : تخلیق آدم کے ساتھ ساتھ ہی اس شیطان لعین سے دشمنی کا آغاز ہو گیا تھا، اسی لئے

یہ مردود بہت پرانا دشمن انسانیت ہے۔ اس نے خدا کے سامنے چیلنج کیا تھا کہ میں انسانوں کو راہِ راست سے الگ کردوں گا، اللہ تعالیٰ نے بھی اعلان فرمادیا تھا کہ جو میرے نیک بندے ہیں ان پر تیرا جادو نہ چلے گا۔ ان کی حفاظت پروردگارِ عالم فرماتا ہے، انسان کے بس کی بات نہیں کہ اس لعین کے برے اثرات سے محفوظ رہ سکے، اس لئے سالک کو اس کی خباثت اور برے اثرات سے پناہ کی التجا بارگاہِ خداوندی میں ہمیشہ کرتے رہنا چاہیئے کیوں کہ جس کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کے برے اثرات سے بچائے گا صرف وہی محفوظ رہ سکے گا، اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہو کر دنیا و آخرت میں عزت والا ہو گا، اسی کا قلب مصفّٰی ہو گا اور راہِ سلوک میں معرفت کا دروازہ اسی کیلئے کُھل سکتا ہے بغیر اسکی رحمت اور مدد کے کوئی کام پورا نہیں ہو سکتا۔

خالقا ہر مؤمنے را دار زاں دشمن نگاہ　　من یکے از مومناں از در گہت جویم پناہ

ترجمہ: اے تمام کائنات کے پیدا کرنے والے، ہر ایک مؤمن کو اس دشمن سے محفوظ رکھیو میں بھی ایمان لانے والوں میں سے ہوں اور تیری بارگاہ کی پناہ ڈھونڈتا ہوں۔

تشریح: جیسا کہ بتلایا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بعد اس بدنصیب دشمن کی خباثت سے محفوظ رہنا کسی بھی انسان کے بس کی بات ہی نہیں، اس لئے مصنّف رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی پروردگار کی بارگاہ میں عاجزی اور انکساری کے ساتھ عرض پرداز ہیں کہ اے پروردگار! تو اپنی رحمت سے مجھے بھی اس دشمن کی برائیوں سے اور خباثت سے محفوظ رکھنا، میں تمام دنیاوی سہاروں سے رشتہ توڑ کر صرف تیری ہی پناہ چاہتا ہوں، اپنی رحمت سے مجھے اپنی پناہ میں لے لے، بیشک تیری پناہ سب سے زیادہ قوی ہے اور اس پناہ میں آکر دین دنیا کی تمام برائیوں سے محفوظ رہا جاسکتا ہے، علاوہ اور کوئی مددگار وحمایتی بھی نہیں ہے

☆

در بیانِ خطرۂ ملکی

فرشتوں کی طرف سے آنیوالے وساوس کا بیان

ہر چہ دل را او عبادت شاد دارد اے پسر خطرۂ ملکی مرآں را راست دانی کن نظر

ترجمہ: اے سالک! جس خیال سے دل کو عبادت کرنے میں مسرت ہو یقینی طور پر یہ بات مان لو کہ یہ خیال فرشتوں کی طرف سے ہے۔

تشریح: سالک کو پیش آنے والے وساوسِ قلب کا بیان چل رہا تھا۔ اس سلسلہ میں خطرۂ نفسانی اور خطرۂ شیطانی کا تفصیلی بیان گذر چکا ہے، نیز نفس کی اقسام "امّارہ، لوّامہ، مطمئنہ" کا بیان بھی ہوگیا۔ اس عنوان کے تحت مصنّف علیہ الرحمۃ خطرۂ ملکی اور خطرۂ رحمانی کا بیان فرمارہے ہیں۔ قلبِ سالک میں اگر ایسے خیالات آئیں جن کی وجہ سے عبادت واطاعت میں قلب مسرت محسوس کرے تو ایسے خیالات کو صوفیاء حضرات فرشتوں کی طرف منسوب کرکے "خطرۂ ملکی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ فرشتوں کی طرف ایسے خیالات کی نسبت کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرشتے قلبِ سالک میں ایسے خیالات کا القاء کرتے ہیں، بلکہ فرشتوں میں فطری طور پر عبادت واطاعت میں مشغولیت کا مادہ ہے، اور گناہوں کے ارتکاب کا مزاج ہی نہیں، اس لئے قلبِ سالک میں ذکر وفکر کے ذریعہ توفیقِ خداوندی اگر یہ بات پیدا ہوجائے کہ اس کا دل فطری طور پر یعنی مجبوری اور دباؤ کے بغیر حقیقت میں عبادت واطاعت میں مسرت محسوس کرے اور گناہوں سے اس کو طبعی نفرت ہوجائے تو صفاتِ ملکیہ کا اس میں غلبہ ہوگیا اور صفاتِ بہیمیہ مغلوب ہوگئی ہیں گویا یہ احساس واعمال نتائج ہیں ان خیالات ووساوس کے جن کا انتساب فرشتوں کی طرف ہے۔ ھٰذَا فَیْضَانُ المُرْشِدِ

از گناہ ومعصیت در ترس دارد ہر زماں سوئے طاعت می کشد ایں خطرۂ ملکی بداں

ترجمہ: یہ وساوس سالک کو ہر وقت گناہ اور نافرمانی سے ڈراتے ہیں۔ بلکہ یہ

سالک کی تمامتر توجہات کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف مبذول کرتے رہتے ہیں۔

تشریح: یعنی جن خیالات کی آمد کی وجہ سے عبادت میں ذوق وشوق کے ساتھ ارتکابِ گناہ سے خوفِ خداوندی کی کیفیت بھی قلبِ سالک میں پیدا ہو جائے تو اس قسم کے تمام خطرات خطرۂ ملکی کے ضمن میں آتے ہیں، صوفیائے محققین نے لکھا ہے کہ اس قسم کی کیفیت کو "کیفیتِ حضوری" کہتے ہیں۔ یعنی سالک حقیقت میں یہ محسوس کرتا ہے کہ میں دربارِ خداوندی میں حاضر ہوں اور وہ ذاتِ پاک تجلیاتِ جمال وجلال کے ساتھ میرے سامنے ہے، یا وہ ذاتِ پاک جو مکمل طور پر علیم وخبیر ہے وہ میرے ہر کام کو دیکھ رہی ہے، جب یہ تصور صحیح طور پر قائم ہو جائے گا تو لازمی طور پر قلبِ سالک کو کیفیتِ حضوری حاصل ہو جائے گی اور جب احکم الحاکمین ہر وقت اس کے ساتھ ہے تو گناہ کرنے کی جرأت ہی نہ ہوگی موقع اور قدرت میسّر ہونے کے باوجود وہ گناہ سے مکمل طور پر پرہیز کریگا اور عبادت واطاعت اسکی روحانی غذا بن جائے گی۔

ہرچہ قلبت را بفکرِ حق بدارد در نہاں　　　خطرۂ روحی مراد ما راست دانی بے گماں

ترجمہ: جو خیال بھی باطن میں تیرے قلب کو فکرِ حق کے ساتھ مشغول رکھے، شک و شبہ کے بغیر ایسے خیال کو خطرۂ روحی یقین کرو۔

تشریح: یہاں سے مصنف علیہ الرحمہ خطرۂ رحمانی کا بیان فرمارہے ہیں، یعنی جو خیال بھی دل میں اس طرح آئے کہ اس کا تعلق ذاتِ پاک سے ہو، کہ سالک ذاتِ پاک کی صفات میں غور کرنے لگے، اس قسم کے خیال کو "خطرۂ رحمانی" سے تعبیر کیا جاتا ہے مصنف نے "خطرۂ روحی" سے یہی مراد لیا ہے، روح چونکہ بے کیف وکم ہے اور انتہائی لطیف بھی ہے اس لئے اس قسم کے خیالات جو روح سے متعلق ہوں گے وہ سب "خطراتِ رحمانی" سے تعلق رکھیں گے، یہ سب سے اعلیٰ درجہ ہے اسکے بعد ذات کی تجلیات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس کا تعلق مشاہدہ سے ہے۔

انسان کا قلب مجموعہ ہے نفس اور روح کا۔ نفس کا تعلق اعمالِ ظاہری سے ہے، خواہ یہ اعمال خیر ہوں یا برے اعمال ہوں، اور روح کا تعلق اعمالِ باطنی سے ہے اور روح فطری

طور پر پاک ہے اس لیئے اس کا تعلق بھی پاکی سے ہوگا اور اس کے اعمال بھی پاک ہوں گے،
اب اگر قلب کا یہ حصہ یعنی نفس، روح کے تابع ہوجاتا ہے تو اعمالِ خیر کا صدور لازمی طور پر ہوگا
اِن اعمالِ خیر کی وجہ سے روح کو کسبِ فیض میں فراوانی میسّر ہوجاتی ہے اور باطن کی درستگی کے
اسباب مہیّا ہوجاتے ہیں، اِس طرح سالک کے ظاہر و باطن کی تکمیل ہوجاتی ہے اور تفکّر
فی الصّفات کی توفیق حاصل ہوجاتی ہے۔

مصنف رح نے چار قسموں میں خواطر کی تقسیم کرکے ظاہر اور باطن کی تکمیل کا کس قدر عمدہ راستہ
اختیار کیا ہے۔ سب سے پہلے خطرۂ شیطانی سے قلب و دماغ کو مکمل طور پر محفوظ رکھنا، اسکے بعد
خطرۂ نفسانی کا دفعیہ کرنا، پھر خطرۂ ملکی کے ذریعہ اعمالِ ظاہری پر برضا و رغبت پابندی
کرنا، پھر اعمالِ خیر کی روح کو اپنے اندر خطرۂ رحمانی کے ذریعہ پیوست کرلینا، ان چار خواطر کی منزل
سے گزرنے کے بعد ہی اُن کیفیات کا آغاز ہوتا ہے جو منزلِ مقصود کی رہبر ہیں۔ ھٰکذا قال مُرشدی

غیرِ فکرِ حق گمار و لا اُبالی جملہ کار — خطرۂ روحی است فکرِ حق تعالیٰ ہوشدار

ترجمہ: فکرِ حق کے علاوہ تمام امور سے سالک بے پرواہ ہوجاتا ہے، یہ بات دھیان
میں رکھو کہ فکرِ حق تعالیٰ ہی خطرۂ روحی ہے۔

تشریح: یعنی خطرۂ رحمانی کی منزل پر پہونچنے کے بعد سالک کی نظر ایسے مشاہدے سے
سرفراز ہوجاتی ہے کہ اس کو ہر ایک شئے میں اسی کی صفات کا معائنہ ہونے لگتا ہے، فکرِ حق
سے مراد ذاتِ حق میں تفکّر نہیں بلکہ صفاتی مشاہدہ مراد ہے یعنی ذاتِ پاک کی صفات میں غور و فکر
اور مشاہدہ کی کیفیت جب سالک کو میسّر ہوجاتی ہے تو پھر وہ دیگر تمام متعلّقات سے اپنا
ذہنی رشتہ ختم کرکے ذاتِ واحد کی تجلّیات کے مشاہدے میں منہمک ہوجاتا ہے، اور اس کے
بعد "جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے" کی کیفیت کا حصول ہوتا ہے۔

روح باشد معدن و گنجینۂ ہر کارِ خیر — بے عبادت بے تفکّر نیست اُو را ہیچ سیر

ترجمہ: روح تمام نیک کاموں کا گہوارہ اور خزانہ ہے، عبادت اور تفکّر کے بغیر

اس کو سکون ہی میسر نہیں ہوتا۔

تشریح : روح کا تعلق حقیقت کے اعتبار سے پاکیزگی سے ہے، اسی لئے خطرۂ رحمانی کو اس سے متعلق کیا جاتا ہے خطرۂ رحمانی سے متعلق ہونے کے بعد لازمی طور پر روح میں یہ خواص پیدا ہوجائیں گے کہ تدبر کی نعمت بھی سالک کو حاصل ہوجائے گی یعنی اس کے اعمال میں مرضیاتِ خداوندی کا از اوّل تا آخر ظہور ہوگا اور تفکر کی دولت سے بھی اس کو نوازا جائے گا یعنی صفاتِ خداوندی کے مشاہدہ کے لیئے اس کے قلب کی آنکھوں کو کھول دیا جائے گا، اب تدبر اور تفکر کے بغیر روح کو سکون اور آرام کہاں ؟ هٰذَا فَيْضَانُ الْمُرْشِدِ۔

روح شاہِ خیر آمد لشکر او عقل داں نفس بد را بس بدار از پیر و انش ہر زماں

ترجمہ : اعمالِ خیر کا بادشاہ روح ہے اور عقل کو اس کا لشکر سمجھو اور نفسِ بد کو ہمیشہ اس کی تابعداری ہی میں رکھو۔

تشریح : یہاں پر مصنفؒ روح کی تین حیثیتیں واضح فرما رہے ہیں (۱) کہ روح کی حیثیت جسم انسانی میں بادشاہ کی سی ہے لیکن ایسا بادشاہ جس کے تمام احکام اعمالِ خیر پر ہی مشتمل ہوتے ہیں اور عقل کی حیثیت اس کے لشکر کی سی ہے یعنی نیک کاموں کا آرڈر روح کی طرف سے جاری ہوتا ہے اور عقل اس حکم کی تکمیل کرتی ہے (۲) وہ جسم انسانی میں قلب سے متعلق ہے اسی لئے قوتِ موثرہ کے طور پر عقل کو احکام صادر کرتی ہے اور عقل قوت متاثرہ کے طور پر تاثر لے کر ان احکامات کی تکمیل کرتی ہے (۳) یہ کہ روح اور نفس دونوں ساتھ ساتھ ہیں جو قلب میں یکجا رہتے ہیں، اسی لئے صوفیائے محققین فرماتے ہیں کہ "قلب مجموعہ ہے روح اور نفس کا" قلب میں روح کی حیثیت جب بادشاہ کی سی ہے تو پھر دیگر تمام کو اس بادشاہ کی عظمت وحکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کردینا چاہیئے، ورنہ نظامِ حکومت خراب ہوجائے گا، اسی لئے مصنفؒ فرماتے ہیں کہ نفس اور عقل کو روح کے تابع رکھنا ضروری ہے، خاص طور پر نفس کو روح کی تابعداری میں رکھنے میں کامیابی حاصل ہوگی کیونکہ

روح شاہ نیکی و عقل است لشکر بالیقیں　　نفس شد شاہ ہوا، لشکر مر او را ہمچنیں

ترجمہ: روح نیک کاموں کی بادشاہ ہے اور عقل یقینی طور پر اس کا لشکر ہے خواہشات کا بادشاہ نفس ہے، اس کا لشکر بھی اسی انداز کا ہوگا۔

تشریح: اس سے پہلے مصنفؒ نے فرمایا تھا کہ نفس کو روح کی تابعداری میں رکھنا چاہیئے کیوں کہ روح بنیادی طور پر پاک ہے۔ اس لئے کہ روح کو "مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" کا خاص تمغہ عطا فرما کر دیگر مخلوقات سے امتیاز عطا کیا گیا ہے۔ اسی امتیازی خصوصیت کی وجہ سے تقاضائے روح پاکیزگی ہے اور نفس کی خاصیت روح کے برعکس ہے، اسی لئے وہ خواہشات کا بادشاہ ہے، جب بادشاہ ایسا ہے تو رعایا کا اندازہ کر لیجئے کہ کیسی ہوگی۔ ظاہر بات ہے کہ آرزو اور تمنا اس کا لشکر ہوں گی۔ اور ان دونوں کا مرکز قلب ہے یعنی روح اور نفس قلب میں یکجا ہیں جیسا کہ مصنفؒ بیان فرما رہے ہیں کہ:-

دل میان ہر دو لشکر در میان ہر دو شاہ　　ہر کہ غالب گشت بر وے رائے آں دانی ہست شاہ

ترجمہ: دل دونوں لشکروں اور دونوں بادشاہوں کے درمیان میں ہے اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ جو اس پر قبضہ کر لے گا وہی حکومت کرے گا۔

تشریح: جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ قلب مجموعہ ہے روح اور نفس کا، گویا جسم انسانی میں اس کی حیثیت دارالسلطنت کی سی ہے اور جسم ایسی مملکت ہے جس میں دو مختلف مزاج کے بادشاہ بیک وقت قیام پذیر ہیں۔ جس طرح دنیاوی اقتدار اور حکومت کیلئے تعمیر پسند اور تخریب پسند دونوں طرح کے عناصر کوشش کرتے ہیں اور جو بھی کامیاب ہو جاتا ہے وہی حکومت کرتا ہے اور اسی کے اصول و احکام نافذ کئے جاتے ہیں اسی طرح سلطنت جسمانی میں بھی انسان جس کسی کو اپنا ووٹ دیکر منتخب کر لے گا وہی بادشاہ قلب پر اپنا تسلط قائم کر لے گا اور اپنے مزاج اور ذوق کے اعتبار سے احکام صادر کرے گا۔ اس لئے اگر قلب پر نفس کی حکومت قائم ہو گئی تو خیر کی توقع فضول ہے بلکہ برے خیالات اور برے اعمال

سے اس کا تعلق لازمی ہوگا، کیوں کہ بنیادی طور پر تقاضائے نفس روح کے برعکس ہے، نفس کی اصلاح کرتے ہیں قلب کو روحانیت کی سطح پر لایا جاتا ہے اور اگر روح کی حکومت ہوگی تو پھر احکامات خیر کا صدور ہونا لازمی ہے، کیونکہ روح بنیادی اعتبار سے پاک ہے اور پاکی و صفائی کے ماحول کو پسند کرتی ہے۔ اب تمام معاملہ موقوف ہے پسند کرنے والے کی پسند پر، جس کو وہ چاہے پسند کرے لیکن اس بات کا دھیان ضرور رکھے کہ:-

روح از حق نفس از وے راستدانی اے پسر　　　شد ز کار روح راضی حق تعالیٰ سر بسر

ترجمہ: اے سالک! یہ بات تو صحیح ہے کہ روح اور نفس دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ روح کی کارکردگی سے ہی خوش ہوتا ہے۔

تشریح: اس سے قبل مصنف نے جس مفہوم کی طرف اشارہ کیا تھا کہ خیر اور شر دونوں چیزیں سامنے ہیں، یہاں اس کی وضاحت فرما رہے ہیں، بندہ کس کو اختیار کرنا چاہتا ہے اور کس کی حکومت کو پسند کرتا ہے، اس سلسلہ میں انسان کو عقل سلیم عطا فرما کر، اچھائی اور برائی میں امتیاز کا شعور بخش کر خداوندِ قدوس نے کچھ اختیار بھی دیدیا ہے، مجبور محض نہیں بنایا اور اسی اختیار پر ہی عذاب و ثواب کا دارومدار ہے کیونکہ یہ بات تو بلاشک یقینی ہے کہ روح بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے موجود ہوئی ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي "آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے وجود پذیر ہوئی ہے" اسی طرح نفس کا وجود بھی حکم خداوندی سے ہے، روح بنیادی طور پر لطیف اور پاک ہے اور پاکی سے تعلق رکھتی ہے اور پاک کاموں ہی کو پسند کرتی ہے اور تقاضائے نفس شہوت و غضب ہے، بلاشبہ ان دونوں یعنی روح اور نفس کا وجود بحکم خداوندی ہے لیکن اس تخلیق کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید اور احادیث پاک میں مکمل طور پر اپنی مرضیات اور غیر مرضیات کی وضاحت فرمادی ہے، جس سے صاف طور پر یہ معلوم ہوگیا کہ خداوند قدوس کو روح کی کارکردگی یعنی اچھے اور پاک کام پسند ہیں اور نفس جن امور کی ترغیب دیتا ہے، وہ

امور ناپسند ہیں جیسا کہ مصنف فرماتے ہیں کہ

نیست راضی حق زکارِ نفس کافر زینہار ہر کہ گوید راضی ست او گشت او را حال زار

ترجمہ: نفس کافر کے کاموں سے اللہ تعالیٰ ہرگز راضی نہیں اور جو یہ کہتا ہے کہ امورِ نفس سے اللہ تعالیٰ راضی ہے اس کا انجام خراب ہے۔

تشریح: چونکہ یہ بات محققین صوفیاء اور متکلمین کے درمیان طے شدہ ہے کہ ہر ایک شئے کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، ایمان وکفر مومن اور کافر خیر اور شر یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے وجود پذیر ہیں۔ ایمان کا تقاضا اطاعتِ خداوندی ہے اور کفر کی خاصیت انکار حقیقت اور بغاوت ہے۔ اس تشریح سے یہ بات عیاں ہو گئی کہ مومن کا مزاج اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور کافر کا کام اللہ تعالیٰ سے بغاوت کرنا ہے۔ یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ اطاعت اور بغاوت کی تخلیق بھی اسی کے حکم سے ہوئی ہے۔ ان کی تخلیق کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی پسند اور ناپسند کا اعلان فرمادیا کہ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ۔ (اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور حقوق قرابتداری کیلئے حکم کرتا ہے، بیحیائی اور برائیوں سے روکتا ہے) معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نفس کے باغیانہ افعال سے راضی نہیں، بلکہ جس قدر کام نفس کی اطاعت و پیروی کی وجہ سے ہوتے ہیں وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے غضب کا سبب بنتے ہیں، اور جو کام نفسانی خواہشات کے خلاف روح کے تقاضوں کے تحت ہوتے ہیں وہ قربت خداوندی کا سبب ہوتے ہیں۔ اس لئے کوئی اگر یہ کہے کہ اگر کفر کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا تو اسکی تخلیق ہی کیوں فرماتا؟ اس کا مختصر اور جامع جواب یہی ہے جو اوپر گذر چکا ہے کہ ایمان وکفر، خیر وشر کو پیدا فرما کر قرآن وحدیث کے ذریعہ اپنی پسند اور ناپسند کا اعلان بھی فرمادیا تاکہ فرماں برداروں اور نافرمانوں میں امتیاز پیدا ہو جائے اور اسی کے مطابق جزا وسزا کی ترتیب قائم ہو، اس مختصر بیان کے بعد یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ اگر کوئی شخص اس کے برخلاف عقیدہ رکھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ کفر، کافر اور گناہ کی تخلیق ان امور کے پسندیدہ ہونے

کی علامت ہے یعنی ایمان کی طرح کفر، مومن کی طرح کافر اور نیکیوں کی طرح گناہ بھی اس کی پسند میں داخل ہیں اور ان کے ارتکاب سے جرم و سزا کا تصور پیدا نہیں ہوتا تو یقینی طور پر ایسے شخص کا انجام خراب ہے۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْہُ۔

شرحِ خطرہ بسکہ بسیار است و اِی اَپسر　　　ایں خلاصہ از کتبہا شرح کردم مختصر

ترجمہ: اے سالک! یہ بات سمجھ لے کہ وساوس کی تشریح تو بہت طویل ہے، میں نے مختصر طور پر بہت سی کتابوں سے تشریحات کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔

تشریح: یعنی جس طرح کے خیالات اور وساوس سے عام آدمی کو واسطہ پڑتا ہے وہ بیشمار ہیں اور سالکانِ راہِ معرفت کے پیچھے تو شیطان خاص طور پر اپنی توجہ صرف کرتا ہے اور ہر لمحہ اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ کسی طرح اس کو منزلِ مقصود سے غافل کر دے، اس سلسلہ میں وہ جس قدر وساوس اور خیالات قلبِ سالک میں ڈالتا ہے ان کی کوئی حد ہی نہیں ہے ان مواقع کے لیے ہی شیخ کی ضرورت پیش آتی ہے ہر ایک سالک کو اس کے فہم اور ظرف کے مطابق ان دشواریوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس لئے مصنف فرماتے ہیں کہ تمام وساوس و خیالات کی تشریح تو ناممکن ہے، البتہ خاص خاص اور مشترک وساوس کو مختصر انداز میں تصوف کی معتبر اور ضخیم کتابوں سے اخذ کر کے اصولی طور پر میں نے بیان کر دیا ہے، ورنہ اگر ان وساوس کی تشریح کی جائے تو صرف اسی ایک موضوع پر لکھنے اور اس کا حق ادا کرنے کے لیے ایک بہت بڑا دفتر درکار ہو گا۔ ھٰکَذَا قَالَ مُرْشِدِیْ۔

ہر خیالے غیرِ مولیٰ در دلِ خود زشت داں　　　ایں ریاضت سالکاں را فرض آمد ہر زماں

ترجمہ: مالکِ حقیقی کے علاوہ جو خیال بھی دل میں آئے اس کو برا سمجھو، اس تصور پر محنت کرنا سالکین راہِ طریقت کے لئے ہر وقت ضروری ہے۔

تشریح: سالک کے قلب میں ہر وقت یعنی خلوت و جلوت میں مقصود کے تصور کے علاوہ اور ہونا ہی نہیں چاہیے اور مقصودِ سلوک صرف معیّتِ ذات اور قربتِ ذات ہے اور

یہ حقیقت بھی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی دولت اور سعادت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس تصور میں جو شئے بھی رکاوٹ بنے اس کے خیال کے علاوہ جو خیال بھی دل میں آئے اس کو برا سمجھ کر فوراً دل سے نکال دینا چاہیئے۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی اس کی یاد سے غافل نہونا چاہیئے ورنہ وہ تو ایسا نازو انداز والا اور مغرور و متکبر ہے کہ ذرا سی بے توجہی کے سبب منزل مقصود سے ہزاروں لاکھوں میل کا فاصلہ ہو جاتا ہے۔

باش حامل ایں ریاضت اوراہِ حق بگیر　　　بالیقیں ایں نفیِ خاطر شد عبادت اے فقیر

ترجمہ: اس جد و جہد پر پابندی سے قائم رہ کر راہِ معرفت اختیار کر۔ قلب سے وساوس کو دور کرنا بھی اے سالک یقینی طور پر عبادت ہے۔

تشریح: کسی بھی عظیم مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مسلسل جد و جہد اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہے اور راہِ طریقت تو سب سے عظیم الشان مقصد ہے، اس لئے اس راہ میں سب سے زیادہ محنت، مستقل مزاجی اور بلند ہمتی کی ضرورت ہے، اسی انداز پر عمل کر کے جب سالک اس منزل کی طرف قدم بڑھائے گا تو شیطان اور نفس جو کہ ازلی دشمن ہیں اندر اور باہر دونوں طرف سے حملہ آور ہوں گے، ان تمام وساوس اور خیالاتِ پریشاں کو بلند ہمتی کے ساتھ سالک کو اپنے دل و دماغ سے نکالنا ہو گا تاکہ یکسوئی دل و دماغ حاصل ہو جائے اور ذکر و فکر میں مکمل طور پر انہماک کی کیفیت حاصل ہو جائے، یہاں پر ایک بات کا خیال رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے وساوس کو دور کرنا بھی عبادت میں شامل کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان وساوس کی وجہ سے چونکہ یکسوئی حاصل نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے ذکر و فکر میں انہماک نہیں ہوتا، اس لئے حسب ہدایت مرشدِ کامل ذکر نفی یعنی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ بطریق جلی کر کے، یا حبس دم کے ساتھ ذکر خفی کر کے ان وساوس کو دور کرے گا تو پھر تصفیہ قلب ہو کر کیفیات کا حصول ہو جائے گا، اس لئے وساوس کا دور کرنا اگرچہ فی نفسہ عبادت نہیں بلکہ عبادت و ریاضت میں معاون

ہے تو گویا یہ بھی عبادت ہے ۔ ھٰذا فَیضَانُ المُرشِد

اے پسر در خطرہ داری قلب خود را تا کجا سرکشی خبث وے را پست می کن دائما

ترجمہ: اے سالک اپنے دل کو کہاں تک وساوس وخیالات میں الجھائے رکھے گا،
بلکہ اس کی خباثت کی وجہ سے نافرمانی کے رجحان کو ہمیشہ قابو میں رکھ۔

تشریح: یہاں مصنف رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت اہم نکتہ کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ قلب میں خطرات کی آمد کو تو کوئی ختم نہیں کر سکتا، یہ تقاضائے فطرت ہے، البتہ برے خیالات کو حتی الامکان قلب میں ٹھہرنے مت دو، جب کبھی ایسی کیفیت ہو تو فوراً مرشد کی طرف رجوع کر کے مرشد کی ہدایت کے مطابق عمل کرے اور ہمیشہ اس کی طرف متوجہ رہے کہ قلب میں اچھے خیالات کا قیام ہو، کیونکہ نفس کی نافرمانیوں کا اندازہ تو سالک نہیں کر سکتا، ذرا سی غفلت سے یہ تمام بنا ہوا کام بگاڑ دیتا ہے، اس لئے نفس کی نافرمانیوں اور شرارتوں کے معاملہ میں ذرا سی بھی بے توجہی نہیں اختیار کرنی چاہیے، کیونکہ:

ہر کہ ایں خطرات را از دل جدا سازد بداں میرسد نزد دلا آرام و بر آرام جہاں

ترجمہ: جو سالک ان وساوس وخیالات کو دل سے دور کر دے گا تو سمجھ لو کہ اس نے
نہ صرف دلی مقصد کی قربت حاصل کی بلکہ مقصود دل کے پہلو میں اس کو جگہ مل گئی۔

تشریح: جب سالک نے اپنے قلب کو وساوس وخیالات کے قائم ہونے سے بچالیا، تو منزل مقصود کی راہ اس کے لئے آسان ہوگئی اور جب منزل کا راستہ آسان ہو جاتا ہے، تو منزل تک پہونچنا بھی کوئی مشکل کام نہیں، بس سمجھ لو کہ بتوفیق خداوندی منزل مقصود تک رسائی ہوگئی اور معیت ذات کا لطف اس کو حاصل ہونے لگے گا۔

او یکے از اولیاء حق بباشد اے پسر چوں بمیرد موت او را نقل گویند از خبر

ترجمہ: ایسا شخص تو اللہ تعالیٰ کے دوستوں کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے، پھر
جب وہ مرتا ہے تو اس کی موت کو از روئے حدیث نقل مکانی کہتے ہیں۔

تشریح : یہ بات تو ظاہر ہے کہ ولی وہی ہے جس کو قربتِ ذات اور معیتِ ذات کی کیفیت کا حصول ہو، جب ایسا شخص اس دنیا سے پردہ کرتا ہے تو اس کی موت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کا عنوان دیا جاتا ہے، یعنی اس کو مرا ہوا نہیں کہا جاتا، کیوں کہ وہ تو اپنی زندگی ہی میں عشقِ الٰہی میں فنا ہو گیا اور فنا ہو کر امر ہو گیا، وہ تو زندگی ہی میں مر چکا تھا، کہیں مُردوں پر بھی موت طاری ہوتی ہے؟ لیکن قانونِ قدرت کے تحت موت کے احوال اس پر طاری ہوئے تو وہ اس دارِ فانی سے دارِ باقی کی طرف منتقل ہو گیا، اس لئے موت کا لفظ ایسے حضرات کیلئے استعمال نہیں کیا جاتا، اسی طرح حدیث پاک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کا ذکر اسی عنوان کے آخر میں مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ "موت تو ایک پُل کی طرح ہے جو دوست کو دوست سے ملاتا ہے"

اولیا را می نہ باشد موتِ فانی بالیقیں   میروند از حبسِ دنیا در مکانِ خرّمیں

ترجمہ : اللہ تعالیٰ کے دوستوں کی موت سے اُن پر فنا کا اطلاق یقیناً نہیں ہوتا، بلکہ وہ تو دنیا کے قید خانے سے رہائی پا کر عیش وعشرت کے گہوارے میں پہونچ جاتے ہیں۔

تشریح : یعنی وہ حضرات جو حکمِ الٰہی کی بجا آوری میں اپنی زندگی ہی میں اس قدر منہمک اور مستغرق ہو گئے کہ انھوں نے اپنی تمام خواہشات اور تمناؤں کو اللہ اور رسول کے حکم کے تحت کر لیا تو گویا انھوں نے خود کو فنا کر کے ابدیت حاصل کر لی اور جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابدیت کا تحفہ عطا کر دیا جائے تو موت کی کیا مجال کہ ان کو فنا کر سکے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس دنیا کے قید خانے سے رہا ہو کر ایسی جگہ پہونچ گئے جہاں ان کے اور محبوبِ حقیقی کے درمیان کوئی حجاب ہی نہ رہا، اس سے بڑھکر عیش ومسرت کا اور کیا مقام ہو سکتا ہے۔ حدیث پاک کے مطابق تو دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے۔ جس طرح کسی قیدی کو دنیوی آرام وراحت، رنگینیوں اور آزادی کی فضا سے ہٹا کر دنیوی قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے لئے بھی یہ دنیا ایک قید خانہ ہے۔ قید خانے کی زندگی بھی ایک طرح کی

موت ہے کیونکہ وہ قیدی کو دنیاوی لذتوں سے محروم کردیتی ہے اور جب قید سے رہائی ہوتی ہے تب آزادی کی فضا میں سانس لے کر دنیاوی لذائذ اور مسرتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملتا ہے۔ اسی طرح مومن کو بھی اس دارِ فانی کے قید خانے سے منتقل ہونے کے بعد دار باقی کی لافانی مسرتوں سے فیض یابی کا انعام عطا کیا جاتا ہے، حقیقت میں تو صحیح عیش وہی ہے جو ابدی ہے اور لامحدود ہے۔

موت پل باشد رساند یار را با یارِ خویش   مصطفٰے فرمود زیباں در حدیثِ نیک کیش

ترجمہ: موت ایک ایسا پل ہے جو دوست کو دوست سے ملاتا ہے، اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کا ارشاد نیک خصلت شخص کے بارے میں فرمایا ہے

تشریح: یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اَلْمَوْتُ جِسْرٌ یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ یعنی موت ایک ایسا پل ہے جو دوست کو دوست سے ملاتا ہے، جن حضرات نے اس دنیاوی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کر کے دوستی کا شرف حاصل کر لیا ہے تو ایسے حضرات اس حقیقی محبوب سے ملنے کیلئے تڑپتے رہتے ہیں اور لذتِ دیدار کے لئے ہمیشہ بے چین رہتے ہیں، موت ان کے لئے پل کا کام دیتی ہے یعنی احکامِ موت ان پر طاری ہو کر ان کو اس دنیا کے قید خانے سے نجات دلا کر محبوب حقیقی سے ملنے کا سبب بنتے ہیں تو یہ موت ان کے لئے فنا کرنے والی نہیں بلکہ محبوب حقیقی سے ملا کر عیش و آرام کی ابدی اور لامحدود زندگی عطا کرنے والا پُل ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسکی توفیق عطا فرمائے

آمین

هٰذَا فَیْضَانُ الْمُرْشِدِ

در بیانِ موتِ ثُلمہ

آرزوؤں کو توڑنے والی موت کا بیان

موتِ او را موتِ ثُلمہ گفت احمد راستاں ۔۔۔ چند با تو از علاماتہائے آں سازم بیاں

ترجمہ: یہ بات سچ سمجھو کہ اس کی موت کو احمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت ثلمہ کہا ہے ،اس موت کی کچھ علامتوں کا بیان میں تمہارے سامنے کرتا ہوں .

تشریح: اس سے پہلے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اولیاء اللہ کی موت کی تشریح اس طرح بیان کی تھی کہ ان کی موت انتقال مکانی کا درجہ رکھتی ہے .وہ دنیاوی قیدخانے سے چھوٹ کر عیش وآرام کی جگہ چلے جاتے ہیں بلکہ موت تو ان کے لئے ایک پُل کی طرح ہے جو محبوب کے دیار تک لے جاتا ہے .اب اس موت کی حقیقت بیان فرمارہے ہیں کہ ان کی موت کو یہ صفات کس طرح حاصل ہوئیں ، مصنفؒ فرماتے ہیں کہ حدیث پاک میں لفظ ثلمہ کا ذکر آیا ہے جس کے معنی ہیں توڑنے والی یعنی آرزوؤں کو توڑنے والی شئے کا نام موت ہے اور یہی موت اولیاء اللہ کی ہوتی ہے ،یہ اس لئے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں آرزوؤں اور تمناؤں سے اپنا تعلق اسی طرح توڑ لیا تھا جس طرح مرنے والا دنیاوی آسائش وآرام سے تعلق ختم کرلیتا ہے ، انھوں نے زندگی کی ہر آرزو ، ہر ایک تمنا مرضئ مولا پر موقوف کردی تھی ،گویا یہ ان کی زندگی اپنے لئے بالکل نہیں تھی اور جب زندگی اپنی نہ تھی تو پھر آرزو اور تمنا کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے ،کہیں مُردے بھی آرزو اور تمنا کیا کرتے ہیں ؟ بالکل نہیں ! معلوم یہ ہوا کہ آرزوؤں کو مالک حقیقی کی رضا کے سپرد کردینا اور دیگر تمام چیزوں سے رشتہ توڑ لینے کا نام ہی صحیح معنی میں موت ہے جس کی طرف حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے اور اسی موت کو اولیاء اللہ اپنے اوپر طاری کرلیتے ہیں . اسی وجہ سے موت کے احکام کے سلسلے میں کچھ ایسے امور بھی ان کو معلوم ہوجاتے ہیں جن کا احساس دوسرے افراد نہیں کرسکتے اور واقفیت کا یہ مغالطہ

صرف اپنے بارے ہی میں نہیں بلکہ دیگر افراد کے بارے میں بھی کچھ علامتوں اور نشانیوں کے ذریعہ ان حضرات سے متعلق کر دیا جاتا ہے، موت کا یقینی علم تو صرف خداوند قدوس ہی کو ہے البتہ اس کی نشانیوں کے ذریعہ قیاس کو تقویت پہونچا کر کسی نتیجہ پر پہونچا جا سکتا ہے، اب یہ نشانیاں خواہ ظاہر سے تعلق رکھتی ہوں یا باطن سے۔ ظاہری نشانیاں تو وہ ہیں جن کو دیکھ کر حکیم اور ڈاکٹر انسان کی یا مریض کی صحت و موت کا فیصلہ صادر کر دیتا ہے، اسی طرح باطنی نشانیاں روحانی طبیب سے متعلق ہوتی ہیں۔ ان باطنی اور ظاہری علامتوں کے بارے میں مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے جو طریقۂ کار بیان فرمایا ہے وہ مقصدِ تصوف کے ضمن میں اگرچہ مکمل طور پر نہیں آتا مگر چونکہ ایسی استعداد بھی خداوند تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہے، اس لئے اگر سالک اس طریق کار میں بہ نیتِ خلوص مشغولیت اختیار کرے تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ اس شغل سے نظر سالک میں ایک ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے جو سلبِ امراض اور تسخیری صفات کی حامل ہوتی ہے مگر یہ معاملہ ہر ایک سالک کی استعداد اور قوتِ ہاضمہ سے باہر کی بات ہے، اس لئے اس میں مشغول ہونے کے لئے مرشدِ کامل کی اجازت ضروری ہے، جب مرشد کامل اس استعداد پر غلبہ کی صلاحیت طالب میں دیکھ لیتا ہے تو اجازت عطا کر دی جاتی ہے ورنہ ایسا ہونے کا یقینی طور پر اندیشہ ہے کہ مسلسل جد و جہد اور مستقل مزاجی سے عمل کر کے اس شغل کے فوائد کا حصول ہو جائے اور کرامتوں کا انبار لگ جائے اور سالک کی توجہ مقصود سے ہٹ کر غیر مقصود کی طرف ہو جائے گی جو سراسر نقصان کا سودا ہے اسلئے بہت سوچ سمجھ کر اس شغل میں مشغولیت اختیار کی جائے۔ میرے مرشد نے ایسا ہی فرمایا۔

در نشانِ موت بشنو از کلامِ اہلِ دیں   سایۂ خود را نگر در جائے صحرا بر زمیں

ترجمہ: اللہ والوں کی باتوں سے موت کی نشانیوں کے بارے میں سنو کہ جنگل میں جا کر اپنے سائے کو زمین پر غور سے دیکھو۔

تشریح: اب مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس شغل کا طریقہ بیان کر رہے ہیں، اس شغل کا بنیادی

نقطہ "نظر خود بینی" ہے اور مصنف نے اس کی دو صورتیں بیان کی ہیں ایک "بذریعہ سایہ" اور دوسرے "بذریعہ آئینہ"۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ آبادی سے باہر جنگل میں کسی ایسے مقام پر جہاں آمد و رفت نہ ہو، سکون اور سناٹا ہو، سورج کی طرف پشت کر کے پاک صاف زمین پر بطریق مراقبہ نشست اختیار کرے اور پلک جھپکائے بغیر اپنے سائے پر تمام تر توجہ کو مرکوز کر دے۔ اَللّٰہُ حَاضِرِیْ اَللّٰہُ نَاظِرِیْ، اَللّٰہُ مَعِیْ کے تصور کے بعد ذکر اسم ذات قلبی طور پر برابر جاری رکھے اور سورج کی گردش کے ساتھ سائے پر نظر جمائے ہوئے نشست میں گھماؤ کرتا رہے اور صبح کی نماز کے بعد سے برداشت کے مطابق اس میں مشغول رہے، جب اس منزل پر پہونچے کہ سایہ نظروں سے غائب ہو جائے تو پھر فضائے آسمانی کی طرف نظر قائم کرے، جیسا کہ شغل ہوائے ظاہری میں فضائے آسمانی کی طرف نظر قائم کی جاتی ہے، پھر فضا میں اس کو ایک وجیہ اور بارعب صورت نظر آئے گی، اس صورت پر غور کرے اور جو احوال نظر آئیں ان پر مصنف کی وضاحت کے مطابق غور کرے۔

یہاں یہ بات دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ اس شغلِ خود بینی میں کیفیات کا حاصل ہونا آسان بات نہیں ہے، جو اشغال پہلے بیان ہو چکے ہیں ان میں سے کسی ایک میں اگر مشغولیت ہو چکی ہو اور اس پر عبور حاصل کر لیا ہو تب اس شغل میں آسانی ہو سکتی ہے ورنہ اس سے فوائد حاصل کرنے کے لئے مدتِ دراز تک اس میں مشغولیت کی ضرورت ہے۔

پس نظر را در ہوا بر دار ہمچناں　　　　صورتے یک مجسم آید بہ بینی اندراں

ترجمہ: پھر فضا میں اپنی نظر کو اسی طرح قائم کر کے غور سے دیکھو، تو تم کو اس میں ایک بارعب صورت نظر آئے گی۔

تشریح: یعنی جب نظر میں یہ تاثیر پیدا ہو جائے گی کہ اس کے سامنے سے سایہ معدوم ہو جائے تو پھر فضائے آسمانی کی طرف نظر اٹھا کر تمام تر توجہ اسی طرف مرکوز کر لو، اس وقت فضا میں ایک جسم مثالی کی صورت تم کو نظر آئے گی، اس کی طرف غور سے دیکھو کہ

چوں بہ بینی آں مصوّر را بہر اعضا تمام زندگانی دیر دانی شادمانی کن مدام

ترجمہ: جب تم یہ دیکھو کہ وہ صورت اپنے تمام اعضاء کے ساتھ صحیح سالم موجود ہے تو اس کی زندگی بہت لمبی ہے اس لئے ہمیشہ خوش رہو۔

تشریح: یعنی جس کے بارے میں تم سے یہ سوال کیا جائے کہ اس کی زندگی کی مدت کم ہے یا زیادہ ہے، کم ہے تو کس قدر اور زیادہ ہے تو کس مقدار میں؟ تو اس جسم مثالی میں اس شخص کی شباہت کا تصور قائم کر کے غور کرو، اگر اس جسم مثالی کے تمام اعضائے جسمانی درست ہیں تو سمجھ لو کہ جس کے بارے میں سوال کیا گیا ہے وہ بہت دنوں زندہ رہے گا، اس کی زندگی کے بارے میں کسی قسم کی فکر کی ضرورت نہیں بلکہ آرام کے ساتھ ہنسی خوشی سے رہنا چاہیئے۔

گر کسے را سر نہ باشد از مصوّر ہوشدار سہ شب است او را بدنیا زندگی مستعار

ترجمہ: اگر اس جسم مثالی میں کسی کی شبیہ کا سر موجود نہ ہو تو سمجھ لو کہ اس دنیائے فانی میں اس کی زندگی صرف تین رات کی ہے۔

تشریح: یعنی جو جسم مثالی تم کو فضا میں نظر آرہا ہے اگر اس کا پورا جسم صحیح سالم ہے اور سر موجود نہیں ہے تو اس شخص متعلق کی زندگی صرف تین رات کی باقی رہ گئی ہے۔

حکم بینی در نشانِ موت دانی حکمِ سر شک نیاری در ہمیں گفتارِ عارف سر بسر

ترجمہ: موت کی نشانی کے سلسلے میں ناک کا حکم سر کی طرح ہے، عارف کی ان باتوں میں تم کو بالکل شک نہ کرنا چاہیئے۔

تشریح: یعنی جس طرح جسم مثالی کا سر نہیں تھا تو اس کی زندگی کے بارے میں یہ بتایا گیا تھا کہ تین رات کی ہے، اسی طرح اگر فضا میں نظر آنے والے جسم مثالی کا سر تو ہے لیکن ناک بالکل غائب ہے تو بیشک ایسے شخص کی زندگی بھی صرف تین راتوں کی ہے۔

گر کسے را در مصوّر نقص گوشے شد عیاں عمر او را گر شماری پانزدہ روز است و بس

ترجمہ: اگر کسی جسم مثالی کی شبیہ میں کان کا عیب ظاہر ہو تو اس کی عمر

پندرہ روز کے شمار کے مطابق سمجھو۔

تشریح : یعنی وہ جسم مثالی جو سامنے آرہے اس کا سر اور ناک صحیح سالم ہیں لیکن اس کے دونوں کان غائب ہیں تو ایسے شخص کی زندگی صرف پندرہ دن باقی سمجھو۔

حکم دریک گوش یک مہ زندگانی در جہاں　　　از یکے دو چند از یک دو بیاید در جہاں

ترجمہ : ایک کان کا حکم ایک مہینہ کی دنیوی زندگی ہے، ایک کے دوگنے کم ہونے میں دو کا ایک حصہ دنیاوی زندگی ہے۔

تشریح : یعنی اگر کسی کے دو کان غائب ہوں گے تو پھر اس کی دنیوی زندگی صرف پندرہ دن کی ہے اور اگر ایک کے دوگنے میں سے ایک کم ہوگا یعنی ایک کان نہ ہوگا تو اس کی زندگی دوگنی ہوگی یعنی ایک ماہ کی زندگی باقی ہوگی۔

گر کسے را گردنش نقصان باشد آں ماں　　　ہفت روز و ہفت شب او زندہ ماند در جہاں

ترجمہ : اگر کسی کو اس جسم مثالی کی گردن میں اس وقت کوئی کمی محسوس ہو تو اس دنیا میں اس کی زندگی سات دن اور سات رات کی باقی رہ گئی ہے۔

تشریح : یعنی اس جسم مثالی کی گردن ٹوٹی ہوئی، یا زخمی یا ٹیڑھی دکھائی دے تو پھر اس شخص کی زندگی ایک ہفتہ باقی سمجھنی چاہیے۔

ور کسے بے دست بیند سایہ خود اے پسر　　　می بود شش ماہ عمر او بعالم سر بسر

ترجمہ : اور اگر کوئی اپنا سایہ بغیر ہاتھ کے دیکھے تو اس کی زندگی اس دنیا میں کل چھ مہینے کی باقی رہ گئی ہے۔

تشریح : اپنے سایہ سے مراد وہی جسم مثالی ہے جو فضا میں نظر آرہا ہے، اگر اس جسم مثالی کا تمام جسم ٹھیک ہے لیکن دونوں ہاتھ نہیں ہیں تو ایسے شخص کی زندگی چھ مہینے ہے۔

گر بود یک دست کس اور مصور آں زماں　　　می بود یک سال عمرش راوانی در جہاں

ترجمہ : اگر اس جسم مثالی میں اس وقت ایک ہی ہاتھ ہو تو یہ بات تسلیم کرلو کہ اس کی

عمر کا اس دنیا میں ایک برس باقی رہ گیا ہے۔

تشریح: یعنی اس جسم مثالی کے تمام اعضاء درست ہونے کے ساتھ ایک ہاتھ بھی ٹھیک ہے اور دوسرا ہاتھ نہیں ہے تو اس شخص متعلق کی عمر ایک برس کی سمجھنا چاہیئے۔

گر بود بے پائے سایہ سالِ واحد عمر اوست
حکم یک پا زندگی در دارِ دنیا سال دوست

ترجمہ: اگر وہ جسم مثالی بغیر پاؤں کے ہے تو اس شخص کی عمر ایک سال کی باقی ہے، اور ایک پاؤں والے کا حکم اس دنیا میں دو سال کی زندگی کا ہے۔

تشریح: یعنی اگر وہ جسم مثالی جس کو شاغل دیکھ رہا ہے اگر اس کے دونوں پاؤں نہیں ہیں تو اس کی عمر ایک برس کی ہے اور اگر ایک پاؤں ہے تو پھر دو سال تک سلسلۂ حیات قائم رہے گا۔

یہاں تک سایہ کے ذریعہ علاماتِ موت کی دریافت کا معاملہ تھا، اب مصنف رحمۃ اللہ علیہ آئینہ کے ذریعہ ان علامات کے دیکھنے کا بیان کرنے جا رہے ہیں۔

در نشانِ موت در مرآت بینی آنچناں
عکس خود در آئینہ بیں تا چہ بینی اندراں

ترجمہ: موت کی علامات آئینہ میں تو اس طرح دیکھ کہ اپنے عکس کو آئینہ میں بغور دیکھ کہ اس میں کیا دکھائی دیتا ہے۔

تشریح: یہ دوسری صورت خود بینی کی بذریعہ آئینہ ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ کسی ایسے کمرے میں جہاں مکمل طور پر تنہائی اور سکون میسر ہو، ایک بڑا سا آئینہ جس میں پورا جسم بیٹھ کر دیکھ سکے اپنے سامنے رکھے اور صبح کی نماز یا عشاء کی نماز کے بعد تمام طرف سے توجہ ہٹا کر ایک مرکز پر قائم کر لے اور چار زانو بیٹھ کر اپنے عکس کو آئینہ میں بغیر پلک جھپکائے غور سے دیکھتا رہے، ذکر اسم ذات قلب میں جاری رہنا ضروری ہے۔ ابتداءً شغل سُلْطَانًا نَصِيْرًا اور سُلْطَانًا مَحْمُوْدًا کی طرح اس میں بھی آنکھوں کو پریشانی ہوگی لیکن مستقل مزاجی سے مشغولیت جاری رکھے۔ جب نظر قائم ہو جائے گی تو آئینہ کا عکس آہستہ آہستہ غائب ہونا شروع ہو جائے گا، یہاں تک کہ یہ عکس بالکل غائب

ہو جائے گا اور کچھ دھندلے سے نقوش آئینہ میں ابھرنے لگیں گے جن میں مختلف اقسام کی روشنی کی لہریں نکلتی ہوئی محسوس ہوں گی۔ اس کے بعد ایک جسم متحرک مثالی آئینہ میں دکھائی دے گا۔ اب جس کسی کے بارے میں کچھ دریافت کرنا ہو تو اس جسم مثالی متحرک کی علامات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فلاں شخص کی زندگی کا سلسلہ کب تک قائم رہے گا، اسی کو مصنف بیان فرما رہے ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس شغل میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ جسم مثالی (عکس) جو آئینہ میں نظر آرہا ہے آئینہ میں غائب ہو کر آئینہ کی حدود سے باہر آجاتا ہے اور جسم مثالی سے جو کہ لطیف ہوتا ہے جسم کثیف اختیار کر لیتا ہے یعنی جس طرح چلتا پھرتا انسان آپ کو نظر آتا ہے وہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ کس لئے ہوتا ہے بعض حضرات کا خیال ہے کہ قوتِ نظر کی مرکزیت کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے، جس طرح سورج کی شعاعیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور کائنات کی ہر ایک شئے اپنی استعداد کے مطابق اس سے حرارت و زندگی حاصل کرتی ہے اور وہ شعاعیں کسی کو جلاتی نہیں لیکن اگر ان شعاعوں کو آتشی شیشے میں جمع کر کے کسی کپڑے پر یا کاغذ پر ڈالا جائے تو وہ مرکزیت کا رخ اختیار کر کے اور یک جا ہو کر جلانے کی صلاحیت حاصل کر لیتی ہیں۔ اسی طرح آنکھ سے جو شعاعیں متعلق ہیں اگر ان میں بھی مرکزیت پیدا ہو جائے تو ان کی صلاحیت بھی قیاس سے بالاتر ہو سکتی ہے۔ اور بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ جسمِ مثالی لطیف میں یہ صلاحیت بذاتِ خود موجود ہے لیکن اس سے تعلق نہ ہونے کی وجہ سے اور اس میں غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے ان پوشیدہ صلاحیتوں کا احساس نہیں ہوتا، توجہ کی مرکزیت سے آنکھ میں وہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے کہ اس جسمِ لطیف مثالی کی صلاحیتوں کو دیکھ سکے، اس لئے ایسا ہوتا ہے۔ بہرحال یہ مسئلہ ہمارے موضوع سے متعلق نہیں، اس لئے اس پر ہم مکمل طور پر گفتگو نہیں کر سکتے صرف اشارۃً ضمنی طور پر یہ عرض کر دیا گیا ہے۔

ہاں تو بات یہ چل رہی تھی کہ اگر اس قسم کی کیفیت کا ظہور ہو تو سالک کو اس جسم مثالی کی طرف جو شکل انسانی شاغل کے سامنے موجود ہو جائے توجہ نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ اس طرف توجہ کرنے سے مافوق العادت معاملات کا ظہور ہونے لگتا ہے اور پھر شہرت، عزت اور دولت کے جال میں پھنس جانے کا بہت زیادہ امکان ہو جاتا ہے اور آخر عمر تک اس سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوتا۔ اسی لئے بزرگانِ دین نے ہمزاد وغیرہ کو اپنے تابع کرنے کی سختی سے ممانعت فرمائی ہے کیونکہ مرنے کے وقت یہ بحالتِ نزع ایمان پر حملہ آور ہوتا ہے اور اس نازک وقت میں عامل کے سامنے ایسے مناظر پیش کرتا ہے کہ نہ کلمۂ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی توفیق ہوتی ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف خیالات کا رُخ ہوتا ہے اسی لئے مرشدین کاملین صرف ایسے طالبانِ حق کو اس کی اجازت مرحمت فرماتے ہیں جن کا ہاضمہ قوی ہوتا ہے اور طبیعت میں مغلوبیت نہیں ہوتی۔ طالب میں ان صفات کا امتحان لینے کے بعد مرشد کامل اس لئے اس شغل کی اجازت مرحمت فرماتے ہیں کہ اس شغل کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس طریقِ کار پر پوری طرح مستعدی اور مستقل مزاجی کے ساتھ عمل کرنے سے نظر میں ایک ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کو مسمریزم اور ہپناٹیزم سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے حصول سے سلبِ امراض میں بڑی مدد ملتی ہے، قلب اور دماغ پر اس کے اثرات مرتب ہونے سے کوئی بھی ذی ہوش انکار نہیں کر سکتا۔ اس لئے بری عادتوں کو چھڑا دینا اور مسخر کر لینا اس شغل پر عبور حاصل کرنے کے بعد کوئی مشکل نہیں رہتا۔ صوفیاء حضرات نے صحیح طریقہ پر اس شغل سے فائدہ حاصل کرنے کیلئے اسم ذات کا ذکرِ قلبی مقرر کیا ہے تاکہ ایک لمحہ کے لئے بھی ذاتِ پاک کے تصور سے علیحدگی نہ ہو اور کرامات کے حصول کی وجہ سے غیر مقصود کی طرف رغبت نہ ہو جائے۔ اس لئے کہ مقصودِ اصلی تو ذاتِ پاک ہے اور ہر طرف سے توجہ ہٹا کر صرف اسی کی طرف تمام تر توجہ رکھنا بہت زیادہ ضروری ہے۔ ھٰذا فیضانُ المرشد

چوں بہ بینی عکس خود را با تمامی اندراں   میزی ور وار دنیا تا بہ بینی ہمچناں

ترجمہ: جب تم اپنے عکس کو آئینہ میں تمام اعضاء کی درستگی کے ساتھ دیکھو تو سمجھ لو کہ جب تک اس طرح دیکھتے رہو گے اس دنیا میں زندہ رہو گے۔

تشریح: یعنی آئینہ میں جسم مثالی کی صورت میں جو اپنا عکس تم کو نظر آرہا ہے اگر وہ عکس صحیح سالم ہے اور تمام اعضاء درست ہیں۔ سر، ناک، کان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ سب ٹھیک ہیں تو اس جسم مثالی کے تصور سے جو شخص بھی متعلق ہوگا خواہ عامل خود ہو یا کسی دوسرے کے بارے میں اس سے سوال پوچھا گیا ہو، تو وہ شخص اس وقت تک زندہ سلامت رہے گا جبتک آئینہ میں جسم مثالی اعضاء کی درستگی کے ساتھ نمودار ہوتا رہے۔

گر نہ بینی عکس خود را با تمامی اندراں   زندگیت ختم باشد راست میری آں زماں

ترجمہ: اگر آئینہ میں تم اپنے عکس کو مکمل حالت میں نہ دیکھو تو تمہاری زندگی ختم ہوگئی اور عنقریب تمہاری موت واقع ہو جائے گی۔

تشریح: یعنی اس جسم مثالی کے اعضاء درست نہ ہونے کی صورت میں موت کا واقع ہونا یقینی ہے، تمام اعضاء کے درست نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سر بہت چھوٹا ہو یا بہت بڑا ہو یا پھٹا ہوا ہو، یا زخمی محسوس ہو، اسی طرح سے ناک، کان، ہاتھ، پاؤں، غرضیکہ تمام اعضاء میں درستگی نہیں ہے تو اس صورت میں اس عکس سے متعلق شخص کی موت عنقریب واقع ہونے والی ہے۔

گر کسے را تن بہ بیند سر نہ بیند اے پسر   زندگی او سہ شب باشد بماند پر خطر

ترجمہ: اگر کوئی آئینہ میں بدن تو دیکھے لیکن اس کا سر موجود نہ ہو تو اس کی زندگی تین رات کی باقی رہ جاتی ہے اور وہ خطرہ میں گھرا ہوا ہے۔

تشریح: وہ جسم مثالی اس انداز پر نظر آرہا ہے کہ اس کا تمام بدن تو ٹھیک ہے لیکن اس کا سر موجود نہیں ہے تو اس صورت میں اس متعلق شخص کی زندگی صرف تین رات کی باقی رہ گئی ہے

کن چو قیاس ہمچناں کاندر نشان اول است　　این چنین در آئینہ ہم بس نشان موت ہست

ترجمہ: یہاں پر بھی تم اسی طرح قیاس کرو جس طرح یہ علامات پہلے بیان کر دی گئی ہیں اسی طرح آئینہ میں بھی بس موت کی یہی علامات ہیں۔

تشریح: مصنفؒ بتلا رہے ہیں کہ آئینہ میں جسم مثالی کو دیکھ کر علامات موت کے ذریعہ کسی نتیجہ پر پہونچنے کا معاملہ بالکل ویسا ہی ہے جس طرح سایہ بینی کے ضمن میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس لئے ان مضامین کو دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسی پر قیاس کرکے نتیجہ اخذ کر لینا کافی ہے۔

در نشانِ موتِ مردم رحمتے راہو شدار　　بے حباب ار بول آید مرگش آمد می شمار

ترجمہ: آدمی کی موت کے سلسلے میں ایک بیماری کا خیال رکھو، جھاگ کے بغیر اگر مریض کو پیشاب آئے تو اس کی موت عنقریب واقع ہو جائے گی۔

تشریح: اس سے پہلے اسی عنوان کے تحت ان علامات کا بیان کیا تھا جن کا تعلق جسمِ ظاہری سے نہیں جسمِ مثالی سے تھا، اسی لئے ان علامات کے جاننے والے کو طبیب روحانی کہا جاتا ہے۔ اب مصنفؒ ان علاماتِ موت کا ذکر فرما رہے ہیں جن کا تعلق جسم ظاہری سے ہے اور ان علامات کو دیکھ کر ایک ماہرِ طبِ یونانی اور معالج جسمانی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ زندگی کے قائم رہنے کے آثار کب تک باقی رہ سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں مصنفؒ، مرد کی بیماری کے بارے میں یہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی مریض کو پیشاب آئے اور اس میں جھاگ نہ ہوں اور نہ بلبلے پیدا ہوتے ہوں تو اس صورت میں حالات ظاہری کے تحت اب اس شخص کی زندگی کا چراغ گل ہونے والا ہے، کیونکہ از روئے طب تمام قوتوں کا دار و مدار جسمِ انسانی میں حرارتِ غریزیہ پر ہے خواہ وہ قوت قابضہ ہو یا دافعہ، ماسکہ ہو یا ہاضمہ، اور ان قوتوں کے اعتدال سے نظامِ جسمانی کا تعلق جس قدر قریب ہوگا حرارتِ غریزی کا نظام بھی اسی کے مطابق روح سے فیضان حاصل کرتا رہے گا یعنی

جسمِ انسانی میں جو رُوح مدبّرِ بدن ہے وہ ان قوتوں کے اعتدال کا نتیجہ ہے ۔ پیشاب اگر بغیر جھاگ کے آرہا ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قوتِ دافعہ (باہر پھینکنے والی قوت) کمزور ہو گئی ہے ، اور یہ علامت ہے اس بات کی کہ اب رُوح اپنے کام کو سمیٹ رہی ہے یا جھاگ کے بغیر پیشاب کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس میں وہ اجزاء جو تمام بدن سے تیزاب کی صورت میں باہر پھینکے جاتے ہیں اور گُردوں کے ذریعہ یہ عمل جاری رہتا ہے اس نظام میں بھی مجموعی طور پر ان چاروں قوتوں کے اعتدال کے ساتھ ظہور نہ ہونے کی وجہ سے خلل پیدا ہو گیا ہو ، اگرچہ بنیادی طور پر عناصرِ اربعہ کا خلل ، نظامِ جسمانی کے خلل کا باعث ہے مگر ان عناصرِ اربعہ کی کارکردگی کا نتیجہ یہ چار قوتیں ہیں ، جن کا اعتدال علامتِ صحت ہے ۔

البتہ اس ضمن میں اس بنیادی بات پر دھیان رکھنا کافی ہے کہ رُوح اپنی ذمہ داریوں سے آہستہ آہستہ سبکدوش ہونا چاہتی ہے اسلئے اس قسم کی خرابیاں ظاہر ہو رہی ہیں ۔

بے ارادہ ریدآید ، بول افتد ہمچنان   گر نیاید بول آندم فقد خایہ شد بداں

ترجمہ : بغیر ارادہ پاخانہ نکل پڑے یا پیشاب نکل جائے ، اسی طرح اگر پیشاب ہی نہ آئے تو اس وقت عضوِ مخصوص کی کارکردگی ختم ہو گئی ۔

تشریح : یعنی قوتِ حساسیہ بالکل ختم ہو جائے اور بغیر ارادہ کے پیشاب پاخانہ کا آنا اس بات کی علامت ہے کہ اس کی موت عنقریب ہے اور اگر پیشاب بالکل بند ہو جائے تو گویا گُردوں کے ساتھ ساتھ مجرائے پیشاب نے اپنا کام کرنا بند کر دیا ۔ ان علامات سے بس یہی سمجھنا چاہیئے کہ اس شخص کا چل چلاؤ ہے ۔

قصیر چوں شد کیرِ مرد و حصیر چوں شکلِ فرج زن   دل ازو بردار آندم از تداوی دم مزن

ترجمہ : جب مرد کا عضوِ مخصوص چھوٹا ہو جائے اور عورت کا مقام بھی سکڑ جائے تو دل کو اس کی صحت یابی سے الگ کر لو اور علاج کی کوشش بھی نہ کرو ۔

تشریح : حرارتِ غریزی کے ختم ہونے سے حواس خمسہ ظاہری طور پر بھی متاثر ہوتے ہیں اور ان میں اثر پیدا ہونے سے پورے نظامِ جسمانی پر اثر پڑتا ہے۔ اس قسم کی علامات بھی موت کی علامات ہیں۔

از نشانِ موت باشد یک مرض اے اہل ہوش ‌‌ ‌ کو نہد انگشتِ خود را در صماخِ ہر دو گوش

ترجمہ : اے عقل مند! موت کی نشانیوں میں سے ایک مرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کانوں کے سوراخ میں انگلیاں رکھے۔

تشریح : یعنی اگر مریض اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے تو اس سے بھی موت کی علامات کا اندازہ ہو جاتا ہے، وہ اس طرح کہ

گر درونش بشنود آواز بے مفہوم خاست ‌‌ ‌ کس نمیرد تا بود ایں صوت درو سے راست

ترجمہ : اگر وہ اندر میں بے مفہوم کی آواز اٹھتی ہوئی محسوس کرتا ہے تو ایسا آدمی نہیں مرے گا جبتک کہ یہ آواز اس کو ٹھیک ٹھیک سنائی دے رہی ہو۔

تشریح : یعنی مریض اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں دے اور اس کو آواز بے مفہوم یعنی گھوں گھوں، یا کسی قسم کی گونج کانوں میں محسوس ہو تو یہ علامت زندگی کی ہے، جبتک اس آواز کے سننے کا احساس باقی ہے یہ آدمی بھی زندہ ہے۔

گر درو آواز نے مرگش از و نزدیک دان ‌‌ ‌ سر دآمد باب ناسوتی بمیرد آں زماں

ترجمہ : اگر اس میں آواز کی گونج نہیں ہے تو موت کو قریب سمجھو، کیونکہ عالم ناسوت کا دروازہ اب بند ہو چکا ہے اس لئے وہ اب مر جائے گا۔

تشریح : یعنی مریض کے کان میں انگلیاں دینے کے بعد اس کو کسی قسم کی گونج سنائی نہ دے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ عالم ناسوت کا دروازہ اس کے لئے بند ہو چکا ہے اور اب اس دنیا سے اس کا تعلق منقطع ہو گیا ہے، گویا وہ عنقریب عالم ناسوت سے عالم بالا کی طرف سفر کرنے والا ہے۔

ہم نشانِ آں دگر با تو بگویم اے پسر　　زندگی از دیدنِ بینیت یابی سر بسر

ترجمہ: موت کی نشانیوں کے سلسلے میں ایک اور بات میں تم کو بتلاتا ہوں کہ ناک کے دیکھنے سے بھی تم زندگی باقی رہنے کی علامت سمجھ سکتے ہو۔

تشریح: یعنی اگر مریض اپنی آنکھوں کو حرکت دے سکتا ہے اور ناک کو دیکھ سکتا ہے تو ابھی آثارِ حیات مزید باقی ہیں، اور اگر نہ دیکھ سکے تو پھر امیدِ زندگی نہیں جیسا کہ مصنفؒ فرماتے ہیں کہ:

گر نہ بیند نائے بینی موئے چشم وابرداں　　شد حجاب باب جبروتی بمیری آں زماں

ترجمہ: اگر وہ اپنی ناک کو، آنکھوں اور پلکوں کے بالوں کو نہ دیکھ سکے تو گویا اب عالمِ جبروت کا حجاب حائل ہو گیا وہ شخص عنقریب مر جائے گا۔

تشریح: صوفیاء فرماتے ہیں کہ کان عالمِ ناسوت میں روح کا دروازہ ہیں، اسی طرح آنکھ عالمِ جبروت میں روح کا دروازہ ہے، جب کان میں کسی بھی قسم کی آواز آنی بند ہو جائے تو زندگی کا سلسلہ ختم ہونے والا ہے، اسی طرح سے آنکھ کام کرنا بند کر دے تو گویا عالمِ جبروت میں روح کا فیضان ختم ہو رہا ہے، یہ سب علاماتِ موت سے ہیں۔

می نگر در چشم روشن چوں ستارہ نور دار　　گر نباشد موت تو نزدیک از تو یاد دار

ترجمہ: آنکھ میں غور سے دیکھو، اگر وہ پُرنور ستارے کی طرح روشن نہیں ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ موت تم سے اب نزدیک ہے۔

تشریح: یعنی آنکھ میں روشنی اگر اس انداز میں نہ ہو جیسے چمکدار ستارہ ہوتا ہے اور آنکھیں بجھی بجھی سی معلوم ہوں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ بس ہمیشہ کیلئے آنکھ بند ہونے والی ہے۔

ہم نشانِ علت الموت است ایں شکل دگر　　کو نہ بیند سایۂ خود یا نمی آید نظر

ترجمہ: ایک دوسری صورت بھی موت واقع ہونے کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے سایہ کو نہ دیکھے، یا اس کو نظر ہی نہ آتا ہو۔

تشریح : یعنی موت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے سایہ کو نہ پہچان سکے یا اگر پہچاننے کی کوشش بھی کرے تو اس کو سایہ نظر ہی نہ آتا ہو، ان دونوں صورتوں میں بھی موت کے عنقریب واقع ہونے کا امکان ہے۔

ار نہ بیند سایۂ خود ہوش داری اے پسر ‏ نور دیدہ زو نہاں شد راست میرد بے خطر

ترجمہ : اگر وہ اپنے سایہ کو نہیں پہچان پاتا تو تم یہ اندازہ لگا لو کہ اس کی آنکھ کا نور اس سے چھپ گیا ہے اور وہ بے شک مر جائے گا۔

تشریح : جب نوبت یہاں تک آجائے کہ وہ اپنے سایہ کو نہ پہچان سکے تو گویا آنکھ کی روشنی اور ہوش و حواس کی درستگی میں خلل آگیا ہے اور بیشک یہ علامات موت سے ہے۔

ہم نشان علت الموت است اندر دست او ‏ چوں نجنبد نبض دست از زندگی او بشو

ترجمہ : موت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اس کے ہاتھ کے اندر جب نبض حرکت نہ کرے تو اس کی زندگی سے ہاتھ دھو لینے چاہئیں۔

تشریح : یعنی یہ بھی ایک علامت موت کی ہے کہ ہاتھ میں نبض حرکت کرتی ہوئی محسوس نہ ہو، اسی کو نبض چھوٹنا کہتے ہیں کہ اب آہستہ آہستہ روح جسم سے رخصت ہو رہی ہے ایسے شخص کی زندگی سے ناامیدی ظاہر بات ہے۔

گر چہ بینی زندہ او را ہست دم باقی بداں ‏ ختم شد عمرش ملک آید بر داز جسم جاں

ترجمہ : اگر تم یہ دیکھو کہ وہ زندہ ہے اور اس کا سانس باقی ہے لیکن یہ سمجھ لو کہ اس کی عمر ختم ہو چکی ہے، فرشتہ اس کی روح جسم سے نکالنے والا ہی ہے۔

تشریح : یعنی اگر ایسے شخص کا سانس چل رہا ہو لیکن نبض کی حرکت ہاتھ میں محسوس نہ ہوتی ہو تو زندگی کی علامت یعنی سانس چلنے کے باوجود اب مزید زندہ رہنے کی امید ختم کر دینی چاہیئے بس اس میں صرف اتنی مہلت باقی ہے کہ فرشتہ آکر اس کی روح قبض کر لے۔

ہم نشان علت الموت از دہانش ہوشدار ‏ گر لعابش ترش شد از مرد گانش می شمار

ترجمہ: موت کے اسباب میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس کے منہ پر دھیان کرو، اگر اسکا تھوک (لعابِ دہن) کھٹا ہو جائے تو اس کو مُردوں میں شمار کرو۔

تشریح: یعنی اس سے معلوم کرنے پر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ اس کے لعابِ دہن (تھوک) کا مزہ کھٹا ہو گیا ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اب وقفۂ زندگی بہت کم رہ گیا ہے۔

برنیاید گر خویش بے جابی بے زبان   گشت سدباب لاہوتی بمیر دآں زماں

ترجمہ: اگر عادت کے مطابق لعاب بغیر جھاگ کے اس کی زبان پر نہ آئے تو عالمِ لاہوت کا دروازہ گویا بند ہو گیا اور وہ شخص اس وقت موت کے قریب ہے

تشریح: یعنی اگر اس شخص کے مُنہ میں جھاگ کے ساتھ لعابِ دہن آرہا ہے تو یہ بھی موت کی علامت ہے کیونکہ عام طور پر عادت تو یہ ہوتی ہے کہ زبان پر لعاب رہتا ہے اور جھاگ پیدا نہیں ہوتے، البتہ بعض افراد کے معمولی سے جھاگ نکلتے ہیں، لیکن بیمار آدمی کی سانس کی رفتار کے ساتھ منہ سے تھوک نکلے اور تھوک کے ساتھ جھاگ بھی ہوں تو گویا آلاتِ تنفس کا نظام خراب ہوتا جارہا ہے جس کا مستقل قائم رہنا موت کی علامت ہے۔

از نشانِ موتِ ہردم زحمتی بشنو خبر   از کدامی دردم آید، باتواتر کن نظر

ترجمہ: آدمی کی موت کی علامت میں ایک مرض یہ بھی ہے کہ یہ غور کرو کہ متواتر کس طرف سے سانس آرہا ہے۔

تشریح: یعنی مریض کے سانس پر غور کرو کہ ناک کے کون سے حصے سے سانس کی آمد و رفت ہے، دائیں طرف سے سانس آرہا ہے یا بائیں طرف سے کیونکہ

از دمِ خورشید یابد صحتِ امراض داں   وز دمِ مہتاب دشوار است بر و بیگماں

ترجمہ: سورج کی طرف سے اگر سانس آرہا ہے تو مرض سے صحت ہو جائے گی اور چاند کی طرف سے اگر سانس کا آنا جانا ہے تو صحت کا حصول مشکل ہے۔

تشریح: ناک کے دائیں طرف کے حصہ سے سانس کی آمد و رفت کے سلسلے کو سورج

کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور بائیں طرف کے سُر کو چاند کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس لیئے اگر سانس مسلسل بائیں طرف سے چل رہا ہے تو یہ صحت کی علامت ہے اور دائیں طرف سے مسلسل چل رہا ہے تو صحت کی امید نہیں ہے کیونکہ دائیں طرف کا سانس گرم ہوتا ہے، جو حرارتِ غریزی کی علامت ہے اس لیئے صحت کی امید ہے اور بائیں طرف جو چندرما کا سُر کہلاتا ہے اس میں ٹھنڈک کے اثرات کا غلبہ ہے جس سے حرارتِ غریزی کی مغلوبیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگرچہ عام صحت کے دنوں میں دونوں طرف سے باری باری سانس کی آمدورفت رہتی ہے لیکن جب مسلسل سانس بائیں طرف سے آئے تو یہ بھی موت کی علامت ہے کیونکہ طبیعتِ مدبرہ کو وہ حرارت نہیں مل پائے گی جو برودتِ مزاج کو حرارت دیکر اعتدال قائم کرسکے۔

گر کسے را دم زچپ بیروں نیاید تا سہ روز — دم شمارش گشت کامل بہر او شو اہلِ سوز

ترجمہ: اگر تین دن متواتر کسی کا سانس بائیں طرف سے باہر نہ آئے تو اس کی زندگی کا وقفہ پورا ہوگیا ہے اس کی طرف سے صبر کرلے۔

تشریح: یعنی بائیں طرف سے تین دن تک سرد سانس کا تعلق منقطع رہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اب اسکی عمر قریب الختم ہے کیونکہ اب حرارتِ غریزی کا سلسلہ بھی تقریباً ختم ہوا چاہتا ہے۔

جمع گردد دو دمش در وقتِ مردن راستداں — باز گردد باب ملکوتی رود دم زود آں

ترجمہ: اور اگر دونوں سانس ایک ساتھ چلنے لگیں تو پھر یقین جانو کہ اس حالت میں عالمِ ملکوت کا دروازہ کھل جاتا ہے اور سانس تیزی سے نکل جاتا ہے۔

تشریح: یعنی تمام جسم سے روح کھینچکر اوپر کی طرف چلی جاتی ہے، پاؤں کے انگوٹھوں سے روح کی واپسی شروع ہوجاتی ہے اور آنکھ صوفیائے محققین کے نزدیک عالمِ ملکوت کا دروازہ ہے جب یہ دروازہ کھل جاتا ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ اسکے سانس پورے ہوگئے یعنی اسکے مرنے کا وقت قریب آگیا۔ اس لیئے ناک کے دونوں سُر سے سانس کا سلسلہ آمدورفت شروع ہوجاتا ہے، اب موت نے زندگی سے اس کا رشتہ توڑ دیا۔ واللہ اعلم

دربیانِ علامتِ موتِ مومن

مومن کی موت کی نشانی کا بیان

بازگویم از نشانِ موتِ مومن نیک مرد — وقتِ مردن خوئے پیشانی بود با نور زرد

ترجمہ: نیک اور صاحب ایمان آدمی کی موت کی نشانی میں بیان کرتا ہوں، مرنے کے وقت اس کی پیشانی اور چہرہ زرد رنگ سے پرنور ہوجاتا ہے۔

تشریح: اس سے پہلے عنوان میں مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے علامات موت کا بیان تفصیل کے ساتھ کیا تھا، اب اسی علامتِ موت کا تعلق مومن سے کس طرح ہوتا ہے یعنی نیک اور ایماندار آدمی کی موت کے وقت کیا کیا علامتیں ظاہر ہوتی ہیں وہ بیان کر رہے ہیں۔

پہلی نشانی تو یہ بتلا رہے ہیں کہ فطری طور پر کسی نقاہت یا بیماری کے بغیر اس کا چہرہ اور پیشانی زرد ہوجاتی ہے، کیونکہ انسان کا ظاہر اس کے باطن کا آئینہ دار ہوتا ہے اور محققین صوفیاء نے مکاشفہ سے تصوف میں لطائف کے جو رنگ معلوم کئے ہیں ان میں لطیفۂ روح کا رنگ زرد ہے، پس جس شخص کا باطن نورِ ایمان سے منور ہوگا اور اعمالِ صالحہ سے ظاہر مزین ہوگا تو فیضانِ روح کی بنا پر لطیفۂ روح کا نور یعنی زرد رنگ اس کی پیشانی اور چہرے پر نمایاں ہوجائے گا، مشاہدہ بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ ھٰکذا قال مرشدی۔

آبِ دیدہ تر کند رخسار خندد پُر دہاں — یا بخواند ذکر یا خاموش ماند آں زماں

ترجمہ: اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہوتا ہے اور لبوں پر بھرپور مسکراہٹ ہوتی ہے، اسوقت یا تو وہ ذکر ذات میں مصروف ہوتا ہے یا خاموش رہتا ہے۔

تشریح: یہ تین علامتیں بھی مومن کی موت کی ہیں، ایک تو یہ کہ اس کے آنسو مرنے کے وقت رخسار پر بہہ رہے ہیں، یہ اس وجہ سے کہ اب وہ احکم الحاکمین کی بارگاہ میں حاضر ہو رہا ہے اس

کو باوجود ان اعمالِ صالحہ کے جو اس نے اپنی زندگی میں کیئے ہیں یہ احساس ہے کہ مجھ سے بندگی کا حق ادا نہ ہو سکا اور تمام عمر ضائع ہوگئی، اس احساس کے تحت آنسو نکل آئے ہوں، یا یہ بات ہو کہ اب محبوب حقیقی سے ملنے کا وقت قریب ہے، تمام زندگی جس گھڑی کا انتظار کرتا رہا وہ اب آن پہونچی ہے، اس لئے یہ آنسو خوشی کے آنسو ہوں، لیکن ان دونوں کیفیات کے ساتھ اس کے ہونٹوں پر بھرپور مسکراہٹ ہوتی ہے، اسلئے یہ خیال صحت کے زیادہ قریب ہے کہ یہ خوشی کے آنسو ہیں جو مسرت کی زیادتی پر بے اختیار آنکھوں کے پیمانوں سے چھلک رہے ہیں۔

دوسری علامت یہ ہے کہ موت کے وقت تمام رشتے ناتے توڑ کر وہ محبوب حقیقی کے ذکر میں مصروف رہتا ہے، کیونکہ اسم کے ذکر سے مقصود مسمّٰی ہے، اسلئے جب اس نے اس اسم کا ذکر کثرت کے ساتھ بحالت صحت کیا ہے تو اب آخری وقت میں تو اس کی لذت کی کیفیت کے احساس کے تحت بے اختیار وہ ذکر باری تعالیٰ میں مصروف رہتا ہے۔

تیسری علامت یہ ہے کہ وہ اب خاموش ہے یعنی اس کے سامنے تجلّیاتِ خداوندی کے وہ نظارے آجاتے ہیں جن میں گم ہو کر وہ سب سے بے خبر ہو جاتا ہے اور تصویر حیرت بن کر محبوب حقیقی کی تجلّیات کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے، اس وقت اس کا تعلق ایک ایسے عالم سے قائم ہو جاتا ہے جس کا اظہار الفاظ کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا۔ صوفیائے محققین نے ذکر کی کثرت اور اجرائے لطائف کا عمل و شغل اسی لئے وضع کیا ہے کہ بے اختیار اور لاشعوری طور پر اسکے قلب و دماغ، روح، خفی، اخفیٰ میں ذکر سرایت کر جائے، اور جب تمام تعلقات ختم کرنے کا وقت آجائے تو صرف اسی ذات وحدہٗ لاشریک سے براہ راست رابطہ قائم ہو جائے

اس سے بڑی ایمان اور سعادت کی

علامت کیا ہوگی

-اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ-

دربیانِ علامتِ موتِ فاسق

فاسق کی موت کی نشانی کا بیان

ہم نشانِ موتِ فاسق ایں زماں گویم ترا سُرخ گردد رنگِ رویش وقتِ مُردن برملا

ترجمہ: اب میں تجھ سے فاسق کی موت کی علامت بیان کرتا ہوں کہ مرنے کے وقت کھلّم کھلّا اس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہو جاتا ہے۔

تشریح: جس طرح لطیفۂ روح کا نور زرد رنگ کا تسلیم کیا گیا ہے اسی طرح لطیفۂ قلب کا نور سرخ رنگ کا ہے، چونکہ اس مرنے والے کے قلب میں فسق موجود تھا اور برے اعمال سے اس کا تعلق تھا، اس لیئے موت کے وقت وہ رنگ شرمندگی کی علامت کے طور پر اس کے چہرے پر آگیا، بلکہ تجربہ اور مشاہدہ یہ بتلاتا ہے کہ فاسقوں کے منھ پر چھانے والی یہ سُرخی سیاہی مائل ہوتی ہے جس کو دیکھ کر تکدّر پیدا ہوتا ہے۔

رنگ خاکستر شود یا کف برآید از دہاں غرغرہ از حلق خیزد ہمچوں بانگِ اشتراں

ترجمہ: یا اس کی رنگت مٹی کی سی ہو جاتی ہے اور منھ سے جھاگ نکلنے لگتے ہیں، اس کے حلق سے غرغرہ کی آواز اونٹ کی آواز کی مانند نکلتی ہے۔

تشریح: ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ باطن کا آئینہ ظاہر ہوتا ہے، ایسے لوگ جن کا تعلق برے اعمال سے قائم رہتا ہے اور توبہ کی توفیق نہیں ہوتی تو زندگی ہی میں ان کے چہرے کی رونق اور نور ختم ہو جاتا ہے، احساس جرم کی وجہ سے چہرے کی رنگت اڑ جاتی ہے اور منھ سے جھاگ نکلنے لگتے ہیں، اس دنیا سے جاتے ہوئے مسرت محسوس کرنے کے بجائے روتا چلّاتا ہے، ہائے ہائے کرتا ہے، زبان بند ہو جاتی ہے تو اونٹ کی طرح غرغرہ کی آواز اس کے حلق سے نکلتی ہے، یہ تمام علامتیں اس بات کی ہیں کہ اس کی موت اچھی حالت میں نہیں ہے۔ اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْنَا مِنْهُمْ۔

خاتمۃ الکتاب

از عنایاتِ خدا کردیم ختم ایں کتاب   حمدِ او را باز گویم بے شمار و بے حساب

اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں سے ہم نے اس کتاب کو مکمل کرلیا۔ ہم دوبارہ اسکی ان گنت اور بیحد تعریف بیان کرتے ہیں، یعنی ایک مرتبہ تو آغازِ کتاب میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی تھی اور اُسی کے نام سے اِس کام کو شروع کیا تھا اور اختتام بھی اسی کے نام پر کرتے ہیں

باز گویم مصطفیٰؐ را ہم درود و ہم سلام   بے عدد با پیروان و آل و اصحابش تمام

سیّد الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی دوبارہ درود و سلام بھیجتے ہیں، اور ان کے ماننے والوں اور آل اطہار اور اصحاب کرام پر بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت بھیجتے ہیں،

ختم شد بر شش صد و پنجاہ بیت ایں گنج راز   نہ صد و شصت و شش آنرا سال و ہم تاریخ ساز

راز کا یہ خزانہ چھ سو پچاس اشعار پر مکمل ہوگیا، نو سو چھیاسٹھ ہجری میں اس تاریخ ساز کتاب کو ترتیب دیا۔

غرۂ ذی الحجہ را ترتیب دادم مختصر   در سرِ عہد بہادر شاہ غازی بو ظفر

ذی الحجہ کی چاند رات کو میں نے یہ مختصر سی کتاب ترتیب دی، ابو ظفر بہادر شاہ غازی کے زمانۂ حکومت میں۔

نظم خوشتر، راز برتر، ساز داد از بہر عام   بندۂ عاجز کہ آں را عبدِ رحمٰن است نام

معرفت کے بلند پایہ راز کو بہترین نظم کے اندر طالبانِ حق کے لئے ترتیب دیا ہے اس بندۂ عاجز نے جس کا نام عبد الرحمٰن ہے

ساخت انشائے صحیفہ از نوال ذو الجلال   در مقامِ خاص فتح آباد شہرے پر جلال

خداوند ذو الجلال کے انعام اور کرم سے نادر مضامین پر مشتمل یہ کتاب تیار کی ہے بارونق شہر مقام فتح آباد میں۔

ملک میمون و مبارک از دم محمود شاہ ۔۔۔ حق تعالیٰ دار دش دائم ز ہر آفت نگاہ

محمود شاہ کی وجہ سے یہ ملک بارونق اور تہذیب کا گہوارہ ہے، اللہ تعالیٰ ہر آفت سے اسکو ہمیشہ محفوظ و مامون رکھے۔

دائما از برکتش بادا سلامت برقرار ۔۔۔ ظالمان شہر از وے جملگی زار و نزار

یہ شہر اس کے زیر سایہ ہمیشہ پرامن اور باقی رہے اور شہر کے فتنہ انگیز عناصر اس کے مقابلہ میں کمزور اور عاجز ہیں۔

از وجودش شہر سالم از ہمہ آفات نیز ۔۔۔ فتح روزی بادا ورا از عنایات عزیز

اس کی موجودگی کے سبب تمام آفات و مصائب سے شہر محفوظ رہے، اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے طفیل روزی کی کشادگی اسکے لیے ہمیشہ رہے۔

غوث عالم شیخ سیف اللہ قتال خدا ۔۔۔ قطب عالم شیخ لطف اللہ پیر ایں گدا

غوث عالم حضرت شیخ سیف اللہ جو مجاہد راہ خدا ہیں اور قطب عالم حضرت شیخ لطف اللہ جو اس فقیر کے مرشد ہیں۔

رحمت حق بر روان جملہ بادا بے حساب ۔۔۔ کز نگاہ لطف ایشاں نظم کردم ایں کتاب

اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمت ان سب حضرات پر ہو کہ ان کی نگاہ کرم کے فیض سے میں نے یہ کتاب مرتب کی ہے

ہر کہ ایں جا از ستمگاری ندارد دل پاک ۔۔۔ زار گردد زود از وے میرود در زیر خاک

جو یہاں پر ظلم و ستم سے اپنے دامن کو پاک نہیں رکھتا وہ اپنے اعمال بد کی وجہ سے جلد ہی ذلیل و خوار ہو کر مٹی کے نیچے چلا جاتا ہے

در شمار نظم ایں را نام آمد "گنج راز" ۔۔۔ در زمان وسط شاہ از لطف شاہ بے نیاز

اس منظوم صحیفہ کا نام "گنج راز" ہے جو شاہ ابو ظفر غازی کے دور میں شاہ لطف اللہ صاحب کی مہربانی سے یہ کتاب مکمل ہوئی۔

تمت بالخیر۔